نعرۂ حق

سوامی وویکانند

002 www.taemeernews.com

نعرۂ حق

سوامی وویکانند

کی

تقاریر اور تصانیف سے انتخاب

جلد اوّل

رامکرشن مشن نئی دہلی

طبع اوّل سنہ ۱۹۶۳ء

پبلشر:۔ سوامی سوواہانندا

قیمت مجلد آٹھ روپیہ ــــ مجلد فل کلاتھ دس روپیہ

003 www.taemeernews.com

NÁRA - E - HÂQ

(Selections from Swami Vivekananda)

VOL. I

[FIRST EDITION]

Price :- *Rs. 8·00* ... ... ORDINARY BINDING

Rs. 10·00 ... ... DELUXE BINDING

1963

Published by

SWAMI SWAHANANDA

Ramakrishna Mission

NEW DELHI

Printed at Kapur Printing Press, Delhi

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

فہرست مضامین

حصہ اول

۱۔ پیشِ لفظ۔	6
۲۔ سوامی جی کے سوانحِ حیات۔	9
۳۔ مذہب کیا ہے؟	14
۴۔ مذہب اور معیارِ عقل (علم اور عرفان)	32
۵۔ مذہب کی ضرورت۔	50
۶۔ ایک عالمگیر مذہب کا آدرش۔	68
۷۔ پارلیمنٹ آف ریلیجنز (مجلسِ مذاہب)	98
۸۔ دُنیا کے مذہبی رہنما۔	121

حصہ دوم

۹۔ دیباچہ	144
۱۰۔ تعلیم	146
۱۱۔ ہندوستان اور اس کے مسائل	215
۱۲۔ ہندوستان کی عورت	301
۱۳۔ حضرت محمدؐ	307

006 www.taemeernews.com

پیش لفظ

سوامی وویکانند کی سویں سالگرہ کی تقریب پر رامکرشن مشن کی مختلف شاخوں سے اُن کے لیکچروں اور دُوسری تصانیف کے مجموعے اپنے دیش کی زبانوں میں شائع کئے جارہے ہیں اس سلسلے میں سوامی سوداہا نندا جی سیکریٹری رامکرشن مشن نئی دہلی نے فیصلہ کیا کہ سوامی وویکانند کی تقاریر اور تصانیف کا انتخاب اُردو زبان میں بھی چھپوایا جائے چنانچہ اس بنا پر اُنہوں نے سرکار ہند کے محکمہ تعلیم سے مالی امداد کا وعدہ بھی لے لیا اُس کے بعد اُنہوں نے سوامی جی کی تصانیف کا انتخاب میرے ہاتھ میں دے کر ترجمہ کی ذمہ داری مجھے سونپ دی اس لئے نہیں کہ مجھ میں اس کام کی کوئی خاص اہلیت ہے بلکہ اس وجہ سے کہ سوامی جی کی اردو داں طبقے میں زیادہ واقفیت نہیں۔

بہرحال میں نے اپنے ایک دوست کی معرفت اُردو کے دو مانے ہوئے ادیبوں کو ترجمہ کرنے پر راضی کرلیا "نعرۂ سنیاس"، "پارلیمنٹ آف ریلیجنز" اور دُوسرے چند مضامین کا ترجمہ میں نے اپنے سر لے لیا اور باقی کام ان بزرگوں کے سپرد کردیا۔ خیال تھا کہ کتاب چھ مہینوں میں تیار ہوجائے گی لیکن جب مجھے ترجمہ وصول ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس پر نظرِثانی کی ضرورت تھی مجھے ان دونوں عُلما کا پُورا پُورا احترام ہے لیکن شاید چونکہ اُنہوں نے جلدی سے کام ختم کرنے کی کوشش کی اس لئے اُن کے ترجمے میں وویکانند کے خیالات کی پُرزور روانی نہ آسکی۔ مجھے ان صفحات میں وویکانند کی رُوح نظر نہ آئی اُن کی بھگتی اور پریم کا رس نہ مِلا۔ کسی حد تک تو مترجم مجبور تھے کیونکہ انتخاب میں بہت سے "نوٹ"ل شامل تھے، "یہ نوٹ" سوامی جی کے لیکچروں کی یادداشتیں ہیں اور بحیثیت نوٹ ہونے کے ان میں روانی ہو ہی نہیں سکتی

ل Notes

www.taemeernews.com

روانی پیدا کرنے کے لئے انہیں کچھ نہ کچھ پھیلانا پڑتا ہے میں نے ایسا کرنا ضروری سمجھا ہے کیونکہ اس مجموعے کا مقصد ودیکانند کے خیالات کو اُن بھائیوں تک پہنچانا ہے جو براہ راست انگریزی میں اُن کی تصانیف کا مطالعہ نہیں کر سکتے ودیکانند کے الفاظ میں معنی اس طرح کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں کہ بسا اوقات اُن کے محض لفظی ترجمہ سے (خواہ وہ کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو) پورے معنی پیدا ہی نہیں ہوتے' اس لئے جہاں تک مجھ سے بن پڑا ہے میں نے ترجمہ کرتے وقت یا اُس پر نظر ثانی کرتے وقت معانی کو خصوصاً پیشِ نظر رکھا ہے' چونکہ انگریزی اور اُردو کا اپنا اپنا محاورہ ہے' اس لئے بیان کی روانی اور خیال کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی خاطر میں نے کہیں کہیں کچھ جملے اپنی طرف سے بڑھا دیئے ہیں۔ اُمید ہے کہ اہلِ ذوق کو اس پر کوئی خاص اعتراض نہیں ہوگا۔

مجھے اپنی خامیوں کا پورا احساس ہے لیکن سوامی ودیکانند سے عقیدت اور محبت کے تقاضے نے مجھے اپنے "ایڈیٹر" کے حقوق کا استعمال کرنے پر مجبور کر دیا اور میں نے اپنے ادیب دوستوں کے ترجمہ کو مرتب کرتے وقت اس میں جہاں کہیں بھی سوامی جی کے معانی کو اُبھارنے کے لئے ضروری سمجھا کم و بیش ردّ و بدل کر دیا ہے یہاں تک کہ بہت سے حصّوں کو کلیتاً اپنے الفاظ اور اپنی طرز میں لکھ دیا ہے' اِن "دراز دستیوں" کے لئے میں اُن بزرگوں سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ ودیکانند کے نام پر وہ مجھے بخش دیں گے البتہ اس گستاخی کا ایک نتیجہ نکلا ہے کہ تمام کتاب کا بیان کسی قدر ہموار ہو گیا ہے۔

کتاب کو اس طرح تہذیب و ترتیب دینے کے لئے مجھے کافی وقت نکالنا پڑا بعض اوقات ترجمہ پر نظر ثانی کرنے میں براہ راست اصل سے ترجمہ کرنے سے بھی زیادہ وقت لگنے لگا۔ یہ دیکھ کر میں نے سوامی جی کی اجازت سے کچھ منتخب شدہ مضامین کی بجائے[1] دُوسرے مضمون چن کر اُن کا براہِ راست ترجمہ کر دیا تاکہ کتاب کی اشاعت میں اور زیادہ تاخیر نہ ہو' اطلاعاً عرض ہے کہ اس مجموعہ میں جن مضامین کا ترجمہ میں نے خود کیا ہے وہ یہ ہیں نعرہ سنیاس' مذہب کیا ہے' مذہب اور معیارِ عقل' پارلیمنٹ آف رلیجنز' دنیا کے مذہبی رہنما' پیرماتما حق و رعائت۔

ان حالات میں کتاب کی تیاری میں اندازے سے کہیں زیادہ وقت لگ گیا' دُوسرے چینی حملے نے میری مشکلات کو اور بھی بڑھا دیا دفتر میں کام کی بھرمار کی وجہ سے آٹھ نو گھنٹے صرف ہونے لگے اور اس کام کے لئے رات ہی کو وقت نکالنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا میری صحت خراب ہو گئی اور مجھے کچھ عرصہ بستر علالت پر دراز رہنا پڑا اس کے بعد کام کی رفتار بہت کم کرنا پڑی اور کتاب وقت پر شائع نہ ہو سکی اس کے لئے میں سوامی جی سے معافی کا خواستگار ہوں۔

---

[1] اس کتاب کی اشاعت کے بعد ان مضامین کو ترتیب دے کر اس مجموعے کی دُوسری جلد میں شامل کرنے کا ارادہ ہے۔

www.taemeernews.com

(ب)

آخر میں مجھے اُن سب اصحاب کا شکریہ ادا کرنا ہے، جن کی مدد اور تعاون سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے، میرے مترجم دوستوں میں سے ایک صاحب نے خصوصاً میرا ہاتھ بٹایا۔ کتاب ہٰذا کے کاتب اور اُن کے معاون کاتبوں نے متواتر محنت اور جانفشانی سے کتابت کی اور پُورے تحمّل سے غلطیوں کی تصحیح کی میرے ایک دوست نے ساری کتاب پڑھ کر کتابت اور زبان کی غلطیوں کو دُور کرنے میں مدد دی اور پرنٹرز نے دو ہی مہینے میں کتاب چھاپ کر شائع کر دی لیکن ممکن ہے کہ باوجود سب کی محنت کے کتاب میں کئی غلطیاں اور خامیاں رہ گئی ہوں ناظرین سے میری التجا ہے کہ ان سے درگزر کرتے ہوئے وِویکانند کے خیال اور معانی کی طرف توجہ دیں۔

بھگوان کی دیا سے کتاب اب چھپ کر تیار ہو گئی ہے، آج میں اپنی عقیدت کے اس پھُول کو سوامی وِویکانند کی خدمت میں بھینٹ کرتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ اُن کی معرفت اسے اُس یزدانی ہستی کے پاک قدموں میں جگہ نصیب ہو، جس کی الہامی آواز خود وِویکانند کے وجود میں مجسم ہوئی تھی۔

009 www.taemeernews.com

سوامی جی کے سوانح حیات

سوامی وویکانند کا جنم ۱۲ جنوری ۱۸۶۳ء کو کلکتہ کی ایک بستی "سملہ" میں ہوا۔ اُن کے پتا دشوا ناتھ دت ہائی کورٹ کے ایک نہایت کامیاب وکیل تھے۔ اُن کی ماتا کا نام بھونیشری دیوی تھا۔ سوامی وویکانند کی تعلیم و تربیت پر اُن کا خاص طور پر اثر پڑا۔

سوامی جی کا نام نریندر ناتھ دت تھا لیکن سب اُنہیں "نرن" نام سے پکارتے تھے۔ نرن ایک شرارتی اور چنچل لڑکا تھا۔ دوسروں کو خوب چڑاتا تھا اور اپنی بہنوں کو خاص طور پر تنگ کرتا تھا۔ سکول میں بھی کھیل کود میں سب سے آگے رہتا تھا لیکن ساتھ ہی اس قدر ذہین کہ اُستاد اُسے کچھ نہیں کہتے تھے۔

وہ نہ صرف جسمانی طاقت کا مالک تھا۔ بلکہ اُس کے دماغ میں بھی کسی قسم کا خوف و ہراس نہ تھا۔ ایک دفعہ وہ درخت سے چھلانگیں لگا رہا تھا کہ ایک بزرگ نے کہا کہ ایسا مت کرو، اِس درخت میں ایک بھوت رہتا ہے۔ وہ تمہاری گردن مروڑ دے گا۔ نرن اُس وقت تو چُپ ہو گیا لیکن جب وہ بزرگ چلے گئے تو پھر چھلانگیں لگانے لگا۔ جب اُس کے دوست نے بھوت کا خوف دلایا تو نرن ہنس کر کہنے لگا۔

"اگر کوئی بھوت ہوتا تو اب تک میری گردن کئی بار مروڑ دی گئی ہوتی"۔ نرن کی شرارتوں سے تنگ آکر ایک دفعہ اُس کی ماں نے کہا:۔ "میں نے بھگوان شِو سے ایک سپوت مانگا تھا لیکن اُنہوں نے مجھے ایک بھوت بھیج دیا ہے"۔

نریندر کی قابلیت اور ذہانت کے سب قائل تھے۔ سکول اور کالج میں اُس کی دھاک تھی۔ اُس کا مطالعہ وسیع تھا۔ اُس کی یادداشت نہایت تیز تھی۔ اِس کے کالج کے پرنسپل نے لکھا ہے: "میں نے اِتنی قابلیت

010 www.taemeernews.com

اور ذہانت کا مالک کبھی لڑکے کو نہیں پایا۔ یہ بڑا ہو کر نمایاں کام کرے گا۔

کالج کی تعلیم نے نریندر کے دل و دماغ میں بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا۔ اُسے اپنے مذہب کی سچائی پر شک ہونے لگا۔ وہ اصلاح کی تحریکوں میں حصہ لینے لگا اور برہمو سماج سے اُس کی عقیدت بڑھنے لگی لیکن اس سے اس کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ مہرشی دیویندر ناتھ ٹیگور کے پاس گیا اور کہا مہاراج کیا آپ نے بھگوان کو دیکھا ہے؟ وہاں سے منفی میں جواب پاکر وہ شری رام کرشن کے پاس دکشنیشور کے مندر میں پہنچا۔ جب اس نے اُن سے وہی سوال کیا تو اُنہوں نے کہا "بھگوان کے درشن ہو سکتے ہیں بھگوان سے عین اسی طرح گفتگو کی جا سکتی ہے جیسے میں تم سے کر رہا ہوں" آہستہ آہستہ نریندر شری رام کرشن کے نزدیک ہوتا گیا اور آخر ان کا ہی ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بھی نریندر کو اپنی ساری شکتی اور آگہی دیدی۔ وویکانند کے اپنے لفظوں میں "مجھے جو کچھ ملا ہے اپنے گورو دیو سے ملا ہے۔ اور جو کچھ میں کر پایا ہوں وہ سب گورو دیو جی کی برکت ہے"۔ شری رام کرشن سے ہی انہوں نے اپنی زندگی کا مشن حاصل کیا اور وہ مشن یہ ہے کہ انسانوں میں خدا کو جلوہ گر دیکھ کر سب کی سیوا کرو، ہر جاندار کو بھگوان کا روپ مان کر اس کی سیوا ہی سچا دھرم ہے۔

شری رامکرشن ۱۸۸۶ء میں دنیا سے کنارہ کش ہو گئے۔ اُن کے بعد نریندر نے ان کے سب چیلوں کو یکجا کر کے رام کرشن مشن کی بنیاد رکھی اور جلد ہی شری رامکرشن دوسرے چیلوں کے ساتھ خود بھی سنیاس اختیار کر لیا۔ اسکے بعد نوجوان سنیاسی نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس دورے میں اُن کے دل پر ہندوستان کی غریبی اور مفلسی کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے اپنے دیش کی ترقی اور بہبودی کے لئے کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں "میں مُلک بھر گھوم آیا ہوں، مجھے اپنی آنکھوں سے عوام کی غریبی اور مصیبت دیکھ کر بہت ہی دُکھ ہوا اور میں خوب رویا۔ میرا عقیدہ ہے کہ جب تک تنگ دستی اور دُکھ کو نہ مٹایا جائے۔ مذہب اور آتم گیان کی باتیں کرنا بالکل فضول ہے۔ میں اپنے دیش باسیوں کی بھلائی اور بہبودی کے لئے امریکہ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں وہ مذہب ہی کیا جس کے سائے میں غریبی بستی ہو، میرا دل اب بہت وسیع ہو گیا ہے اور مجھے دیش بھر کے درد کا احساس ہے۔

چنانچہ دیش کی عزت بڑھانے اور اس کے لئے دنیا کی ہمدردی حاصل کرنے کی خاطر وہ ۱۸۹۳ء میں امریکہ گئے۔ وہاں انہوں نے پارلیمنٹ آف ریلیجنز میں شرکت کی اور اپنی تقریر سے تہلکہ مچا دیا۔ یہاں انہوں نے دُنیا کو کائناتی اخوت کا پیغام سُنایا اور کہا "بھگوان تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہیں وہ سب کے سب اس تک پہنچانے کی اہلیت رکھتے ہیں" انہوں نے اعلان کیا کہ "اگر دُنیا میں کوئی ایک عالمگیر مذہب ہونا ممکن ہے تو وہی مذہب ہو سکتا ہے جس کا کسی خاص مقام یا وقت سے کوئی تعلق نہ ہو جو کسی بھی طرح محدود نہ ہو۔ جس کے سورج کی روشنی بھگوان کرشن اور یسوع مسیح کے پجاریوں اور دوسرے سب مذاہب کے پیروؤں کو یکساں طور پر حاصل

www.taemeernews.com

ہو۔"

اِس تقریر کے بعد سوامی جی کا نام امریکہ اور یورپ میں گونج اُٹھا۔ شہرت اور عزت کے اس ریلے میں بہہ جانا بہت ممکن تھا لیکن وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے دیش اور اپنے فرائض کو نہ بھولے۔ وہ اپنے خطوط میں لکھتے ہیں:۔

نوجوانو! دیش سیوا کے لئے کمرکس لو، بھگوان کی جے کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھتے چلو۔ پیچھے مڑکر دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں کہ کون گرا۔ بس بڑھتے چلے جاؤ۔"

سوامی جی امریکہ اور یورپ میں تین سال تک متواتر کام کرتے رہے، ۱۸۹۶ء کے آخر میں وہ بھارت کے لئے روانہ ہو کر ۱۸۹۷ء کے شروع میں کامیابی کا سہرا باندھے اپنے دیش میں واپس آئے۔ یہاں تمام ملک اُن کے قدم چومنے کو جھک رہا تھا اُن کا جو عالی شان استقبال ہوا۔ وہ ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے سوامی جی نے جنوب سے شمال تک ملک کا فاتحانہ دورہ کیا اور اُن کے جان بخش پیغام سے لوگوں میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ سوامی جی نے اعلان کیا:۔

"ہمارا مذہب وہی ہے جو ہمیں مردانگی سکھائے۔ ہماری تعلیم وہی ہے جس سے مردانگی کی بو آئے۔ ہمارا فلسفہ وہی ہے جو ہماری قوت میں اضافہ کرے۔ یہی ایک معیار ہے حقیقی رُوحانیت کا، یہی کسوٹی ہے سچے مذہب کی، جو مذہب، جو نظریہ، جو فلسفہ انسان کو جسمانی، ذہنی، اخلاقی یا روحانی کمزوری کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ سراسر جھوٹ ہے۔ افترا ہے، اس کے پاس نہ بھٹکو۔ وہ زہر ہلاہل ہے اُسے چھوؤ تک نہیں وہ موت ہے، زندگی نہیں سچ وہی ہے جو تقویت دے سچ ہی پاکیزگی ہے۔ سچ ہی علم ہے۔ جھوٹ جہل کا دوسرا نام ہے سچ کے علم بردار و! اُٹھو اور کمزور کرنے والی ریتوں کو خیرباد کہو اور جان بخش سچی رُوحانیت کو اپناؤ، یاد رکھو، جیسے زندگی بذاتِ خود مشکل پسند نہیں ہے۔ اسی طرح سچائی، پیچیدہ نظریوں کا سلسلہ نہیں، حقیقت سادگی کے مترادف ہے"۔

اُنھوں نے فرمایا:"ہر فرد کی طرح ہر قوم کا بھی ایک مرکزی موضوع ہوتا ہے جو اس قوم کی صدیوں کی تاریخ سے اُبھرتا ہے، یا یوں کہو کہ ایک بنیادی سُر ہوتا ہے جس میں اُس قوم کی اور کارروائیاں دوسرے سُروں کی طرح مل کر ایک میٹھا راگ پیدا کر دیتی ہیں۔ کوئی قوم اپنے مرکزی موضوع سے منحرف ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی"۔

"ہندوستان کا مرکزی موضوع، اُس کا تاریخی راستہ، اس کے راگ کا بنیادی سُر رُوحانیت ہے۔ ہاں ایک بار پھر بھارت کے ہر طبقہ اور ہر ذات کے مرد عورت اور بچے کو سُنا دو کہ تمہاری وراثت رُوحانیت ہے کوئی

012 www.taemeernews.com

طاقتور ہو یا کمزور، اونچی ذات کا ہو یا نیچی ذات کا امیر ہو یا غریب، عالم وفاضل ہو یا اَن پڑھ، الغرض، سب میں ایک ہی لازوال رُوحِ اعظم ہے جو کسی طرح بھی محدود نہیں جس کو جاننے سے بے حد طاقت حاصل ہوتی ہے جس کو جان کر ہر چیز ممکن ہو جاتی ہے اور نیکی اور بھلائی کرنے کی بیکراں قوت بیدار ہو جاتی ہے ہر شخص سے پکار پکار کر کہہ دو۔ "اُٹھو جاگو، اور آگے بڑھو، رُکنا تمہارا کام نہیں، جب تک منزلِ مقصود تک نہ پہنچ جاؤ، بڑھتے چلو" تمہاری کمزوریوں نے تم پر جادو کر رکھا ہے، تمہیں موت کی نیند سُلا دیا ہے جاگو، یہاں کون ہے جو کمزور ہے، رُوح کو کون کمزور کہتا ہے تم ہر طاقت کے مالک ہو تم ہر جگہ ہو، کوئی شئے تم سے چھپی نہیں ہے، اپنے آپ کو جانو، اُٹھو اور اپنی حقیقت سے آشنا ہو کر تم بھی انا الحق کے نعرے لگاؤ، اپنے آپ سے غافل ہونا ہی خُدا سے منکر ہونا ہے، اُٹھو اور یقین خودی کا اعلان کر دو۔"

اِس پیام کے ساتھ ساتھ سوامی جی نے اپنے ہم وطنوں کو اُن کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا، فرمایا "ہم اپنی ذلّت کے خود ذمہ دار ہیں، ہمارے آبا و اجداد نے عوام کو صدیوں سے روندا ہے، وہ غریب اس قدر پس گئے ہیں کہ اُنہیں اپنے انسان ہونے کا بھی احساس نہیں رہا۔ سالہا سال سے اِن مظلوموں سے فقط محنت و مشقت کا کام لیا گیا ہے۔ ان کی حالت بار برداری کے جانوروں کی سی بن گئی ہے، اِن غریبوں کا خیال کرو۔ اگر تمہارے دل میں اِن کروڑوں انسانوں کے لئے درد نہیں ہے تو تمہاری روحانیت، تمہاری ویدانت ایک بے معنی نظریہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی! کیا تم کہہ سکتے ہو کہ تمہارے دل میں اپنے نام کی شہرت کی خواہش نہیں ہے؟ کیا تمہیں اپنے بیوی بچوں کا خیال نہیں ستاتا؟ کیا تمہیں اپنی جائیداد کی فکر نہیں ہے؟ اور کیا تم میں اپنی جان پر کھیل جانے کی ہمت ہے؟ اگر تم اِن تمام مرحلوں سے گزر چکے ہو تو دیش بھگتی کے رستے پر پہلا قدم اُٹھانے کے قابل ہو۔ دیش بھگتی کوئی آسان اور سستی چیز نہیں ہے، فضول باتوں سے دیش بھگتی نہیں ہوتی۔ جاؤ اپنے لئے کوئی عملی پروگرام بناؤ۔ محض نکتہ چینی سے کام نہیں چلے گا۔ جاؤ عملی طور پر دوسروں کی مدد کرو۔ کسی دُکھیارے کا دُکھ بانٹو۔ کسی غمزدہ کی دل جوئی کرو اور اُنہیں دکھ درد کے اندھیرے سے نکال کر زندگی کی روشنی میں لے آؤ۔ اس کام میں تمہارے رستے میں بہت سی مشکلات آئیں گی تمہیں بڑی سے بڑی مشکلوں کو ہٹانے کی ہمت پیدا کرنا ہوگی۔ اگر تمام دُنیا تمہارے راستے میں حائل ہو جائے تو بھی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تمہیں اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اگر تم میں یہ طاقت ہے تو تم ضرور کامیاب ہو گے مگر جان لو کہ یہ کام آسان نہیں۔"

سوامی جی نے اس طرح دیش بھگتی اور خدمتِ خلق کا پرچار کیا۔ اِس کام کو سرانجام دینے کے لئے کئی مٹھ قائم ہو گئے۔ کتنے ہی سیوا آشرم بن گئے۔ جو آج بھی قائم ہیں۔ اور عوام کی خدمت کر رہے ہیں۔

013 www.taemeernews.com

۱۸۹۹ء میں سوامی جی مغرب کے دوسرے دورے پر روانہ ہوگئے۔ کچھ دنوں لندن میں رُکے، اس کے بعد سال بھر امریکہ رہے پھر پیرس، وی آنا، استنبول، ایتھنز اور قاہرہ ہوتے ہوئے دسمبر ۱۹۰۰ء میں واپس بھارت پہنچ گئے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ان کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اُن کی صحت بھی جواب دے چکی تھی۔ اب وہ زیادہ وقت کلکتہ میں اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت میں گزارنے لگے۔

آہستہ آہستہ سوامی جی نے سب کاموں سے اپنا تعلق توڑ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دُنیا کو خیرباد کہنے والے ہیں۔ آخر وہ دن آپہنچا۔ ۴ جولائی ۱۹۰۲ء شکروار کی صبح کو وہ مندر کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرکے تین گھنٹے تک دھیان میں مگن رہے۔ اس کے بعد ماتا کے چرنوں میں ایک میٹھا بھجن ارپن کیا جس کو سن کر سب آشرم واسی مست ہوگئے۔ بہت دیر تک مندر سے بھجن کی میٹھی میٹھی لہریں اٹھتی رہیں۔ آخر سوامی جی سیڑھیوں سے اُترے اور آشرم کے میدان میں گھومنے لگے۔ دوپہر کا کھانا خلافِ معمول سب کے ساتھ مل کر کھایا، اس کے بعد تین گھنٹے تک سنسکرت پڑھاتے رہے۔ شام کی پُوجا کے وقت وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور ایک گھنٹہ تک دھیان میں لگے رہے، اس کے بعد بستر پر لیٹ گئے۔ اُن کی مالا ہاتھ میں تھی۔ ایک گھنٹہ کے بعد اُنہوں نے کروٹ لی۔ اور گہرا سانس لیا، پھر ایک دوسرا سانس لیا اور اس کے ساتھ ہی سب کچھ شانت ہوگیا۔ سوامی جی ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح جگت ماتا کی گود میں ہمیشہ کے لئے سو گئے۔

سوامی جی کی عمر اس وقت اُنتالیس سال اور کچھ مہینے تھی وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں چالیس سال تک نہ جی پاؤں گا۔ اور ان کی یہ بات پُوری ہوئی لیکن در اصل وہ زندۂ جاوید ہیں۔ وہ آج ہمارے درمیان نہیں لیکن وہ اب بھی اپنا کام کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

---

014 www.taemeernews.com

مذہب کیا ہے؟

دندناتے ہوئے قوی ہیکل دیو کی طرح ریل کا انجن چھکا چھک چھکا چھک لپکتا چلا آرہا ہے، دھرتی اس کے پاؤں تلے کانپ رہی ہے، ریل کی پٹری پر لرزہ طاری ہے اور دُور ایک رینگتا ہوا ناچیز کیڑا اس ارتعاش کو محسوس کرتا ہے اور اپنی محدود قوت کو پوری طرح کام میں لاکر پٹری کے اوپر سے سرک جاتا ہے، انجن بجلی کی سی سرعت سے گزر جاتا ہے لیکن کیڑے کو کچل نہیں پاتا پٹری کے بازو سے لپٹی ہوئی یہ سہمی ہوئی ننھی سی جان پھر اپنے سُکڑے ہوئے جسم کو ڈرتے ڈرتے پھیلا کر زمین پر اُتر آتی ہے، زندگی موت کی زد سے نکل کر پھر اپنی راہ پر چلنے لگتی ہے۔

سوچو تو اس ناچیز کیڑے اور ریل کے دیو صورت انجن میں کیا فرق ہے؟ آخر اس چھوٹے سے کیڑے کی ہستی تو بس اتنی ہے کہ ایک لمحہ میں کچلی جا سکتی ہے، مگر پھر بھی یہ ایک زندہ چیز ہے۔ اس میں جان ہے، اس کے برعکس انجن جسیم اور بھاری بھرکم ضرور ہے لیکن مُردہ مادّہ ہے، بے جان ہے، اس کی تمام طاقت تمام سینہ زوری، تمام رفتار محض مشینی ہے، میکانکی ہے، اس لحاظ سے ریل کی پٹری پر رینگنے والا ناچیز کیڑا جسے انجن کا ذرا سا لمس بھی جان سے مار سکتا تھا انجن سے کہیں زیادہ عظیم ہے کیونکہ وہ لامحدود زندگی کا حصہ دار ہے، خود اس میں اپنی رفتار کو کم بیش کرنے کی طاقت ہے انجن کو جس طرح ڈرائیور چلائے اُسے ویسے ہی چلنا ہوتا ہے، یہی فرق ہے مُردہ اور زندہ میں، مشین میں طاقت ضرور ہے لیکن وہ بس وہی کام کر سکتی ہے، جس کے لئے اُسے بنایا گیا ہے، اس کی میکانکی حرکت زندگی کی حرکت نہیں، زندگی کی حرکت میں آزادی اور شعور شامل ہیں، مُردہ مادہ ہر صورت میں محبوس و محدود ہے، کیونکہ اس کی نقل و حرکت میں آزادی اور شعور

015 www.taemeernews.com

کو ہرگز دخل نہیں ۔ زندگی آزادی اور خودمختاری کے مترادف ہے' یہی آزادی اور خودمختاری ہی ہمارا طرۂ امتیاز ہے' اور ہماری تمام زندگی دراصل اسی آزادی اور خودمختاری کو حاصل کرنے کی متواتر اور مسلسل جدوجہد پر مشتمل ہے' ہم ہر لمحہ پہلے سے زیادہ آزاد ہونا چاہتے ہیں' ہماری تمام کوششوں اور کاوشوں کا مقصد زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرنا ہی تو ہے' ہماری زندگی کا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے' زندگی کا کمال مکمل آزادی ہی میں مضمر ہے' جب انسان ہر بندش سے آزاد ہو جاتا ہے تو اپنے کمال کو پالیتا ہے ۔

ہمیں اس بات کا پوری طرح شعور اور احساس ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاٹھ پوجا' بھجن اور کیرتن زہد اور تقویٰ' ترک اور ریاضت غرضیکہ عبادت اور پرستش کی ہر مروجہ صورت کے پس پردہ حصولِ آزادی ہی کی خواہش اور کوشش کارفرما ہے' مثلاً ارتقا کی پہلی منزلوں میں انسان بھوت پریت کی پوجا کرتا ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کی رُوحوں کی پرستش کرتا ہے' سانپ اور اژدہے کے آگے سر جھکاتا ہے' اپنے قبائلی دیوی دیوتاؤں کی عبادت کرتا ہے ۔ آخر کیوں؟ اس لئے تاکہ وہ غیر شعوری طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ ہستیاں اُس سے زیادہ بڑی ہیں' زیادہ طاقت ور ہیں اور اس کی آزادی کی راہ میں مخل ہیں' وہ ان طاقتوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اُسے تنگ نہ کریں' اس کی خواہشات کی تکمیل کے راستے میں حائل نہ ہوں بلکہ اس حد تک مددگار ہوں کہ اُسے دنیا کی تمام نعمتیں محنت اور مشقت کے بغیر ہی مل جائیں ۔ دُوسرے لفظوں میں انسان ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لئے ان طاقتوں سے جنہیں وہ اپنے سے بڑا سمجھتا ہے مدد طلب کرتا ہے یہی عبادت اور پرستش کی بنیاد ہے ۔

غور سے دیکھا جائے تو آدمی کی نظر ہمیشہ معجزات پر لگی رہی ہے' دنیا ہر وقت کسی نہ کسی معجزہ کی متوقع رہتی آئی ہے ۔ ہم لاکھ کوشش کریں معجزے کی اُمید ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتی ۔ مابعد الفطرت کا خیال ہم سے جُدا ہونے نہیں پاتا بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہمارے دماغ کا وجود بذاتِ خود اسرار و معنیٰ حیات کی تلاش کے لاانتہا سلسلے سے پیدا ہوتا ہے ۔ یہی ابدی جستجو مجسم اور مسلسل ہو کر انسانی دماغ بن گئی ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ زیادہ تر غیر تربیت یافتہ لوگ ہی مابعد الطبیعات کی طرف مائل ہوتے ہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ یہودی قوم ہمیشہ معجزے کی دُعا مانگ کر اس کا انتظار کرتی رہی ہے بلکہ ہزارہا سال سے تمام دنیا اُس معجزے کی راہ تک رہی ہے جس سے ہماری زندگی جنت کی زندگی میں مبدل ہو جائے بہرحال اسکا تو آپ کو اعتراف ہے کہ ہر شخص دنیا سے نالاں ہے کسی کو تسلی نہیں ۔ چاروں طرف بے چینی اور ناشکیبائی ہے' ہم اپنی حالت پر راضی نہیں ہیں ہم آئے دن اپنے لئے ایک نیا نصب العین تیار کرتے ہیں

016 www.taemeernews.com

اور ابھی اس کی تحصیل کے لئے چند قدم ہی چلنے پاتے ہیں کہ ایک اور بلند تر آدرش تخلیق کر لیتے ہیں، ہم کسی خاص چیز، مقام یا مرتبہ کو حاصل کرنے کا تہیہ کر کے اس کے لئے لگاتار سخت کوشش کرتے ہیں لیکن ہمیں جلد ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری مطلوبہ چیز ہماری ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہے، اس سے ہماری تسلی نہیں ہوتی، بس بے چینی اور مایوسی ہے کہ ہر وقت دل پر چھائی رہتی ہے، آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اگر ہمارے نصیب میں انتشار اور بے قراری ہی لکھی ہے۔ اگر ہماری قسمت میں پریشانی ہی ہے تو ہمارے دماغ کو کیوں کسی غیر معلوم حقیقت کی تلاش ہے؟ ہمارے دل و دماغ کی خود اپنی حقیقت کیا ہے؟ اس جہان گیر بے چینی اور بیقراری کے کیا معنی ہیں؟ اس کی وضاحت بس یوں ہی ہو سکتی ہے کہ انسان کی منزل مکمل آزادی ہے، اور وہ ہر گھڑی زیادہ سے زیادہ آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ جنم سے مرن تک انسان کی تمام زندگی کشمکش، اور جد و جہد میں مبتلا ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی قوانین زندگی کے خلاف احتجاج کرتا ہے، اس کے گلے سے پہلی آواز ایک چیخ کی صورت میں نکلتی ہے جیسے کہ وہ زندگی کی غلامانہ بندشوں کے خلاف بغاوت کر رہا ہو، یہ احساس جس جو انسان اپنے ساتھ لئے دنیا میں آتا ہے، آزادی کی آرزو کو جنم دیتا ہے، اور آزادی کی زبردست خواہش سے ہی ہمارے دل و دماغ میں ایک ایسی ہستی کا تصور پیدا ہوتا ہے جو آزادِ مطلق ہے، خدا کا تصور ہماری سرشت میں داخل ہے، یہ تصور ہمارے وجود کا بنیادی عنصر ہے، ویدانت نے مکمل آزادی کے اس تصور کو ست چت آنند کا نام دیا ہے۔ جس کے معنی ہیں ہستی، شعور اور مسرت، ویدانت میں خدا کا بلند ترین تصور وہ ہستی ہے جس میں وجود، شعور اور نشاط بیک وقت کمال پر پہنچ گئے ہوں، بلکہ وجود ہستی و شعور نشاط ہی کے کمال کا نام خدا ہے۔ آگہی (گیان)، کا عطر اور نشاط کا ست ہی خدا ہے، خدا ہماری زندگی کا مقصد ہے، ہم مدتوں اپنے دل کی اندرونی آواز کو دباتے رہے ہیں، ہماری کوشش یہی رہی ہے کہ قوانین قدرت کے مطابق زندگی بسر کریں لیکن ہماری فطرت میں کوئی چیز ایسی ہے جو ہمیں قدرت کے بظاہر اٹل قانونوں کے خلاف سر اٹھانے پر مجبور کرتی ہے، بغاوت ہماری فطرت کا تقاضا ہے، ہم اس بات کو پوری طرح سمجھیں یا نہ اپنی اس فطری خاصیت کے معنی کو پائیں یا نہ لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہمارے اندر ایک مسلسل کشمکش جاری ہے، یہ کشمکش عموماً غیر شعوری طور پر ہوتی رہتی ہے لیکن وقتاً فوقتاً یہ کشمکش شعور کی سطح پر بھی نمودار ہو جاتی ہے، ہمارے روحانی رجحانات اور جسمانی مطالبات کے درمیان یا یوں کہیئے کہ ہمارے دماغ اور نفس کے درمیان یا دماغ کے اعلیٰ اور ادنیٰ حصوں کے درمیان ہمیشہ یہ کشمکش جاری رہتی ہے، ایک چیز ہمیں محدود و محبوس رکھنے میں کوشاں ہے تو دوسری آزاد ہونے کے لئے بے تاب ہے، اسی کشمکش سے ہماری انفرادی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے، جہاں مکمل آزادی ہے وہاں انفرادیت کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا اسی

017 www.taemeernews.com

طرح جہاں قدرت کی مکمل غلامی ہے، وہاں مُردہ مادّے کا وجود ہوتا ہے زندگی کا ظہور نہیں ہوتا۔

زندگی بذاتِ خود احساسِ حبس کے خلاف بغاوت ہے، یہ جو تقریباً ہر مذہب میں جہنم کا تصور ملتا ہے اس عظیم حقیقت کا ثبوت ہے کہ ہم پیدائشی باغی ہیں، ہم قوانین کی بندشوں کو قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کرتے چلے آئے ہیں، پیدائش کے وقت بھی ہم چلاّ چلاّ کر کہتے ہیں "ہائے یہ بندھن کیسا؟ یہ قانون کیوں؟" جب تک ہم قدرت کے قوانین کی پوری طرح پیروی کرتے ہیں ہماری ہستی مشینوں کے وجود سے بہتر نہیں ہوتی۔ کائنات کا کاروبار چلتا رہتا ہے اور اس میں میکانکی طور پر ہم بھی شامل ہیں لیکن ہم میں اس چکر سے باہر نکلنے کی طاقت نہیں ہوتی، ہماری فطرت قوانینِ قدرت کا عکس ہو کر رہ جاتی ہے، جب ہم اس میکانکی درجہ سے اوپر اُٹھ کر محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اندر کوئی ایسی طاقت ہے جو قوانینِ قدرت کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہونا چاہتی ہے تو ہم انسانی زندگی کے ارتقاء کا پہلا قدم اٹھاتے ہیں ہماری رُوح آزادی کا نعرہ لگاتی ہے "آزادی" "آزادی" "مطلق اور مکمل آزادی" کی صدا دردنِ قلب سے اٹھتی ہے لیکن صد حیف کہ اس مقام پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قوانینِ قدرت نے ہمیں پوری طرح جکڑ رکھا ہے اور غلامی ہی ہمارے حصے میں آئی ہے۔

ہمارا یہ مجبوری کا احساس ہی خارجی امداد کی تلاش کا محرک بنتا ہے، ورنہ یہ سانپ اور اژدھے یا جن اور بھوت کی پُوجا کے کیا معنی؟ یہ معجزوں کی جستجو کے مختلف طور طریقوں کا کیا مطلب؟ آخر ہم کیوں کہتے ہیں کہ ایک چیز میں جان ہے اور دُوسری میں نہیں؟ اس تلاش، اس جستجو، اس جدوجہد کا آخر کچھ تو مطلب ہونا چاہیئے یہ کشمکش، یہ سعیِ مسلسل بے معنی اور فضول تو نہیں ہو سکتی، یہ سب کرشمے ہیں انسان کی تلاشِ آزادی کے، لیکن ہم ابھی تک یہ نہیں سمجھ پائے کہ قوانینِ قدرت کے دائرے میں آزادی ناممکن ہے۔ یہاں تو اٹل قانون ہے اور بس، ستاروں سے ذرّوں تک سب قانونِ قدرت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور قدرت کی تمام وسعتیں انسان کے لئے آزادی کو محدود کرنے کی حدیں ہیں تمام عالمِ کائنات میں انسان کے لئے آزادی ناممکن ہے، لیکن ہمیں اس تلخ حقیقت کا یقین نہیں آتا۔ خارجی علم جسے ہم آج کل سائنس کے نام سے موسوم کرتے ہیں ہزار ہا سال سے اس کوشش میں ہے کہ قدرت پر قابو حاصل کر کے آزادی حاصل کر لی جائے، لیکن ایک قانون سے گزر کر اس سے زیادہ ہمہ گیر قانون سے پالا پڑتا ہے، پھر بھی ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ قدرت کی چار دیواری میں حصولِ آزادی ناممکن ہے، ہم ابتدائے زمانہ سے قوانینِ قدرت کا مطالعہ کرتے آرہے ہیں لیکن اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کرنا چاہتے کہ خود انسان انہیں قوانین کا پابند ہے، ہماری رُوح بار بار آزادی کی رٹ لگائے جاتی ہے، جب سے انسان نے خدا کی آزاد مطلق ہستی کا تصور پایا ہے، وہ قدرت کی دوامی غلامی کو قبول کرنے کے لئے کسی صورت بھی راضی نہیں ہوتا، بندشوں میں گھر کر بھی انسان بندشوں کا قائل نہیں ہوتا، وہ کہتا ہے "میں مانتا ہوں کہ

018 www.taemeernews.com

میں جنم سے غلام ہوں، مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ قدرت نے مجھے ہر طرف سے جکڑ رکھا ہے، میری مشکیں کس رکھی ہیں لیکن پیش بھی جانتا ہوں کہ ایک ایسی ہستی بھی ہے جو قدرت کے ہر قانون سے بالا ہے، جو آزاد مطلق ہے، جو خود قدرت کا آقا اور حاکم ہے جس کے اشارے پر قدرت ناچتی ہے۔ میں غلام ہی پر اس ہستی کو پاکر آزاد ہو سکتا ہوں۔"

ظاہر ہے کہ آزادئ مطلق یعنی خدا کا تصور انسانی دماغ کا اتنا ہی اہم اور بنیادی جزو ہے جتنا کہ فطرت کی مجبوری اور غلامی کا خیال اگر جبر ایک حقیقت ہے تو اختیار کا ہونا بھی لازم ہے، اگر انسان مجبور ہے تو اس کا خدا مختار کُل ہے، سچ تو یہ ہے کہ فطرت کی مجبوری اور خدا کے اختیار کے تصور دراصل دونوں اس ایک حقیقت کے دو رُخ ہیں جسے ہم آزادئ مطلق کہہ سکتے ہیں، آزادی کے بغیر زندگی ناممکن ہے، آزادی کے بغیر کوئی پودا تک اُگ نہیں سکتا، کوئی کیڑا تک رینگ نہیں سکتا، فرق صرف اتنا ہے کہ پودے یا کیڑے میں زندگی کبھی انفرادی شخصیت کے درجہ تک اٹھا ہوتا ہے لیکن آزادی کا احساس غیر شعوری طور پر ان میں بھی کارفرما ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پودا قدرت کا غلام نہیں بلکہ اپنی خاص صورت اور اپنی مخصوص قسم کے تحفظ کے لئے زندہ رہتا ہے یہی حال زندگی کی دُوسری صورتوں کا ہے۔

جبر اور اختیار کی کش مکش ہر جگہ اور ہر وقت جاری ہے۔ بظاہر ہر قدم پر ہماری آزادی قوانین قدرت کی پابند معلوم ہوتی ہے لیکن جتنا ہی مادی دُنیا کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے ان وسیع بندشوں سے نکلنے کا خیال بھی تقویت پکڑتا جاتا ہے، جیسے ہمارا علم مادیات بڑھتا ہے اور ہم قوانین قدرت کی عالم گیری سے واقف ہوتے ہیں ویسے ہی ان ہمہ گیر قوانین سے بالا اور آزاد حالت کا تصور بھی زیادہ کشادہ اور مضبوط ہوتا جاتا ہے اور اس طرح جبر اور اختیار کی یہ مسلسل جنگ جاری رہتی ہے یہ جنگ کبھی ایک صورت اختیار کر لیتی ہے کبھی دوسری شکل میں نمودار ہوتی ہے، وقت اور مقام کے لحاظ سے، اور انسانی ارتقا کے مطابق مختلف مذہب اور مسلک ظہور میں آتے ہیں اور نئے نئے اعتقاد والے فرقے پیدا ہوتے ہیں، صوری اختلافات کی وجہ سے یہ فرقے آپس میں برسر پیکار نظر آتے ہیں، بہت حد تک جبر اور اختیار کے تصادم کی یہ صورتیں ناگزیر ہیں جبر کی حدیں بڑھیں گی تو آزادی بھی ان حدوں کو عبور کرنے کے لئے اور زیادہ مکمل صورت اختیار کرے گی، اگر ہم اس بات کو ذہن نشین کر لیں تو پھر "جنگِ ہفتاد و دو ملت" بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کیوں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم سب ایک ہی منزل یعنی مکمل آزادی کی طرف گامزن ہیں۔

اسی مکمل آزادی کے تصور ہی کو مجسم کر کے ہم قادرِ مطلق یا خدا کہتے ہیں، خدا کی ہستی سے انکار ناممکن ہے، آزادی کے خیال کے بغیر زندگی ناممکن ہے اسی خیال ہی کے سہارے تو ہم جیتے ہیں اس کا ترک

019 www.taemeernews.com

کیونکہ ممکن ہوسکتا ہے مثلاً اگر آپ کو اپنی آزادی اور خود مختاری کا پُورا یقین نہ ہوتا تو کیا آپ میرا لیکچر سُننے کے لئے یہاں آتے ؟ آپ میں سے کون ہے جو یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ یہاں اپنی خوشی اور مرضی سے آیا ہے ؟ کون ہے جسے قدرت کے اٹل قوانین کے باوجود اپنی آزادی اور اپنے اختیار کا احساس نہیں' یہی احساس تو ایمان ہے' یہی خدا کی ہستی کا اقرار' ممکن ہے کہ کسی نہ کسی وقت حیاتیات کی سائنس یعنی بائیالوجی (Biology.) اس احساسِ اختیار کی وضاحت مہیا کردے' آزادی کی اس دائمی جدوجہد کی تشریح کردے لیکن یہ سب کچھ مان بھی لیا جائے تو بھی مکمل آزادی کا تصور بجائے خود قائم رہتا ہے' یہ خیال تو کسی صورت نہیں مٹنے پاتا جیسے کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں اختیار اور آزادی کے اس تصور کی اتنی ہی حقیقت ہے جتنی قوانین قدرت کے سامنے ہماری مجبوریوں کی :

غلامی اور آزادی' روشنی اور اندھیرے' نیکی اور بدی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اگر غلامی اور مجبوری کی کوئی حقیقت ہے تو آزادی اور اختیار کی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مانا کہ انسانی ارتقا کے مطالعہ سے بیشتر یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی مجبوریوں کا زیادہ احساس رہا ہے لیکن آزادی اور اختیار کا تصور بھی ضرور رہا ہوگا۔ آج ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اوائل تاریخ کے انسان کا احساسِ مجبوری حصولِ آزادی کی جدوجہد کی ایک صورت تھی' لیکن یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ آزادی اور اختیار کے خیال نے جنم ہی نہیں لیا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ غیر مہذب انسان کے ضمیر میں ناپاکیزگی اور گناہ کا خیال بہت کم ہوتا ہے کیونکہ ارتقا کے اس مقام پر اس کا درجہ جانوروں سے کچھ ہی اونچا ہوتا ہے اس لئے اُسے گناہ کی مجبوری کا احساس نہیں ہوتا وہ تو مادّی مجبوریوں کے خلاف جدوجہد کرتا ہے۔ اس کی ساری کوششیں اپنی جسمانی ضروریات کو پورا کرنے میں صرف ہوتی ہیں لیکن انسانی شعور کے اس پست مقام سے ہی آہستہ آہستہ دماغی محدودیت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور بڑھتے بڑھتے روحانی آزادی کی زبردست خواہش میں مبدل ہوجاتا ہے۔ شروع شروع میں تو یہ یزدانی نور جہالت کے موٹے موٹے پردوں کے پیچھے بالکل نظر ہی نہیں آتی لیکن جوں جوں جہالت کم ہوتی جاتی ہے۔ اس نورِ ازلی کی کرنیں چھن چھن کر آنے لگتی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ آزادی اور کمال کا یہ لازوال مجسمہ ہمیشہ اور ہر وقت اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ ریز ہے جس کو جتنی تاب دید ہوتی ہے اسے اتنا ہی فیض یاب ہوتا ہے' فرق صرف درجے کا ہوتا ہے' نوعیت کا نہیں ہوتا۔

اس نقطۂ نظر سے تمام عالم ایک عبادت گاہ ہے اور قدرت کی ہر جنبش اور حرکت خدا کی پرستش کی ایک صورت ہے' جہاں کہیں زندگی جلوہ گر ہوتی ہے' آزادی اور اختیار ساتھ لئے ہوتی ہے اور چونکہ مکمل آزادی اور اختیارِ کل کا نام ہی خدائی ہے اس لئے آزادی کی جستجو خدا کی تلاش ہے' خدا کی عبادت ہے اور حصولِ آزادی

020
www.taemeernews.com

کا مطلب وصلِ الٰہی ہے۔

مکمل آزادی ملتے ہی ہمیں قدرت پر پورا اختیار حاصل ہو جاتا ہے لیکن یہ آزادی علم اور آگہی کے بغیر ناممکن ہے، ہم جانتے ہیں کہ جتنا وسیع ہمارا علم ہوتا چلا جاتا ہے اتنی ہی زیادہ قدرت ہمیں فطرت پر حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس اختیار اور قدرت کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی طاقت کا احساس ہوتا چلا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اگر کوئی ہستی ایسی ہے جو قادرِ کُل ہے، جو آزادِ مطلق ہے، تو اس ہستی کا علم بھی مکمل ہوگا، اسے قدرت سے پوری طرح واقفیت ہوگی یعنی وہ ہستی حاضر و ناظر ہوگی، دانائے کُل ہوگی۔ آزادی اور قدرت، اختیار و معرفت کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، یہ دونوں ایک ساتھ ہوتی ہیں اور وہی ہستی قوانینِ قدرت سے بالا ہو سکتی ہے اور کامل کہلا سکتی ہے جس میں پوری آزادی اور قدرت کے ساتھ ساتھ علم اور معرفت بھی بدرجۂ اتم موجود ہو۔

اس کے علاوہ کامل ہستی کے اعلیٰ ترین تصور میں برکت اور دائمی سکون شامل ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ مذہب کا بلند ترین تصور اس برکت اور شانتی کا تصور ہے جو مکمل آزادی سے پیدا ہوتی ہے خصوصاً ویدانت میں تو بھگوان کے متعلق تمام خیالات کی اصل وہ آزادِ مطلق ہستی ہے جو کسی چیز کی پابند نہیں جس میں کوئی تغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو قوانینِ قدرت سے بالا ہے، بلکہ قدرت خود اس ہستی میں شامل ہے جو ہمیشہ یکساں ہے، ساتھ ہی ویدانت یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ یہ مکمل آزادی آپ کی اور میری، ہم سب کی اصل ہے، اسی کو پانا ہی سچی نجات ہے باقی سب غلامی ہے۔

مشکل یہ ہے کہ ہم سب یہ تو مانتے ہیں کہ خدا کی عظیم الشان ہستی ہمیشہ قائم ہے۔ بس ایک اسی کو ثبات ہے لیکن جب ہم اسے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں، جب ہم آزادی حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں تو ہم اپنی جد و جہد کو قدرت کی خارجی سطح پر ہی محدود کر لیتے ہیں اپنی روزمرّہ کی زندگی کی معمولی باتوں پر اپنی ساری قوت صرف کر دیتے ہیں ہم دولت کمانے، جاہ و مرتبہ پانے اور کسی کی محبت حاصل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور اسی میں اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ چیزیں غلامی کی زنجیریں ہیں۔ ان کے حاصل کرنے سے آزادی نہیں ملتی بلکہ ان سے غلامی کو تقویت پہنچتی ہے، تغیر پذیر اور فانی چیزیں ہمیں اپنی اصل سے اور دور لے جاتی ہیں آخر قدرت کی درخشندگی کی اصل کیا ہے؟ وہ کیا شے ہے جو قدرت کی ہر روز بدلتی ہوئی صورتوں میں متواتر درخشاں ہے؟ دنیا سورج یا چاند یا ستاروں کی روشنی سے زندہ نہیں، زندگی کی چمک، قدرت کا حسن و جمال، عالمِ کائنات کی تابانی سب اسی ازلی اور ابدی نور سے پیدا ہیں جسے ہم خدا یا بھگوان کہتے ہیں، دنیا میں جہاں کہیں بھی نور کی کرنیں نظر آتی ہیں سب اسی کا عکس ہیں

021 www.taemeernews.com

سُورج کی تاب و تپش بھی اُسی سے ہے اور ہمارے ضمیر کی چشم افروز روشنی بھی وہی ہے جو ہر طرف نُور پاش ہے اُسی کے نور سے سب چیزیں روشن ہیں۔

تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خُدا اپنا ثبوت آپ ہے۔ خود درخشاں ہے حاضر و ناظر ہے، دانائے کُل ہے۔ آزادِ مطلق ہے۔ تمام فطرت کا آقا و مالک ہے شہنشاہِ عالم ہے، ہم اس بات کو سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن دُنیا میں جہاں کہیں بھی اور جیسے بھی پُوجا ہوتی ہے، سب اُسی ہی کی عبادت اور پرستش ہوتی ہے، وہی ہم سب کے سجدوں کی آستاں ہے[1] بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ جس چیز نے ہم سب کو حیران اور پریشان کر رکھا ہے اور جسے ہم بدی اور شیطنت کے نام سے پکارتے ہیں وہ بھی خدا ہی کی پرستش کی ایک صورت ہے[2]، اگر خدا مکمل آزادی کا نام ہے تو اُس آزادی کو حاصل کرنے کی ہر کوشش اُس کی پُوجا ہے۔ اگر اُس کی صورت بگڑی ہوئی ہے تو کیا اُس کی نوعیت تو دُوسری نہیں آپ کو میری بات سے خوف تو ضرور آئے گا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ گناہ اور ثواب، خیر و شر آزادی حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں، وہی آزادی کی خواہش ہے جو ایک آدمی کو نیک اعمال کی طرف مائل کرتی ہے اور دُوسرے کو بُرے کاموں کی ترغیب دیتی ہے، میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ دُوسری حالت میں آزادی کی خواہش غلط رستے پر چل نکلی لیکن اس حقیقت سے کیوں کر انکار ہو سکتا ہے کہ قوتِ تحریک دونوں حالتوں میں ایک ہے، اور وہ ہے بندشوں سے نکل کر آزاد ہونے کی خواہش[3]، آزادی کی یہ تمنا عالمِ کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہے، زندگی کی ہر دھڑکن کی محرک ہے[4]۔ حیاتِ عالم کے وجود میں بس یہی واحد دل دھڑک

---

[1] ہمہ کس طالبِ یار اند چہ ہشیار چہ مست ✤ ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

[2] میخوارہ و سرگشتہ و رندیم و نظر باز ✤ وآنکس کہ چو ما نیست درین شہر کدام است
با محتسبم عیب مگوئید کہ او نیز ✤ پیوستہ چو ما در طلبِ شربِ مدام است

[3] نیک سیرت آدمی دل کی کشادگی اور نظر کی وسعتوں میں آزادی محسوس کرتا ہے، اور اپنی محبت کے دائرے کو متواتر وسیع تر کرنے کی کوشش کرتا ہے، برعکس اس کے شیطان سیرت آدمی تمام دُنیا کو اپنے بس میں لانا چاہتا ہے، اس کے ہر کام میں خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے اور ہم اسے بجا طور پر بداعمال کہتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

[4] روشن از پرتوِ رویت نظرے نیست کہ نیست ✤ منتِ خاکِ درت بر بصرے نیست کہ نیست
ناظرِ روئے تو صاحب نظر انند آرے ✤ سرِ گیسوئے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

022 www.taemeernews.com

رہا ہے، اسی کی نسبت سے ہی اعضائے زندگی کی کثرت سمجھ میں آتی ہے،
یہ ہے خدائے ذوالجلال کا وہ عظیم تصور جو ہمیں اُپنشدوں میں ملتا ہے لیکن اُپنشد ہمیں نہیں رُک جاتے وہ ہمیں یہاں سے بھی آگے اس مقام پر لے جاتے ہیں جہاں اوّل اوّل ہم حیران و ششدر رہ جاتے ہیں اُپنشد کہتے ہیں کہ ہماری اصل اور خُدا درحقیقت ایک ہیں بندہ اور خدا اصل میں دو نہیں بلکہ ایک ہی ہستی ہیں۔ وہی ہستی جو تتلی کے خوب صورت پروں میں اور گلاب کے دل کش غنچوں میں رنگ بن کر جلوہ گر ہوتی ہے، اُسی کے دم سے تتلی پرواز کرتی ہے اور غنچہ کھلتا ہے، وہی خالق جو ہمیں زندگی بخشتا ہے، خود ہمارے اندر ہماری قوتِ محرکہ بن کر رہتا ہے اسی کے پیار کی گرمی سے حیات رُونما ہوتی ہے، اور اُس کی سرد مہری سے کڑی سے کڑی موت واقع ہوتی ہے زندگی اور موت اسی کی قدرت کے کرشمے ہیں زندگیِ جاوداں اُس کا عکس منور ہے اور موت اُسی کی کالی پرچھائیں۔ اگر ہمیں اُپنشدوں کے خدا کے ہمہ گیر تصور کو سمجھنا ہے تو اُس کی دونوں صورتوں کو قبول کرنا ہوگا۔ ہم عام طور پر دنیا کی خوف ناک چیزوں سے اس طرح دور بھاگتے ہیں جیسے خرگوش شکاری کتوں کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ خرگوش کی طرح سر چھپا کر ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ خطرے سے بچ گئے، حالانکہ اس طرح کی خود فریبی سے ہماری موت اور بھی یقینی ہو جاتی ہے۔ تمام دُنیا خوف ناک چیزوں کے آگے بھاگ رہی ہے اور آخر یہ دہشت ناک چیزیں اسے دبوچ لیتی ہیں خطرے کا مقابلہ اس طرح کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں میں آپ کو اپنی زندگی کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک دفعہ میں بنارس شہر کے ایک ایسے حصے سے گزر رہا تھا جہاں ایک طرف تو بڑا بھاری تالاب تھا اور دوسری طرف ایک بہت اونچی دیوار تھی اس علاقے میں بے شمار بندر رہتے تھے۔ شاید آپ جانتے ہیں کہ بنارس کے بندر کافی بڑے ہوتے ہیں اور اشتعال میں آجائیں تو مسافروں کے لئے وبالِ جان بن جاتے ہیں بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب میں تالاب کے پاس سے گزرنے لگا تو انہوں نے دل میں ٹھان لی کہ مجھے اپنی گلی سے نہیں جانے دیں گے گروہ کے گروہ میرے گرد آکر چیخنے اور شور مچانے لگے یہاں تک کہ وہ اس قدر نزدیک آگئے کہ میرے پاؤں پر جھپٹ مارنے لگے۔ یہ دیکھ کر میں نے وہاں سے بھاگنے کی ٹھانی لیکن میں جو بھاگنے لگا تو بندروں نے میرا تعاقب کرنا شروع کر دیا، جتنا میں تیز بھاگتا اتنا ہی تیزی سے وہ میرے پیچھے دوڑتے آتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ وہ دانت نکال کر کاٹنے کو آگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جان بچ نہیں پائے گی۔ عین اس وقت ایک اجنبی کا ادھر سے گزر ہوا اس نے مجھے پکارا اور کہا" بھاگو مت ان وحشیوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاؤ" چنانچہ میں فوراً رک گیا اور مڑ کر بندروں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آناً فاناً بندر بھی رک گئے اور ایک ایک کر کے سب وہاں سے چلے گئے، دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنے کا یہی راز

023 www.taemeernews.com

ہے۔ خوف ناک اور دہشت ناک چیزوں کا دلیری سے ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ زندگی کی مشکلات بنارس کے بندروں کی طرح بھاگ جاتی ہے اور ہمیں اُن کے آگے بھاگنے کی ضرورت نہیں رہتی اگر ہمیں آزادی حاصل کرنا ہے تو اُس کا واحد طریقہ قدرت پر اختیار حاصل کرنا ہے، قدرت کے آگے بھاگنے سے کام نہیں چلے گا بزدلوں کی کبھی جیت نہیں ہوتی۔ ہمیں خوف سے جنگ کرکے اس پر فتح حاصل کرنا ہے، ہمیں مشکلات کا سامنا کرکے انہیں مٹانا ہے، ہمیں جہالت کا مقابلہ کرکے اُسے بھگانا ہے، ہاں تو ہمیں ہر خوف ناک چیز کا شیر دل کی طرح مقابلہ کرنا ہے، آخر یہ تمام ڈراؤنی چیزیں کیا ہیں جن سے ہمیں دہشت ہوتی ہے؟ اور سب سے ڈراؤنی چیز موت کیا ہے جس سے سب ڈرتے ہیں؟ کیا آپ کو ان سب خوف ناک چیزوں کے ڈراؤنے نقاب کے پیچھے بھگوان کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر نہیں آتا؟ اس رُخِ روشن کا خیال کیجئے سب خوف دُور ہو جائے گا، شیطنت، خوف اور مصیبتوں سے فرار ا ن کو تعاقب کی دعوت دیتا ہے، جتنا کوئی اُن سے بھاگے گا اتنا ہی وہ اس کا پیچھا کریں گے، اُن کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جائیے تو سب دُم دبا کر بھاگ جائیں گے، تمام دنیا عیش و آرام کی طالب ہے، سب لوگ سُکھ اور چین کی پوجا کرتے ہیں کون ہے جو دکھ اور درد کا سامنا کرنے کو تیار ہے کس میں رنج والم کو پُوجنے کی ہمت ہے، آزادی تو تب ہی ملتی ہے جب انسان سُکھ اور دُکھ دونوں سے بالا ہو جاتا ہے سُکھ بھوگ کر اور دکھ سے بھاگ کر آزادی دستیاب نہیں ہو سکتی ہم سب کو دُکھ سُکھ کا سامنا کرنا ہے اُن سے گزرنا ہے، آزادی کا جذبہ ہم سب میں ہے، دُکھ سُکھ کے کواڑوں سے بنے دروازے سے گزر کر ہی انسان آزادی کی فضا میں سانس لے سکتا ہے بھگوان کو پوجنے کی خواہش ہم سب کے دل میں ہے، ہم سب اپنے مالک کی پرستش کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن ہمارے اور خدا کے درمیان جسمانی کمزوریوں کی دیوار حائل ہو جاتی ہے۔ قوانینِ فطرت کی قوتیں پہاڑ بن کر ہمارے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں اور ہماری نظر محدود ہو کر رہ جاتی ہے، لیکن ہمیں وُسعتِ نظر پیدا کرنا ہوگا۔ ہمیں خدا کے پورے جلوے دیکھنے کی تاب پیدا کرنا ہوگی فقط برکت اور رحمت نیکی اور بھلائی حُسن و جمال اور رنگ و نکہت ہی میں نہیں بلکہ ظلم اور قہر، آفت اور مصیبت، رنج و غم اور کثافت و گناہ میں بھی اُسی ایک ہی ہستی کا جلوہ دیکھنے کی اہلیت پیدا کرنا ہوگی آج تک دنیا میں نیکی کے خدا کا پرچار ہوتا آیا ہے، میں جس خدا کی تعلیم دیتا ہوں وہ نیکی اور برائی دونوں کا خدا ہے اگر ہمت ہے تو آؤ میرے اس خدا کو قبول کرو جس میں نیکی بھی ہے اور برائی بھی۔ یہی نجات اور مطلق آزادی کا واحد طریقہ ہے اس طریقے سے انسان کو اس آخری حقیقت کا شعور اور احساس ہوتا ہے جسے وحدت الوجود کہتے ہیں جب ہم گناہ و ثواب دونوں کو خدا کے وجود میں شامل کر لیتے ہیں تو بھلے بُرے کا فرق نہیں رہتا چھوٹے بڑے کا امتیاز مٹ جاتا ہے، ہمارا دماغ ان تفرقات کی بندشوں سے آزاد ہونے لگتا ہے اور جوں جوں ہم

024 www.taemeernews.com

مطلق آزادی کے نزدیک ہوتے چلے جاتے ہیں ہماری مشکلات مٹتی جاتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم پر خدا کی خاص رحمت ہو رہی ہے ہم اس کے سایہ تلے چلے جا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ ہمیں جہنم میں ڈال دے یا بہشت میں رکھے ہمارے لئے دونوں برابر ہیں۔ ہمیں دونوں میں وہی جلوہ گر نظر آتا ہے بلکہ جنت دوزخ کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔ آدمی آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا کوئی کیوں کر یہ کہہ سکتا ہے کہ "میں جہان بھر کے دوسرے آدمیوں سے برتر ہوں" یہ فرق و امتیاز تو بس اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک ہماری نظر میں خدا کے علاوہ اور چیزوں کی انفرادی ہستی موجود ہوتی ہے جب نظر میں بس اُسی کا جلوہ ہو جب ہر شے میں ہر جگہ اور ہر وقت وہی نظر آئے تو فرق و امتیاز کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے خدا کو پاکر ہی ہمیں وحدت کا احساس ہوتا ہے نہیں تو کثرت ہی کا شعور رہتا ہے۔

مثال کے طور پر میں اُپنشدوں کی ایک کہانی پیش کرتا ہوں دو خوب صورت پرندے ایک درخت پر رہتے تھے۔ یہ دونوں دوست ایک دوسرے سے کبھی جُدا نہیں ہوتے تھے۔ ایک درخت کی چوٹی پر رہتا تھا اور دوسرا نچلی شاخوں میں آخرالذکر پرندہ درخت کے پھل کھاتا تھا کبھی کڑوے اور کبھی میٹھے پھل اُس کے منہ لگتے تھے۔ میٹھے پھل کھا کر خوش ہوتا اور کڑوے پھلوں سے اُسے رنجش ہوتی اور کبھی سخت کڑوا پھل کھا بیٹھتا تو دکھی ہو کر چوٹی والے پرندے کی طرف دیکھنے لگتا جو میٹھے اور کڑوے پھلوں سے بے نیاز اپنے آپ میں مست بڑی شان سے چوٹی پر اطمینان کی تصویر بنا بیٹھا ہوتا اُس کی شاہانہ عظمت کو دیکھ کر یہ پرندہ بھی پھدک کر اونچی شاخوں کی طرف چلا جاتا لیکن جلد ہی پھل کھانے کے شوق سے مجبور ہو کر رک جاتا اور پھر کڑوے اور میٹھے پھل کھانے لگتا ایسا کئی بار ہوا اور یہ پرندہ آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھتا گیا۔ آخر کار اُسکے منہ ایک ایسا سخت کڑوا پھل لگا کہ اُس کا جی بھر گیا اور اوپر والے پرندے کی طرف بڑھنے لگا حتیٰ کہ وہ اس کے بہت نزدیک پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اُس نے دیکھا کہ جو نور اوپر والے پرندے سے برس رہا تھا اُس کی شعاعوں نے اُسے کچھ اس طرح گھیر لیا کہ وہ خود اوپر والا پرندہ بن گیا۔ اس کو پورا اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا اُسے اپنی شان و عظمت کا احساس ہوا اور وہ سمجھ گیا کہ دراصل دو پرندے کبھی تھے ہی نہیں نچلی شاخوں میں تو چوٹی والے پرندے کا عکس رقص کر رہا تھا۔

یہی حال ہم سب کا ہے، دراصل ہماری ہستی خدا کی ہستی سے جُدا نہیں، ہستی تو ایک ہی ہے، اس کے عکس کی مختلف صورتوں سے کثرت کا دھوکا ہوتا ہے جیسے سورج ایک ہے لیکن شبنم کے لاکھوں قطروں میں اس کا عکس جُدا جُدا ہے۔ اسی طرح حقیقت ایک ہے، اُسی کے جلوے بے شمار نظر آتے ہیں، شبنم کے قطرے

ل؎ کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوہ نے ٭ کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا۔ غالبؔ

025 www.taemeernews.com

بخارات بن جاتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے لاکھوں سورج غائب ہو جاتے ہیں اور بس ایک ہی سورج رہ جاتا ہے اسی طرح خدا کی داحدہستی کے کروڑوں عکس جب سمٹ جاتے ہیں تو وہی ایک حقیقت رہ جاتی ہے ہمیں اپنی انفرادی شخصیت کو مٹا کر ہی خدا سے ایک ہونے کا احساس ہو سکتا ہے، نظر عکس سے ہٹ کر ہی اصل کو دیکھ سکتی ہے۔ انسانی خودی کو مٹا کر ہی اپنی یزدانی خودی کا شعور مل سکتا ہے، یہ تمام کائنات اپنی وسعتوں کے باوجود ہماری تسلی کے لیے کافی نہیں ہے، ہم یہاں خود کو محدود محسوس کرتے ہیں اور ہر وقت اپنی بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، اسی مقصد کی خاطر کنجوس زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنے میں لگا رہتا ہے، ڈاکو ڈاکہ ڈالتا ہے، گناہ گار گناہ کرتا ہے اور یہ جو آپ یہاں اگر مذہب اور فلسفہ کی بات سُن رہے ہیں اس کی محرک بھی وہی ایک قوت ہے جسے آزادی کہتے ہیں، دنیا کے تمام کاروبار کا حاصل یہی ہے اس کے علاوہ زندگی کا اور کوئی مقصد ہی نہیں۔ بجھ بوجھ کر یا لاشعوری طور پر ہر شخص کمال حاصل کرنے میں کوشاں ہے، اور یہ یقینی امر ہے کہ ہر شخص اپنے کمال تک پہنچ کر رہے گا جو شخص دُکھ درد اور مصیبتوں کا بوجھ اٹھائے جہنم کے راستے گناہ کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے، اُسے کمال حاصل کرنے میں دقت ضرور لگے گا لیکن بالآخر وہ بھی اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔ ایسے شخص نے جو غلط راستہ اختیار کیا ہے ہم اسے عام طور پر اس راستے سے ہٹا نہیں سکتے، لیکن جب وقت کے ہاتھوں اُس کو کچھ شدید چوٹیں لگیں گی تو اُس کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے اور وہ بھی اس سیدھے راستے پر آجائے گا جو اُسے خدا تک لے جائے گا۔ آخر کار نیکی، پاکیزگی، بے غرضی، خود سپردگی اور روحانیت کا راستہ ہر شخص کے لیے کھل جاتا ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جہاں عوام غیر شعوری طور پر اپنے کمال کی منزل کی طرف گامزن ہیں، وہاں اہلِ بصیرت دیدہ و دانستہ اپنی ذات کے انکشاف کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اسی خیال کو سینٹ پال[ل] نے یوں بیان کیا ہے، فرماتے ہیں" وہ خدا جس کی آپ سب لوگ انجانے میں پوجا کرتے ہیں میں اسی خدا کا آپ کے سامنے اعلان کرتا ہوں[ل]" یہ ہے وہ عظیم الشان سبق جسے تمام دنیا کو سیکھنا چاہیئے۔

فطرت اور زندگی کے متعلق فلسفے اور منطق کے بے شمار نظریے سب بے سود ہیں اگر ان سے ہمیں اپنی منزلِ مقصود تک جانے میں مدد نہیں ملتی، آؤ ہم مخلوقات کی ہر شئے سے اپنی وابستگی کا احساس اور

ل Saint Paul

ل The God that ye ignorantly worship Him declare I unto ye.

026 www.taemeernews.com

شعور پیدا کریں آؤ ہم دیکھیں کہ ہم سب میں ایک ہی حقیقت جلوہ گر ہے' اور وہ حقیقت' وہ وحدت خود ہماری ذات ہے۔ آؤ ہم دنیا کی ہر شے میں اپنی ذات کے جلوہ کو دیکھنے کی اہلیت پیدا کریں آؤ ہم خدا کے سب محدود تصورات کو ترک کر دیں اور قبائلی دیوتاؤں اور مختلف مذہبی فرقوں کے علیحدہ علیحدہ خداؤں کی پرستش اور عبادت کی حدود سے نکل جائیں تاکہ ہمیں ہر طرف اور ہر جگہ خدا ہی خدا نظر آئے' یہی سچی آگہی ہے۔ یہی علم معرفت ہے یہ وہ حالت ہے جب خارجی اور داخلی دنیا میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ایک طرف دل کے مندر میں ہر وقت بھگوان کی پوجا ہوتی ہے' دوسری طرف عالم کائنات کی ہر شے سربسجدہ نظر آتی ہے خدا کی عبادت کے مختلف طریقوں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اور ہر شخص کا مخصوص طریقہ ہر لحاظ سے حق بجانب نظر آنے لگتا ہے۔

میں آپ کو یہ سچی آگہی حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اس کے لئے سب سے پہلے تو خدا کے متعلق سب محدود خیالات کو خیرباد کہنا ہوگا ہر شخص میں اسی کو دیکھنے کی کوشش کیجئے وہی سب کے ہاتھ بن کر کام کر رہا ہے' وہی پاؤں بن کر چل رہا ہے' سب منہ اسی کے ہیں کھانا وہی کھا رہا ہے' اسی کے دم سے زندگی ظہور پذیر ہے' ہر دماغ میں اسی کی روشنی ہے' ہر خیال اسی سے ابھرتا ہے' وہ اپنا ثبوت آپ ہے' وہ خود درخشاں ہے' اس کا وجود خود ہمارے جسمانی وجود سے بھی زیادہ قریب ہے' اس حقیقت کو جان لینے کا نام ہی مذہب اور ایمان ہے اور میری بھگوان سے یہی پرارتھنا ہے کہ ہم سب کو آگہی کی اس برکت سے مالا مال کر دے جب ہمیں اس وحدت کا پورا احساس ہو جائے گا تو ہم امر ہو جائیں گے۔ ہم سمجھ جائیں گے کہ لازوال عالم کائنات کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے ہم مادی طور پر بھی زندۂ جاوید ہیں[1]۔

یہی ہے زندگی دوام کا رازِ سربستہ، آؤ اعلان کر دو کہ میں کوئی محدود ہستی نہیں ہوں' میری ہستی کائناتی ہے' گزرے زمانوں کی سب عظیم ہستیوں کی روح میں ہی تھا' میں ہی بدھ کی روح تھا' عیسےٰ میں ہی تھا' اور محمدؐ بھی میں ہی۔ جتنے رہنما اور معلم گزرے ہیں سب میں میرا ہی جلوہ تھا اس کے ساتھ ہی دنیا کے تمام ڈاکو لیٹروں کی ہستی بھی میرے ہی دم سے تھی، میں نے ڈاکے ڈالے' قتل کئے اور مجھے ہی سُولی پر چڑھایا گیا[2]۔ میں ہرگز محدود و محبوس نہیں ہوں۔ میری ہستی کائناتی ہے۔ تمام عالم ایک زندہ وحدت

---

[1] "ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

[2] I am the universal ; I am the life of all the sons of the past ;

I am the soul of Buddha, of Jesus, of Mohammad ; I am the بقیہ اگلے صفحہ پر

027 www.taemeernews.com

ہے اور میری ہی ذات ہے وہ وحدت، میں زندۂ جاوید ہوں، میری ابتدا ہے نہ انتہا، میں لازوال ہوں، لافانی ہوں۔ لاثانی ہوں۔

اُٹھو میرے دوستو۔ اپنی حقیقت کو پہچانو، اپنی ذات کا انکشاف ہی اعلیٰ ترین عبادت ہے، سب کائنات تمہاری ذات میں موجود ہے، تم سے جُدا نہیں۔ میری نظر میں اپنی حقیقت کا اعلان ہی سچا علم ہے، گھٹنے ٹیک کر ماتھا رگڑنا اور اپنے آپ کو گناہ گار کہنا سراسر جھوٹ ہے، انسانی ارتقا کا بلند ترین مقام وہ ہے جہاں تفرقات کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ انسانی مذہب کی بلند ترین تعلیم وہ ہے جو ہمیں کائناتی وحدت کا راز بتاتی ہے۔ یہ کہنا کہ میں فلاں ابنِ فلاں ہوں، اپنی ذات کو محدود کر دیتا ہے، یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے۔ اس خیال کو کلیتاً ترک کر دو، اپنی زندگی کو اس خیال سے تشکیل دو کہ میری ہستی کائناتی ہے اور ہمیشہ اس بلند مقام پر کھڑے ہو کر خدا کی بلند ترین ہستی کی عبادت کرو۔ زندگی کا اعلیٰ ترین مظہر تم خود ہو۔ اپنی ہستی کے دیپ جلا کر بھگوان کی پوجا کرو، خدا رُوحِ پاک ہے، رُوح کا واسطہ رُوح سے ہی ہو سکتا ہے اس کی عبادت رُوح سے کرو، صدقِ دل سے کرو۔ عبادت کے کم درجہ طریقوں سے انسان کے مادّی خیالات کو رُوحانی سطح تک اُٹھنے میں مدد ملتی ہے لیکن یہ طریقے مقاماتِ راہ ہیں، بالآخر لامحدود کائناتی ہستی کی بھی عبادت رُوح کی وساطت سے ہی ہو سکتی ہے۔ ہر محدود چیز مادّی ہے۔ فقط رُوح لامحدود ہے انسان بھی دراصل رُوح ہے اور لامحدود ہے، لامحدود کی عبادت لامحدود کر سکتا ہے، یعنی لامحدود کو لامحدود ہی سمجھ سکتا ہے اور پا سکتا ہے، آؤ ہم پوجا کے اِس معیار کو اپنائیں اور لامحدود ہو کر لامحدود کی پُوجا کریں۔

میں جانتا ہوں کہ ان خیالات کی عظمت کا تصور کرنا آسان نہیں، اُن کو سمجھنا اور اُن پر عمل کرنا تو

---

soul of all the teachers and I am all the robbers that robbed and all the murderers that were hanged. I am the Universal.

لے God is spirit, is infinite. Man is spirit and therefore infinite and the infinite alone can worship the infinite.

028 www.taemeernews.com

اور بھی مشکل ہے، بات یہ ہے کہ یہاں ذکر اس چیز کا ہے جو بیان سے باہر ہے جو شعور کی گرفت میں نہیں آسکتی نظریہ بازی آسان ہے، میں آپ کے سامنے خوب باتیں بنا رہا ہوں، فلسفہ بگھار رہا ہوں لیکن عین ممکن ہے کہ اسی گھڑی اگر کوئی چیز میری مرضی کے خلاف ہو جائے تو مجھے خود بخود فوراً غصہ آجائے گا۔ میں اپنے اعلیٰ فلسفہ کو بھول جاؤں گا مجھے یہ یاد نہیں رہے گا میری ہستی کائناتی ہے، میں جھٹ اپنے آپ کو اپنی انفرادی شخصیت پر محدود کر لوں گا اور میرا ردِ عمل اسی کے مطابق ہوگا ایسی حالت میں میں اپنے آپ سے یہ کہنا بھول جاتا ہوں کہ "میں روح ہوں اس معمولی سی رنجش سے میرا کیا بگڑتا ہے، میرا بگڑ ہی کیا سکتا ہے۔ میں تو روح ہوں" میں بھول جاتا ہوں کہ یہ سب تو میرا ہی رچایا ہوا کھیل ہے، میں خدا کو بھول جاتا ہوں۔ مجھے اپنی مطلق آزادی کا دھیان نہیں رہتا۔

روحانی آزادی کا رستہ لمبا اور کٹھن ہے، اس پر چلنا تلوار کی تیز دھار پر چلنے کے برابر ہے[1] مہاتماؤں نے اس راہ کی مشکلات کا بار بار ذکر کیا ہے، لیکن ان مشکلات کو سر کرنا ہی ہوگا اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں سے ہار مت مانو، پاؤں کی ان بیڑیوں کو کاٹ ڈالو، اپنشدوں نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا ہے، "اٹھو، جاگو، اور بڑھتے چلو، رکو مت، منزل سے ادھر دم لینا حرام ہے"[2]۔

تلوار کی دھار کی طرح تیز سہی لیکن ہم اس راہ پر ضرور چلیں گے۔ مشکل اور لمبا سہی لیکن ہم اس راستے کو ضرور سر کریں گے۔ آخر انسان کو دیووں اور دیوتاؤں دونوں کے مقام سے آگے گزرنا ہے، اگر آج ہمارے سر پر مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں، اگر آج ہم رنج والم میں مبتلا ہیں تو اس کا الزام خود ہمارے ہی سر پر ہے۔ ہمیں اپنے دکھ درد کا علاج آپ کرنا ہے، مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، کون کہتا ہے کہ

---

[1] Sharp like the blade of a razor, long and difficult and hard to cross is the way to freedom.

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا ٭ کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا
شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل ٭ کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا
مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم ٭ جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

[2] Arise, awake and stop not till the goal is reached.

www.taemeernews.com

جدوجہد فضول ہے، کون کہتا ہے کہ زندگی زہر کا پیالہ ہے اور یہاں امرت کی تلاش بے سود ہے، امرت یقیناً ہے اور ہر شخص کو اُسے پانا ہے، زندگیٔ جاوید ہر شخص کا حق ہے۔ خود بھگوان کرشن نے کہا ہے "اِدھر اُدھر کی راہیں ترک کر دو فضول ہاتھ پاؤں نہ مارو، میری شرن میں آؤ میں تمہیں سنسار کے اُس پار لے جاؤں گا۔ ڈر کی کوئی بات نہیں"۔[۱] یہ پیغام ہمیں دنیا کی سب مقدس کتابوں سے ملتا ہے۔ انجیل مقدس سے یہی آواز اس طرح آرہی ہے "اے میرے مالک ہمیں طاقت دے کہ جیسے آسمانوں پر تیری رضا سب کو قبول ہے ویسے ہی زمین پر بھی تیری رضا ہمیں صدق دل سے قبول ہو[۲] کیونکہ تو ہی سرورِ عالم ہے تمام عظمت اور شان تجھ سے ہی منسوب ہے[۳]۔

سیدھی سی بات ہے لیکن اس پر عمل کرنا مشکل ہے، سخت مشکل ہے، کہنے کو تو میں جھٹ کہہ اٹھتا ہوں کہ "میرے مالک میں اِسی دم تیری شرن میں آرہا ہوں، مجھے اپنا پریم بخش دے، میں تیرے لئے ہر قربانی کرنے کیلئے تیار ہوں، بُرا بھلا جیسا بھی ہوں تیرے در پر پڑا ہوں۔ اگر میں نے کوئی بھلائی کی ہے اگر مجھ سے کوئی نیک کام ہو پایا ہے تو سب تیرے قدموں میں بھینٹ کرتا ہوں، میرے گناہ۔ میری برائیاں اور میرا دکھ درد تم سے پوشیدہ نہیں، میں انہیں بھی تیرے ہی آگے پیش کرتا ہوں۔ تو میرا سب کچھ لے لے اور میں جیسا بھی ہوں مجھے قبول کر، مجھے اپنا لے میرے مالک میں تجھے کبھی نہیں بھولوں گا" اسی طرح میں یہ بھی کہتا ہوں کہ "خداوندا تیری رضا مجھے قبول ہے" لیکن ذرا سی بات میری مرضی کے خلاف ہو تو مجھے آگ لگ جاتی ہے، میں طیش میں آجاتا ہوں، مذہبی صداقتوں کا اعتراف کرنا آسان ہے، اُن پر عمل کرنا مشکل ہے، اور عمل ہی تو مذہب کی جان ہے۔

سب مذہبوں کی منزلِ مقصود ایک ہی ہے، اگر کچھ فرق ہے تو مذہبی رہنماؤں کی زبان میں ہے

---

[۱] Give up all these paths and struggles. Do thou take refuge in Me. I will take thee to the other shore, be not afraid.

[۲] Thy will be done upon earth as it is in heaven.

[۳] Thine is the kingdom and the power and the glory.

030 www.taemeernews.com

سب کا مقصد انسان کی جھوٹی خودی کو مٹانا ہے تاکہ سچی خودی آشکار ہو جائے اور خدا کی رضا سچے معنوں میں قبول ہو۔ یہودیوں کی مقدس کتاب میں خدا یوں اعلان کرتا ہے "میں تمہارا واحد خدا اور مالک ہوں میرے سامنے کسی دوسرے خدا کا نام نہ لو میں کثرت کے خیال کو برداشت نہیں کرسکتا۔ یاد رکھو کہ اس لحاظ سے مجھے دوسرے دیوتاؤں سے سخت حسد ہے" [۱] مطلب یہ ہے کہ جہاں خدا کی ہستی کا سچا شعور اور احساس ہوتا ہے وہاں کسی اور چیز کا وجود ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا ہے تو اور کچھ نہیں آؤ ہم صدق دل سے یہ دعا کریں کہ 'خداوندا میری کوئی ہستی نہیں بس تو ہی تو ہے' اور یہ کہہ کر خدا کے علاوہ سب چیزوں کے خیال کو کلیتاً اور عملاً ترک کر دیں۔ اس کے بعد اسی کا راج ہو، وہی ہر طرف اور ہر شے میں جلوہ گر نظر آئے، ممکن ہے کہ ہماری پوری اور سچی کوششوں کے باوجود ہمارے پاؤں لڑکھڑا جائیں اور ہمیں پھر یزدانی مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے کی کوئی ضرورت محسوس ہو، مایوس ہونے اور گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ کوئی بات نہیں اگر ہمیں سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، ہمیں سہارا بھی مل جائے گا اور اگر ہمارا ارادہ مصمم اور مضبوط ہے تو ہمیں ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔

زندگی لامحدود ہے، خدا کی رضا کو قبول کرنا اور اسے عملی جامہ پہنانا اس کا ایک پہلو ہے، عارضی ناکامی اور مایوسی اسی لامحدود زندگی کا ایک دوسرا پہلو ہے اور جب تک آدمی زندگی کے ہر باب پر عبور حاصل نہیں کر لیتا زندگی کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ ہم صدق دل سے چاہتے بھی ہیں اور کہتے بھی ہیں کہ 'خداوندا تیری رضا ہمیں قبول ہے' لیکن ہر گھڑی ہمارا غدار من اس کے خلاف سخت بغاوت کرتا ہے اور اپنی بات منوانا چاہتا ہے، اس کا واحد علاج یہی ہے کہ ہم بار بار اس ارادے کو دہراتے رہیں کہ خدا کی مرضی ہماری مرضی ہے بس اس طریقے ہی سے ہم اپنے نفس پر فتح حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ ہم دماغ کی غلامی کر کے اس کا کہنا مان کر آزادی اور اختیار حاصل نہیں کر سکتے ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم اپنے نفس کے احکام بجا لانے سے انکار کرتے رہیں اور اپنے ضمیر کی آواز پر کان دیں۔ دنیا میں سب گناہ معاف ہو سکتے ہیں لیکن غدار توم فروش کو معاف نہیں کیا جا سکتا، ہمارا من خود ہمارا مخالف ہے۔ یہ ہماری ذات کے ساتھ غداری کرتا ہے۔ یہ ہمیں اپنی یزدانی عظمت کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے اکساتا ہے، اگر ہم نفس کی باتوں میں آ کر اپنی حقیقی ذات کی آواز کو سننے سے انکار کرتے ہیں تو ہم اپنے ساتھ غداری

---

[۱] I the Lord thy God am a jealous God ; thou shalt have no other gods before Me.

www.taemeernews.com

کرتے ہیں، آؤ آج ہم قطعی فیصلہ کرلیں کہ جو کچھ بھی ہو ہم اپنا تن من سب بھگوان کے ارپن کردیں گے، اپنا سب کچھ خدا کے سپرد کردیں گے، اُسی کی رضا پر قانع رہیں گے۔ اُسی کی مرضی کو اپنی مرضی بنائیں گے۔ کسی فلاسفر نے کیا خوب کہا ہے، اگر کوئی شخص یہ دوبار کہتا ہے کہ خداوند تیری رضا مجھے قبول ہے تو وہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، جب ایک بار کہہ دیا کہ "خداوند تیری رضا مجھے قبول ہے" تو اُسے دُوسری بار دُہرانے کے معنی ہی کیا ہیں۔ جب اُس کی رضا قبول کرلی تو باقی رہ ہی کیا گیا دوبارہ کہنے کا تو مطلب ہوا کہ ہمارا پہلا فیصلہ قطعی نہیں تھا آؤ ہم ایک ہی بار بالکل قطعی فیصلہ کرلیں، اور ہمیشہ کے لئے اعلان کریں کہ "خداوندا جیسے آسمانوں پر تیری رضا سب کو قبول ہے ویسے ہی ہم زمین پر تیری رضا قبول کرتے ہیں[ل]۔ تو ہی سرورِ دوعالم ہے تمام عظمت اور شان تیری ہے اور تیری رہے گی۔"

ل بہ دُرد و صاف ترا کار نیست خوش درکش ☆ کہ ہرچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است

اگر بلطف بخوانی مزید الطاف است ☆ دگر بہ قہر برانی درون ما صاف است

من و مقامِ رضا بعد ازیں و شکر و شکیب ☆ کہ دل بدردِ تو خو کرد و ترکِ درماں گفت

در طریقت ہرچہ پیش سالک آید خیرِ اوست ☆ در صراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

032 www.taemeernews.com

مذہب اور معیارِ عقل [ل]

(علم اور عرفان)

ہمارے ایک رشی جن کا نام نارد تھا ایک دفعہ ایک دوسرے رشی سنت کمار کے پاس اُن سے حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے گئے۔ رشی سنت کمار نے پوچھا اب تک کیا کیا علوم حاصل کر چکے ہو، نارد جی نے بتایا کہ چاروں دیدوں کے علاوہ علم نجوم وغیرہ سب پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ رشی سنت کمار بولے کہ دیدوں کا علم اور علم نجوم اور فلسفہ وغیرہ کی حیثیت ثانوی ہے سب سے اعلیٰ علم وہی ہے جس کی مدد سے ہم برہم کو پا سکتے ہیں۔

یہ خیال کہ خارجی علوم کا درجہ داخلی عرفان سے بہت کم ہے۔ ہر مذہب میں پایا جاتا ہے، ہر مذہب کا دعوےٰ ہے کہ خارجی علوم ہماری زندگی کے ایک جزو کو بیان کرتے ہیں لیکن داخلی عرفان جو مذہب سے حاصل ہوتا ہے ہمیں لامحدود اور لازوال حقیقت سے آگاہ کرتا ہے اور اس لئے اس کا درجہ سب علوم سے بلند ہے۔ اس دعویٰ کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ بدقسمتی سے مذہب کے علمبردار خارجی علوم کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے، یہاں تک کہ ان علوم سے مذہبی حقائق کا ثبوت ملتا ہو تو بھی اُن کو مذہب کے نزدیک نہ آنے دیا گیا۔ مذہب اور خارجی علوم میں یہ خود ساختہ فاصلہ بڑھتے بڑھتے عناد تک جا پہنچا اور اس دشمنی نے تعصب کی صورت اختیار کر لی مذہب کا دعویٰ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ روحانی علم ہی سچا علم ہے عرفان ہی ہماری سچی رہنمائی کر سکتا ہے کیونکہ یہاں غلطی کا امکان ہی نہیں ہے۔ خارجی علم کی باتوں پر کان دھرنا بے کار ہے مذہب والوں کے یہ طور دیکھ کر خارجی علم کے طرفدار عقل اور منطق کی تیز تلوار لے کر مذہب کی ہر بات کا قلع قمع کرنے پر تل گئے یہ جنگ ہر زمانے اور ہر ملک میں ہوتی رہی ہے اور آج بھی جاری ہے۔ مذہب کو ہمیشہ شکست ہوئی ہے اور کئی بار تو ایسا معلوم

ل Religion and Reason.

www.taemeernews.com

ہوتا تھا کہ مذہب جہان سے اٹھ ہی جائے گا۔ زمانۂ جدید میں اس کی مثال انقلابِ فرانس[1] ہے جب مذہب اور روحانیت کی قدروں کو کچل دیا گیا اور ان کی جگہ عقلی قدروں نے لے لی۔ انسانی تہذیب کی تاریخ میں پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا ہے کہ بس عقل اور منطق کو خدا مان کر اس کی پوجا کی گئی۔ انقلابِ فرانس تو گذشتہ واقعات کا اعادہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس انقلاب کی شکل میں مذہب اور عقل کے پرانے عناد نے ایک جنگِ عظیم کا رنگ اختیار کر لیا جو آج تک جاری ہے بلکہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ایک طرف تو طبعی علوم نے آج بہت ترقی کر لی ہے دوسری طرف رفتارِ زمانہ سے غافل ہو کر مذہب پہلے سے بھی زیادہ کمزور ہو گئے ہیں۔ مذہب اور عقل کے درمیان یہ خلیج جتنی وسیع ہوتی جاتی ہے اتنی ہی نفرت اور دشمنی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ آج کل کے لوگ بظاہر کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ اپنے دل میں بخوبی جانتے ہیں کہ جب تک عقل کسی بات کو قبول نہ کرے اس پر ایمان اور اعتقاد لانا ناممکن ہے۔ وہ زمانہ گیا جب لوگ پنڈتوں ملاؤں اور پادریوں کے کہنے پر یقین کر لیتے تھے یا مذہبی کتابوں کی ہر بات کو مان لیتے تھے یا سماج کی دیکھا دیکھی مذہبی رسوم کی پیروی کرتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جو آج کل بھی اندھا دھند ہر قسم کی مبینہ مذہبی اور روحانی باتوں پر ذرا یقین لے آتے ہیں لیکن ان ضعیف الاعتقاد لوگوں میں سوچ بچار کی طاقت ہی نہیں۔ ان لوگوں کا ایمان تو بس اندھی تقلید اور دماغی کاہلی ہے۔ زمانہ جلد ہی ان لوگوں کو جھنجھوڑ کر جگا دے گا۔ بھلا کوئی کب تک سویا رہ سکتا ہے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہی حالت رہی تو مذہب اور عقل کی جنگ جلد ہی ختم ہو جائے گی اور مذہب ہمیشہ کے لئے ہار جائے گا اور ہم روحانیت کی بے بہا دولت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ کیا اس نعمت کو بچایا جا سکتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ مذہب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر روحانی حقائق کو ثابت کر دیا جائے۔ اگر خارجی علوم کی بنیاد عقل اور منطق پر ہے تو مذہب کی بنیاد عقل اور منطق پر کیوں نہیں رکھی جا سکتی؟ میں سمجھتا ہوں کہ فی زمانہ عقل اور مذہب میں موافقت بہت ضروری ہے۔ اگر عقل کو مخصوص طریقوں سے استعمال کر کے سائنس اور خارجی علوم میں اس قدر ترقی ہو سکتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ عقلی تجربہ سے مذہبی صداقتوں کا ثبوت بہم نہ پہنچایا جا سکے۔ اگر مذہب عقل کا چیلنج قبول نہیں کر سکتا۔ اگر مذہب عقل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا ہے تو ایسے مذہب کا مٹ جانا ہی اچھا ہے۔ سمجھ لو کہ ایسا مذہب شروع ہی سے فضول اور بے کار توہمات کا سلسلہ تھا اور توہمات کا مٹ جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔ یقین مانئے ایسے مذہب کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں لیکن مذہب کوئی وہم نہیں، خواب و خیال نہیں۔ روحانیت ایک روشن حقیقت ہے۔ توہمات کو مٹ جانے دو۔ عقل کو اپنا کام کر لینے دو۔ مذہب کے روشن چہرے پر جو گرد جم گئی ہے اسے صاف ہو لینے دو۔ پھر دیکھئے مذہب کس آب و تاب سے چمکتا ہے۔ روحانیت کس شان سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ سائنس کو توہمات کی بوسیدہ بنیادوں کو ڈھا لینے دو۔ مذہب کی شان دار

ل The French Revolution.

www.taemeernews.com

عمارت کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا اس سے رُوحانیت کے محل کی پائندگی اور بھی نمایاں ہو جائے گی طبیعات اور علم کی طاقت محض خارجی ہے۔ مذہب اور رُوحانیت کی داخلی قوت میں جب سائنس کی خارجی طاقت شامل ہو جائے گی تو مذہب کی عظمت پُوری طرح ثابت ہو جائے گی۔ مجھے اُن لوگوں سے اتفاق نہیں جو کہتے ہیں کہ عقل اور مذہب میں موافقت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ دونوں کے میدان ہی مختلف ہیں اور مذہبی اصولوں کو عقل اور منطق کی کسوٹی پر پرکھنا فضول ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کہنا خود اپنی بات کی تردید کرنا ہے۔ سب مذہب والوں کا دعویٰ ہے کہ صرف اُن کا مذہب ہی سچا ہے، کیوں کہ وہ اُن کے پیغمبر پر نازل ہوا اب اگر دو مذہبوں کی اخلاقیات میں ایک ہی بات کے متعلق مختلف اور متضاد احکام درج ہوں تو عقل اور منطق سے کام لئے بغیر کوئی کیونکر یہ جان سکتا ہے کہ کس مذہبی ہدایت پر عمل کرنا ٹھیک ہے مثلاً ایک مذہب لوگوں کو زبردستی اپنے دائرے میں لانے کی اجازت دیتا ہے یہاں تک کہ بعض حالات میں قتل بھی روا سمجھتا ہے۔ دوسرا مذہب تشدّد اور قتل کو بدترین گناہ قرار دیتا ہے، دونوں مذہبوں کے پیرو اپنے اپنے مذہب کو سچّا کہتے ہیں، اور اس کے ثبوت میں اپنی اپنی مقدس کتاب کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دو مقدس کتابوں میں دو ایسی باتیں لکھی ہوں جو ایک دُوسرے کی ضد ہوں تو وہ کونسا معیار ہے جس کی رُو سے ہم یہ فیصلہ کرلیں کہ کونسی بات سچی ہے اور کونسی جھوٹی؟ ہر مذہب کے حامی اپنی بات کی حمایت میں یہی ایک دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہماری بات خُدا کے اُن احکام پر مبنی ہے جو خُدا نے ہمارے پیغمبر کی معرفت عائد کئے اگر حق اور باطل کو جانچنے کا معیار یہی ہے تو قتل کرنا بھی روا ہے اور کسی کو نقصان نہ پہنچانے کی تلقین بھی بجا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ کبھی خُدا ایک بات کو روا قرار دیتا ہے اور کبھی اس کے خلاف احکام صادر کرتا ہے، ایسے خدا پر ایمان لانا مشکل ہو جاتا ہے جن لوگوں میں ذرا بھی ذہانت ہے وہ قدرتی طور پر مذہب سے احتراز کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب مذہبی کتابوں کے حوالے سے کوئی بات ثابت نہیں ہو سکتی تو ہمیں کوئی ایسا معیار دریافت کرنا ہوگا جو ان کتابوں سے بھی بلند ہے اور جس کی مدد سے مختلف مذہبی احکام کے حق و باطل کا اندازہ لگایا جا سکے ہم صاف طور پر مانیں یا نہ یہ معیار عقل اور منطق ہی کا معیار ہو سکتا ہے۔

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ عقل الہام کو سمجھنے سے قاصر ہے آپ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا عقل کی روشنی میں مختلف پیغمبروں کی الہامی باتوں کی حقیقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ الہام اور چیز ہے اور منطق اور چیز۔ آپ کا اعتراض سر آنکھوں پر لیکن میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اگر عقل اور منطق ہمارے مسئلے کو حل نہیں کر سکتے تو مذہبی کتابوں اور پیغمبروں کے متعلق جو جھگڑے فساد صدیوں سے ہوتے آرہے ہیں اُن کا قلع قمع کرنا بھی ناممکن ہے، اگر عقل کی مدد سے

035 www.taemeernews.com

ان جھگڑوں کا تصفیہ نہیں ہو سکتا تو یوں سمجھ لینا پڑے گا کہ تمام مذہب جھوٹے ہیں متضاد باتوں کا ایک سلسلہ ہیں جن کی تہ میں اخلاقیات کا کوئی بنیادی اصول کام نہیں کر رہا۔ آخر مذہب یا روحانیت کا ثبوت تو خود انسان کی سرشت سے ہی تو ملے گا۔ مقدس کتابیں بھی انسان ہی کی فطرت کا اظہار ہیں۔ کتابوں سے آدمی کی تخلیق نہیں ہوتی۔ انسان ہی کے وجود سے یہ کتابیں ظہور میں آئی ہیں ان کی اپنی کوئی خارجی اصل نہیں۔ برعکس اس کے عقل انسان کی سرشت کا جزو ہے، ہمیں اپنی فطرت اپنی سرشت سے باہر اپنے سوالوں کا جواب نہیں ملے گا۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اگر مذہبی کتابوں میں اختلاف ہے تو اس کا فیصلہ عقل ہی کر سکتی ہے البتہ شرط یہ ہے کہ عقل کو گمراہ نہ ہونے دیا جائے۔ عقل سے خلاف فطرت کام نہ لیا جائے۔ اس سے میرا کوئی خاص مطلب نہیں۔ میں وہی بات کرنے کو کہہ رہا ہوں جو ہر تعلیم یافتہ مرد اور عورت کے دل میں ہے، سب یہی تو چاہتے ہیں کہ زمانۂ حال کی غیر مذہبی اور سائنٹفک (Scientific) معلومات کی روشنی میں مذہبی اصولوں اور اخلاقیات کا تجزیہ کیا جائے۔ تاکہ اگر مذہب اور روحانیت کی کچھ حقیقت ہے تو ثابت ہو جائے۔

دلیل اور منطق کا اصول یہ ہے کہ کسی محدود اور مخصوص چیز کی تشریح اس سے کم محدود اور مخصوص چیز کی نسبت سے کی جاتی ہے اس عمل تعمیم سے ہم بالآخر اس بنیادی اصول اس عالمگیر حقیقت تک آپہنچتے ہیں جس کا اطلاق دنیا کے سارے مظاہر قدرت پر ہوتا ہے اور ہم اُسے کائناتی اصول مان لیتے ہیں، اور اُسے قانون فطرت کا نام دیتے ہیں اگر واقعات عالم اس قانون کے مطابق ہوتے ہیں تو ہم انہیں اطمینان سے قبول کر لیتے ہیں کیونکہ ہم بنیادی اصول سے واقف ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خاص واقعات کو فوراً کائناتی قانون سے نسبت دے کر اُس کی تشریح کر لیتے ہیں مثلاً درخت سے سیب کو گرتے دیکھ کر نیوٹن کو اچنبھا ہوا اس واقعہ سے اُس کے دماغ میں ایک ہلچل سی مچ گئی لیکن جب اُس نے کشش ثقل ارضی کا قانون دریافت کر لیا تو اُسے تسلی ہو گئی۔ انسانی ادراک و شعور کا یہ پہلا اصول ہے۔ ہم کسی آدمی کو سڑک پر گزرتے دیکھتے ہیں۔ ہمارا دماغ فوراً اُسے بنی نوع انسان کے وسیع تصور کے دائرے میں لے آتا ہے اور ہم مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اسی عمل کو بر سر کار لاتے ہوئے ہم خاص سے عام محدود سے وسیع اور وسیع سے وسیع تر کی طرف جاتے ہیں اور بالآخر وہ کائناتی اصول دریافت کر لیتے ہیں جو تمام عالم پر حاوی ہے اور یہ ہے احساس حیات شعور خودی جس کی نسبت سے ہم باقی سب چیزوں کے وجود کا ادراک کرتے ہیں اس بات کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے ہم سب انفرادی طور پر مرد عورت اور بچے ہیں لیکن مجموعی طور پر ہم سب انسان کہلاتے ہیں۔ ہم بنی نوع انسان کا ذکر یوں کرتے ہیں گویا سب کا وجود ایک ہو اسی طرح آدمی۔ بلی اور کتے کی انفرادی طور پر مختلف نوعیت ہے لیکن مجموعی طور پر ہم سب کو جاندار کہتے ہیں اس سے آگے بڑھیے تو ہم نباتات کو بھی اپنے میں شامل کر لیتے ہیں اور سب کو "زندگی" یا حیات کہتے ہیں، اور آخر میں مادیات کو بھی اس مجموعے میں ملا کر "وجود" کا نام دیتے ہیں اس کا مطلب صرف یہی

036 www.taemeernews.com

ہے کہ ہم محدود چیز کو وسیع تر چیز سے نسبت دیتے ہوئے کائناتی اصول دریافت کرتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں عام اطلاق کے بہت سے نظریئے اور اصول بھرے پڑے ہیں۔ ہمارا دماغ مختلف قسم کے کلوں کا ذخیرہ ہے جنہیں اپنے اپنے خانے میں رکھ دیا گیا ہے جب کبھی کوئی نئی بات وقوع میں آتی ہے ہمارا دماغ اُسے جانی پہچانی باتوں کے کسی مناسب خانے میں ڈالنا چاہتا ہے اگر ہم اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہماری تسلی ہو جاتی ہے اور ہم کہتے ہیں اسے تو ہم جانتے ہیں" اسی چیز کو علم یا ادراک کہتے ہیں لیکن اگر ہم کسی نئے واقعے کو اپنے دماغ کے کسی خانے میں نہیں ڈال سکتے تو ہمارے اندر ہلچل مچ جاتی ہے اور ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک کہ اپنے دماغ سے کوئی نیا عام اطلاق کا اصول نہ نکالیں اسی لئے تو کہتے ہیں کہ علم اور ادراک تقسیم و ترتیب کا دوسرا نام ہیں۔ یہ نئے اصول ہمیں کہیں باہر سے دستیاب نہیں ہوتے بلکہ ہمارے ہی دماغ میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں خارجی واقعات ہمارے دماغ کو محرک کرتے ہیں اور دماغ اپنے اندر غوطہ زن ہو کر نئے نئے موتی نکال لاتا ہے ؛

علم اور ادراک کا دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر چیز کی صحیح تشریح اور تفسیر خود اس کی سرشت اور فطرت کی نسبت سے حاصل ہوتی ہے کسی خارجی مصدر سے نہیں ملتی۔ کسی زمانے میں لوگ سمجھتے تھے کہ اگر ہوا میں زور سے پتھر پھینکا جائے تو اُسے کوئی بھوت واپس پھینک دیتا ہے اسی طرح ہزاروں قدرتی باتوں کو لوگ غیر قدرتی ہستیوں سے منسوب کر کے اُن کی کچھ نہ کچھ تشریح کر لیتے ہیں لیکن یہ تشریح عموماً غلط ہوتی ہے مثلاً یہ کہنا کہ پتھر اس لئے گرتا ہے کہ بھوت اُسے زمین کی طرف کھینچ لاتا ہے ایک قدرتی واقعہ کی تشریح ضرور ہے لیکن یہ تشریح ایک خارجی محرک پر مبنی ہے داخلی فطرت پر منحصر نہیں جب کشش ثقل زمینی کا اصول دریافت کر لیا گیا تو داخلی تشریح حاصل ہو گئی اور اس سے ہماری پوری تسلی ہو گئی جدید فکر کا رجحان اس نوعیت کی تشریح تلاش کرنے کی طرف ہے۔ یہ مان لیا گیا ہے کہ ہر چیز کا راز اُسی کی داخلی فطرت میں ہے اور اس راز کو آشکار کرنے کا نام ہی سائینس ہے۔ واقعاتِ عالم کی تشریح کے لئے سائینس کسی خارجی وجود کو ضروری نہیں سمجھتی مثلاً علم کیمیا کے ماہر کو کسی کیمیائی عمل کی تشریح کے لئے بھوت پریت وغیرہ کے وجود کی ضرورت نہیں اسی طرح دوسرے سائینسداں بھی اس قسم کے خارجی محرکات سے بے نیاز ہیں۔

سائینس کا یہی اصول مذہب پر عائد ہونا چاہئے اور میری کوشش یہ ہے مذہب کو اسی اصول کی کسوٹی پر جانچا جائے۔ اگر کوئی مذہب اس امتحان میں کامیاب نہیں ہوتا یا اگر کسی مذہب کی کچھ جزویات اس معیار پر پوری نہیں اترتیں تو اُن کا ترک ہی بہتر ہوگا اور سچ تو یہ ہے کہ سائینس کے مقابلے میں بیشتر مذہبی نظریوں کی تشریح داخلی فطرت پر مبنی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن مذہب کا وقار کم ہوتا چلا جاتا ہے، مثلاً تقریباً تمام پرانے

حاشیہ صفحہ گذشتہ

لہ Existence.

037 www.taemeernews.com

مذہب شخصی خدا کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس خدا کی ہستی کائنات سے باہر اور اس سے جدا ہے، یہ خدا کائنات کا مالک ہے، اس کا حکمران ہے دنیا کا کاروبار اُس کی رضا سے ہوتا ہے اس نظریئے کے حق میں جو دلائل صدیوں سے پیش کی جاتی رہی ہیں اُن سے سب واقف ہیں، میں اُنہیں دُہرانا نہیں چاہتا، البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اُس شخصی خدا کو سب رحیم و کریم مانتے ہیں، لیکن دنیا میں جو ناانصافی اور عدم مساوات کے روز مظاہرے ہوتے ہیں ان کی کوئی وجہ نہیں بتاتا کہ آخر رحیم و کریم اور منصف خدا کے ہوتے ہوئے یہ ظلم کیوں ہوتے ہیں؟ خیر اس بات کو چھوڑیئے، فلسفہ اور سائنس کے نقطۂ نظر سے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں، سائنس اور فلسفہ تو یہ کہتے ہیں کہ خارجی شخصی خدا کا تصور اصلاً ہی غلط ہے، کائنات کی تخلیق کا خیال ہی بے بنیاد ہے، ان نظریوں کا ثبوت خود کائنات کی سرشت سے نہیں ملتا یہ کہنا کہ اس دُنیا کا سبب دنیا سے باہر ہے اور اس کے موجب اور محرک کا وجود اس سے علیحدہ ہے ٹھیک ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ جب ہم پتھر ہوا میں پھینکتے ہیں تو کوئی بھوت اُسے واپس زمین کی طرف کھینچ لاتا ہے شخصی خدا کا تصور دنیا کی تشریح کے لئے ناکافی ہے یہی وجہ ہے کہ مذہب سائنس اور فلسفہ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔

ارتقا کا اصول بھی اسی بنیادی اصول کا ایک نیا پہلو ہے کہ ہر چیز کی تشریح خود اُس کی سرشت سے ملنی چاہیئے زمانۂ جدید کے اس انقلاب انگیز خیال کا سارا مطلب آخر یہی تو ہے کہ ہر چیز کی سرشت ہی میں اُس کی ہر صورت کا راز پنہاں ہے، ہر چیز فطرتاً بار بار ظاہر ہونا چاہتی ہے۔ اور اس اظہار کے دوران میں اپنے پوشیدہ رنگوں کو اُبھارتی ہے، اور نئی نئی صورتیں اختیار کرتی ہے لیکن ہر نئے انداز کا محرک اور سبب خود اُس کی فطرت ہے، دراصل علت اور معلول ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں جب یہ حقیقت پنہاں ہوتی ہے تو ہم اُسے سبب کہتے ہیں اور جب یہ آشکار ہوتی ہے تو اثر کہلاتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ عالم کائنات اس ایک حقیقت کی ارتقائی صورتوں کا ظہور ہے، دنیا کسی خارجی خُدا کی تخلیق نہیں ہے، ہمیں اپنے سمیت جو کچھ نظر آتا ہے اسی ایک ہی سبب کے مختلف اثرات ہیں لیکن نہ تو سبب اثرات سے علیحدہ ہے اور نہ اثرات سبب سے باہر، ہر ظاہر اثر اپنے پوشیدہ سبب ہی کی ایک صورت ہوتا ہے، یہ صورت سبب ہی میں مضمر ہوتی ہے اور ضرورت ہو تو حالات کے مطابق نیا رنگ اختیار کر لیتی ہے لیکن یہ اپنے سبب سے مختلف نہیں ہوتی اسی کو ارتقا کہتے ہیں سبب اور اثر کے اس سلسلے کا نام ہی کائنات ہے، ہمیں اس کائنات کی تشریح کے لئے اس سے باہر کسی خارجی محرک کے تصور کی چنداں ضرورت نہیں ہے ہمیں اس دنیا کے خالق کا خیال درکار نہیں۔ ایسی صورت میں کچھ عجیب نہیں کہ مذہب کی وقعت کم ہوتی چلی جا رہی ہے کیونکہ تقریباً تمام مذہب اب تک ایک مافوق الطبعی حقائق کے نظریئے کو اپنائے چلے جاتے ہیں، فی زمانہ ایسے شخصی خدا کا تصور قبول نہیں ہو سکتا کیونکہ اس تصور کے

www.taemeernews.com

مُطابق تو خدا ایک بہت ہی جسیم اور طاقتور آدمی ہے اور بس زمانۂ جدید کا انسان اس تصور سے کہیں آگے نکل گیا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی مذہب ایسا ہو سکتا جو فلسفہ اور سائنس کے ان دونوں اُصولوں کے موافق ہو جن کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مذہب اول تو حصولِ علم کے اس اُصول پر پُورا اترے کہ ہمارا دماغ خاص سے عام کی طرف جاتا ہے اور ہم چند واقعات کی بنا پر کلیہ قائم کرتے ہیں (یا یوں کہیئے کہ ہم مخصوص اور محدود علم سے ہمہ گیر اور وسیع تر علم پاتے ہیں) اور دُوسرے ارتقا کے اس اصول کے موافق ہو کہ سبب اور اثر ایک دُوسرے سے علیٰحدہ نہیں ہوتے۔ ان اصولوں کے تحت آخر ہمیں ایک ایسے ہمہ گیر کائناتی کُلیے کو دریافت کرنا ہے جو سب علم اور ادراک پر حاوی ہو ہمیں اس حقیقت اس بنیادی سبب تک پہنچنا ہے جو ادنیٰ اور اعلےٰ ہر صورت میں مکمل اور کامل ہے' کائنات کی تشکیل کا اولیں اور عظیم ترین سبب اپنے معمولی سے معمولی اثر سے جُدا نہیں ہو سکتا' اثر خواہ سبب سے کتنا ہی دُور افتادہ کیوں نہ ہو اصلاً اُس کی فطرت اپنے بنیادی سبب کی فطرت ہے۔ سبب اور اثر کا فاصلہ ارتقاء کے ایک سلسلے کا نام ہے' حقیقت وہی ہے جس میں سبب اور اثر دونوں شامل ہوں' فلسفۂ ویدانت میں اس حقیقت کو برہم کا نام دیا گیا ہے' برہم وہ ہمہ گیر تصور ہے جس سے سب چیزوں کی تشریح ہوتی ہے۔ برہم کے نام سے کوئی صفت منسوب نہیں ہے' برہم کو "ست چِت آنند"[1] (وجودِ واحد' شعورِ مطلق و نشاطِ کامل) کہا گیا ہے۔ میں نے ابھی آپ کے سامنے مثالیں دے کر دکھایا کہ "زندگی" یا "وجود"[2] یا ہستی کا تصور وہ تصور ہے جس سے آگے انسانی دماغ جا ہی نہیں سکتا۔ اس میں مادیات' نباتات اور حیوانات سب شامل ہیں۔ اسی طرح "شعور"[3] یا احساس بہت یا آگہی بھی۔ علم و ادراک کے سلسلے میں سب سے اعلیٰ تصور ہے "شعور" یا آگہی سے میری مراد مختلف قسم کی عام فہم باتوں سے نہیں جن سے ہم اپنا دماغ بھر لیتے ہیں بلکہ آگہی کے معنی ہیں وہ رس جو ہمارے تمام علوم کی جان ہے' جس کی بدولت ارتقا کا عمل جاری ہے' اور جس کا اظہار انسان اور حیوان سب میں ارتقا کی مختلف صورتوں میں ہو رہا ہے آگہی کا یہ رس ہمارے روزمرہ کے تمام مدرکات کا سرچشمہ ہے' آگہی وہ واحد اور ہمہ گیر حقیقت ہے جس سے ہمارے تمام علوم کی کثرت ظہور پذیر ہوتی ہے' میں سمجھتا ہوں کہ اگر سائنس نے کوئی بات ثابت کر دی ہے تو وہ وحدتِ حیات کا نظریہ ہے۔ یہ وحدت نہ صرف رُوحانی ہے بلکہ دماغی اور جسمانی بھی' کون کہتا ہے کہ ہم جسمانی طور پر ایک دُوسرے سے مختلف ہیں' فرض کیجئے کہ ہم مادہ پرست ہیں اور خدا کی ہستی میں یقین نہیں رکھتے پھر بھی ہمیں ماننا پڑے گا

لے [1] Sat-Chit-Anand, Absolute Existence Knowledge & Bliss.

لے [2] Existence.

لے [3] Knowledge.

039 www.taemeernews.com

کہ تمام کائنات مادّے کا ایک بے کنار سمندر ہے جس میں آپ اور میں کچھ دیر گرداب کی طرح اپنی انفرادیت کے چکر میں رہ کر پھر اس سمندر کی لہروں میں کھو جاتے ہیں، جس مادّے سے آج میرا جسم بنا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ سال پہلے آپ کے تندرست و توانا جسم کا جزو بن کر چل پھر رہا ہو یا خورشیدِ عالمتاب کا حصّہ بن کر شعلے کی صورت میں لپک رہا ہو یا کسی سرسبز و شاداب پودے کی رگوں میں رس بن کر بہار دے رہا ہو، دنیا کی ہر شے ہر گھڑی اپنی صورت بدلتی رہتی ہے، اگر ثبات ہے تو بس اس بنیادی وحدت کو جس سے یہ سب کثرت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں کہ ہمارے جسم ایک دُوسرے سے علیحدہ ہیں اور ہم مختلف شخصیتوں کے مالک ہیں دراصل تمام اجسام ایک ہیں، یہی حال ہمارے دماغوں کا ہے، ہم ہر دماغ کو دوسرے سے علیحدہ سمجھتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو ہر دماغ بھی شعور و احساس کے بیکراں سمندر میں ایک گرداب کی صورت رکھتا ہے، اس کا ثبوت خود آپ کے سامنے موجود ہے، دیکھئے تو کس طرح میرے خیالات بغیر کسی رُکاوٹ کے آپ کے دماغوں میں داخل ہو رہے ہیں اور آپ کے خیالات میرے دماغ میں چلے آ رہے ہیں، دراصل ہم سب کی ہستی ایک ہے، جسم ایک ہے، دماغ ایک ہے اور جسم اور دماغ سے اُوپر اٹھئے تو رُوح ایک ہے، رُوح جسم اور دماغ کی وہ واحد قوتِ محرکہ ہے جس سے دونوں کی تشکیل ہوتی ہے، رُوح یا آتما ہی کا وہ ہمہ گیر تصور ہے جس کی وحدت میں سب کثرت بیک وقت پوشیدہ اور ظاہر ہے، بہرحال آپ آتما کو مانیں یا نہ، اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم سب ایک بنیادی وحدت کے حصّہ دار ہیں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ دراصل ہم جسمانی اور دماغی لحاظ سے بھی ایک دُوسرے سے جُدا نہیں ہیں، سائنس آئے دن اس بنیادی وحدت کا ثبوت بہم پہنچا رہی ہے، مغرور انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا دعوٰی ہے، سائنس اُسے بتاتی ہے کہ اعلٰی ترین انسان اور کمترین کیڑے میں طبیعاتی اور کیمیائی لحاظ سے کوئی فرق نہیں کیونکہ اموبا[1] کی ابتدائی منزل سے ترقی کرتے کرتے ہی انسان اپنے حالیہ مقام تک پہنچا ہے اسی بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پچھلے جنموں میں ہم اور آپ کیڑے کوڑے بھی رہ چکے ہیں، اسی کرۂ میں ارتقا کی وہ پوشیدہ طاقت تھی جس کی بدولت وہ بڑھتے بڑھتے انسان کے درجے تک آ پہنچا ہے یہ ہے "وحدتِ الوجود" کی نئی تعلیم جو ہمیں سائنس سے ملتی ہے، اس تعلیم کی اہمیت کو سمجھنا ضروری ہے، ہم میں سے بیشتر لوگ اپنے آپ کو، اپنے سے بلند ہستیوں کے برابر سمجھ کر تو بہت خوش ہوتے ہیں لیکن کون ہے جو انسان اور حیوان کی مساوات کا اعتراف کرنے کے لئے تیار ہو گا۔ بنی نوعِ انسان کی جہالت کا یہ حال ہے کہ ہر شخص اپنے نسب کا سلسلہ کسی ایسے بڑے آدمی سے جوڑنا چاہتا ہے جس کے دبدبے اور رعب کی وجہ سے سب اس کی عزت کرتے ہوں، خواہ وہ آدمی کتنا ہی ظالم کیوں نہ ہو، رہزن اور ڈاکو ہی کیوں نہ ہو برعکس اس کے اگر ہمارے آباؤ اجداد میں کوئی بزرگ

---

[1] Amoeba.

040 www.taemeernews.com

نہایت غریب رہا ہو تو ہم اُس کے نام تک کو بھلا دینا چاہتے ہیں خواہ وہ شرافت اور دیانتداری میں اپنی مثال آپ ہو لیکن شکر کا مقام ہے کہ سائنس کی بدولت ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ رہے ہیں، سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ مادی سطح پر زندگی ایک ہے، اس تعلیم سے مذہب کو تقویت پہنچی کیونکہ مذہب بھی یہی سکھاتا ہے کہ دنیا اور روحانی سطح پر زندگی ایک ہے۔ بہرحال ویدانت کے ادویت وادی فلسفے کی تعلیم یہ ہے کہ آتما[1] ہی تمام کائنات کا رس ہے، سب زندگی کی اصل ہے، انفرادی اور مجموعی زندگی اُسی سے ہے اور "وہ آتما تم ہو"[2] تمہاری حقیقی خودی ہی خُدا ہے۔ تمہاری وسعت میں تمام کائنات سمو رہی ہے تمام عالم تمہاری ہستی کا پرتو ہے، جو کوئی اپنے آپ کو دوسروں سے علیحدہ اور مختلف سمجھتا ہے، وہ خواہ مخواہ مصیبت مول لیتا ہے، دنیا کے تمام دکھ درد اِس احساسِ تفریق سے پیدا ہوتے ہیں، وحدت کے احساس میں سچی خوشی ہے، نشاط کامل احساسِ خودی کا دُوسرا نام ہے، جو یہ جانتا ہے کہ وہ اور کائنات ایک ہیں۔ وہی ستیہ چت آنند ہے، وہی برہمہ ہے۔

ظاہر ہے کہ ویدانت سائنس کے مطالبات کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے اس فلسفہ کے بنیادی نظریے میں ہمہ گیری ہے اور یہ دنیا کی ہر شے پر پوری طرح حاوی ہے۔ یہ فلسفہ قانونِ ارتقا کے موافق ہے اور کسی خارجی محرک یا سبب کا محتاج نہیں اس کے علاوہ فلسفۂ ویدانت ہر چیز کی تشریح اُس کی اپنی فطرت اور سرشت کی نسبت سے کرتا ہے ویدانت میں جس خُدا کا تصوّر ملتا ہے وہ ایک ایسی وحدت ہے جس کے باہر کوئی دوسری چیز نہیں، ویدانت کے برہمہ کے علاوہ اور کسی چیز کی ہستی نہیں، ویدانت میں خالق اور مخلوق کا تصور نہیں ملتا۔ یہاں تو برہمہ ہی کائنات کے اندر اور باہر ہے وہی سب کچھ ہے، ویدانت میں برہمہ کو یوں مخاطب کیا گیا ہے "تو ہی مرد ہے تو ہی عورت ہے تو ہی جوان ہے جو جوانی کے نشے میں سر بلند کئے جا رہا ہے اور تو ہی بوڑھا ہے جو زندگی کے بوجھ تلے دب کر لڑکھڑا رہا ہے" برہمہ ہر جگہ موجود ہے وہ ہے تو ہم ہیں ہم اُسی کو تو ہر وقت اور ہر مقام پر دیکھتے ہیں، سنتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اُسی کی بدولت ہی تو جیتے ہیں اسی میں بس کر تو زندگی گزارتے ہیں اسی کی حرکت سے ہم میں جان ہے اُسی کے دم سے ہماری ہستی ہے[3]۔ یہی خیال انجیل مقدس میں بھی ملتا ہے آپ کے پیغمبر نے بھی ایسے خدا کا تصور پیش کیا ہے جو کائنات کے اندر اور باہر موجود ہے، جو اس جہان کی رُوحِ رواں ہے جو اس کا رس ہے، اُس کو زندہ رکھنے والا دل ہے جو اس دنیا کی ہر شے میں جلوہ گر ہے وہ ست چت اور آنند (ہستی آگہی اور مسرت) ہے وہ وجود شعور اور نشاط کا بے کنار سمندر ہے اور ہم اور آپ اس سمندر میں چھوٹے چھوٹے قطروں کی طرح ہیں جنہیں سمندر

---

[1] Atma.

[2] Thou art that.

[3] In Him we live and move and have our being.

041 www.taemeernews.com

کی لہریں کبھی اُچھال دیتی ہیں اور کبھی اپنے دامن میں سنبھال لیتی ہیں ہماری ہستی برہمہ کی ہستی سے جُدا نہیں ہم تو اسی کے اظہار کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ برہمہ نورِ مجسّم ہے تو ہم اُس نور کی کرنیں ہیں۔ برہمہ مکمل بیان ہے تو ہم چھوٹے چھوٹے حرف یا الفاظ ہیں کرنیں نور سے جُدا نہیں الفاظ بیان سے علیحدہ نہیں۔ دراصل برہم ہی برہم ہے، یہ ہمیں جو آدمی آدمی میں فرق نظر آتا ہے، یا ہم جو فرشتے اور آدمی، آدمی اور جانور، جانور اور پودوں اور پودوں اور پتھروں میں تمیز کرتے ہیں دراصل یہ فرق نوعیت کا نہیں درجے کا فرق ہے، زندۂ جاوید فرشتے سے لے کر بے جان پتھر تک سب میں وہی برہمہ جلوہ گر ہے، ہوسکتا ہے کہ برہمہ کا جلوہ مجھ میں کم ہو اور آپ میں زیادہ، لیکن اس سے جلوے کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اظہارِ جلوہ کے ذرائع میں بھی کوئی فرق نہیں، فرق ہے تو ارتقا کے مقام کا آپ ارتقا کی اونچی منزل پر ہیں اور میں مقابلتاً نیچے ہوں لیکن ہم دونوں برہمہ کے نور کی جلوہ گاہ ہیں، آپ کی اصل، آپ کی سرشت اور فطرت بھی خدا ہے اور میری بھی آپ اپنے مقام پر پاکیزگی اور تقدس کے کمال کو حاصل کر چکے ہیں اور میں ابھی گناہ میں لت پت ہوں آپ فرشتہ خصلت ہیں اور میں شیطان سیرت۔ آپ سے نور کی کرنیں چھن رہی ہیں اور مجھ سے تاریکیاں برس رہی ہیں لیکن مجھے بھی برہمہ سے واصل ہونے کا اُتنا ہی حق ہے جتنا آپ کو اور صرف حق ہی نہیں مجھے بھی آخر برہمہ کے مقام پر پہنچنا ہے کیونکہ برہم ہی میری اصل ہے، میں بھی ست چت آنند ہوں۔ آپ نے آج اپنی اصل کو آشکار کر لیا ہے، آپ کو مبارک ہو لیکن میری اور آپ کی اصل ایک ہی ہے کچھ دیر رُک جائیے کل تک میں بھی اپنی اصل کو جلوہ گر کر لوں گا۔ نہ مجھے اور نہ آپ کو کسی خارجی مدد کی ضرورت ہے یہ تمام کائنات برہمہ ہی تو ہے۔

یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اگر سب کائنات برہمہ ہی ہے تو کیا برہمہ محض مادہ ہے؟ ہرگز نہیں۔ مادہ کیا ہے؟ مادہ برہمہ کی وہ صورت ہے جسے ہم حواسِ خمسہ کی مدد سے دیکھتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ برہم محض مادہ ہے، جب ہم حواسِ خمسہ سے اوپر اُٹھ کر برہمہ کا تصور ذہن سے کرتے ہیں تو برہم کی ایک غیر مرئی صورت پیدا ہو جاتی ہے برہمہ ایک کائناتی من[ل] (دماغ) کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ برہم محض دماغ ہے اس سے بھی آگے رُوح کا مقام آتا ہے، اور جب رُوح برہمہ کا احساس کرتی ہے تو برہمہ روحِ اعظم کی صورت میں نظر آتا ہے، اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ چونکہ سب کائنات برہمہ ہے اس لئے برہمہ مادہ ہے۔ برہمہ مادہ نہیں بلکہ مادہ کے پس پردہ جو حقیقت ہے وہ برہمہ ہے مثلاً اس کُرسی کو لیجئے۔ برہمہ یہ کرسی نہیں لیکن برہمہ ہی کی حقیقت سے اِس کُرسی کا شعور ہوتا ہے اس کرسی کے شعور کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں۔ ایک تو وہ خارجی چیز ہے جو کہ جسمانی وجود سے باہر ہے

ل Universal Mind.

042 www.taemeernews.com

اور جس کا ادراک میں اپنے حواس اور دماغ سے کرتا ہوں اور دُوسری وہ داخلی چیز جس سے میرے حواس اور دماغ میں ادراک کی اہلیت پیدا ہوتی ہے' ان دونوں چیزوں کے ملنے سے کرسی کا شعور پیدا ہوتا ہے' برہمہ وہ لازوال حقیقت ہے جو ان دونوں کے پیچھے ہے جو ہماری خارجی دنیا میں بھی موجود ہے اور داخلی دنیا میں بھی جو ہمارے حواس اور دماغ سے بالا ہے اور جس کو ہمارے حواس اور دماغ مختلف صورتوں میں دیکھتے ہیں۔ کبھی وہ ہمیں کرسی کی صُورت میں نظر آتا ہے اور کبھی میز بن کر ہمارے سامنے آتا ہے' ہمارے کرنے مکان' ہمارے شہر' ہمارے ملک' ہماری دُنیا سورج چاند ستارے سب کے سب اِسی برہمہ کی مختلف صورتیں ہیں یا یوں کہیے کہ برہمہ کی ہستی ایک پردہ ہے جس پر ہمارے حواس اور دماغ یہ تصویریں بناتے رہتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ اگر ایسا ہے تو یہ کیوں کر ہوتا ہے کہ ہم سب کو کرسی کُرسی ہی نظر آتی ہے اور میز میز' یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ہر شخص ست چت آنند کے کینوس (پردے) پر ایک ہی قسم کی تصویریں بنا رہا ہے' بات یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص ایک ہی نظر سے برہمہ کو دیکھے' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مختلف آدمی برہمہ کو مختلف رنگوں میں دیکھتے بھی ہیں لیکن یہ لوگ مختلف سطحوں پر ہوتے ہیں' جو لوگ ایک ہی سطح پر ہیں وہ برہمہ کو ایک ہی صورت میں دیکھ سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم ایک دُوسرے کے نقطۂ نگاہ کو سمجھ لیتے ہیں اور سب کو کرسی کرسی اور میز میز نظر آتی ہے۔ ہمارے علاوہ لاکھوں ہستیاں ایسی ہو سکتی ہیں جو برہمہ کے پردے پر ہماری دنیا کی تصویروں سے مختلف تصویریں بناتی ہیں لیکن ہم اِن لوگوں اور اُن کی بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھ نہیں سکتے کیونکہ ہماری زندگی کی سطح اُن سے مختلف ہے' اس بات کا ثبوت بھی جدید سائنس مہیا کر رہی ہے' یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ آج کل طبیعاتی کھوج اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ بنیادی حقیقت ہمیشہ لطیف ہوتی ہے' مجسم صُورت تو بس ظاہری ہوتی ہے۔ سائنس ٹھوس مادّے کے مقام سے گزر کر بجلی کی لطیف لہروں تک آ پہنچی ہے' بہرحال سائنس کے آئندہ نتائج کچھ بھی ہوں مجھے تو آپ کو یہ دکھانا ہے کہ اگر کوئی مذہبی نظریہ آج کل کی سائنس اور دیگر علوم کی کسوٹی پر پُورا اتر سکتا ہے تو وہ ویدانت کا ادیت وادی فلسفہ ہے' یہ فلسفہ سائنس کی وہ دونوں شرائط پُوری کرتا ہے جن کا میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا ہے' یہ نظریۂ حیات ہر چیز پر عائد ہوتا ہے' اس کی ہمہ گیری[1] اور وسعت میں سب زندگی سما جاتی ہے' یہ کسی مخصوص شخصیت پر محدود نہیں ہے۔ جو نظریہ شخصی خدا تک محدود ہوتا ہے وہ کائناتی نہیں ہو سکتا۔ شخصی خُدا کے وجود کے تصور کے ساتھ ساتھ اُس کی صفات کا تصور بھی پیدا ہوتا ہے اور ہم اسے رحیم کریم پاک و منور وغیرہ کے القاب سے یاد کرتے ہیں اس دُنیا میں نیکی اور برائی' روشنی اور تاریکی۔ پاکیزگی اور گندگی ساتھ ساتھ ملتی ہیں لیکن ہم شخصی خُدا کے تصور میں صرف اچھی صفات ہی بھر دیتے ہیں اور دنیا کی تلخ حقیقتوں کو اُس

---

[1] It is the highest generalisation.

043 www.taemeernews.com

منسوب نہیں کرتے اس طرح خدا کا تصور شروع سے ہی اَدھورا رہ جاتا ہے۔ ہم اچھی اور خوشگوار صفات سے مرکب ایک تصور قائم کرلیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا شخصی خدا ایسا ہے لیکن ویسا نہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں ایک اور وجود کا تصور تخلیق کرنا پڑتا ہے جو ویسا ہے ایسا نہیں جس میں وہ سب برائیاں ہیں جو ہم نے اپنے شخصی خدا کے تصور سے خارج کردی ہیں اس طرح شخصی خدا کے تصور کے ساتھ شخصی شیطان کا تصور بھی لازم ہوجاتا ہے، خدا اور شیطان ایک دوسرے کے لازم اور ملزوم ہو جاتے ہیں ظاہر ہے کہ شخصی خدا کا تصور مکمل نہیں اور اس کو کائناتی درجہ نہیں دیا جاسکتا ہمیں اس سے زیادہ مکمل اور ہمہ گیر نظریہ تلاش کرنا ہوتا ہے اور وہ نظریہ ہے غیر شخصی برہمہ (خدا) کا برہمہ کے تصور میں یہ کائنات جیسی ہے ویسی قائم رہتی ہے یہاں کی مسرتیں اور مصیبتیں نیکیاں اور برائیاں سب کی سب برہمہ ہی میں بسی ہیں، آپ پوچھیں گے وہ بھی بھلا کس قسم کا خدا ہوگا جس سے بُرائی بھی منسوب کی جاتی ہے؟ ایسے غیر شخصی خدا کے تصور کے معنی یہ ہیں کہ نیکی اور برائی دونوں ایک ہی طاقت کے دو مختلف کرشمے ہیں، نیکی اور بُرائی کو دو مختلف چیزیں مانا ہی نہیں جاتا اس نظریئے کے مطابق نیکی اور بُرائی کو مختلف چیزیں ماننا ایک زبردست غلطی ہے، دنیا کی بہت سی مصیبتیں اسی غلط خیال کے باعث پیدا ہوئی ہیں۔ مذہبی جھگڑے اور فسادا اسی خیال سے اُٹھتے رہے کہ نیکی اور بدی ایک دُوسرے کے متضاد دو مختلف طاقتیں ہیں، جو ہمیشہ ایک دُوسرے کے خلاف برسرِپیکار ہیں، نیکی کی فتح کے نام پر نہ جانے کتنے قتل وخون ہوئے کاش کہ ہم نیکی اور بدی کو ایک دُوسرے کا دشمن نہ سمجھتے۔ شاید اس طرح آدمی آدمی کا دشمن نہ بنتا۔ مجھے تو آج تک کوئی ایسا آدمی ملا نہیں جو مجھے دکھا سکے کہ فلاں چیز مکمل طور پر اچھی ہے اور فلاں کلیتاً بُری میری نظر سے تو کوئی واقعہ ایسا نہیں گزرا جو یا تو کلیتاً اچھا ہو یا کلیتاً بُرا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا جو چیز آج اچھی ہے کل بُری ہوسکتی اور آج جو بُری ہے کل اچھی بھی ہوسکتی ہے، اسی طرح جو چیز میرے لئے اچھی ہے وہ آپکے لئے بُری ہوسکتی ہے۔ اور جو چیز آپ کے لئے اچھی ہے وہ میرے لئے بُری ہوسکتی ہے میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نیکی اور بُرائی دونوں سلسلۂ ارتقا کی کڑیاں ہیں بلکہ نیکی اور بدی بذاتِ خود اضافی خیال ہیں۔ ارتقا کے دوران میں ایک ہی مقام کو آج اچھا کہا جاسکتا ہے لیکن اس سے بلند منزل پر جاکر وہی مقام بُرا نظر آتا ہے مثلاً اگر کسی طوفان میں میرا کوئی دوست مرجاتا ہے تو مجھے اُس طوفان میں برائی ہی بُرائی نظر آئے گی لیکن اسی طوفان سے مختلف بیماریوں کے لاکھوں جراثیم مرجاتے ہیں اور اس طرح ہزاروں انسانوں کی جانیں بچ جاتی ہیں مجھے اُن کا خیال تک نہیں آئے گا۔ لوگ اس طُوفان کو برکت سمجھیں گے لیکن میرے لئے وہ قہر ہی رہے گا ظاہر ہے کہ نیکی اور برائی اضافی چیزیں ہیں، اُن کا تعلق اس اضافی دنیا، اس عالمِ شہود سے ہے جس غیر شخصی خدا کا ہم تصور پیش کر رہے ہیں وہ کوئی اضافی ہستی نہیں ہے اس کے متعلق یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اچھا ہے یا بُرا ہے۔ وہ نہ اچھا ہے نہ بُرا۔ وہ ان دونوں اضافی صفات سے بالا ہے، ہاں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے بُرائی کی بجائے

044 www.taemeernews.com

نیکی میں اس کا جلوہ زیادہ روشن ہوتا ہے۔ نیکی ارتقا کی زیادہ اونچی منزل ہے۔

اگر ہمارا غیر شخصی خدا اضافی ہستی نہیں اور اگر کائنات اُسی میں بس رہی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ کائنات بحیثیتِ مجموعی ساکن و ثابت ہے۔ حرکت اور تغیر کا تصور اضافی ہے۔ ایک چیز دوسری کی نسبت سے حرکت کرتی ہے وہ بدلتی رہتی ہے۔ انفرادی طور پر دنیا کی ہر چیز تغیر پذیر ہے اور ہر لحظہ حرکت میں ہے۔ ارتقا کا سلسلہ اسی حرکت اور تغیر پر مشتمل ہے۔ لیکن ہمارا غیر شخصی خدا مکمل ہے۔ اُسی میں سب دنیا بسی ہے۔ اس لئے اس کی نسبت حرکت و تغیر کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا خدا سکونِ جاوداں ہے۔ ہماری کائنات اٹل اور پائیدار ہے۔ حرکت اور تغیر کا ادراک بس عالمِ شہود کی ظاہری سطح پر ہے۔ جہاں کی ہر چیز اضافی ہے۔ مثلاً میں اس کرسی کی نسبت سے حرکت کرتا ہوں۔ یہ کرسی ساکن ہے اور میں اس کے مقابلے میں آگے پیچھے جا سکتا ہوں۔ حرکت کے تصور کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک چیز دوسری کی نسبت سے حرکت کرتی ہے۔ اگر تمام کائنات کی وحدت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس "واحد الوجود" میں حرکت اور تغیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر یہ واحد وجود کس کی نسبت سے حرکت کرے گا۔ پس ثابت ہوا کہ ہمارا غیر شخصی خدا، ہماری ہستیِ مطلق[1] ہمارا برتر سکونِ جاوداں ہے اور اس میں مکمل ثبات ہے۔ حرکت اور تغیر کو اس سے منسوب کیا ہی نہیں جا سکتا۔ حرکت اور تغیر تو شہود کے کرشمے ہیں۔ یہ محدودیت کے مناظر ہیں۔ غیر شخصی خدا کی ہستی ہر صورت سے مکمل ہے۔ ہر شے اس ہستی میں شامل ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا ایٹم[2] بھی اس کا جزو ہے اور شخصی خدا بھی اِسی ہستی کا ایک پرتو ہے۔ جسے ہم خالق و شہنشاہِ عالم کہتے ہیں جس کے آگے سر جھکا کر اور گھٹنے ٹیک کر دعائیں مانگتے ہیں وہ اسی غیر شخصی ہستی کا بلند ترین جلوہ ہے۔ ہمیں شخصی خدا سے انکار لازم نہیں۔ عقل شخصی خدا کی ہستی کو قبول کر سکتی ہے۔ غیر شخصی حقیقت مختلف رنگوں میں جلوہ نما ہوتی ہے۔ ہم سب کی زندگی اسی کے دم سے ہے۔ آپ میں اور مجھ میں یہی کارفرما ہے۔ لیکن ہماری زندگی کی جلوہ گاہ تنگ و تاریک ہے۔ اس میں وسعت اور روشنی نہیں۔ شخصی خدا ایک کشادہ اور درخشندہ مظہر کا تصور ہے جہاں غیر شخصی خدا کی ہستی کا زیادہ سے زیادہ جلوہ نظر آ سکتا ہے۔ اس سے بلند اور وسیع تصور ہمارے ذہن کے لئے ناممکن ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم شخصی خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہم اُس کو پا سکتے ہیں۔ یہ جو ویدانت اعلان کرتا ہے کہ آپ کی اور میری حقیقی خودی ہی خدا ہے اس سے مراد شخصی خدا نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب کی اصل وہ غیر شخصی ہستی ہے جس کے دم سے ہم زندہ ہیں۔ مثلاً مٹی سے بہت بڑے ہاتھی کا بھی مجسمہ بنایا جا سکتا ہے اور ایک چھوٹا سا چوہا بھی۔ یہ چوہا ہاتھی نہیں بن سکتا لیکن دونوں کو پھر سے پانی میں گھول کر برابر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مٹی دونوں کی اصل ہے۔ جب تک مٹی نے چوہے اور ہاتھی کی شکل اختیار کر رکھی ہے دونوں میں ہمیشہ فرق رہے گا۔ جس ہستی کو ہم لامحدود غیر شخصی خدا کہتے ہیں اُس کی مثال اس مٹی کی ہے جو لاکھوں کروڑوں مجسموں کی صورت

---

[1] The Absolute.　　[2] Atom.

045 www.taemeernews.com

اختیار کرلیتی ہے' آپ کی اور میری ہستی اور شخصی خدا کی ہستی مختلف مجسمے ہیں جب تک ہم اپنی اصلی حالت میں رہتے ہیں، دونوں برابر ہوتے ہیں ہم میں کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن جب ہم پردۂ شہود پر مجسم ہو کر نمودار ہوتے ہیں ہم دونوں کے درمیان بندے اور خدا کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ ہماری مجسم ہستی ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتی ہے شخصی خدا مالک ہوتا ہے اور ہم غلام وہ معبود ہوتا ہے اور ہم اُس کے پجاری اور یہ حسین اور مسرت انگیز رشتہ ہمیشہ قائم رہتا ہے' اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر شخصی خدا کی ہستی کو ماننے سے شخصی خدا کا تصور مٹ نہیں جاتا بلکہ اور روشن ہو جاتا ہے اس کے ساتھ ہی دُنیا کی دُوسری تمام اضافی چیزیں بھی اپنی اپنی جگہ پر بحال رہتی ہیں لیکن مذہب عقل اور منطق کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ شخصی خدا کو پانے کے لئے بھی غیر شخصی خدا کا شعور ضروری ہے عقل اور منطق کا طریقہ کار یہ ہے کہ محدود اور مخصوص چیزوں کو وسیع اور عام چیزوں کی نسبت سے جانا اور پرکھا جاتا ہے۔ ہمہ گیر تصورات کے شعور ہی سے مخصوص تصورات کو اپنی جگہ پر قائم کیا جاتا ہے۔ انسان اور انسان کے عظیم ترین نمونے یعنی شخصی خدا کا تصور غیر شخصی ہستی کے ہمہ گیر تصور ہی سے قائم ہو سکتا ہے' اس ہستی کے شعور سے شخصی خدا اور بندے کے تعلقات کو تقویت پہنچتی ہے یہ تعلقات ایک نیا رنگ اختیار کر لیتے ہیں اُن کے معنی اُبھر آتے ہیں۔ خدا کی عبادت اب بھی ہوتی ہے لیکن ہم گڑگڑا کر دنیاوی چیزوں کے لئے دُعائیں نہیں مانگتے۔ دُعا مانگنے کا خیال ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھ لیتے ہیں کہ دعائیں محض دنیاوی خواہشات کا اظہار ہوتی ہیں ہم جان لیتے ہیں کہ دنیا کی قدریں اضافی ہیں، ہمارے لئے ان کی کشش ہی مٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیدار مغز مذہبی راہنما خدائے تعالیٰ سے دُعا مانگنے کی اجازت نہیں دیتے' دعائیں مانگنا ہو تو دیوتاؤں سے مانگیے' اولیاء سے مانگیے خدا سے دُعا مانگنے کے کیا معنی مثلاً رومن کیتھولک عیسائی اولیاء[1] ہی سے دعائیں مانگتے ہیں اور یہ دُرست بھی ہے اور فطرت کے موافق بھی' خدا سے دُعا مانگنا محض بے عقلی ہے بھلا یہ کہاں تک ٹھیک ہے کہ ہم خدا سے تازہ ہوا۔ بارش یا فصلوں کے لئے دُعا مانگیں' ایسی دعائیں قانون قدرت کے خلاف ہوتی ہیں۔ البتہ سنت' سادھو اور اولیا جو ہماری طرح کے انسان ہیں لیکن جو ارتقا کی اعلیٰ منزلوں تک جا پہنچے ہیں اور جنھوں نے ہم سے زیادہ طاقت حاصل کر لی ہے' ہماری خواہشات کو پُورا کرنے میں ہماری مدد کرنے پر راضی ہو سکتے ہیں' انسان کا انسان سے مدد طلب کرنا بجا ہے' اس لئے سنتوں اور اولیا سے دُعا مانگنے کے تو معنی ہو سکتے ہیں لیکن خدائے تعالیٰ شہنشاہِ عالم سے اس قسم کی دعائیں مانگنا کہ یا اللہ میرے سر میں درد ہے اس کو دور کر دے" اپنا اور اپنے خدا کا مضحکہ اڑانا ہے' اس دُنیا میں لاکھوں کروڑوں ایسی رُوحیں آئیں جو یہاں سے رُوپوش

---

[1] Saints.

046 www.taemeernews.com

ہونے کے بعد فرشتوں اور اولیا کے مقام تک جا پہنچیں وہ سب کی سب ہماری مدد کو موجود ہیں، اگر ہمیں اپنی دنیادی خواہشات ہی کے لئے دُعا مانگنا ہے تو ان سے مدد طلب کی جا سکتی ہے لیکن خدا سے دُعا؟ آخر کیوں؟ خدا سے دُعا مانگنا ہے تو خدا کو مانگئے، اُن چیزوں کو مانگئے جو ہمیں اُس تک لے جا سکتی ہیں، یقیناً بیوقوف ہے وہ شخص جو گنگا کے کنارے بیٹھ کر پانی کے لئے چند قدم دُور اپنا ایک علیحدہ کنواں کھودنا چاہتا ہے یقیناً بے عقل ہے وہ آدمی جو ہیروں کی کان میں جا کر کوئلے کی تلاش کرتا ہے گنگا تک جا کر امرت پیجئے ہیروں کی کان سے ہیرے دامن میں بھر لیجئے۔ خدا سے خدا کو طلب کیجئے۔ اس سے دنیا کی خواہشات کی تکمیل کی دُعا مانگنا کفرانِ نعمت ہے آخر اس سے زیادہ اور کیا حماقت ہو سکتی ہے کہ ہم برکت و رحمت کے سرچشمہ سے محبت و شفقت کے دریا سے آبِ حیات کے بجائے کنکر اور ریت طلب کریں جس ہستی سے ہمیں علم و آگہی کا عالمتاب نور مل سکتا ہو اُس سے خواہشات کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے مانگیں آیئے ہم خدا سے آگہی اور طاقت اور محبت کی مانگ کریں، آیئے ہم دُعا کریں کہ ہمارے دل و دماغ اُس کے نُور سے چمک اُٹھیں اور ہماری رگ رگ میں اس کی لازوال محبت جاگ اُٹھے یاد رکھئے کہ جب تک ہم میں کمزوریاں اور خامیاں ہیں جب تک ہم خواہشات کے غلام ہیں اور اس غلامی میں ہم کو لطف آتا ہے، اس وقت تک نہ تو ہم شخصی خدا کے تصور سے آگے نکل سکیں گے اور نہ ہم اُس سے اپنی مُرادیں منوانا بند کریں گے لیکن اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو رُوحانی ارتقا کی اعلےٰ منزلوں تک جا پہنچے ہیں۔ یہ بلند مقام لوگ دنیادی قدروں کی کچھ پروا نہیں کرتے اِن کی نظر میں دنیادی ساز و سامان کی کوئی قیمت نہیں یہ تو تقریباً بھُول ہی گئے ہیں کہ خود اپنے لئے کسی چیز کی خواہش کرنا کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی خودی کو کچھ اس طرح مٹا دیا ہے کہ اُن کی اپنی کوئی ضرورت ہی نہیں یہ ہمیشہ دوسروں کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں یہی لوگ تو غیر شخصی پُوجا کے اہل ہیں یہ وہ پُوجا ہے جس میں احساسِ کمتری کو بالکل کوئی دخل نہیں غیر شخصی خدا کی پُوجا میں غلامی کا کوئی عنصر شامل نہیں، یہاں پجاری یہ نہیں کہتا کہ خدایا میں ہیچ ہوں۔ مجھ پر رحم کر دیہ پُوجا تو انالحق کا نعرہ بن کر گونجتی ہے۔ آپ نے فارسی کی وہ نظم سُنی ہو گی جس میں یہ مثال بیان کی گئی ہے "میں اپنے محبوب کو ملنے آیا۔ میں نے دیکھا کہ سب دروازے بند ہیں میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی "کون ہے؟" میں نے کہا "میں فلاں شخص ہوں" لیکن دروازہ نہ کھُلا، میں دوبارہ محبوب کے دروازے پر آیا اور دستک دی، اندر سے پھر وہی آواز آئی "تم کون ہو" میں نے پھر وہی جواب دیا "میں فلاں شخص ہوں" دروازے کے کواڑ اب بھی بند ہی رہے، میں تیسری بار پھر وہیں آیا اور اس بار بھی مجھ سے وہی پہلے والا سوال پوچھا گیا، میں نے جواب دیا "میں تو" ہوں میرے محبوب" میرا یہ کہنا تھا کہ محبوب کے محل کے سارے دروازے مجھ پر کھُل گئے۔

یہ ہے غیر شخصی خدا کی پرستش کی صُورت جس کی بنیاد احساسِ خودی پر ہے یہ پرستش حقیقت اور آگہی

047 www.taemeernews.com

کی بنا پر کی جاتی ہے، اور وہ حقیقت یہ ہے کہ "میں وہ ہوں" اگر میں یہ کہوں کہ "میں تو نہیں ہوں" تو یہ سراسر غلط ہے، اگر میں یہ سمجھوں کہ "میں تجھ سے جدا ہوں" تو یہ ایک خطرناک جھوٹ ہے، میں تو تمام کائنات کی وحدت ہوں، وہ وحدت جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا مجھے اس بات کا کوئی ثبوت پہنچانے کی ضرورت نہیں کیونکہ مجھے براہِ راست اس حقیقت کا شعور و احساس ہے کہ یہ تمام کائنات اور میں ایک ہیں، یہ تمام عالمِ شہود مجھ میں ہے اور میں اس میں ہوں یہ آکاش، یہ ہوا یہ چاند سورج، یہ ٹھنڈک اور گرمی یہ نور و جمال ہیں ان سب میں موجود ہوں اور میری بدولت جلوہ گر ہیں یہ تمام کائنات اور میں ایک ہیں۔ میں کسی سے جدا نہیں اور نہ مجھ سے کوئی چیز جدا ہے، میں وحدتِ جاوداں ہوں میں ہی کائناتی ہستی[لہ] ہوں اور میں ہی عالمِ شہود بھی، میں زندگی دوام بھی ہوں اور دُنیائے ناپائیدار بھی۔ دراصل مجھے ناپائیدار سمجھنا ہی غلط فہمی ہے کیونکہ میرے سوا کچھ ہے ہی نہیں تمام کاروبارِ جہاں مجھ سے رواں ہے۔ ہر فعل کا فاعل اور ہر عمل کا عامل میں ہوں ہر دل میں "میں" کا احساس مجھ ہی سے ہے میں امر ہوں۔ لازوال ہوں، لاثانی ہوں، میں زندۂ جاوید ہوں۔ میں سدا جاگتا رہتا ہوں، میرا جلال ہمیشہ قائم رہتا ہے میری طاقت اور قدرت میں کبھی کمی نہیں آسکتی میں "وہ" ہوں؛

یہ ہے غیر شخصی خدا کی پرستش کا رنگ اس سے انسان کی تمام زندگی بدل جاتی ہے، سب کمزوریاں اور خامیاں دُور ہو جاتی ہیں اور انسان یزدانی طاقت کا مجسمہ بن جاتا ہے، اگر ہمیں زندگی میں کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ طاقت و توانائی ہے۔ آخر جس چیز کو ہم گناہ کہتے ہیں وہ اپنی کمزوری کی تلافی کی ہی ایک صورت ہے، اس جہاں کے سارے غموں کا سبب بھی ہماری کمزوری ہے، کمزوری سے جہالت پیدا ہوتی ہے اور جہالت دکھوں کی جڑ ہے جو کمزور ہے اس میں حقیقت کو پہچاننے کی تاب نہیں، اور جو حقیقت سے واقف نہیں وہ قدرتی طور پر دُکھ درد میں مبتلا رہتا ہے (مثلاً جو رسی کو سانپ سمجھتا ہے وہ ہر وقت خوف میں ہی مبتلا رہے گا) غیر شخصی خدا کی پرستش حقیقت شناسی ہے؛ احساسِ حق سے ہم میں بے انتہا طاقت آجاتی ہے ہم دُنیا کی مصیبتوں کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں (ہمارے دل میں کسی قسم کا خوف نہیں رہتا ضرورت ہو تو ہم موت کے مُنہ میں جانے سے بھی نہیں ڈرتے) دنیا جنہیں شیطان سیرت لوگ کہتی ہے ہم اُن کے کرتوتوں پر بھی مسکرا دیتے ہیں (کیونکہ اُن کی کم مائیگی، اور کم نگاہی ارتقا کی ایک عارضی منزل ہے) ہمیں تو شیر اور چیتے کی خونخواری میں بھی اپنی واحد خودی کا جلوہ نظر آئے گا۔ سچی طاقت اُسی میں ہے جو اپنے خدا سے ایک ہو گیا ہے جو ہر طرف اُسی کو جلوہ گر دیکھتا ہے اور جس کے دل سے خوف کا نام و نشان ہی مٹ گیا ہے، آپ اپنی انجیل مقدس کو ہی دیکھئے، یسوع مسیح کی زندگی کا مطالعہ کیجیے، اور سوچیے

لہ Universal Being.

www.taemeernews.com

کہ آخر اُن کی بے انتہا طاقت کا کیا راز تھا؟ وہ زبردست طاقت آخر کہاں سے آئی تھی جو باغیوں کی بغاوت
پر ہنس دیتی تھی اور جس کی بدولت یسُوع مسیح اپنے قاتلوں کے حق میں بھی دُعائے خیر ہی کرتے رہے، دیکھئے خود یسُوع
مسیح اس طاقت کے مصدر کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں" میں اور میرا یزدانی باپ دراصل ایک ہیں"[1] اور پھر دیکھئے
اُن کی پرارتھنا کیا ہے کہتے ہیں" میرے پتا جیسے میں اور آپ ایک ہیں۔ اسی طرف سب کو میرے ساتھ ایک کر دو"[2] یہی
سچی پرارتھنا ہے یہی سچی پُوجا ہے کائنات کو اپنے میں سمو کر اُس سے ایک ہو جاؤ یہ کائنات جس ہستی میں بس رہی ہے
اُس سے ایک ہو جاؤ اس کائناتی ہستی۔ اس غیر شخصی خدا کی حقیقت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے
کہ اسی کے دم سے ہی ہم زندہ ہیں۔ ہماری زندگی اُس کی زندگی ہے وہ ہمارے اس قدر قریب ہے کہ ہمارے اور
اُس کے درمیان کوئی فاصلہ ہی نہیں وہ ہمارے حواس سے بھی زیادہ نزدیک، اور ہمارے خیالات سے بھی زیادہ
قریب ہے اُسی کی بدولت تو ہم حواس سے کام لیتے ہیں اُسی کی روشنی میں تو ہمارے خیالات پیدا ہوتے ہیں، کسی چیز کو
دیکھنے سے پہلے ہم اُسے دیکھتے ہیں، یہ جو میرے سامنے دیوار کھڑی ہے اس کو دیکھنے سے پہلے یعنی اس کا بحیثیت دیوار کے
اِدراک کرنے سے پیشتر مجھے اُس ایک حقیقت کو دیکھنا ہوتا ہے جس میں یہ دیوار موجود ہے، وہی تو ہر شے کی اصل ہے
وہی تو ہر فعل کا واحد فاعل ہے۔ آخر کون کس کو دیکھتا ہے؟ وہی تو ہر دل میں بس رہا ہے، اجسام بدلتے رہتے ہیں
ذہن اور دماغ میں تبدیلی آتی رہتی ہے خوشی اور غمی، نیکی اور برائی آنے جانے کی چیزیں ہیں، زمانہ گذرتا رہتا ہے
دن اور سال بیت جاتے ہیں، جنم اور مرن کا سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن "وہ" کبھی نہیں مرتا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں
آتی "وہ" لازوال ہے زندۂ جاوید ہے "میں ہوں" "میں ہوں" کی واحد آواز ہمیشہ برقرار رہتی ہے، اس میں تغیر نہیں
آتا۔ اُسی میں بس کر اور اُسی کے دم سے ہمیں عالمِ شہود کا شعور اور ادراک ہوتا ہے، ہماری تابِ نظر، طاقت احساس
اور قوتِ فکر سب اُسی ہستی کا پرتو ہیں ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں تو اُس کی آنکھوں سے ہمارے کان سُنتے ہیں تو اُس کے
کانوں سے، ہمارے ہاتھ پاؤں اُسی کے ہاتھ پاؤں ہیں اور ہمارے دل و دماغ اُسی کے دل و دماغ ہیں اُس کی
ہستی ہی سے ہماری ہستی قائم ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ درُست ہو گا کہ ہستی ہے تو بس اُسی وجودِ واحد کی یہ "میں" کا احساس
جسے ہم غلطی سے اپنی محدود انفرادی ہستی کی بنیاد سمجھ لیتے ہیں۔ دراصل ہم سب میں موجود ہے مجھ میں بھی اُسی "میں" کا
احساس ہے جس کا آپ سب کو آپ کا "میں" اور میرا "میں" ایک ہے یہی واحد احساسِ خودی سب میں ہے انسان

---

[1] I and my Father are One.

[2] Father, just as I am one with Thee so make them all one with me.

www.taemeernews.com

میں بھی اور حیوانوں میں بھی فرشتوں کی ہستی بھی اُسی ایک احساسِ خودی سے قائم ہے اور زندگی کی کمترین صورت میں بھی اُسی کا جلوہ ہے، صوفی اور قاتل کے "میں" میں فرق نہیں۔ غریب کا "میں" امیر کے "میں" سے مختلف نہیں، مرد اور عورت کا احساسِ ہستی ایک ہے بچے اور بوڑھے میں وہی "میں" محرکِ حیات ہے، ہستی ہے تو اُسی ایک کی ذہنی "میں" بن کر سب میں جلوہ گر ہے۔ اموبہ[1] سے لے کر فرشتے تک ہر رُوح میں وہی موجود ہے ہر طرف سے ہر گھڑی یہ آواز آرہی ہے "میں وہ ہوں۔ میں وہ ہوں"[2] جب ہم اس آواز کو سمجھ جائیں گے، جب ہم "میں وہ ہوں" کا مطلب ذہن نشین کرلیں گے تو کائنات کا راز ہم پر کھُل جائے گا۔ اس کے بعد کوئی چیز ہم سے چھپی نہیں رہے گی۔ ہم اُس حقیقت کو پالینگے جس کی تلاش میں دنیا کے تمام مذہب ظہور پذیر ہوئے اور جس کو پانے کی تلقین وہ آج بھی کر رہے ہیں اس حقیقت کو پاکر ہی ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب کے نقطۂ نظر سے مادّی علوم کو کیوں ثانوی حیثیت دی گئی ہے، سچا علم تو وہی ہے جو ہمیں خدا اور خدا کی کائنات سے ایک کردے ؛

---

[1] Amoeba.   [2] "I am He, I am He"

www.taemeernews.com

مذہب کی ضرورت

یہ لیکچر بمقام لندن دیا گیا

نسلِ انسانی کی تقدیر کے بنانے میں جو قوتیں بیشتر کام کرتی رہی ہیں ۔ اور آج بھی جن کا یہ عمل جاری ہے، ان میں اس قوت سے زیادہ عظیم یقیناً اور کوئی قوت نہیں جس کے ظہور کا نام مذہب قرار دیا گیا ہے۔ تمام سماجی معنوں کے پس پشت کہیں نہ کہیں یہ حیرت انگیز قوت کارفرما ہوئی ہے۔ بنی نوع انسان میں باہمی تعلقات کے زبردست جذبے کا ماخذ بھی یہی مذہب کی طاقت ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اکثر و بیشتر مذہب کا رشتہ ۔ نسلی جغرافیائی قومی اور خاندانی رشتوں کے بمقابلہ زیادہ پائیدار ثابت ہوا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہم معبود و ہم مذہب لوگ بھائیوں اور خاندانی رشتہ داروں سے بھی کہیں زیادہ آپس میں مِل جُل کر رہتے آئے ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے رہے ہیں، اس لئے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مذہب کی ابتدا کیسے ہوئی اور کہاں سے ہوئی ؟ جو قدیم مذہب آج بھی جاری ہیں اُن کا دعوےٰ تو یہ ہے کہ وہ سب مافوق الفطرت ہیں، الہامی اور غیبی ہیں ۔ اُن کی پیدائش انسانی دماغ سے نہیں ہوئی ۔ بلکہ اُن کا ماخذ انسانی دماغ سے باہر کسی اور جگہ ہے ۔ اس خیال سے گزر کر مذہب کے بارے میں بہت کچھ تحقیقات کی گئی ہے ۔ زمانۂ حال کے عالموں میں دو نظریوں کو کسی قدر مقبولیت حاصل ہوئی ہے ، ایک نظریہ کی رُو سے مذاہب کی ابتدا اس خیال سے ہوئی کہ مرنے کے بعد بھی کوئی چیز یعنی رُوح باقی رہتی ہے ۔ دوسرے نظریئے کے مطابق حِس و محدودیت کے احساس کے دائرے سے نکل کر لامحدودیت اور آزادی کے خیال کی ارتقا ہی کا نام مذہب ہے ۔ محققوں کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ مذہبی خیالات کا آغاز مرحوم بزرگوں کی

051 www.taemeernews.com

پرستش سے ہوا۔ دوسری جماعت کی رائے کے مطابق مذہب کی ابتدا قدرت کی غیر مرئی طاقتوں کو شخصی وجود دینے سے ہوئی۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے مرحوم بزرگوں کو بھولنا نہیں چاہتا، وہ اپنے بزرگوں کی یادگار قائم رکھنا چاہتا ہے اس کا دل یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ ان کی جسمانی فنا کے بعد اُن کی ہستی بالکل نابود ہو جاتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ موت کے بعد بھی کوئی چیز (روح) ہے جو زندہ رہتی ہے اور اُن کی انفرادیت برقرار رکھتی ہے اس لئے وہ اُن سے اپنا تعلق قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے وہ اُن کے لئے خوراک مہیا کرنا چاہتا ہے یا کسی اور طریقے سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے جس سے آبا و اجداد کی پرستش کا رواج جاری ہوتا ہے اور اسی عقیدے سے اس چیز کی نشوونما ہوئی جسے ہم مذہب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مصر۔ بابل۔ چین نیز امریکہ اور دوسرے ملکوں کی بعض قوموں کے قدیم مذاہب کا مطالعہ کرنے سے نہایت واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ بزرگانِ رفتہ کی اسی پرستش سے مذہب کی ابتدا ہوئی مصر کے قدیم باشندوں کا اولین عقیدہ رُوح کے بارے میں یہ تھا کہ رُوح جسم ہی کا ایک نقشِ ثانی[۱] ہوتی ہے۔ ہر انسان کے جسم میں بالکل اسی سے ملتا جلتا ایک اور بھی وجود ہوتا ہے اور جب کوئی انسان مرتا ہے تو یہ دوگانہ[۲] وجود جسم سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی ہستی برقرار رہتی ہے لیکن اُن کے خیال کے مطابق اس دوگانہ وجود کی ہستی اتنے ہی عرصے تک قائم رہتی ہے جتنے عرصے تک مُردہ جسم صحیح وسالم طور پر برقرار رہتا ہے اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ مصر میں اس بات کی خاص احتیاط رکھی جاتی تھی کہ متوفی کے جسم کو کوئی گزند نہ پہونچنے پائے۔ مصر والے ارواحِ رفتہ کے جسم کو محفوظ رکھنے کے لئے بڑے بڑے ہرم[۳] بنواتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر خارجی جسم کو کسی طرح کی گزند پہونچے گی تو اس کا اثر دوگانہ وجود پر بھی پڑے گا اور اس کو بھی چوٹ پہونچے گی۔ ظاہر ہے کہ اُن کا یہ خیال اور یہ عمل بزرگانِ رفتہ کی پرستش ہی کی ایک دوسری شکل ہے۔ قدیم اہلِ بابل میں بھی دوگانہ وجود کا عقیدہ پایا جاتا ہے لیکن ان میں اِس کی صورت کسی قدر مختلف ہے۔ اُن کے یہاں محبت کی جگہ خوف کام کرتا ہے مشفق اور مہربان رُوحوں کے بجائے بھوت پریت کا خیال پایا جاتا ہے۔ اُس کے مطابق دوگانہ وجود کی حس تو بالکل رخصت ہو جاتی ہے۔ خود اپنے بچوں اور اپنی بی بی کی محبت تک اِس دوگانہ وجود کے دل سے عنقا ہو جاتی ہے۔ یہ رُوحیں زندوں کو ڈراتی ہیں اور انھیں کھانے

---

[۱] اور [۲] Double. [۳] Pyramids.

052 www.taemeernews.com

پینے کی چیزیں مہیا کرنے پر مجبور کرتی ہیں یا اور مختلف طریقوں سے اُن سے اپنی خدمت کراتی ہیں۔ قدیم ہندوؤں میں بھی بزرگانِ رفتہ کی پرستش کا رواج پایا جاتا ہے۔ چینیوں کے مذہب کی تو بنیاد ہی بزرگانِ رفتہ کی عبادت پر رکھی گئی ہے۔ اس وسیع مُلک کے طول وعرض میں آج بھی ہر گھر میں آبا واجداد کی پرستش ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چین میں مذہب کبھی مرحوم بزرگوں کی عبادت سے آگے بڑھا ہی نہیں اس کی ارتقا بس اسی مقام پر آکر رُک گئی۔ اس لئے زمانۂ حال میں بھی اُن کا مذہب محض اسی بات پر محدود و موقوف ہے۔ ان مثالوں سے اُن لوگوں کے نظریے کا ایک بہت اچھا جواز مہیا ہو جاتا ہے جن کا خیال یہ ہے کہ مذہب کی ابتدا ارواحِ رفتہ کی عبادت سے ہوتی ہے۔ لیکن دوسری طرف ایسے بھی علما ہیں جو آریوں کے قدیم ادب سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کی ابتدا پرکرتی پُوجن یعنی قدرت کی پرستش سے ہوئی ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں بھی ہر جگہ اُن بزرگانِ رفتہ کی پرستش کے رواج کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواج بعد میں پیدا ہوا کیوں کہ جو قدیم ترین یادداشتیں[ل] اب تک محفوظ ہیں۔ اُن میں اس رواج کا ذکر کہیں نہیں پایا جاتا ہے۔ آریہ قوم کا قدیم ترین گرنتھ رگ وید سنگھتا ہے۔ لیکن اس سنگھتا میں کہیں اس رواج کا نشان تک نہیں ملتا۔ ہاں دورِ حاضرہ کے عالموں کی معلومات کے مطابق رگ وید سنگھتا میں پرستشِ قدرت کی مثالیں ضرور ملتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا دماغ مناظرِ قدرت کے پسِ پردہ حقیقت کا متلاشی ہے اور اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ یہ علی الصباح نُور کے تڑکے کا سماں۔ یہ شام کا دل فریب منظر۔ فطرت کے حسن وجمال کی یہ دلکش صورتیں اور اس کے برعکس یہ تلاطم وطوفان کی کیفیت۔ فطرت کی یہ عظیم اور ہیبت ناک قوتیں ایسی ہی تمام چیزیں انسانی دماغ پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اُسے اپنی نوعیت کو سمجھنے کے لئے متحرک کرتی ہیں۔ انسان ان مظاہرات سے گزر کر حقیقت تک پہونچ جانا چاہتا ہے۔ اسی کوشش کے دوران میں مناظرِ فطرت کے پیچھے قوتوں کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ پھر انسانی تخیل ان مختلف قوتوں کو مجسم کرتا ہے۔ اُن کو شعور بخشتا ہے اور انھیں شخصی صفات سے منسوب کر کے جیتے جاگتے حسین وجمیل یا مہیب اور دہشت ناک دیوی دیوتا پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ غیر شخصی لامحدودیت کا تصور بھی قائم رکھتا ہے۔ یہ دیوی دیوتا بیک وقت انفرادی شخصیت کے مالک بھی ہوتے ہیں۔ اور اس سے بالا بھی اس طرح انسانی تلاشِ حق

ل Records.

053 www.taemeernews.com

مختلف تصورات اختیار کرلیتی ہے۔خواہ یہ تصورات شخصی ہوں خواہ غیر شخصی۔یہی حال قدیم زمانے کے یونانیوں کا بھی ہے۔اُن کی تمام دیو مالا محض پرستشِ فطرت ہی کی ایک مجسّم صورت ہے۔اسی طرح دوسری آریائی نسلوں مثلاً جرمنی اور اسکینڈے نیویا کے پُرانے لوگوں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔ گویا اِن اطراف میں اِس نظریئے کی حمایت نہایت مضبوطی کے ساتھ ہوتی ہے کہ مذہب کی ابتدا فطرت کی قوتوں کی تجسیم و تشکیل سے ہوئی۔

حالانکہ بظاہر یہ دونوں نظریئے ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان میں باہمی موافقت و مطابقت کی صورت یوں پیدا ہوسکتی ہے کہ مذہب کی اصل ماہیئت تعینات حواسی سے اوپر اُٹھنے کی جدّوجہد کو قرار دیا جائے یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آخر انسان اپنے باپ دادا کی رُوحوں سے مدد کا متمنی کیوں ہے یا وہ قدرت کی مختلف قوتوں کو مجسّم کرکے اُن کی پُوجا کیوں کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حواس کا دائرہ عمل محدود اور تنگ ہے۔ انسان کی فطرت بھی یہی ہے کہ وہ ہر قسم کی بندش اور محدودیت سے باہر نکلنا چاہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ایک جھلک اس چیز کی دیکھنا چاہتا ہے جو جسم کے فنا ہونے کے بعد باقی رہ جاتی ہے یا وہ اس طاقت کے راز کو سمجھنا چاہتا ہے جو فطرت کے اِس مظاہرۂ عظیم کے پسِ پشت کام کررہی ہے۔بہر حال اِن دونوں حالتوں میں وہ یقیناً حواس کی قید سے آزاد ہوکر بلند ترین منزل پر پہونچنا چاہتا ہے وہ اس قید میں مطمئن نہیں رہ سکتا اور اس سے باہر نکلنا چاہتا ہے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ انسان حواس کی حد میں قانع اور مطمئن کیوں نہیں رہتا۔اِس سوال کا کوئی پیچیدہ اور پُراسرار جواب ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ہم خود اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک قدرتی امر ہے۔اِس سے زیادہ حیرت انگیز بات اور کیا ہمارے تجربے میں آسکتی ہے کہ جب ہم سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور ہمارے جسم بظاہر بے جان پڑے ہوئے نظر آتے ہیں تو بھی ہمارا دماغ اپنا پُرپیچ کام سرانجام دیے جاتا ہے۔ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بچّے اور غیر تربیت یافتہ لوگ خواب اور بیداری کے تجربات میں تمیز نہیں کرسکتے۔یہ دیکھ کر انسان قدرتی طور پر یہ سوچنے لگتا ہے کہ آخر خواب کی حالت میں دماغ کا کام جاری رہتا ہے تو کیا اِس جسم کی فنا کے بعد بھی اُس کی کارروائی جاری رہ سکتی ہے دوسرے الفاظ میں کیا موت کے بعد بھی زندگی ممکن ہے؟ مذہب اور روحانیت کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے بسینوں (خوابوں) پر غور و خوض کرتے کرتے انسان کے دِل میں حیاتِ جاوِدانی کا خیال جنم لیتا ہے اس خیال

ا Mythology   ۲ Scandanavia

054 www.taemeernews.com

سے کبھی مافوق الفطرت ہستی کا تصوّر پیدا ہوتا ہے اور اسی سے آبا و اجداد کی رُوحوں کے وجود اور مناظر قدرت کی مجسّم قوتوں (دیوی دیوتاؤں) کے تصوّر کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اسی کے توسّل سے مذہب اور رُوحانیت کے متعلق بلند ترین نظریئے انسانی دماغ کی گرفت میں آجاتے ہیں اور آخر آدمی یقین اور ایمان کی منزل تک پہونچ جاتا ہے۔ میرے خیال میں مذہب کی ابتدا کو واضح طور پر اسی طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہ وضاحت دوسری وضاحتوں پر حاوی بھی ہے اور ان سے زیادہ معقول بھی ہے یہ اور بات ہے کہ بعد کی تحقیقات سے اکثر لوگ اس نتیجے پر پہونچے کہ جو کچھ وہ خواب میں دیکھتے ہیں اس کی تصدیق حالتِ بیداری سے نہیں ہوتی۔ اور یہ کہ سپنوں (خوابوں) میں انسان کوئی نئے اور تازہ تجربے نہیں کرتا۔ حالتِ خواب کے مدرکات و مشاہدات تو گزشتہ محسوسات کا عکس محض ہوتے ہیں۔ اِس حالت میں بس اُنھیں تجربات کا اعادہ ہوتا ہے جو حالتِ بیداری میں ہوچکے ہوتے ہیں۔

لیکن پیشتر اس کے کہ دُنیا کے خواب کے متعلق اس قسم کی معلومات حاصل ہوتیں۔ خوابوں پر غور کرتے کرتے انسانی تحقیق و تلاش کا آغاز ہوچکا تھا۔ یہ تلاش اندرونی تھی۔ انسان اپنے دل و دماغ[لے] کی مختلف حالتوں کا نہایت گہرا مطالعہ کرتا رہا اور اس نے بیداری و خواب ان دونوں حالتوں سے بھی زیادہ بلند مدارج دریافت کئے۔ اِن مقامات کا ذکر دُنیا کے ہر مذہب میں آتا ہے کوئی اس حالت کو آنند یا مستی کہتا ہے اور کوئی اِسے الہام و القا کے نام سے پکارتا ہے۔ تمام منظم مذاہب کے بانیوں، پیغمبروں اور رسُولوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُن پر ایسی ایسی دماغی کیفیات طاری ہوا کرتی تھیں جنھیں نہ بیداری کہہ سکتے ہیں نہ خواب۔ ایسی حالت میں وہ حقائق کے ایک نئے سلسلے کا مشاہدہ بچشمِ خود کرتے ہیں۔ یہ رُوحانی حقیقتیں محض خواب و خیال اور تصورات پر مبنی نہیں بلکہ مجسّم ہوکر اُن کے روبرو آجاتی ہیں اور اُن کا شعور و احساس اُنھیں پوری شدّت سے ہوتا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ جاگتی حالت میں اپنے گرد و پیش رُونما ہونے والے واقعات کا احساس ہم لوگوں کو جس شدّت سے ہوتا ہے۔ اِس سے کہیں زیادہ شدّت اِن کیفیات کے احساس میں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہندو مذہب کو لے لیجئے۔ ہندوؤں کی متبرک و مقدس کتابیں وید ہیں۔ ویدوں کے مصنف وہ خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ جنھیں رُوحانی حقائق کا ذاتی اور عملی تجربہ تھا اور جنھیں ہم رشی[کلے] کہتے ہیں سنسکرت

[لے] Mind. [کلے] Rishi.

055 www.taemeernews.com

زبان میں لفظ رشی کے صحیح معنی ہیں وہ روشن ضمیر بزرگ جن پر ویدک منتروں کے ابواب معانی[51] ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اِن بزرگوں کی آنکھوں کے سامنے وہ حقائق مجسّم ہو کر جلوہ گر ہوتے ہیں جن کا بیان ویدوں کی منتروں[52] میں آیا ہے۔ خود اِن بزرگوں نے علانیہ کہا ہے کہ انھیں کچھ مافوق الفطر حقائق کا عملی اور ذاتی تجربہ ہوا ہے وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اِن حقائق کا شدت سے شعور و احساس کیا ہے (حالانکہ ماورا الحِس تجربات کے بیان کے لئے شعور و احساس کے الفاظ ناکافی ہیں) اور انھیں تجرباتی واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ اِسی حقیقت کا اعلان دوسرے مذاہب مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں کے رہنماؤں نے بھی کیا ہے۔ آپ میرے اس بیان پر اعتراض کر سکتے ہیں کہ یہ کلیّہ بُودھ مت پر عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ بُودھ تو خُدا یا رُوح کی ہستی کو مانتے ہی نہیں۔ اس لئے کم ازکم اُن کے مذہب کی بنیاد فوق الحواسی حقیقت کے شعور و ادراک پر نہیں رکھی گئی۔ بظاہر یہ اعتراض درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سوچا جائے تو جس لازوال اخلاقی قانون کا پرچار بُدھ مت کرتا ہے اس کے جواز میں کوئی دلیل نہیں پیش کی گئی۔ بلکہ خود بودھوں کے اعتقاد کے مطابق مہاتما بُدھ کو اس دوامی اخلاقی قانون کا پتہ فوق الحواس حالت ہی میں چلا۔ آپ میں سے جن حضرات نے مہاتما بُدھ کے اس مختصر سوانح حیات کا مطالعہ کیا ہے جو لائٹ آف ایشیا[53] ایسی حسین و جمیل نظم میں بیان کی گئی ہے۔ ان کو یاد ہوگا کہ اس میں بھگوان بدھ کو برگد کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے حتےٰ کہ بیٹھے بیٹھے اُن پر استغراق یا سمادھی کی کیفیت طاری ہوگئی ان کی تمام تعلیمات ان کی اسی استغراقی کیفیت کے تحت صادر ہوئیں۔ اُن میں منطق اور دلائل نیز ذہنی غور و فکر کو ذرا بھی دخل نہیں تھا۔ مختصر یہ کہ دُنیا کے سب مذاہب کا یہ زبردست دعوےٰ ہے کہ بعض لمحوں میں انسانی دماغ محض حواس کے تعینات ہی سے نہیں گزر جاتا، بلکہ علّت و دلیل کی حدوں کو بھی پار کر جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کے سامنے ایسے حقائق پیش ہوتے ہیں جن کا علم ہم کو نہ کبھی حواس کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور نہ عقل و دلیل کی مدد سے۔ دُنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد انھیں حقائق پر قائم ہے۔ ہمیں یقیناً اِن حقائق کی جانچ پڑتال کرنے اور ان کو عقل و دلیل کی کسوٹی پر کسنے کا پُورا حق حاصل ہے لیکن یہ بھی امرِ مسلّمہ ہے کہ دُنیا کا ہر مذہب اِس بات کا دعوے دار ہے کہ اِنسانی دماغ میں حواس اور عقل کی حدوں کو پار کرنے کی عجیب و غریب صلاحیت ہوتی ہے۔ اور اسی

---

۵۱ Seer of mantras. ۵۲ Vedic hymns.

۵۳ Light of Asia.

056 www.taemeernews.com

صلاحیت کو سب مذاہب ایک امرِ واقعی قرار دیتے ہیں۔

یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ دعوے کہاں تک صحیح ہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ سب مذہبوں میں ایک خصوصیت مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ فوق الحواسی حقائق جن کا پتہ سب مذہب دیتے ہیں۔ غیر مرئی ہیں[1] علم طبیعات کی دریافتوں کی طرح ٹھوس اور مرئی نہیں بلکہ اُن تمام بڑے بڑے مذاہب میں جن کا فلسفہ منظم اور تفصیلی (detailed) ہے یہ حقائق خالص ترین وحدتِ مطلق کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اِس (فوق الحواس) وحدتِ مطلق کا شعور و ادراک کرنے کے لئے اس کو مختلف نام[2] دیئے گئے ہیں جو حقیقت صفات سے بالا ہے اُسے مختلف صفات سے موصوف کیا ہے۔ کہیں اسے حاضرِ کُل نراکار کہا ہے کہیں اسے غیر مرئی شخص کی صورت دے کر خُدا کا لقب دیا ہے کسی نے اس کو لازوال اخلاقی قانون کہہ کر بیان کیا تو کسی نے اُسے ہستی کا وہ جوہر حقیقی بتایا جس کے دیدار کی کسی کو تاب نہیں۔

بہرحال سب مذہبوں کی بنیاد ان غیر مرئی فوق الحواس حقائق ہی پر قائم کی گئی ہے۔ زمانۂ حال میں کچھ لوگوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ مذہب کی مافوق الحواس حقیقتوں کا سہارا نہ لیا جائے بلکہ عقل و شعور کی حدود میں رہ کر مذہب کی اشاعت کی جائے۔ لیکن ایسے لوگوں کو کسی نہ کسی صورت میں پُرانے بزرگوں کے نظریۂ وحدتِ مطلق کو اپنانا پڑتا ہے۔ اِس کے بغیر اُن کا کام چل ہی نہیں سکتا ہاں اس کے نام ضرور بدل جاتے ہیں جس چیز کو پُرانے لوگ "خُدا" کہتے تھے۔ اُسے آج اخلاقی قانون[3] یا وحدتِ عینی کہہ لیتے ہیں اور اس طرح عقل کی حدود میں رہنے کا دعوے کرنے والے بھی ان حدود سے باہر قدم رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس عقل اور حواس سے اوپر اُٹھ جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ کائنات کے پس پُشت ایک معیاری وحدت[4]

---

[1] The facts of religion are abstractions.

[2] They take the purest form of Unit Abstraction either as an Abstracted Presence or as an Omnipotent Being or an Abstract Personality called God, as a Moral Law or an Abstract Essence underlying all existence.

[3] Moral Law.

[4] Ideal Unity Absolute

057 www.taemeernews.com

مُطلق ہے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس حقیقت کو مختلف مذاہب کس صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اُسے شخصی خُدا کہتے ہیں یا غیر شخصی وجود یا اخلاقی قانون یا جوہر حقیقی یا غیر مرئی حاضر و ناظر ہستی[1] اصل بات تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک معیار رکھ دیا گیا ہے اور اس معیار تک پہنچنے کے لیے جد وجہد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ حقیقی مذہب یہی ہے۔ ہم نے آج تک کسی آدرش پرش (معیاری انسان[2]) کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تاہم اسکے وجود پر ایمان لاکر اس کے کمال کو خود حاصل کرنا ہی سچا مذہب ہے، اس حقیقت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ کسی آدرش یا معیار کو پیش نظر رکھے بغیر ہم کسی قسم کی ترقی نہیں کرسکتے۔ اپنے نصب العین تک پہونچنے کی جدوجہد ہی ہماری زندگی ہے۔ یہ تو ہمارے ذاتی مشاہدے کی بات ہے کہ ہر انسان لامحدود طاقت اور بے پایاں مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے اپنی اپنی بساط کے مطابق ہر شخص طاقت اور مسرت ابدی کے نصب العین تک پہونچنے کے لئے لگاتار کوشش کررہا ہے۔ دُنیا کا تمام کاروبار اسی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ ہمارے گرد وپیش کی یہ تمام سرگرمی اور مصروفیت اِسی جدوجہد سے وجود میں آئی ہے اور اسی کی بدولت انسان بڑے بڑے کام سرانجام دے پاتا ہے۔ لیکن زندگی بھر کی لگاتار محنت اور مشقت کو دیکھ کر چند سوچ سمجھ رکھنے والے آدمی جلد ہی اِس نتیجے پر پہونچ جاتے ہیں کہ جس لامحدود طاقت اور بے پایاں مسرت (پُورن شکتی اور آنند) کی تلاش میں وہ سرگرداں ہیں وہ حواس کے ذریعہ حاصل ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ حواس اور جسم بذاتِ خود محدود ہیں اور محدود کے ذریعہ غیر محدود کا ظہور ممکن نہیں۔ یہ دیکھ کر انسان محدود ذرائع سے لامحدود تک پہنچنے کی کوشش ترک کردیتا ہے۔ ترک اخلاقیات کا یہی پس منظر ہے۔ اسی سے مذہب اور روحانیت کی ابتدا ہوتی ہے۔ دُنیا میں کوئی اخلاقی اور مذہبی قانون ایسا نہیں جس کی بنیاد ترک پر نہ رکھی گئی ہو، آخر تمام اخلاق کا لُب لباب یہی تو ہے کہ "میں نہیں" "تو" ہے اس کا اُصول خود پرستی اور خود غرضی کو مٹاتا ہے اور اسی کا نام ہے ترک۔ اخلاق کا تقاضا ہے کہ آپ دوسروں کو اپنے سے زیادہ اہمیت دیں، مقدّم سمجھیں۔ اُن کے مفاد کو اپنی اغراض پر ترجیح دیں۔ حواس کی زندگی انانیت اور خود غرضی کی زندگی ہے۔ حواس کا تقاضا ہے "پہلے میں" اور بعدہٗ کوئی اور" اخلاق ہمیشہ "پہلے" آپ" کا سبق دیتا ہے۔ اخلاق کے تمام ضابطے اور قانون ترک پر مبنی ہیں۔

---

[1] Personal God, Impersonal Being or a Moral law or an Essence or a Presence.

[2] Ideal human being

www.taemeernews.com

اخلاق ترک وایثار ہی کا دوسرا نام ہے جس انفرادیت کو حواس مادّی سطح پر تعمیر کرتے ہیں۔ اُس کا انہدام ہی اخلاق کی تعلیم ہے۔ کیونکہ محدود مادّی سطح پر غیر محدود ظاہر ہو ہی نہیں سکتا حتیٰ کہ اس کا قیاس تک ناممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ لامحدودیت کے شدید احساس اور اظہار کے متلاشی انسان کو مادّی سطح سے اوپر اُٹھ کر دوسرے بلند طبقوں میں جانا پڑتا ہے۔ اِنسان اونچے اُٹھنے کے مختلف طریقوں کو دریافت کرتا ہے اور اسی تلاش وتجسس سے اخلاق کے مختلف قوانین کی تخلیق وتشکیل ہوتی ہے۔ ان سب باتوں کی تہ میں بس ایک "ترک خودی" (مرگِ انانیت) کا ہی مرکزی خیال مخفی ہوتا ہے۔ یہی "خودکشی" یعنی انفرادیت کی مکمل تخریب ہی اخلاقیات کا نصب العین ہے۔ عام طور پر لوگ ایسی باتیں سُن کر حیران رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ترک خودی کو خارج از امکان چیز سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کسی سے کہیں کہ اپنے انفرادی وجود کو بھُول جاؤ تو وہ حیرت سے آپ کا منہ تکنے لگے گا۔ لوگ اپنی محدود انفرادیت کے مٹ جانے کے خیال ہی سے گھبرا جاتے ہیں۔ انھیں تو مرگِ خودی کے خیال ہی سے خوف محسوس ہونے لگتا ہے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ یہی لوگ سوچے سمجھے بغیر بڑے زور وشور سے اعلان کرتے ہیں کہ اخلاق کے بلند ترین آدرش صحیح اور قابلِ عمل ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اخلاقیات کی اصل غائت خودی کی تخریب ہے نہ کہ تعمیر۔

سچ تو یہ ہے کہ جب تک اس ہستی کا اقرار نہ کیا جائے جسے مافوق الفطرت وجود کہتے ہیں اور جسے میں فوق الشعور کا احساس ومشاہدہ کہتا ہوں۔ اخلاقیات کی تخلیق کا اس وقت تک سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ محض افادیت کے معیاروں سے نہ تو انسانوں کے باہمی روابط کی وضاحت ممکن ہے۔ اور نہ کوئی اخلاقی قانون بنائے جاسکتے ہیں۔ افادیت بھی تو آخر انسانی خودغرضی کی ہی ایک صورت ہے۔ اس پر اخلاق کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ کیونکہ ہر شخص افادیت کے معنی اپنے اپنے نقطۂ نظر سے نکال لیتا ہے در اصل اخلاق کے پسِ پشت کوئی اور ہی طاقت کارفرما ہے۔ سچے اخلاقی معیاروں کی تفسیر ہر شخص اپنی مرضی کے مُطابق نہیں کرسکتا۔ اور یہ اعلیٰ معیار فوق الشعور لامحدودیت ہی سے منسوب ہیں۔ اخلاقی نصب العین مقرر ہی اس حالت میں ہوتے ہیں جب اِنسان لامحدودیت تک پہونچنے کے لئے جدوجہد کرنے لگتا ہے۔ افادیت[۵۵] پسندوں کا کہنا ہے

---

۵۵ Utilitarians.

059 www.taemeernews.com

کہ کسی فوق الحس وجود کے تصور کی ضرورت ہی نہیں۔ کسی لامحدود ہستی تک پہونچنے کی کوشش کرنا دائرۂ عمل سے باہر ہے اور ایسی باتوں میں پڑنا فضول ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ایک ہی سانس میں ہمیں اخلاقیات کی تعلیم بھی دیتے ہیں ہم سے سماج کی بھلائی کے کام کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے میرا یہ سوال ہے کہ آخر میں فلاح عام کے کام کیوں کروں؟ قوم اور ملت کی بہبودی کا خیال کیوں کروں؟ دوسروں کے لئے قربانی حاصل کرنے سے آخر حاصل کیا ہے؟ ان کو کیوں فائدہ پہونچاؤں کیوں ان کے کام آؤں۔ ان کو فائدے کے بجائے نقصان کیوں نہ پہنچاؤں۔ ان کو دُکھ کیوں نہ دوں۔ اذیت کیوں نہ دوں؟ اگر بنی نوعِ انسان کا مقصد ذاتی خواہش حاصل کرنا ہے تو میں فقط اپنی خوشی کے لئے کیوں نہ جیوں۔ اپنی خواہش پر دوسروں کی زندگی کیوں نہ قربان کردوں کوئی جئے یا مرے۔ میری بلا سے۔ اگر مجھے کسی کو دُکھ دے کر خوشی ملتی ہے تو میں اس کو عذاب میں کیوں نہ مبتلا کردوں؟ اس کے لئے کلفت و آزار کا موجب کیوں نہ بنوں۔ کون مجھے ایسا کرنے سے باز رکھ سکتا ہے؟ افادیت پسندوں کے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں۔ اخلاقیاتی مسلک بذاتِ خود زندگی کا مقصد نہیں ہوسکتا البتہ کسی مقصدِ حیات کو حاصل کرنے کا ذریعہ ضرور ہو سکتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ وہ مقصد، وہ آدرش ہے کیا؟ اخلاقیات کی اہمیت تو ثانوی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا نصب العین کیا ہے جو ہماری قوتوں کو متحرک کرتا ہے اور جس کے بغیر اخلاقیات ایک بے جان فلسفہ بن کر رہ جاتی ہیں۔

افادیت کے خلاف دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اُس کا بنیادی فلسفہ بہت تنگ ہے اور یہ مروّجہ سماج کے رسم و رواج پر محدود ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ سماج اس حالت اور صورت میں ہمیشہ قائم اور برقرار رہے گا۔ جس چیز کو آج ہم سماج (سوسائٹی) کہتے ہیں۔ ہزاروں سال پیشتر اس کا کہیں وجود تک نہیں تھا اور ممکن ہے کہ آج سے ہزاروں سال بعد بھی اس کی شکل و صورت بالکل دُوسری ہو۔ انسانی ارتقا کا عمل ہمیشہ جاری ہے سماج کی تشکیل بھی اسی عمل کی ایک صورت ہے یہ صورت ہمیشہ بدلتی رہے گی۔ اس کو کسی صورت سے ثبات نہیں حاصل ہے اور کسی خاص دور کی سوسائٹی ہمیشہ کے لئے فطرت انسانی کا مکمل طور پر احاطہ نہیں کرسکتی۔ کل کے اخلاقی قانون آج لازمی طور پر عائد نہیں ہوسکتے سماج کے رسم و رواج اور اور افادیت پسندی کے اصول اور نظریئے زیادہ سے زیادہ موجودہ سماجی حالات میں عمل پذیر ہوسکتے ہیں اور بس اس کے بعد ان کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔ اس کے برعکس جن اخلاقیات اور جن اخلاقی ضوابط کا دارومدار مذہب اور رُوحانیت پر ہے ان کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہوتا ہے منفرد انسان مذہب کا موضوع ضرور ہے لیکن مذہب اور رُوحانیت انسان کی انفرادیت کو وُسعت دے کر اُس کا رشتہ وجودِ لامحدود کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ مذہب میں سماج کا ذکر بھی ضرور آتا ہے۔ اور سماج کے کاروبا

060 www.taemeernews.com

کے متعلق ہدایات بھی ملتی ہیں لیکن فقط اس حیثیت سے کہ سماج افراد کے مجموعے ہی کا نام ہے بنیادی طور پر مذہبی اخلاقیات کا اطلاق انسان اور خدا کے دوامی روابط پر ہوتا ہے اور چونکہ آدمی سماج کا جزو ہے۔ اس لئے اس کا اطلاق لازمًا سماج پر بھی ہوتا ہے۔ سماج کے مخصوص اور وقتی نظام سے ان بنیادی اصولوں میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ سماجی اخلاقیات کے لئے بھی روحانیت اور مذہب کی ضرورت ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انسان مذہب اور روحانیت کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ مادّی چیزوں کا خیال خواہ کتنا ہی مسرّت بخش کیوں نہ ہو۔ دیرپا نہیں ہوتا۔ انسانی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ مادّیات سے دل کی تسلی نہیں ہوتی۔ انسان کا دماغ ہر وقت مادّی چیزوں کے خیال سے خوش نہیں رہ سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ روحانی معاملات کی طرف زیادہ توجہ دینے سے اس دنیا میں ہمارے عملی روابط میں خلل واقع ہونے لگتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ہزاروں سال پہلے جب چین میں کنفیوشس[1] کا دَور دورہ تھا یہ کہا جاتا تھا "پہلے ہم اپنی اس دُنیا کی فکر کرلیں۔ اس کے بعد جب اس دنیا سے رشتۂ تعلق منقطع ہو جائے گا تو پھر دوسری دُنیا کی فکر کرلی جائے گی۔ اس دُنیا کی فکر کرنا اچھی بات ہے۔" میں مانتا ہوں کہ رُوحانی معاملات کی طرف بہت زیادہ توجہ دینے سے ہمارے عملی روابط پر اثر پڑ سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صرف دنیوی تعلقات ہی تک اپنی توجہ مبذول رکھنے سے ہمیں دُنیا و ما فیہا میں بہت کچھ نقصان پہونچ سکتا ہے۔ ہم مادّیت پرست ہو کر رہ جاتے ہیں اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کو سمجھنے اور ان سے محظوظ ہونے کی سعادت ہم سے چھن جاتی ہے۔ اِنسان کے لئے محض خارجی قدرت پر فتح حاصل کر لینے کے عمل کو منزلِ مقصود قرار دے لینا مناسب نہیں۔ اس کی منزلِ مقصود تو اس سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

اِنسان اسی وقت تک انسان کہلائے جانے کا حقدار ہے جب تک وہ مقام فطرت سے بلند ہونے کے لئے جدّوجہد کرتا ہے یہ فطرت باطنی بھی ہوتی ہے اور خارجی بھی۔ فطرت کے دائرے میں صرف وہی قانون داخل نہیں جن کا عمل مادّے کے جاندار یا بے جان ذرّات پر ہوتا ہے۔ اس میں تو وہ لطیف اندرونی جوہر بھی شامل ہے جو درحقیقت خارجی دُنیا کی بھی قوتِ محرکہ ہے خارجی فطرت کو قابو میں لانا ایک شاندار کارنامہ ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ شاندار کارنامہ یہ

---

[1] Confucius.

www.taemeernews.com

اپنی اندرونی فطرت کو مسخر و مسحور کر لینا اُن قوانین پر دسترس رکھنا بہت بڑی بات ہے۔ جن کے تحت یہ ستارے اور سیارے اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ لیکن اُن قوانین کا علم حاصل کر لینا تو اس سے بھی کہیں زیادہ عظیم کارنامہ ہے جن کے تحت بنی نوع انسان کے جذبات و احساسات اور ارادوں کو تحریک ہوتی ہے۔ یہ علم و آگہی کی نعمت مذہب کے حصے میں آئی ہے۔ انسان کے اس باطنی وجود پر فتح پانا۔ انسانی دماغ کے اندر جو لطیف ترین عمل جاری رہتا ہے۔ اس کے پوشیدہ نکات کو سمجھنا اور اُن حیرت انگیز رازوں کو جاننا مذہب ہی کا کام ہے۔ اُن رازوں کے جاننے کا کام بس مذہب ہی کے لئے مخصوص ہے اور اس میدان میں صرف کچھ اہلِ دل ہی قدم رکھتے ہیں۔ روحانیت ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ عام طور پر انسانی فطرت موٹی موٹی اور زود فہم مادی باتوں کو سمجھنے ہی پر اکتفا کرتی ہے۔ عام لوگوں کے ذہن میں لطیف تصورات نہیں سما سکتے۔ مثلاً عام لوگ شیر کی بہادری کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن شیر کی طاقت اور بہادری کا مظاہرہ ہزاروں میمنوں کی موت ہے۔ عام لوگ اسی قسم کے جسمانی طاقت کے مظاہرے سے مرعوب و محظوظ ہوتے ہیں۔ عوام کی سمجھ میں وہی بات آتی ہے جو خارجی ہو اور وہ جس سے لُطف اندوز ہو سکیں ہر سماج میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنکی نظر میں صرف حواس ہی احتظاز کا ذریعہ نہیں۔ وہ ان حواس سے گزر کر اس لطیف چیز کی تلاش کرتے ہیں جو سچی مسرت کا سرچشمہ ہے نشاط و سرور کا منبع ہے اور یہ تلاش محض سراب نہیں یہ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ ایسے برگزیدہ لوگوں کو مادیت سے کہیں زیادہ بلند اس حقیقت کی جھلک وقتاً فوقتاً نظر آجاتی ہے اور وہ اپنی جد و جہد اس وقت تک جاری رکھتے ہیں۔ جب تک اِس سے دو چار نہ ہو لیں۔ اگر ہم تاریخِ اقوام کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں یہ پتا چل جائے کہ جب کسی قوم میں اس قسم کے صاحبِ حال بزرگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو وہ قوم ترقی اور عروج کی منزلیں طے کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن جب اِن خدارسیدہ بزرگوں کی تعداد کم ہونے لگتی ہے اور لامحدودیت کے شیدائی اور تلاشِ حق کے دلدادہ اشخاص آہستہ آہستہ گھٹتے چلے جاتے ہیں تو اس قوم کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ افادیت پسندوں کی نظر میں تلاشِ حق کی کوششیں کتنی ہی لاحاصل اور فضول کیوں نہ ہوں میں تو ضرور کہوں گا کہ ہر قوم کی طاقت کا سرچشمہ اس کی روحانیت ہوتی ہے اور اس قوم کا خاتمہ اسی روز سے شروع ہو جاتا ہے جب اس کی یہ رُوحانیت زائل ہونے لگتی ہے اور اس پر مادیت غالب آنے لگتی ہے۔ اور اگر آپ کو میرے ساتھ مکمل اتفاق نہیں ہے تو چھوڑیئے اِس بات کو کہ مذہب ہمیں کیا کیا حقائق سکھاتا ہے اور کون کون سے رُوحانی معاملات کا پتا دیتا ہے۔ اس اطمینانِ قلب سے بھی قطع نظر کیجئے جو ہمیں مذہب اور روحانیت کی

062 www.taemeernews.com

بدولت نصیب ہوتا ہے۔ لیکن اس بات سے تو انکار ممکن نہیں کہ مذہب بحیثیت ایک سائنس کے مطالعہ اور تحقیقات کا ایک زبردست موضوع ہے۔ انسانی دماغ کو اپنی قوتوں کی آزمائش کے لئے مذہبی فلسفہ یعنی لامحدودیت تک پہونچنے کے طرزِ عمل سے بڑھ کر اور کیا موضوع دستیاب ہو سکتا ہے لامحدود تک پہونچنے کی یہ کوشش۔ اس کو اپنی گرفت میں لانے کی جدوجہد۔ حواس کی قید سے آزاد ہونے اور مادّے کی حدود سے باہر نکلنے کے لئے یہ جاں فشانی اور اپنی ذات کے رُوحانی پہلو کو آشکارا کرنے اور آب دگِل کے اس چھوٹے سے وجود میں مدغم کرنے کی شبانہ روز یہ کش مکش بذاتِ خود ایک ایسا نہایت عظیم اور شاندار کارنامہ ہے جس پر انسان فخر کر سکتا ہے۔ بعض اشخاص کے لئے کھانا پینا ہی زندگی کی سب سے بڑی لذّت ہے یہ لوگ بڑی خوشی سے کھائیں پئیں اور عیش کریں۔ ہمیں کوئی بھی حق نہیں کہ انھیں ایسا کرنے سے باز رکھیں۔ منع کریں۔ بعضوں کو دھن دولت اور دُنیا کی دوسری چیزوں کے حاصل کرنے ہی سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ لوگ جتنی دولت چاہیں کمائیں۔ اور جتنی چیزیں چاہیں یکجا کریں۔ ہم مانتے ہیں کہ ہمیں یہ کہنے کا کوئی اختیار نہیں کہ وہ ایسا نہ کریں لیکن دوسری طرف اُن لوگوں کو بھی تو کوئی حق نہیں کہ اگر کسی کو رُوحانی خیالات ہی سے بدرجہ انتہائی حظ حاصل ہوتا ہے تو اُس سے بار بار یہ کہتے پھریں کہ وہ ایک فضول اور بے مصرف کام میں لگا ہوا ہے اگر یہ لوگ رُوحانیت کے آدرش کو نہیں سمجھ سکتے تو کم ازکم اس شخص کو تو اپنے حال پر چھوڑ سکتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ اس کش مکش ہی سے انسان کی ارتقا ہوتی ہے اس روحانی جدوجہد سے ہی انسان محض حیوانوں کی سطح سے اونچا اُٹھ جاتا ہے صرف حواس سے تو حیوان ہمارے بمقابلہ کہیں زیادہ لُطف اُٹھا سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہماری سوسائٹی کا نظام جس قدر اسفل اور ادنےٰ ہوگا قطع نظر اس سے کہ اس کی ارتقا کا مرتبہ کس حد تک کم ہے۔ اتنا ہی دار و مدار ہماری راحت اور خوشی کا ہمارے حواس پر ہوگا۔ مثلاً کھانے پینے کا شوق عام آدمیوں کو ہوتا ہے لیکن پھر بھی بہت کم لوگ کھانے پینے کے معاملے میں اُس جوش اور شوق کا اظہار کرتے ہیں جس کا مظاہرہ کُتّے یا بھیڑیے کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کُتّے یا بھیڑیے کی تمام مسرّت حواس ہی پر مبنی ہے لیکن انسان کی مسرت کے ماخذ حواس کے علاوہ اس کے دل و دماغ بھی ہیں، ہر قوم میں ادنیٰ طبقے کے لوگوں کی خوشیاں لذاتِ حواس ہی سے وابستہ ہوتی ہیں۔ لیکن جو لوگ شائستہ اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں ان کو غور و فکر۔ فلسفہ اور فن و حکمت سے حظ حاصل ہوتا ہے۔ جیوں جیوں انسان کے احساس و شعور کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس میں زندگی کی لطیف چیزوں سے لُطف اُٹھانے کی اہلیت بڑھتی جاتی

063 www.taemeernews.com

ہے۔ اپنی لامحدود ذات کے خیال سے۔ رُوح کے تصور سے زیادہ وسیع موضوع اور کون ہوسکتا ہے اسی لئے نشاطِ رُوح کی کوئی حد نہیں۔ اس کا کوئی پایاں کار نہیں۔ رُوحانیت کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے۔ رُوحانی مسرت اور سرور سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں۔ اسی لئے اگر افادیت پسندوں کے اس نقطۂ نظر کو بھی مان لیا جائے کہ انسانی زندگی کا مدّعا حصولِ راحت ہے تو بھی انسان کو مذہبی خیالات کی نشو ونما کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بلند ترین مسرّت اور راحت اسی سے حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مذہب کا مطالعہ ہمارے لئے اشد ضروری ہے۔ اس کے بغیر زندگی بے معنی سی رہ جاتی ہے۔ علاوہ بریں روحانیت بذاتِ خود ایک زبردست طاقت ہے۔ اس کا اندازہ اس کے اثرات سے کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ زبردست ترین قوت ہے جس سے قلبِ انسانی میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور تعمیری کام کرنے کی طاقت ظہور میں آتی ہے۔ اس لحاظ سے آج تک دُنیا میں مذہب اور روحانیت سے بڑھ کر کوئی آدرش نہیں ہوا مذہبی جذبے سے جو طاقت پیدا ہوتی آئی ہے۔ اس سے زیادہ طاقت کسی اور خیال سے پیدا نہیں ہوئی۔ اور آج بھی مذہب کی یہ حالت بدستور قائم ہے۔ اس رُوحانی آدرش کی طاقتیں زائل نہیں ہوسکتیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ انسان محض افادیت پسندانہ نقطۂ خیال سے بھی نیک اور با اخلاق بن سکتا ہے۔ اس دُنیا میں متعدد ایسے بڑے آدمی ہوئے ہیں جن کی نیک خصلت۔ جن کے بلند اخلاق اور جن کی پاک سیرت کی تشکیل محض افادیت کے خیالات سے ہوئی۔ لیکن جن لوگوں نے دُنیا کو ہلا دیا ہے جنہوں نے عالمِ کائنات میں دُنیا میں اپنی مقناطیسی قوت کا خزانہ بھر دیا ہے جن کی رُوح رواں قوموں اور نسلوں میں کارفرما ہے جن کا حوصلہ اور جوش سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں انسانوں کے دِلوں کو اُبھارنے کا موجب ہوتا ہے۔ جن کی مشعلِ زندگی سے دوسروں میں رُوحانی شعلے روشن ہوتے ہیں ایسے لوگوں کی عظمت اور طاقت کی اصل ہمیشہ روحانی قوت ہی ہے اور اس قوتِ محرکہ کا سرچشمہ مذہب ہی۔ نوعِ انسان کو اس کی اصلی فطرت کا احساس دِلاتا ہے مذہب ہی کے ذریعہ انسان "ذات" کو سمجھتا ہے اور اپنی اس لامحدود اور لاانتہا قوّت کو بیدار کرتا ہے جو خود اس کی سرشت میں داخل ہے۔ مذہب ہی وہ معمار ہے جو انسان کے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور اسے نیکی خوبی اور عظمت کے زیوروں سے مزّین کرتا ہے۔ مذہب ہی امن و آشتی کی تعلیم دے کر انسان کو دوسروں کے لئے باعثِ تسکین و مسرت بناتا ہے۔ اسی سے اطمینانِ قلب کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس زبردست قوتِ محرکہ کا مطالعہ کیا جائے جس سے بنی نوعِ انسان کی یہ زندگی رواں دواں ہے۔ یاد رکھیئے کہ آج مذہب کے مطالعہ کے لئے پہلے وقتوں کی نسبت زیادہ

064 www.taemeernews.com

وسعتِ نظر کی ضرورت ہے۔ سچے مذہب میں تنگ محدود اور تفرقہ پرداز خیالات کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ مذہب میں فرقہ وارانہ۔ قبائلی یا قومی خیالات کو ذرا بھی دخل نہیں۔ یہ جو چھوٹے چھوٹے قبیلے یا خاص قومیں اپنا اپنا مذہب اور اپنا اپنا خُدا لئے پھرتی ہیں۔ یہ ہر قبیلے یا قوم کا دعوےٰ ہے کہ بس اُسی کا خدا سچا ہے۔ دوسرے سب مذہبوں کے خدا جھوٹے ہیں۔ بجائے خود ایک خیالی وہم ہے۔ مانا کہ پچھلے زمانے کے لوگ اس وہم میں مبتلا تھے لیکن آج اس قسم کے تمام خیالات کو ترک کر دینے ہی میں ہماری بھلائی ہے۔ انسانی دماغ میں جتنی جتنی کشادگی آتی جاتی ہے اُس کا روحانی دائرہ بھی اُتنا ہی زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اور اب تو وہ زمانہ آچکا ہے کہ انسان بات پیچھے کرتا ہے اور وہ پھیل پہلے جاتی ہے۔ ہمارے خیالات معرضِ تحریر میں آتے ہی چار اطراف عالم میں نشر ہو جاتے ہیں۔ محض طبعی وسائل کی مدد سے ہم ایک دوسرے کے بہت نزدیک ہو گئے ہیں۔ اِسی لئے آجکل کی اس دُنیا کے مذہب کو بھی وسیع اور عالم گیر ہونا پڑے گا۔

زمانہ مستقبل کے مذہبی آدرشوں کو یہاں تک وسیع اور کشادہ دامن ہونا پڑے گا کہ ان میں موجودہ خوبیاں اور صداقتیں بھی سما جائیں اور مزید ترقی کی لامحدود گنجائش بھی رہے۔ زمانہ گزشتہ کی ہر اچھی چیز کا تحفظ لازمی ہے۔ لیکن موجودہ ذخیرے میں اضافے کے لئے مذہب کے دروازے ہر وقت کھلے رہنا چاہیئے۔ تنگ نظری مذہب کی دشمن ہے۔ کشادہ دلی اور ہمہ گیری سچے مذہب کی نشانی ہے۔ ایسے مذہب کو اپنے اندر دوسروں کو جگہ دینے اور انھیں قبول کرنے کی صلاحیت ہونا چاہیئے۔ مختلف مذہبوں نے خُدا کا ذکر مختلف پیرایوں سے کیا ہے۔ لیکن محض اس وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ نفرت سے پیش آنا اور اپنے مذہب کے مقابلے میں دوسرے مذاہب کو حقارت کی نظر سے دیکھنا کم ظرفی کا ثبوت ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں ایسے صحیح الفطرت ذہین اور پُر دماغ اشخاص سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جن کا خدا کی ہستی پر ایمان اِن معنوں میں نہیں تھا جو ہم نے سمجھ رکھے ہیں۔ لیکن جو حقیقی معنوں میں رُوحانیت کے بلند مقام پر پہونچ چکے تھے دراصل وہ خدا کے وجود کی حقیقت کو ان لوگوں سے کہیں زیادہ بہتر سمجھتے تھے جو شخصی خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ مذہب کی تعریف بھی اتنی جامع ہونا چاہیئے کہ اس میں شخصی اور غیر شخصی خُدا کا کردار، لامحدودیت کا خیال۔ اخلاقی قانون کا نظریہ۔ آدرش انسان کا تصور[1] یہ تمام باتیں سما جائیں اور جب مذاہب میں اتنی وسعت پیدا ہو جائے گی تو ان میں لوگوں کو نیکی کی راہ پر لانے کی جو طاقت اور صلاحیت ہوگی اس میں سوگنا اضافہ ہو جائے گا۔ مذہب کی طاقت ایک بڑی زبردست طاقت ہے۔ مجھے اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اہلِ مذہب اُن کی تنگ نظری

[1] اگلے صفحہ پر دیکھئے

www.taemeernews.com

اور محدود خیالی کے سبب سے دُنیا کو فائدے کے بمقابلہ نقصان زیادہ پہونچا ہے لیکن اس میں مذہبی فلسفے کا زیادہ قصور نہیں اگر ہمیں کسی سے شکایت ہے تو اپنی کم ظرفی اور تنگ دلی سے بہر حال ہمیں مذہب کے دَامن کو کشادہ کرنا ہے افسوس کا مقام ہے کہ آجکل بھی ایسے فرقے اور ایسے گروہ موجود ہیں جو بیشتر ہم خیال ہونے کے باوجود باہم دیگر برسرپیکار رہتے ہیں کیونکہ ایک فرقے یا گروہ کی طرف سے وہ خیالات بجنسہٖ اس صورت میں پیش نہیں کئے جاتے ہیں جس میں دوسرے فرقے یا گروہ انھیں پیش کرتے ہیں فی زمانہ اِن باتوں کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے مذہبوں کو اپنا دائرہ وسیع کرنا پڑے گا۔ مذہبی تصوّرات کو عالم گیر، وسیع المشرب اور لا محدود ہونا پڑے گا اور صرف ایسی ہی صورتِ حالات کے پیدا ہونے پر مذہب اپنا کام مکمل طور پر انجام دے سکے گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ زمانۂ حال میں مذہب کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہی۔ روحانی تصوّرات آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں اور مذاہب دم توڑ رہے ہیں۔ مجھے اس سے ہرگز اتفاق نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کی طاقت کو ابھی پورے زور سے نمودار ہونا ہے۔ ابھی تو اس کی ارتقائی رفتار میں تیزی پیدا ہو رہی ہے اور اس طاقت کا اظہار شروع ہی ہوا ہے۔ مذہب کی طاقت وسیع اور منزّہ ہو کر انسانی زندگی کے ہر شعبے میں سرائت کرے گی۔ جب تک مذہب کی باگ ڈور چند منتخب اشخاص یا راہبوں کی جماعت کے ہاتھوں میں رہی اس کا وجود مندروں، مسجدوں اور گرجاؤں میں مقید اور کتابوں، نظریوں رسموں اور رواجوں میں محدود رہا لیکن جب مذہب کے حقیقی روحانی اور عالم گیر تصوّرات ہماری سمجھ میں آجائیں گے تو مذہب میں دوبارہ جان پڑ جائے گی اور یہ ہماری فطرت میں داخل ہو جائے گا۔ ہماری ہستی کا جزو بن جائے گا۔ ہماری زندگی کے ہر لمحے میں سما جائے گا ہمارے سماج کے ہر مسام میں سرائت کر جائے گا۔ جو فوائد آج تک ہم اس سے حاصل نہیں کر سکے وہ سب کے سب ہمارے حصّے میں آجائیں گے اور اس طرح مذہب واقعی صحیح معنوں میں دنیا کی بھلائی اور بہبودی کی ایک لا محدود طاقت بن جائے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے تفرقات

The Personal idea of God or the Impersonal, the Infinite, Moral Law or the Ideal Man, all these ideas have to come under the definition of religion.

066 www.taemeernews.com

اور جھگڑے بٹ کر ان میں باہمی ہمدردی پیدا کی جائے۔ یہ ہمدردی اسی حالت میں پیدا ہو سکتی ہے جب تمام مذاہب کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ ان میں سے ایک کا جو فائدہ ہے وہی دوسرے کا بھی فائدہ ہے اور اسی طرح ایک کا نقصان دوسرے کا نقصان ہے (ایک کی زندگی اور موت دوسرے کی بھی زندگی اور موت ہے) اگر ایک مذہب والے دوسرے مذہب کو غلط اور جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ خود اپنے مذہب کو غلط اور جھوٹا بتاتے ہیں کیونکہ یہ سب مذہب خدا ہی کا راستہ تو دکھانے کا دعوےٰ کرتے ہیں اگر ایک سچا ہے تو پھر سب سچے ہیں۔ اگر ایک جھوٹا ہے تو سب جھوٹے ہیں اگر ہر مذہب والے یہ بات ذہن نشین کرلیں اور ایک دوسرے کی تعظیم و توقیر کرنے لگیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے درمیان باہمی ہمدردی کا جذبہ نہ پیدا ہو جائے۔ یہ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گا اور ضرور ہو گا محض دکھاوے کی باتوں سے دل نہیں ملتے۔ دوسرے مذاہب کو کمتر سمجھ کر ان پر رواداری کے طور پر عنایت کی نظر ڈالنا اور اپنی ذرّہ نوازی کا مظاہرہ کرنے کی خاطر ان کی کم و بیش تعریف کرنا ہرگز ہمدردی نہیں۔ ایسا کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے اور دوسرے مذاہب کے ساتھ ناانصافی سے کام لینا ہے۔ بدقسمتی سے اس قسم کے سلوک کا رواج عام ہو رہا ہے ہمیں اس طرزِ عمل سے بچنا ہے۔ اس باہمی ہمدردی کی ضرورت نہ صرف مختلف مذاہب اور مذہبی فرقوں کو ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ یہ باہمی ہمدردی مذہب اور سائنس کے لئے لازمی ہے تاکہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھیں۔ مختلف ہونے پر بھی تمام مذاہب آخر ایک ہی چیز یعنی رُوحانیت کی تعلیم دیتے ہیں لیکن سائنس اور مذہب کے تو موضوع ہی مختلف ہیں اس لئے ان دونوں کے درمیان بظاہر تضاد دلازمی نظر آتا ہے۔ لیکن در اصل دونوں ایک ہی علم کی ایک ہی آگہی کی شاخیں ہیں۔ مذہب کے مطالعہ کا تعلق دماغی کیفیات سے ہے۔ اور سائنس کا میدانِ فکر زمین سے آسمان تک تمام مادّی چیزوں پر حاوی ہے۔ بدقسمتی سے مذہب والے سمجھتے ہیں کہ دماغی کیفیات کے مطالعہ کا حق صرف انھیں کو حاصل ہے اور سائنس دانوں کا خیال ہے کہ مذہب کا دار و مدار بے بنیاد توہمات پر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم ایک ہے۔ مذہب اور سائنس صرف اس کی مادّی اور غیر مادی صورتیں ہیں علم بھی بذاتِ خود انکشافِ ذات کی ایک صورت ہے۔ ہر قسم کا علم روحانیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اِس لئے سائنس بھی رُوحانی آگہی کا ایک جزو ہے سائنس اور مذہب دونوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے کی ضرورت نہیں بلکہ انسانی ارتقا اور رُوحانی ترقی اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب ان دونوں کے درمیان بھی مکمل ہمدردی اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ اس

www.taemeernews.com

ہم آہنگی اور ہمدردی کی خاطر مذہب اور سائنس دونوں کے ارباب فکر کے لئے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا لازمی ہوگا اور اسے قبول کرنا ہوگا محض رسمی طور پر اعتراف کرنا ہی کافی نہیں ہوگا بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کو پوری طرح اپنانا ہوگا۔ اس کے لئے دونوں کو قربانی کرنا ہوگی اپنے کئی مخصوص اور محبوب خیالات اور تعصبات کو ترک کرنا ہوگا اور میں جانتا ہوں کہ ترک اور قربانی دکھ درد برداشت کئے بغیر ممکن نہیں لیکن میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس قربانی کے دینے سے سائنس اور مذہب دونوں کی شان دوبالا ہو جائے گی اور دونوں حقیقت کے نزدیک پہونچ جائیں گے۔ آخر کار مذہبی علم اور روحانی آگہی جو مکان و زمان کی قیود سے باہر ہے اور سائنس کا علم جو وقت اور مقام کی حدود میں گھرا ہوا ہے۔ دونوں یک جان ہو کر اس "واحد حقیقت" سے واصل ہو جائیں گے جو وجودِ مطلق ہے جو لامحدود ہے اور جس کی نہ کوئی نظیر ہے نہ مثال جو لازوال و لاثانی ہے۔ جو مادی اور غیر مادی دونوں قسم کے علوم سے بری ہے اور جس تک حواس اور دماغ کی رسائی ناممکن ہے۔

068 www.taemeernews.com

ایک عالمگیر مذہب
کا
آدرش یا نصب العین

جہاں دیکھو۔ زندگی کے ہر شعبے میں دو زبردست متضاد[1] طاقتیں کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک طاقت سے عمل[2] کا ظہور ہوتا ہے اور دوسری سے ردِ عمل[2] کا۔ ان طاقتوں کے عمل کا شعور نہ صرف حواس کی حدود کے اندر ہوتا ہے بلکہ ہمارے دماغی تصورات اور تخیلات کی عظیم وسعتوں میں بھی یہ دونوں متضاد طاقتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ ان کے متواتر تضاد سے ایک طرف تو ہمارے گرد و نواح کے مختلف مناظر[3] پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان سے ہماری دماغی کیفیات[4] کا اظہار ہوتا ہے۔ عمل اور ردِ عمل کا یہ مسلسل کھیل خارجی اور داخلی دونوں دنیاؤں میں کھیلا جا رہا ہے۔ خارجی دنیا میں ان دونوں مثبت اور منفی طاقتوں کا عمل کشش اور پسپائی (انجذاب[5] و استرداد) کی شکل میں نمودار ہوتا ہے کشش کی طاقت تعمیری ہوتی ہے۔ اس کی خصوصیت مرکز[6] کی طرف رجوع کرنا اس کے عمل سے یکجائی اور اجتماع کی صورت پیدا ہوتی ہے پسپائی کی طاقت تخریبی ہوتی ہے اس کی خاصیت ہے مرکز سے گریز کرنا[7]۔ دور ہٹنا اس کے عمل سے انتشار ظہور پذیر ہوتا ہے یہی طاقتیں جب داخلی دنیا میں رونما ہوتی ہیں تو ان سے محبت اور نفرت اور نیکی اور بدی

---

[1] Opposite forces. [2] Action and reaction.

[3] اور [4] Physical and mental Phenomenon.

[5] Attraction and repulsion. [6] Centripetal. [7] Centrifugal.

069 www.taemeernews.com

کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ قدرت کا یہ قانون ہی ایسا ہے کہ کچھ چیزیں ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہیں اور کچھ چیزوں سے خود ہم دور رہنا چاہتے ہیں اسی طرح کچھ چیزیں ہماری طرف خود بخود چلی آتی ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے نزدیک نہیں پھٹکنا چاہتیں۔ ہماری زندگی میں متعدد بار یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہم بغیر کسی وجہ کے ہی خود بخود بعض اشخاص کی طرف مائل و متوجہ ہوجاتے ہیں اور اسی طرح بعض اور اشخاص سے ہم دور رہنا چاہتے ہیں یہ تو ایک مُسلّمہ بات ہے کہ محبت کسی سے ہوجاتی ہے۔کی نہیں جاتی اور دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ کسی کے ساتھ نفرت از خود ہوجاتی ہے۔ ارادتاً نہیں کی جاتی کشش اور پسپائی کا یہ عمل سب پر حاوی ہوتا ہے ہمارا میدانِ عمل جتنا بلند ہوتا ہے اتنے ہی زیادہ قوی اور معرکہ آرا اثرات ان متضاد اور مختلف طاقتوں کے رونما ہوتے ہیں۔ مذہب کا مقام انسانی خیالات اور انسانی زندگی کی بلند ترین سطح پر ہے اسی لئے ہم کو قبول و رد کی یہ دونوں طاقتیں اس بلند سطح پر بہت زیادہ نمایاں طور پر کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں مذہب نے جہاں انسان کی گہری سے گہری محبت کو جنم دیا ہے وہاں نفرت کا شیطانی جذبہ بھی مذہب ہی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جہاں مذہب دُنیا کے لئے امن اور شانتی کا پیغام لایا وہاں تمام تلخ ترین دُشنام طرازیوں اور جنگ و فساد کے رجحانات بھی مذہب ہی کی پیداوار بنے مذہب ہی نے دُنیا کے سامنے بلند ترین معیارِ زندگی رکھا اور انسانوں کو کارِ خیر کی تعلیم دی لیکن دوسری طرف اسی مذہب سے شر انگیز سرگرمیاں بھی وجود میں آئیں۔ یہ مذہب کی تعلیم کا ہی نتیجہ ہے کہ نہ صرف غریبوں اور ناداروں کے لئے ہزارہا شفاخانے۔ آشرم اور خیرات گھر قائم ہوگئے بلکہ جانوروں کی بھی دیکھ بھال اور حفاظت کے سامان بھی مہیا کئے گئے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ دُنیا میں جتنی خوں ریزی مذہب کے نام پر ہوئی ہے شاید ہی کسی اور وجہ سے ہوئی ہو۔ مذہب ہی نے ہمیں رحم اور ہمدردی کے جذبات بخش کر نرم دل بنایا اور مذہب ہی کے نام پر ہر طرح کے ظلم اور بے رحمانہ افعال کا ارتکاب ہوا ہے۔ مذہب کے ان دونوں متضاد پہلوؤں کا مشاہدہ ماضی میں بھی کیا گیا ہے اور غالباً آئندہ بھی یہی صورتِ حال جاری رہے گی لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ظلم اور بے رحمی کا یہ سلسلہ کبھی بند نہیں ہو گا۔ اگر کچھ اُمید کی جھلک نظر آتی ہے تو اس بات سے کہ مختلف مذہبوں اور فرقوں کے اسی شور و شغب اسی دار و گیر اسی کشمکش اور نفرت و حسد کے اس عالم میں وقتاً فوقتاً ایسی پُر اثر آوازیں بھی بلند ہوتی رہی ہیں جن کے سامنے یہ سارا شور و شغب ماند پڑ گیا۔ یہ آوازیں ایک قطب سے دوسرے قطب تک گونج اٹھیں جن میں امن اور اتحاد کا پیغام دیا گیا تھا۔ کیا امن و اتحاد کی یہ برکت نیز ہم سائیگی اور ہم آہنگی کی یہ دولت کبھی ہمارے نصیب میں آئے گی کیا یہ ممکن ہے کہ مذہبی زندگی کی اس کشمکش میں اتحاد و آشتی کا ایک غیر منقطع سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاری ہوجائے اس صدی کے اواخر میں اتحاد و آشتی کا سوال دُنیا میں بہت زور شور سے اٹھا

www.taemeernews.com

سوسائٹی میں اسکے متعلق طرح طرح کی تجاویز پیش کی جارہی ہیں اور ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی جارہی ہے لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ یہ کتنا مشکل کام ہے عام طور پر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ زندگی کی کشمکش میں یہ جو ہیجان کا عالم طاری ہے اس کو کم کرنا اور انسانوں میں جو زبردست اعصابی تناؤ پیدا ہو گیا ہے اس کو ڈھیلا کرنا قریب قریب ناممکن ہے اس کام کے مشکل ہونے کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہو سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں تو مادی سطح پر بھی امن و آشتی اور ہم آہنگی پیدا کرنا کوئی آسان بات نہیں ۔ اختلاف کا دور کرنا خارجی زندگی میں بھی کافی مشکل ہے اور داخلی دُنیا یعنی انسان کی باطنی فطرت میں تو شانتی اور چین کا پیدا کرنا اس سے بھی کہیں زیادہ محال ہے مجھے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار نہیں ۔ میں تو آپ سے بس اتنا ہی کہوں گا کہ اگر ہم واقعی امن و آشتی چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے اپنے آپ کو اس جال سے آزاد کرنا ہوگا جس میں ہم سب جکڑے ہوئے ہیں ۔ ہم لوگ تو اپنے بچپن کے زمانے سے محبّت ۔ امن ۔ خیرات ۔ مساوات اور عالمگیر اخوت ایسی بیش بہا چیزوں کا ذکر سُنتے چلے آئے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ سب صداقتیں ہمارے لئے کچھ بے معنی سے الفاظ بن کر رہ گئی ہیں اور ہم ان الفاظ کو دن رات طوطے کی طرح رٹتے رہتے ہیں ہمارے لئے ایسا کرنا ایک فطری امر ہو گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روش سے گریز کرنا اب ہمارے بس کی بات نہیں رہی کتنی عظیم ہستیاں تھیں اُن بزرگوں کی جن کے دلوں میں اس قسم کے عظیم اور گراں قدر خیالات پیدا ہوئے جنھوں نے ان صداقتوں کو شدّت کے ساتھ محسوس کیا اور ان کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ گھڑے ۔ دراصل وہی لوگ ان الفاظ کے حقیقی معنی و مفہوم سے واقف تھے ۔ ان کے زمانے میں اکثر اشخاص نے انکا صحیح مفہوم قرار واقعی طور پر سمجھا بھی ۔ لیکن جیوں جیوں وقت گزرتا گیا ان الفاظ کے معنی پھیکے پڑنے لگے ۔ ان میں ضعف آگیا ۔ آہستہ آہستہ جاہل قسم کے لوگوں نے ان الفاظ کو ہتھیا لیا اور ان سے کھیلنا شروع کر دیا اُنھوں نے مذہب کو ایک لفظی شعبدہ بازی بنا لیا ۔ مذہب چیز تھی عمل کرنے کی ان لوگوں نے اسے محض ایک دکھاوے کی چیز بنا کر رکھ دیا ۔ اس پر اپنی اپنی ملکیت کا دعوے کرنے لگے مذہب ایک انفرادی طرز عمل ہونے کے بجائے ایک سماجی اور قومی اثاثہ بن گیا اور لوگ "باپ دادا کے مذہب" "قومی مذہب" اور "ملکی مذہب" کی باتیں کرنے لگے اس طرح مذہب قومیت اور حب الوطنی کا ایک جزو بن کر رہ گیا چونکہ حب الوطنی ہمیشہ عصبیت کا پہلو لئے ہوتی ہے اسی لئے مختلف مذاہب کے درمیان آشتی اور اتحاد پیدا کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا ۔ اگرچہ ان حالات میں اس مشکل کا حل دستیاب ہونا آسان نہیں پھر بھی آج ہم اتحاد مذاہب کے اس مسئلے پر کچھ نہ کچھ غور ضرور کریں گے ۔

ہر بڑے اور منظم مذہب کے تین اجزا ہوتے ہیں اس کا پہلا حصّہ فلسفے پر مشتمل ہوتا ہے جس میں اس

071 www.taemeernews.com

مذہب کے تمام تمدنوں کی عکاسی کی جاتی ہے اسکے بنیادی اصول پیش کئے جاتے ہیں اسکا مقصد اور اس مقصد کی تکمیل کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ دوسرا حصہ ہے دیومالا یا علم الاصنام کا جس میں فلسفے کو ٹھوس اور مادی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں انسانوں یا مافوق الفطرت ہستیوں کے متعلق حکایات و روایات وغیرہ شامل ہوتی ہیں اس میں فلسفے کا جوہر انسانوں اور مافوق الطبع ہستیوں کی کم و بیش فرضی زندگیوں کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے تیسرا حصہ ہوتا ہے شریعت یا رسم و رواج یعنی کرم کانڈ کا اس کی شکل اور بھی زیادہ مجسّم اور مادی ہوتی ہے اور یہ شکل ہوتا ہے چند دستوروں اور رسموں پراکٹس میں ارکان عبادت یا پوجا پاٹ کی رسمیں بھی شامل ہوتی ہیں مثلاً خاص قسم کے خارجی ماحول میں جسم کو خاص خاص طریقوں سے طرح طرح کی ریاضتوں کی تربیت دینا یا پھولوں اور خوشبویات سے پوجا کا اہتمام کرنا۔ سارے مذہبوں میں اس قسم کی ایسی متعدد رسمیں ہیں جنھیں حواس بخوشی اور بآسانی قبول کرتے ہیں۔ یہ تینوں حصے تمام مروجہ مذاہب میں پائے جاتے ہیں بعضوں میں کسی ایک حصے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور بعضوں میں کسی دوسرے حصے پر جہاں تک پہلے حصے یعنی فلسفے کا تعلق ہے یہ بات قابل غور ہے کیا کوئی فلسفہ ایسا ہے جسے عالمگیر کہا جا سکتا ہو۔ ابھی تک دنیا نے کسی فلسفے کو عالمگیر نہیں تسلیم کیا۔ ہر مذہب والے اپنے اصول پیش کرتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ بس انھیں کے اصول درست ہیں۔ وہ محض اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ باقی سب اصولوں کو غلط قرار دیں تو کہتے ہیں کہ اُن کے مذہب کے علاوہ دوسرے مذہبوں کا طریقۂ کار غلط ہے اور اسی لئے وہ آخرکار کسی نرک یا جہنم میں جائیں گے بعض لوگ تو دوسروں سے اپنے عقائد کو منوانے کے لئے تلوار سے کام لینے میں بھی دریغ نہیں کرتے اور سچے دل سے یقین کرتے ہیں کہ اسی میں ان لوگوں کا بھلا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کسی کو جان سے مار ڈالنا یا زندہ جلا دینا ان پر ظلم کرنے کے مترادف نہیں بلکہ ایسا کرنا ان کی روحانی بہبودی کے لئے لازمی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ اس قسم کے لوگ شیطان سیرت ہیں کیونکہ وہ ظلم بھی کرتے ہیں تو مذہب کے نام پر، دوسروں کی روحانی بہبودی کے خیال سے لیکن میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ یہ لوگ اس دماغی بیماری میں مبتلا ہیں جسے ہم تعصب یا مذہبی دیوانگی کے نام سے موسوم کرتے ہیں درحقیقت اس مرض سے بڑھ کر اور کوئی خطرناک مرض دنیا میں ہے ہی نہیں۔ اسی مرض کے نتیجے کے طور پر فطرت انسانی کی تمام شیطنت اور خباثت اُبھر آتی ہے۔ غیظ و غضب کے شعلے مشتعل ہو جاتے ہیں اعصاب میں ایک نہایت زبردست تناؤ پیدا ہو جاتا ہے اور انسان انسان نہیں رہتے۔ درندے بن جاتے ہیں۔

اب مذہب کے دوسرے جزو یعنی دیومالا یا علم الاصنام؎ کو لیجئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس حصے سے متعلق ان مذاہب میں کوئی یکسانیت یا کسی قسم کا اتحاد پایا جاتا ہے کیا کوئی ایسا عالمگیر علم الاصنام ہے جسے سب

؎ Mythology.

072 www.taemeernews.com

مذاہب تسلیم کرتے ہوں؟ اس سوال کا جواب بھی قطعاً نفی میں ملتا ہے کیونکہ ہر مذہب کی اپنی اپنی جداگانہ دیو مالا ہوتی ہے۔ ہر مذہب یہی کہتا ہے کہ "میری کتابیں میری حکایات محض فرضی افسانے نہیں حقیقتیں ہیں"۔ اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے میں چند مثالیں پیش کروں گا ان کے بیان کرنے سے میرا یہ منشا ہرگز نہیں کہ کسی مذہب پر نکتہ چینی کی جائے از راہ کرم آپ اس سلسلے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں اور میری باتوں کو غلط نہ سمجھیں۔

ان تو عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا نے ناسُتہ کی شکل اختیار کی اور زمین پر نزول فرمایا۔ عیسائی حضرات اس کو ایک تاریخی حقیقت قرار دیتے ہیں محض مثالی افسانہ نہیں سمجھتے۔ ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ پرماتما گائے کے روپ میں جلوہ گر ہوا لیکن عیسائی ہندوؤں کے اس اعتقاد کو تاریخی حقیقت ماننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ تو اس کو محض ایک وہم یا ایک روایتی قصہ قرار دیں گے اسی طرح یہودیوں میں ایک بکس یا صندوق پر فرشتوں کی تصویر یا بُت بنا کر اور اسے اپنی متبرک و مقدس[۵۱] پرستش گاہ میں جگہ دے کر اسی کی عبادت یا پوجا کو منا سب سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کے خیال میں یہ نشان جہوّوا[۵۲] (خدا) کی نظر میں مُقدّس ہوتا ہے لیکن اگر پرستش گاہ کا مجسمہ کسی خوبصورت مرد یا عورت کی صورت میں بنا دیا جائے تو یہی یہودی حضرات اس کو ایک ہولناک بُت قرار دے کر اُسے توڑ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے حال علم الاصنام کی یکسانیت کا۔ اگر کوئی آدمی کھڑا ہو کر یہ کہنے لگے کہ "میرے پیغمبر نے فلاں فلاں حیرت انگیز معجزے دکھائے" تو دوسرے حضرات کہیں گے کہ یہ محض وہم ہے" لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی فرمائیں گے کہ خود ان کے پیغمبر نے اِن سے بھی زیادہ محیّر العقول کارنامے نمایاں کئے ہیں اور یہ لوگ اپنے ان پیغمبروں کے کارناموں کو تاریخی واقعہ قرار دیں گے۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے اس قسم کے اشخاص تاریخ اور علم الاصنام کے درمیانی فرق کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے مذاہب کے متعلق جو چاہے کہیں لیکن اس قسم کی تمام حکائتیں خواہ ان کا کسی مذہب سے بھی تعلق کیوں نہ ہو محض مثالی افسانے ہیں جن میں کہیں کہیں اور کبھی کبھی تاریخی واقعات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

جب مذہبی فلسفے اور مائتھالوجی (علم الاصنام) میں اتفاق اور ہم رنگی کی کوئی صورت نہیں تو مذہب کے تیسرے جزو یعنی رسمیات (کرم کانڈ) میں تو اس کی بالکل ہی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایک فرقے میں ایک قسم کی رسمیات رائج ہوتی ہیں تو دوسروں میں دوسری قسم کی۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ اس کی اپنی رسمیات تو مقدّس ہیں مگر دوسرے فرقے کی رسمیات محض بے معنی توہمات کا درجہ رکھتی ہیں۔

---

۵۱ Holy of Holies.　　۵۲ Jehovah.

www.taemeernews.com

اگر ایک خاص فرقہ ایک خاص قسم کی علامت[1] یا نشان کو اپنا معبود بتاتا ہے تو دوسرے فرقے کو اس سے کراہت ہوتی ہے وہ اس کو ہولناک سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر "لنگ" کے مروجہ نشان کو لے لیجیے یہ نشان یقینی طور پر ایک جنسیاتی نشان ہے لیکن بالعموم اس کا جنسیاتی پہلو تو مٹ چکا ہے اور لوگوں کو اس کے اس پہلو کا خیال تک نہیں آتا اب تو اسے "خالق کائنات" کا ایک نشان ہونے کا مرتبہ حاصل ہے۔ جن قوموں میں یہ نشان رائج ہے وہ اس کو کبھی بھول کر بھی عضو تناسل نہیں سمجھتیں وہ محض ایک نشان ہے اور بس۔ اسکے علاوہ اور کچھ نہیں لیکن کوئی دوسری قوم یا کسی دوسرے مذہب کا کوئی فرد اگر اس نشان کو دیکھتا ہے تو اس کو اس میں عضو تناسل کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا اور وہ اس کی مذمت پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن اپنے مذہب کی رسوم کے تحت خود اس شخص کی ذات سے ایسے فعل صادر ہوتے ہیں جو لنگ کے پجاریوں کی نظر میں شرمناک اور قابلِ مذمت ہوتے ہیں مثالاً میں دو چیزوں کا ذکر آپ سے کرتا ہوں ایک تو یہی لنگ پوجا ہے جو عیسائیوں کی نظر میں نہایت شرمناک رسم ہے اور دوسری عیسائیوں کی رسم اصطباغ[2] ہے اس میں خود ان کے بانی مذہب کو ذبح کرکے ان کے پیرو اس کا گوشت کھاتے اور اس کا خون پیتے ہیں تاکہ اس رسم کے ادا کرنے سے اس عظیم الشان انسان کی خوبیاں اُن کی ذات میں آجائیں۔ غیر عیسائی حضرات پوچھ سکتے ہیں کہ اگر یہ مردم خوری نہیں تو پھر اور کیا چیز ہے یہی کام تو وحشی قومیں بھی کرتی ہیں اگر وحشی قوموں میں کوئی شخص بہت بہادر ہوتا ہے تو یہ وحشی اسے ذبح کرکے اس کا دل کھا لیتے ہیں کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق اس سے ان میں مذبوحہ انسان کی جرأت اور دلیری کے محاسن پیدا ہو جاتے ہیں سرجان لبک ایسے سچے عیسائی بھگت نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ عیسائیوں کے اس عباداتی نشان کی ماہیت دراصل وہی وحشیانہ فعل ہے بہرحال عیسائی لوگ اس کی ماہیت کے متعلق یہ نظریہ تسلیم نہیں کرتے۔ رہا اس کا حقیقی مفہوم۔ اس کا تو انھیں خیال تک نہیں آتا۔ ان کی نظر میں تو یہ ایک مقدس رسم ہے اور بس۔ ظاہر ہے کہ مذہبی رسوم میں بھی کوئی ایسا عالمگیر نشان نہیں پایا جاتا جسے عام طور پر سب منظور اور تسلیم کرلیں۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذہبی فلسفہ۔ مائتھالوجی اور رسم و رواج میں سے کوئی بھی ایک ہم رنگی پیدا نہیں ہو سکتی تو مذہب کی کوئی عالمگیر صورت کس طرح رونما ہو سکتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان تفرقات کے باوجود مذہب کی یہ صورت اب بھی موجود ہے پہلے بھی ہمیشہ موجود تھی اور آئندہ بھی موجود رہے گی دیکھنا یہ ہے کہ اس عالمگیر مذہب کی نوعیت کیا ہے؟

---

[1] Symbol. [2] Sacrament.

www.taemeernews.com

ہم سب نے عالمگیر اخوّت کا ذکر تو بہت سُنا ہے اور ہمیں بہت سی ایسی جماعتوں کا علم بھی ہے جو خاص طور پر اس عالمگیریت کا پرچار کرتی ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کی عملی صورت کیا ہے؟ اس سلسلے میں مجھے ایک پُرانی کہانی یاد آگئی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں شراب نوشی بہت بُری بات سمجھی جاتی ہے اگرچہ لوگ شراب پیتے بھی ہیں تو چھپ چھپا کر۔ کہانی یوں ہے کہ دو بھائیوں نے ایک رات چھپ کر شراب پینے کی ٹھانی ان کا چچا سخت قسم کا انسان تھا اور ان دونوں بھائیوں کے پاس والے کمرے میں سو رہا تھا۔ اسی لئے دونوں نے شغل شروع کرنے کے قبل ایک دوسرے سے کہا "ہم کو بہت خاموشی سے کام لینا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ چچا جان جاگ پڑیں اور سارا مزہ کرکرا ہو جائے" اسکے بعد دور چلنے لگا۔ دونوں شراب پینے میں جُٹ گئے۔ اسی دوران میں ایک بھائی مستی کے عالم میں بول اٹھا دیکھو خاموشی سے کام لو ورنہ چچا جان جاگ پڑیں گے" دوسرا بھی ترنگ میں آگیا اور چلا کر کہنے لگا "چپ رہو یہ شور کیوں مچا رکھا ہے چچا جان کی آنکھ کھل جائے گی۔ وہ جاگ پڑیں گے" بس پھر کیا تھا دونوں ہی زور زور سے چلانے لگے "خاموش۔ چچا جان جاگ پڑیں گے" یہ شور و غل سُن کر چچا جان کی آنکھ واقعی کھُل گئی اور وہ اُٹھ کر دونوں بھائیوں کے کمرے میں جا پہونچے۔ اُدھر سارا معاملہ سمجھ گئے تھے۔ بجنسہٖ یہی حال ہم سب کا ہے ہم ان شرابیوں کی طرح "عالمگیر اخوت" کا شور مچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ہم سب برابر ہیں" اس لئے آئیے ہم سب اپنے آپ کو ایک جماعت میں منسلک کرلیں۔ اس طرح ہم عملی طور پر اپنی اپنی ایک الگ جماعت کھڑی کرلیتے ہیں اور یہ بھُول جاتے ہیں کہ جماعت بندی ہی تو مساوات اور اخوّت کی دشمن ہے اس سے ساری مساوات ختم ہو کر رہ جاتی ہے مثلاً اسلام عالمگیر اخوّت کا سبق دیتا ہے لیکن عملی طور پر مسلمانوں نے اس اخوّت کا دائرہ محدود کر رکھا ہے۔ اگر کوئی شخص مسلمان نہیں تو اس کو اس عالمگیر برادری کی صف میں جگہ نہیں ملتی بلکہ اسے کافر قرار دے دیا جاتا ہے اسکے لئے کوئی بھی سزا واجب سمجھی جاتی ہے اسی طرح عیسائیوں میں بھی عالمگیر اخوت کا بڑا چرچا ہے لیکن جو شخص عیسائی مت کا پیرو نہیں اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم کی آگ کا مستحق سمجھا جاتا ہے ظاہر ہے کہ ہمیں مذاہب سے عالمگیر اخوّت کا تصور ضرور ملتا ہے لیکن عملی طور پر یہ جنس ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اگر کوئی شخص آپ کے سامنے عالمگیر اخوّت کا ذکر کرتا ہے تو آپ فوراً اس کی ہاں میں ہاں نہ ملائیے پوری احتیاط سے کام لے کر اس کی ہر بات کو پرکھئے کیونکہ عموماً اس قسم کی گفتگو کے پس پردہ نہایت شدید قسم کی خود غرضی کام کرتی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں کہاوت ہے کہ "جاڑے کے بادل گرجتے ہیں برستے نہیں اور برسات میں برستے زیادہ ہیں گرجتے کم ہیں جاڑے میں زمین سوکھ جاتی ہے برسات میں ساری دنیا جل تھل ہو جاتی ہے" اسی طرح خلق کے سچے خادم بہت باتیں نہیں

075 www.taemeernews.com

بناتے جن کے دِل میں انسانوں کی عالمگیر برادری کیلئے سچا درد ہوتا ہے وہ چھوٹے چھوٹے فرقے بنا کر اُسے محدود نہیں کرتے وہ عالمگیر اخوت کے نام پر اپنی اہمیت بڑھانے کے لئے کسی قسم کی جماعت بندی نہیں کرتے بلکہ انکے افعال ان کی حرکات وسکنات اور ان کی تمام زندگی سے واضح طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کے دل میں بنی نوع انسان کے لئے واقعی عالمگیر اخوت کا احساس ہے ان کو سب سے محبت اور سب کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے تمام کائنات ان کی محبت میں بسی ہوتی ہے ایسے لوگ بولتے کم ہیں لیکن وہ فعلاً اور عملاً اخوت کی جیتی جاگتی تصویر بن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ دُنیا میں ہنگامہ خیز گفتگو بہت ہوتی ہے لیکن ہمیں تو ضرورت اس بات کی ہے کہ عمل میں خلوصِ دل زیادہ شامل ہو اور باتیں کم ہوں۔

تو کیا ہمارے مذاہب میں ہمہ گیری کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی؟ کیا تمام مذاہب ہمیشہ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہی رہیں گے؟ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب میں عالم گیر وسعت پیدا نہیں ہو سکتی لیکن ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ عالمی اخوت اور کائناتی محبت کے تصورات بے معنی نہیں ہیں کہیں نہ کہیں حقیقت موجود ضرور ہے ہمیں اسی نکتے کو سمجھنا اور اس کو عمل میں لانا ہے۔ پہلی بات جو ہمیں اچھی طرح ذہن نشین کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مساوات کا جو عام مطلب سمجھا جاتا ہے وہ بہت حد تک درست نہیں کہنے کو ہم سب انسان ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ہم سب ہر لحاظ سے برابر ہیں ہم میں سے ہر ایک کی دماغی اور جسمانی قوتیں اور خاصیتیں دوسروں سے مختلف ہیں ایک آدمی دوسرے آدمی سے زیادہ طاقتور اور مضبوط ہوتا ہے ایک شخص کی دماغی قوت دوسرے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اگر ہم سب برابر ہیں تو پھر یہ نابرابری کیسی؟ اگر ہم میں سے کسی کی شخصیت زیادہ پُرزور ہے اور کسی کی کمزور اگر کسی کا دماغ زیادہ اچھا ہے اور کسی کا کم۔ یا کسی کی جسمانی صحت اچھی ہے اور کسی کی بُری یہی نہیں بلکہ اگر ہم میں جنسی نسلی۔ انفرادی قومی اور جماعتی غرضکہ متعدد قسم کے فرق موجود ہیں کوئی مرد ہے کوئی عورت کوئی کالا ہے کوئی گورا، کوئی چھوٹا ہے کوئی بڑا۔ تو ظاہر ہے کہ انسان انسان کے درمیان کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود ہم بار بار شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ سب انسانوں میں یکساں طور پر ایک غیر مرئی انسانیت کی جھلک پائی جاتی ہے ممکن ہے کہ ہم اس غیر مرئی انسانیت کو پوری طرح سمجھ نہ سکیں یا اس کو عملی سانچے میں نہ ڈھال سکیں پھر بھی ہمارا دل یقیناً کہتا ہے کہ اس غیر مرئی کائناتی انسانیت کا واقعی کوئی وجود ہے ضرور۔ مساوات کا اصول ہمارے دل کو کچھ اسقدر مرغوب ہے کہ ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ یہ اصول بے بنیاد ہے۔ تو کیا اس مساوات کی کوئی حقیقت بھی ہے یا یہ محض خیال ہی خیال ہے؟

076 www.taemeernews.com

کیا کوئی ایسی شے ہے جو مرد اور عورت ۔ کالے اور گورے چپٹے اور تیکھے ۔ چھوٹے اور بڑے سب میں یکساں طور پر موجود ہے؟ اگر ان سب کا تعلق ایک ہی نوع انسان سے ہے تو پھر یہ واحد انسانیت کہاں ہے۔ اور کیونکر نظر آسکتی ہے؟ ذاتی طور پر اگر مجھے کسی چیز کے وجود میں یقین ہے تو وہ اسی انسانیت کا وجود ہے جو سب میں مشترک ہے۔ انسانی شعور کی خاصیت ہی یہ ہے کہ کسی چیز کا انفرادی ادراک اس کی بنیادی ہستی کے تصور کی نسبت سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً انسانیت ہی کے تصور کی نسبت سے میں آپ کو مرد یا عورت کی شکل میں دیکھتا ہوں اگر میرے دماغ میں ایک بنیادی انسانیت کا تصور موجود نہ ہو تو مجھے کسی قسم کے فرق اور اختلاف کا شعور ہو ہی نہیں سکتا۔ کثرت کا شعور وحدت کے تصور اور احساس کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہی کیفیت ہے عالمگیر مذہب کے بنیادی تصور کی جو دنیا کے تمام مذاہب میں بشکل خدا جاری وساری ہے یہ تصور ازلی اور ابدی ہے اس کے بغیر مذہب اور روحانیت کا ادراک ناممکن ہے بھگوان کرشن نے گیتا میں فرمایا ہے "میں ہی وہ تار ہوں جس میں یہ تمام موتی پروئے ہوئے ہیں" چھوٹا بڑا ہر مذہب موتیوں کی اس لڑی کا جزو ہے۔ طرح طرح کے یہ موتی بھگوان روپی دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں وحدتِ خدا کے رشتے میں منسلک ہیں لیکن زیادہ تر لوگ اس حقیقت سے بے بہرہ ہیں وحدت در کثرت اس عالم کائنات[1] کا نظام ترکیبی ہے نوع انسانی کے بنیادی تصور کی نسبت سے ہم سب برابر اور یکساں ہیں لیکن انفرادی طور پر ہم کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں طبقہ انسانی کے ایک جزو کی حیثیت سے تو میں اور آپ دونوں یکساں ہیں لیکن بحیثیت جناب فلاں وفلاں ہم ایک دوسرے سے مختلف ہیں مرد کی حیثیت سے تو آپ کا وجود عورت سے مختلف ہے لیکن انسانی رشتے سے آپ میں اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں میں یکسانیت ہے بطور انسان تو آپ کی ہستی جانور کی ہستی سے جدا ہے لیکن ایک جاندار کی حیثیت سے مرد عورت جانور اور پودے سب یکساں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جہاں تک ہستی[2] کے احساس کا تعلق ہے وہ احساس دنیا کی ہر شے میں موجود ہے اس لحاظ سے ہم سب ایک کائناتی ہستی کے حصے دار ہیں ہم سب ایک رشتۂ وحدت میں منسلک ہیں اور یہ رشتۂ وحدت یہ کائناتی ہستی خدا ہی کے وجود کا تصور ہے۔ وہی عالم کائنات کی آخری وحدت[3] ہے۔

ط ۱ Unity in Variety.

ط ۲ Existence.

ط ۳ Ultimate Unity.

077 www.taemeernews.com

خدا کی ذات کا جزو ہو کر اس میں شامل ہو کر ہم سب ایک ہیں لیکن عالمِ ظہور میں انفرادی اور جماعتی سارے اختلافات ہمیشہ قائم رہیں گے۔ ہماری داخلی وحدت جب خارجی دُنیا میں ظاہر ہوتی ہے تو اختلافات ضرور پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ اختلاف مٹ بھی نہیں سکتے۔ فطرت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ ہماری طاقت مختلف کاموں میں علیحدہ علیحدہ پہلوؤں سے نمایاں ہوتی رہے خارجی دُنیا کے اختلافات ہمیشہ قائم رہیں گے اسی لئے اگر عالمگیر مذہب کا تصور یہ ہے کہ ایک ہی قسم کے اصول اور عقائد پر تمام بنی نوعِ انسان یقین لے آئیں۔ سب ایک ہی ماتھالوجی (علم الاصنام۔ دیومالا) کو ماننے لگیں اور ایک ہی دستور یا شریعت کے پابند ہو جائیں اور سب کے رسم و رواج ایک ہی ہو جائیں تو یہ قطعی طور پر ناممکن ہے۔ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا دنیا میں کبھی کوئی ایسا وقت نہیں آسکتا جب سب کے چہرے مہرے یکساں ہو جائیں اور اگر بفرضِ محال کبھی ایسا ہوا بھی تو دُنیا کی ہستی مٹ جائے گی کیونکہ یہ تفریق اور یہ اختلاف ہی تو زندگی کا سنگِ بنیاد ہے یہ تفریق ہی تو ہماری تخلیق کا حقیقی راز ہے۔ وحدت کثرت کا روپ اختیار کر لیتی ہے تو یہ عالمِ کائنات ظہور میں آتا ہے۔ غیر مرئی حالت سے مجسم صورت میں آنا تفریق و اختلاف ہی کا تو نتیجہ ہوتا ہے اگر دُنیا میں مکمل توازن قائم ہو جائے تو پھر دُنیا کی یہ صورت ہی نہ رہے گی یا یوں کہہ لیجئے کہ دُنیا تباہ ہو جائے گی۔ حرارت کا یہ طبعی اصول ہے کہ ہر دو طرف پھیلتی ہے اگر اس کمرے کی گرمی کو اس طرح پھیلنے کا موقع مل جائے تو اس میں گرمی کا احساس ہی مٹ جائے گا۔ کمرے کے اندر اور باہر کے درجۂ حرارت کے فرق ہی سے کمرے کا اپنا مخصوص ماحول قائم ہے ایک اور مثال لیجئے اس دنیا کا دار و مدار حرکت پر ہے لیکن آخر یہ حرکت کیا چیز ہے؟ توازن کے بگڑ جانے سے ہی تو حرکت پیدا ہوتی ہے اگر مکمل توازن قائم ہو جائے تو حرکت کہاں سے ہو گی اور دُنیا کا وجود کہاں ہو گا۔ مکمل یکسانیت اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب یہ دُنیا ختم ہو جائے۔ ورنہ جب تک دُنیا قائم ہے یکسانیت ناممکن العمل ہے اور صرف ناممکن العمل ہی نہیں ہے بفرضِ محال یہ ممکن بھی ہو جائے تو ہمارے حق میں بڑی خطرناک ثابت ہو گی کبھی اس بات کی خواہش نہ کیجئے کہ دُنیا میں سب ہم خیال ہو جائیں پھر تو کوئی بات سوچنے کے قابل رہ ہی نہیں جائے گی۔ اگر ہم سب یکساں ہو جائیں تو ہماری حالت مصری ممیوں[۱] کی طرح ہو جائے گی جو عجائب گھر میں پڑی ایک دوسرے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہتی ہیں۔

---

۱ Egyptian Mummies.

078 www.taemeernews.com

زندگی آپس کے فرق اور اختلاف ہی سے قائم ہے اسی میں ہماری ترقی کا راز ہے توازن کے بگڑنے کا نام ہی حرکت اور حیات ہے۔ ہماری جسمانی اور دماغی قوتیں اسی سے مُتحرک ہوتی ہیں یہی ہماری زندگی کی روح رواں ہیں ہمارے غور و فکر کی جان ہیں جب تک یہ عالم ظہور قائم ہے تفریق اور اختلاف کا ہونا لازمی ہے۔

تو پھر اس عالمگیر مذہب سے میری مُراد کیا ہے؟

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ سب مذہبوں کا فلسفہ ایک ہو۔ سب کی دیو مالا ایک ہو اور سب میں پوجا پاٹھ یعنی پرستش کی رسوم یکساں ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ حیرت انگیز دُنیا ایک پیچیدہ مشینری ہے جس میں پیچ در پیچ بڑے اُلجھاؤ ہیں یہاں یکسانیت کی سادگی ناممکن ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی طریقہ کار ایسا بھی ہے جس سے ہم سب تفرقات اور اختلاف کو مٹا کر اور بغض و عناد کی زنجیروں سے چھٹکارا پا کر چین اور آرام سے زندگی بسر کر سکیں میں کہتا ہوں کہ ہم یقیناً اس مشین روپی دُنیا کو آسانی سے چلا سکتے ہیں۔ اس کے پہیوں میں تیل دے کر اس کی رفتار کو قائم رکھ سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے ہم اس کی پیچیدگی کا اعتراف کریں اور یہ سمجھ لیں کہ زندگی تفریق اور اختلاف پر مبنی ہے یہ تمام فرق مٹائے نہیں جا سکتے۔ ان کو تسلیم کر کے ان کو سمجھ لینے ہی میں کامیاب زندگی کا راز ہے ایک طرف تو ہماری فطرت ہم سے کہتی ہے کہ حقیقت وحدت ہے۔ دوسری طرف ہمارا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ کثرت ہی پر زندگی کا انحصار ہے۔ مکمل توازن ہم رنگی اور یکسانیت زندگی کی ضد ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ حقیقت کا اظہار لاکھوں صورتوں میں ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے اور ان میں سے ہر صورت اپنی جگہ پر سچائی پر مبنی ہے ہمارے لئے اس بات کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ایک ہی چیز ہزاروں نقطہ ہائے نظر سے دیکھی جا سکتی ہے لیکن ہر نقطۂ نظر سے مختلف نظر آنے کے باوجود وہ اپنی جگہ بدستور اپنی شکل میں قائم رہ سکتی ہے۔ مثال کے طور پر آفتاب کو لے لیجیے۔ طلوع کے وقت آفتاب ایک بڑا گولا سا نظر آتا ہے۔ دوپہر اور شام کے وقت اس کی صورت اور ہوتی ہے اور رات کو وہ نظر ہی نہیں آتا مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ بدستور قائم ہے یا فرض کیجیے کہ کوئی شخص اپنے ساتھ ایک کیمرہ لے کر آفتاب کی طرف چل پڑتا ہے اور وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر اس کا فوٹو کھینچتا چلا جاتا ہے حتےٰ کہ وہ آفتاب تک پہونچ جاتا ہے یہ سب فوٹو ایک دوسرے سے مختلف نظر آئیں گے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آفتاب ایک ہی ہے اور یہی حال بھگوان کا ہے۔ بھگوان حقیقت کا سورج ہے ہر شخص اپنے اپنے مقام ارتقا سے بھگوان کو سمجھنے میں کوشاں ہے کسی کو بھگوان ایک صورت میں نظر آتا ہے تو کسی کو دوسری صورت

079 www.taemeernews.com

ہیں۔ یہ تو اپنی اپنی نظر کی بات ہے بھگوان تو دراصل ایک ہے کوئی اسے بلند قسم کے فلسفے کی معرفت سمجھتا ہے تو کوئی ہزارہا قسم کے من گھڑت قصوں کے ذریعہ کہیں ارفع و اعلیٰ علم الاصنام موجود ہے تو کہیں کثیف ترین قسم کی دیومالا۔ کسی مذہب میں پوجا پاٹھ (پرستش) کی رسمیں نفاست کی حد تک پہونچ گئی ہیں اور کسی کے یہاں نہایت ٹھوس قسم کی بُت پرستی کا رواج ہے جس کی بنیاد محض توہمات پر ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان ہر فرقہ ہر قوم اور ہر مذہب دانستہ یا نادانستہ طور پر روحانی بلندی کی طرف گامزن ہے یہ سب ایک ہی خدا کو پانے کے لئے سر توڑ جدوجہد کر رہے ہیں[1] جس کسی کو حقیقت کا دیدار جس صورت سے بھی ہو خدا ہی کا دیدار ہے اور کسی چیز کا نہیں اس نکتے کی وضاحت ایک اور مثال سے یوں کی جا سکتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ہم لوگ اپنے ہاتھ میں ایک برتن لے کر کسی جھیل سے پانی بھرنے جاتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں پیالہ ہے تو کسی کے پاس گلاس۔ کوئی بالٹی لے کر جاتا ہے تو کوئی گھڑا۔ بہرحال ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے برتن میں پانی بھر لیتا ہے اگرچہ یہ پانی ایک ہی جھیل کا ہے لیکن مختلف برتنوں میں بھرے جانے کی وجہ سے مختلف برتنوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ حالانکہ ہر برتن میں ایک ہی جھیل کا پانی ہے بالکل یہی صورت مذہبوں کی ہے۔ تمام مذاہب ان برتنوں کی مانند ہیں جن میں خدا ہی کی معرفت کا پانی بھرا ہوا ہے جن لوگوں کو اس پانی سے اپنی پیاس بجھانا ہو وہ جس برتن سے چاہے پانی پی لیں سوال تو صرف پیاس کا ہے۔ پانی پی لینے کے بعد آخر کار برتن کو عموماً پھینک ہی دیا جاتا ہے۔ ہماری غرض برتنوں سے نہیں ان کی مختلف صورتوں سے نہیں۔ ہمیں تو معرفت کا امرت پینا ہے کسی پیالے میں پی لیا تو خیر ورنہ اوک ہی سہی یہی وہ حقیقت ہے جس کو پا کر ہم عالمگیر مذہب کے تصور کو سمجھ سکتے ہیں۔ کائناتی وسعت یا عالمگیریت کا عرفان یہی ہے کہ تمام مذاہب کے ظاہری اختلافات کے پس پشت ایک خدا

---

[1] Through high philosophy or low, through the most exalted mythology or the grossest, through the most refined ritualism or the arrant fetishism, every soul, every sect, every nation, every religion, consciously or unconsciously is struggling towards God, every vision of truth that man has in the vision of Him and none else.

080 www.taemeernews.com

کی حقیقت کو دیکھا جائے جو لاشریک ہے یکتا ہے واحد ہے اور جس کو حاصل کرنے کے لئے ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق متواتر کوشش کر رہا ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اصولی طور پر تو یہ سب باتیں ٹھیک ہیں لیکن کیا مذہبوں کے مابین باہمی اتحاد و آشتی کے پیدا کرنے کی کوئی عملی صورت بھی ہوسکتی ہے یا نہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں کہ در اصل تمام مذاہب حقیقت پر مبنی ہیں یہ خیال کافی پرانا ہے تمام مذاہب کو محبت اور باہمی اتحاد کے رشتے میں منسلک کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں ہندوستان مصر، یورپ چین، جاپان اور تبت میں یہ کوششیں مدت سے ہوتی چلی آئی ہیں اور زمانۂ حال میں امریکہ والوں نے بھی اسی بات کی متعدد بار کوشش کی ہے کہ کوئی ایسا مذہبی مسلک بنایا جائے جس کی بنیاد باہمی اتحاد و آشتی ہو لیکن ان کی یہ کوششیں بار آور نہ ہوسکیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں کوئی عملی پلان اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ متعدد اشخاص و اصحاب نے فرداً فرداً اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تمام مذاہب اپنی اپنی جگہ راہ راست پر ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے ان مذاہب کو متحد کرنے کے لئے کوئی بھی ایسی راہ نہیں دکھائی جس پر چل کر سب مذاہب متحد بھی ہوجائیں اور ساتھ ساتھ اپنی انفرادیت بھی قائم رکھ سکیں۔ اتحاد محض انفرادیت کے وجود کو مٹا دینے کا نام نہیں اتحاد کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ مختلف اجزا کو یکجا کیا جائے اسی لئے مذہبی اتحاد کا صرف وہی عملی پلان کامیاب ہوسکتا ہے جس میں کسی بھی مذہب کے پیرووں کی انفرادی حیثیت منہدم نہیں ہونے پاتی لیکن ساتھ ہی ساتھ انہیں دوسرے مذہب والوں سے رابطۂ اتحاد قائم کرنے کا موقع بھی ملتا ہے دوسرے لفظوں میں قابل عمل اور کامیاب طریقۂ کار وہی ہوسکتا ہے جو ہمیں اس مقام اتصال تک پہونچا دے جہاں مختلف مذہبی خطوط ایک دوسرے کو قطع کئے بغیر مل جائیں۔ ابھی تک مذہبی اتحاد کے جتنے پلان بنائے گئے ہیں ان میں کہنے کو تو مختلف مذاہب کے تمام نظریوں کو شامل کیا گیا ہے لیکن عملی طور پر اُن سب نظریوں پر پابندیوں اور نئے نظریوں کا ایک اور سلسلہ عاید کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نتیجہ ہمیشہ یہی نکلتا رہا ہے کہ ان پابندیوں اور ان نئے نظریوں نے بجائے خود نئے مذہبی فرقوں کی صورت اختیار کرلی اور تفرقات مٹنے کے بجائے بڑھتے گئے تفرقہ بازی زور ہی پکڑتی گئی۔

آج میں آپ کے سامنے ایک چھوٹا سا پلان پیش کر رہا ہوں میں نہیں جانتا کہ یہ پلان کہاں تک بروئے عمل لایا جاسکتا ہے میں خود یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ پلان کہاں تک کامیاب ہوسکتا ہے۔ میں آپ کو اس پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میرا پلان کیا ہے؟ سب سے پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ انسان کسی قسم کی بھی تخریب کے خیال کو دل سے نکال ڈالے۔ اسے بالکل ترک کر دے۔ تعمیر کے لئے تخریب

www.taemeernews.com

ضروری نہیں جس چیز کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔ کسی چیز کو بھی تباہ و برباد نہ کیجئے بُت شکن رفارمروں[۱] سے دُنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا کیونکہ ان کی تمام قوتیں تخریب ہی کے کام میں صرف ہوجاتی ہیں کسی چیز کی شکست و ریخت نہ کیجئے ہوسکے تو تعمیری کام میں سرگرم ہو جائیے اگر آپ میں کسی کی مدد کرنے کی قوت ہے تو مدد ضرور کیجئے لیکن اگر آپ مدد نہیں کرسکتے تو چپکے سے دِل ہی دِل میں اپنی مجبوری کا اعتراف کرتے ہوئے معافی مانگ لیجئے ہاتھ جوڑ کر ایک طرف ہو جائیے تاکہ اور لوگوں کو کام کرنے کا موقع ملے ۔اپنی مجبُوری کی پردہ پوشی کے لئے شور مچانا یا کسی قسم کا مصنوعی ڈھونگ رچانا فضول سی بات ہے۔ بے فائدہ ہے اس سے کوئی نتیجہ نکلنے کا نہیں۔ توڑ پھوڑ کرنے سے بہتر ہے کہ موجودہ صُورتِ حالات جیسی بھی ہے اسے جاری رہنے دیجئے اگر آپ مدد نہیں کرسکتے تو نقصان تو نہ پہونچائیے کسی کے عقائد کے خلاف اسوقت تک ایک حرف بھی زبان پر نہ لائیے جب تک اُس میں خلوص کا ذرا بھی شائبہ نظر آئے۔ میرے پلان کا دوسرا بنیادی اصُول یہ ہے کہ پہلے ہر شخص کے نجی مقامِ ارتقاء کو سمجھئے اور پھر اسی کی نسبت سے اسے بلند تر مقام تک لے جائیے اگر یہ سچ ہے کہ خدا تمام مذاہب کا مرکز ہے اور ہم میں سے ہر شخص اپنے نصف قطر پر چل کر اس مرکز کی طرف جا رہا ہے تو یہ بھی مُسلّم ہے کہ ہم سب اس مرکز تک کبھی نہ کبھی پہونچ جائیں گے جس طرح مرکز پر پہونچ کر تمام نصف قطر آپس میں مل جاتے ہیں اسی طرح خدا کو پاکر ہمارے تمام باہمی اختلافات بھی دوُر ہو جائینگے لیکن جب تک ہم مرکز پر نہیں پہونچ جاتے اس وقت تک تفرقات اور اختلافات کا یہ سلسلہ جاری رہے گا البتہ یہ ضرور ہے کہ مختلف ملکوں کا فطری جُھکاؤ متعدد نصف قطروں کی طرح ایک ہی مرکز یعنی خدا کی طرف ہوتا ہے۔ ایک شخص اپنی فطرت کے مطابق ایک راستے سے سفر کرتا ہے اور دوسرا شخص دوسرے راستے سے لیکن ہم سب اپنے اپنے راستے پر چلتے ہوئے آخر یقیناً مرکز تک پہونچ جائیں گے[۲] کیونکہ تمام راستوں کی منزل ایک ہی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی فطرت کے تحت ترقی کر رہا ہے وقت آنے پر ہم سب کو ارفع ترین حقیقت کا عرفان حاصل ہو کر رہے گا۔ اصُولِ ارتقا کا تقاضا یہی ہے کہ آخر انسان خود ہی اپنی ذات سے علم عرفان حاصل کرے گا۔ ہر انسان اپنا گرو آپ ہے کوئی کسی کے لئے کیا کر سکتا ہے؟ کوئی کسی کو کیا سکھا سکتا ہے۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ ایک بچے کی بھی درس و تدریس کرسکتے ہیں تو یہ خیال غلط ہے یہ آپکے بس کی بات نہیں۔ ہر بچہ اپنا آپ مُعلّم ہے آپ کا فرض تو یہ ہے کہ آپ اس کے لئے مواقع مہیا کریں اور اس کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دُور کر دیں جیسے آپ کوئی پودا لگاتے ہیں تو اس کے اُگنے اور بڑھنے کا عمل آپ کے اختیار میں نہیں ہوتا لیکن آپ اتنا ضرور کرسکتے ہیں کہ پودے کے گرد جھاڑ بندی کردیں اور اس

---

۱ Reformers. ۲ All roads lead to Rome.

082 www.taemeernews.com

بات کی احتیاط کریں کہ کہیں کوئی جانور اسے چر نہ جائے بس آپ کا فرض یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ پودا تو خود اُگتا اور پروان چڑھتا ہے۔ یہی حال ہے ہر انسان کی رُوحانی نشو و نما کا کوئی آپ کو اس کا درس نہیں دے سکتا کوئی آپ کو رُوحانی انسان نہیں بنا سکتا۔ آپ کو خود ہی درس لینا ہے آپ کی نشو و نما تو آپ کے باطن ہی میں ہو سکتی ہے۔

کوئی خارجی معلم سکھا ہی کیا سکتا ہے وہ تو صرف رکاوٹوں کو دُور کر سکتا ہے بس اس کے آگے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر ممکن ہو تو آپ کسی کی مدد کر دیجئے لیکن تدریس و تعلیم کے پردے میں کسی چیز کو تباہ و برباد نہ کیجئے۔ اس قسم کے غلط اور بے بُنیاد خیالات کو ترک کر دیجئے کہ آپ انسانوں میں روحانیت پیدا کر سکتے ہیں یہ ناممکن ہے خود آپ کے آتما کے سوا آپکا کوئی گرُو کوئی مُرشد نہیں ہو سکتا۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کا نقطۂ نظر اور طریقۂ کار ہی بدل جائے گا۔ اس اصُول کو تسلیم کر لیجئے اور پھر دیکھئے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے سماج میں ہم کو مختلف مزاج کے آدمی ملتے ہیں۔ ہزاروں قسم کے دماغ اور ہزاروں قسم کے رجحانات ہوتے ہیں مکمل طور پر تو ان کی تعلیم ناممکن ہے لیکن عملی مقاصد کے لئے ان رجحانات کو چار زمروں[ل] میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے زمرے میں وہ اشخاص آتے ہیں جو ہر وقت سرگرم اور مستعد رہتے ہیں ہمیشہ کچھ نہ کچھ کام کرتے رہنا چاہتے ہیں۔ اُن کے رگوں اور پٹھوں میں بڑی زبردست طاقت ہوتی ہے۔ اس قسم کے لوگوں کی زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دُنیا میں بڑے بڑے کام سرانجام دیں اور انھیں لوگوں کے ہاتھوں سے عظیم الشان کام سرانجام پاتے بھی ہیں شفاخانے اور آشرم بنائے جاتے ہیں ترقی کی راہیں کھُلتی ہیں یہی لوگ منصوبے اور پلان تیار کر کے انھیں عملی جامہ پہناتے ہیں یہ تمام تنظیم و تعمیر انھیں کی بدولت ظہُور پذیر ہوتی ہے۔

دوسرے زمرے میں وہ لوگ آتے ہیں جو جذبات کے تحت کام کرتے ہیں ایسے لوگوں کو بلند اور حسین چیزوں سے والہانہ محبت ہوتی ہے وہ قدرت کے جمالیاتی رُخ پر جان دیتے ہیں۔ احساسِ جمال سے محظوظ ہوتے ہیں حسن و جمال کے دیوانے عشق و محبت کی پرستش کرتے ہیں اپنی فطرت کے تقاضوں کے مُطابق وہ حسین سے حسین چیز کی متواتر تلاش کرتے رہتے ہیں۔ عشق و محبت کے

ل the worker, the lover, the mystic and the philosopher or the active, the emotional, the mystic and the contemplative.

083 www.taemeernews.com

یہ پجاری آخر خدا کی محبت کو پالیتے ہیں ان کا شوقِ جمال بڑھتے بڑھتے آخر اس پیکرِ جمال کے تصور کو پالیتا
ہے جسے ہم "خدا" کہتے ہیں۔ ان کا سرِ محبت کے سجدۂ شکرانہ میں جھک جاتا ہے ایسے لوگ عرفانِ محبت
کی بدولت دُنیا کے مختلف مذہبوں سے تعلق رکھنے والے تمام زندۂ جاوید پیغمبر، ولی اوتاروں کی عزت
سچے دل سے کرتے ہیں بلکہ وہ تو ان کو پُوجتے ہیں ان کے قدموں میں عقیدت اور محبت کے پھول نچھاور
کرتے ہیں اور اُن کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر ڈالتے ہیں ان کو اس سے غرض نہیں کہ عقل اور دلیل
سے حضرت مسیح یا بھگوان بدھ کا وجود ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں وہ اِس پھیر میں نہیں پڑتے کہ حضرت مسیح
نے سرمن[1] آن دی ماؤنٹ کس تاریخ کو دیا تھا یا بھگوان کرشن کے جنم کی کون خاص ساعت تھی ان کو تو
مطلب ہوتا ہے ان بزرگوں کی شخصیتوں سے۔ ان کی محبوب ہستیوں سے۔ یہ ہے نوعیت جذباتی لوگوں
کے جمالیاتی نصب العین کی یہ ہے معراج عشق کی۔

تیسرا طبقہ صوفیوں یعنی اہلِ باطن[2] کا ہوتا ہے جن کا دماغ خود اپنا تجزیہ نفسی کرنا چاہتا ہے
وہ جاننا چاہتے ہیں کہ انسانی دماغ کس طرح کام کرتا ہے۔ تزکیۂ نفس کی کیا کیا صورتیں ہیں اور وہ کون
سی طاقتیں ہیں جو پردۂ باطن میں کارفرما ہیں اور ان طاقتوں کا علم کیسے پایا جا سکتا ہے ان پر
قدرت کیسے حاصل ہو سکتی ہے نیز یہ کہ انھیں کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اسکے سادھن
کیا ہیں۔

چوتھے زمرے میں فلاسفر آتا ہے جو ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے جو ہر قول کو دماغ
کی ترازو میں تولتا ہے لیکن آخر کار اپنے شعور اور ادراک کو اس ماورائی مقام پر لے جانا چاہتا ہے
جہاں کسی قسم کے بھی منطق اور فلسفے کا گزر نہیں۔

ظاہر ہے کہ عالمگیر مذہب وہی ہو سکتا ہے جو نوعِ انسانی کے ان تمام طبقوں کو تسکین اور
آسودگی بہم پہونچا سکے۔ جو اِن مختلف قسم کے دماغوں کے لئے غذا مہیا کر سکے اور اگر کسی مذہب میں
یہ صلاحیت نہیں ہے تو وہ صرف کسی خاص طبقے کا مذہب ہو سکتا ہے اسے ہمہ گیری نہیں حاصل
ہو سکتی اور مذہب کی اِسی تنگ دامانی سے تو تعصب پیدا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے تقریباً
سارے مذہبی فرقے تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ جذباتی طبقے کے کسی مذہبی مسلک
کو لے لیجئے ان کے ہاں پریم اور بھگتی اور بھاؤ (جذباتِ محبت۔ حال و سرور) کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ

---

[1] Sermon on the Mount   [2] The mystic.

084 www.taemeernews.com

لوگ مستی کی حالت میں گاتے بجاتے اور ناچتے ہیں اور پھر شدّتِ جذبات کے تحت خوشی کے آنسو بھی بہانے لگتے ہیں وہ کبھی دردِ فرقت سے بے چین ہو ہو کر روتے ہیں۔ زار نالی کرتے ہیں۔ آپ اِن میں شامل ہونا چاہیں تو یہ لوگ آپ کو بخوشی قبول کریں گے لیکن آپ ذرا ان سے یہ کہہ کر تو دیکھئے کہ بھئی یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن میں کسی طور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں مجھے تو کسی طاقت بخش۔ جان پرور اور مرد ساز چیز یعنی دلیل اور فلسفے کی ضرورت ہے میں ہر چیز کو تدریج سمجھنا چاہتا ہوں اور وہ بھی معقولات سے کام لے کر" فوراً آپ کو جواب ملے گا کہ" آپ یہاں سے تشریف لے جائیے"۔ صرف یہی نہیں بلکہ اگر ان کا بس چلے تو وہ آپ کو جہنم واصل بھی کردیں میری مراد یہ ہے کہ اس مت یا عقیدے والے صرف انھیں لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں جن کا مزاج خود ان کی طرح جذباتی ہو ان کے علاوہ دوسروں کی مدد کرنا تو در کنار یہ لوگ انھیں تباہ و برباد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے کیونکہ وہ اس بات کا خیال تک نہیں کر سکتے کہ خدا کو پانے کا کوئی اور طریقہ بھی ہو سکتا ہے اس تمام صورت حالات کا دردناک پہلو یہ ہے کہ خدائے تعالےٰ کے یہ پُرخلوص بندے دوسروں کے خلوص کو نظر میں بھی نہیں لاتے اسی طرح آپ کو کچھ فلاسفر بھی ایسے ملیں گے جو ہند اور مشرق کی روحانی اُمنگوں کے قصے بیان کریں گے اور بڑی بڑی نفسیاتی اصطلاحیں استعمال کریں گے جن کے پچاس پچاس ارکان[۱] تہجی ہوں گے لیکن اگر میری طرح کا کوئی معمولی آدمی ان کے پاس جاکر کہے کہ آپ مجھے بھی کوئی ایسی رُوحانیت کی بات بتا دیجئے جس سے میری زندگی سُدھر جائے تو اس کے جواب میں پہلے تو وہ مُسکرائیں گے اور پھر فرمائیں گے، ہوش کی دوا کرو ابھی تمھارے پاس سمجھنے کا دماغ ہی نہیں۔ کہاں ہمارا مقام اور کہاں تم۔" رُوحانیت کے متعلق تمھاری سمجھ میں کیا خاک آئے گا" یہ ہے بزعم خود بلند مقام فلاسفروں کا حال آپ کو دھتکار دینے کے علاوہ ان کے بس کی کوئی بات ہی نہیں صُوفی لوگ تو عالمِ وجود کے مختلف طبقوں کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں دماغ کی مختلف کیفیتوں اور قوتوں کا حال بتاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی معمولی آدمی ان سے کہے کہ" یہ بڑی بڑی باتیں میرے بس کی بات نہیں"۔ مجھے تو کوئی نیک صلاح دیجئے جس پر میں عمل کر سکوں۔ کوئی ایسا کام بتائیے جو میرے لائق ہو اور جسے میں نباہ سکوں" تو وہ ہنس پڑیں گے اور کہنے لگیں گے کہ" ذرا ان کی باتیں سُنئے۔ کتنی گہری جہالت کا پردہ پڑا ہوا ہے ان کے دماغوں پر۔ ان کی تو زندگی ہی خراب ہو رہی ہے۔

تو یہ حال ہے مختلف فرقوں کے رہنماؤں کا جہاں دیکھو ہر طرف۔ یہی کیفیت نظر آرہی ہے میرا

---

[۱] Alphabets.

www.taemeernews.com

بس چلے تو ان مت متانتروں کے کٹر پنتھیوں کو اکٹھا کر کے ان کی تحقیر آمیز مسکراہٹوں کا فوٹو کھنچواؤں تاکہ سند کے طور پر کام آئے ان حالات میں میں کسی خاص مذہب کی تبلیغ نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو صرف ان شرائط کا ذکر کروں گا جن کے بغیر کوئی مذہب عالمگیر نہیں ہو سکتا جس عالمگیر مذہب کا آدرش میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں اسے ایسا ہونا چاہیئے کہ ہر شخص کی طبیعت اُسے قبول کر سکے وہ فلسفی عاشق اور صوفی سب کے لیے یکساں طور پر قابل عمل ہو فلاسفر کے فلسفیانہ معیار کو پورا اترے جذباتی لوگوں کی جمالی ضروریات کو پورا کرے اور صوفیوں کے لیے تصوف اور عرفان کی مستی دامن میں لیے ہو اور محض یہی نہیں بلکہ کالجوں کے پروفیسروں سائنسدانوں اور علم طبیعات کے ماہروں کے ہر سوال کا حل مہیا کرے۔ ان کی منطق اور ان کی دلیل کا معقول و مدلل جواب پیش کرے لیکن یہاں ایک بات بتا دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ یہ تمام دلائل اور مباحثے محض اس دعوے کو ثابت کرنے کیلئے ہوتے ہیں کہ مادی زندگی بجائے خود مکمل نہیں اس کے علاوہ روحانی زندگی کا بھی وجود ہے روحانی زندگی کا بذات خود شعور عقل و خرد سے ممکن نہیں اس کا احساس منطق اور دلیل کی حدوں سے نکل کر ہی ہوتا ہے اگر مذہب درحقیقت مذہب ہے تو اس پر عمل کے دوران میں ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں منطق اور دلیل کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اگر کوئی پروفیسر، سائنس داں یا فلاسفر یہ سمجھے کہ خدا اور نجات کے تصورات محض توہمات ہیں انہیں ترک کر دیجئے تو میں تو یہی کہوں گا کہ روحانی زندگی کے وجود کا مدلل ثبوت بہم پہنچانے پر بھی اگر کوئی شخص مذہبی طریقۂ عمل کو وہم قرار دے تو وہ خود تعصب اور وہم کا شکار ہو رہا ہے۔ ایسے فلاسفر یا سائنس داں کی خدمت میں تو میں یہ عرض کروں گا کہ جناب والا۔ خود آپ کی سائنس اور فلاسفی کا نظریہ یہ ہے کہ تمام خارجی کائنات دراصل ایک ہے یہ تمام عالم ظہور اس واحد الوجود کی مختلف صورتوں کا البم ہے اس لحاظ سے خود آپ کے جسم کا وجود بھی تو توہماتی ہے اور اسے بھی ترک کر دینا چاہیئے کھانا پینا چھوڑ دینا چاہیئے۔ ہر قسم کے کاروبار سے دست بردار ہو جانا چاہیئے لیکن آپ تو اس وہم کو اپنائے ہوئے ہیں جس طرح آپ اپنا کام نہیں چھوڑ سکتے۔ کھانے پینے سے دست کش نہیں ہو سکتے اسی طرح روحانیت کا طلبگار کسی قیمت پر بھی مذہب کو خیرباد نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مذہب ہی تو ہمیں وہ عملی طریقہ بتاتا ہے جس سے آپ کے اس فلسفے کا ذاتی احساس ہوتا ہے کہ یہ دنیا ایک ہی وجود کی مختلف صورتوں کا مجموعہ ہے جس چیز کا آپ کو دماغی شعور ہوتا ہے وہ اسی کا ذاتی احساس پیدا کرنا چاہتا ہے آپ اس راہ پر گامزن نہیں ہو سکتے تو نہ سہی۔ دوسروں کو

086 www.taemeernews.com

تو ہم پرستی کا الزام نہ دیجئے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ایک عالمگیر مذہب میں ہر شخص کو اس کی طبیعت کے رجحان سے مطابقت رکھنے والی راہ عمل کے دکھلانے کی صلاحیت ہونی چاہیئے اگر ہم کسی ایسے مذہب کے پیرو ہیں تو ہم سائنس دانوں اور فلاسفروں کے دلائل کا جواب تو منطق سے دیں گے ہی لیکن اگر ہمارے یہاں کوئی صوفی مزاج آدمی آئے تو ہم اس کا بھی خیر مقدم کریں گے اور اس کو دماغی تجزیہ و تحلیل کا گر سکھائیں گے ہی نہیں بلکہ اس کے سامنے اس کا عملی مظاہرہ بھی کر کے دکھائیں گے۔ ہمارے پاس جذباتی قسم کے لوگ آئیں گے تو ہم ان کے ساتھ مل کر "شراب محبت" پئیں گے۔ ان کے ساتھ محبوب کی یاد میں روئیں گے۔ اس کے خیال سے مسرور ہو کر گائیں گے اور مستی اور حال کی کیفیات میں گم ہو کر پاگل ہو جائیں گے۔ دوسری جانب اگر کوئی مستعد اور چاق و چست کر مچاری (کارگزار) ہمارے پاس آ پہنچے تو ہم بھی اپنی پوری طاقت سے اس کے ساتھ مل کر کام کریں گے جس مذہب کی وسعتوں میں یہ چاروں خوبیاں پائی جاتی ہیں وہی آدرش مذہب ہوتا ہے اور جس آدمی کی سرشت میں فلسفہ جمالیات قوت عمل اور تصور کے عناصر متوازن اور مناسب مقدار میں موجود ہیں صرف یہی آدمی آدرش پرش یا مکمل انسان ہے۔ کاش تمام انسانوں کے دماغوں کی ساخت ایسی ہوتی کہ اس میں یہ چاروں اجزا پوری مقدار میں موجود ہوتے۔ ہونے کو تو ہر شخص میں یہ چاروں عناصر کم و بیش موجود ہوتے ہیں لیکن عملی صورت عموماً ایک دو ہی عنصر اختیار کرتے ہیں جس شخص کے دماغ میں ان سے ایک یا دو اجزا کارفرما ہوتے ہیں میری نظر میں اس کی بھی تکمیل نہیں ہوتی! اس لحاظ سے دنیا قریب قریب تمام تر ادھورے انسانوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کا دماغ بس ایک آدھ خیال کا حامی ہو سکتا ہے وہ بس ایک ہی تنگ راہ پر چل سکتے ہیں جسے ان کی محدود فکر و نظر اختیار کر لیتی ہے اس کے علاوہ ان کی نظر میں اور ہر چیز خطرناک اور مہیب ہوتی ہے۔

میرا آدرش مذہب وہ ہے جس میں ان چاروں عناصر کی گنجائش ہو ہمارے ہاں اس مذہبی مسلک کو یوگ کا نام دیا گیا ہے یوگ کے معنی ہیں اتصال یعنی متحد کرنا جن لوگوں کو کام کرنے کا شوق ہے ان کی نگاہ میں یہ رشتہ اتصال ہر انسان اور تمام طبقہ انسانیت کے درمیان ہوتا ہے عشق حقیقی کے دیوانوں کی نظر میں یہ اتصال خود ان کی ذات اور "خدائے محبت" کا باہمی اتصال ہے صوفی کے خیال میں یہ اتصال روح انسانی اور روح اعظم کا اتصال ہے فلسفی اس کو تمام موجودات کا باہمی اتصال کہتے ہیں ان کا نظریہ وحدت الوجود کا نظریہ ہے ان چار قسموں کے اتصال یا یوگ کے سنسکرت زبان میں چار اصطلاحی نام ہیں یعنی کرم یوگ بھگتی یوگ راجیہ یوگ اور گیان یوگ۔ جو شخص اس اتصال کا جویا ہوتا ہے اس کو یوگی کہتے ہیں۔ کام

www.taemeernews.com

کاج یعنی خدمت خلق کے ذریعہ خدا کو ڈھونڈنے والے کو کرم یوگی کہتے ہیں عشق و محبت (پریم اور بھگتی) کے ذریعہ محبوب حقیقی کے ساتھ وصل کے طلبگار کو بھگت یوگی کہا جاتا ہے۔ تصوف کے ذریعہ اس کے متلاشیوں کو راج یوگی یا راج رشی کے لقب سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو لوگ فلسفے کے ذریعہ اس سے ایک ہونے کے خواہاں ہوتے ہیں وہ گیان یوگی کہلاتے ہیں میں آپ کے سامنے ان چاروں یوگوں کے متعلق ابھی کچھ اور تفصیلاً عرض کروں گا لیکن اس سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ لفظ یوگ کی تھوڑی سی مزید تشریح کردی جائے۔

آپ کے ملک میں لفظ یوگ کے ساتھ نہ جانے کیا کیا عجیب و غریب اور معقولیت سے بعید چیزیں منسوب کردی گئی ہیں اسی لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ پہلے آپ کو یہ بتاؤں کہ یوگ کا جادو ٹونے اور ایسی ویسی اوٹ پٹانگ باتوں سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں۔ یوگ کسی مافوق الفطرت بازی گری کا نام نہیں ہے۔ کسی قسم کے یوگ میں بھی عقل و دلیل کو ترک نہیں کیا جاتا اگر انسان اپنی عقل سے کام نہیں لے گا تو کبھی نہ کبھی ضرور دھوکا کھائے گا۔ چالاک اور دغاباز لوگ اس کا اُلو بنالیں گے۔ یوگ آپ سے دھوکا کھانے کو نہیں کہتا۔ یوگ یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ بغیر سوچے سمجھے اپنے آپ کو پروہتوں پنڈتوں یا راہبوں کے سپرد کردیں یوگ کا تقاضا یہ بھی نہیں کہ آپ کسی مافوق الطبع پیغمبر کی اندھا دھند پیروی کریں۔ یوگ کا تو اصول یہ ہے کہ جو کچھ آپ کی سمجھ میں آئے اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہئے جس چیز کو آپ کی عقل قبول نہیں کرتی اسے مجبوراً قبول نہ کیجئے۔ ایسی چیز کا ترک ہی بہتر ہے۔

حصول علم کے تین وسیلے ہوتے ہیں پہلا وسیلہ تو ہے احساس یا تحریک طبعی[لے] کا۔ جانوروں کا کام اسی تحریک طبعی سے چلتا ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ جانوروں میں یہ تحریک طبعی کافی حد تک نشوونما پاچکی ہے یہ حصول علم کا ادنےٰ ترین وسیلہ ہے اس کا دوسرا وسیلہ ہے دلیل و منطق۔ انسان میں اس کا ظہور بہت زیادہ ہوتا ہے تحریک طبعی کا وسیلہ ناکافی ہوتا ہے اسی لئے جانوروں کا دائرہ عمل بہت محدود ہوتا ہے یہی تحریک طبعی انسان میں ارتقا پذیر ہوکر دلیل و منطق کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور اس کے عمل کا دائرہ بھی وسیع ہوجاتا ہے لیکن دلیل و منطق کی بھی[لے] ایک حد ہوتی ہے اس سے مکمل طور پر مطلب براری نہیں ہوتی۔ دلیل و منطق کے قدم تھوڑی ہی دور تک اُٹھ سکتے ہیں اور ایک مقام پر جاکر رُک جاتے ہیں اس کے آگے نہیں بڑھ سکتے اور اگر آپ زبردستی دلیل و منطق کا سلسلہ آگے جاری رکھتے ہیں تو اس

لے Instinct.

لے ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں ؎ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل ؛ لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے

088 www.taemeernews.com

سے انتشار پیدا ہو جاتا ہے جس کا آپ کے پاس کوئی علاج نہیں۔ خود دلیل و منطق میں نا واجبیت آجاتی ہے۔ دلیل و منطق کا ایک بے معنی چکر پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مادّہ اور طاقت ہی کو لے لیجیے جو شعور اور ادراک کی بنیاد ہے۔ مادّے کی تعریف کیا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ مادّہ وہ چیز ہے جس پر طاقت کا عمل ہوتا ہے اور طاقت کسے کہتے ہیں طاقت اس چیز کو کہتے ہیں جو مادّے پر عمل کرتی ہے دیکھا آپ نے اس بات کی پیچیدگی کو؟ منطقی حضرات اس حالت کو تلوّن اور تذبذب کہتے ہیں اس میں ایک خیال دوسرے کا محتاج ہوتا ہے اور دوسرا خیال پہلے کا۔ اس مقام پر پہونچ کر دلیل و منطق کے قدم رُک جاتے ہیں یہ ایسی رکاوٹ ہے کہ اس کے آگے نکلنا ان کے بس کی بات نہیں پھر بھی دلیل و منطق اس سے آگے بڑھ کر لا محدودیت کے طبقے میں جانے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ یہ تمام عالم کائنات جس کو ہمارے حواس محسوس کر سکتے ہیں یا جس کا شعور ہمارے دماغ کو ہوتا ہے۔ محض ایک شمّہ ایک حقیر ذرہ ہے ایک ایٹم ہے اس وجود کا جو لا محدود ہے بے پایاں ہے اور جس کا ظہور بیداری یا شعور کی سطح پر ہو رہا ہے اور اس بیداری یا شعور کے تار و پود سے ترشح ہونے والی تنگ حدوں کے اندر اندر ہی رہ کر عقل اور دلیل یہ دونوں چیزیں اپنا کام کرتی ہیں اس حد سے آگے بڑھنا ان کے لئے ناممکن ہے، وہاں تک اُن کا گزر نہیں۔ اسی لئے کوئی ایسا اور وسیلہ ہونا چاہیئے جس کی مدد سے ہم ان حدود کے آگے جا سکیں اور وہ وسیلہ ہے القا[1] کا۔ الہام کا۔ تو گویا علم حاصل کرنے کے تین وسیلے ٹھہرے۔ (۱) یعنی تحریکِ طبعی (۲) عقل و دلیل اور (۳) القا یا الہام۔ تحریکِ طبعی کا تعلق جانوروں سے ہے عقل کا تعلق انسان سے ہے اور القا یا الہام کا تعلق خدا رسیدہ انسانوں سے ہے۔

یہاں ان دو باتوں کا یاد رکھنا لازمی ہے ایک تو یہ کہ حصول علم کے یہ تینوں وسیلے بیک وقت ہر انسان کی دسترس میں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ تحریکِ طبعی انسان میں بالکل مٹ جاتی ہے یا خدا رسیدہ انسان عقل و خرد سے کام لینا ہی چھوڑ دیتے ہیں ہر انسان اپنے ارتقائی مقام کی نسبت سے بیشتر ان تینوں وسائل کو کام میں لاتا ہے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر وسیلہ دوسرے وسیلے کی ارتقائی صورت ہے اس کی ضد نہیں ہے تحریکِ طبعی ہی بڑھ کر عقل اور دلیل کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور عقل و دلیل ہی نشوونما پا کر القا یا الہام کا مرتبہ پا لیتے ہیں اسی لئے القا یا الہام سے عقل کا استرداد نہیں ہوتا یہ تو عقل و دلیل کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ جو باتیں عقل کے ذریعہ سمجھ میں نہیں آتیں وہ القا کے ذریعہ صاف نظر آجاتی ہیں لیکن اس القا یا الہام سے عقل و دلیل کی تردید نہیں ہوتی۔ بڑھاپا عہد طفلی کا استرداد نہیں

---

[1] Inspiration.

089 www.taemeernews.com

ہوا کرتا۔ ہاں اس عمر رسیدگی سے بچے کی زندگی پایۂ تکمیل کو پہونچتی ہے لیکن جس طرح بڑھاپے اور بچپن میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے اور بچپن کی سادگی کو بڑھاپے کی تجربہ کاری کے برابر سمجھنا غلطی ہے اسی طرح ادنٰے درجے کے وسیلے یعنی تحریکِ طبعی کو غلطی سے اعلیٰ درجے کے وسیلے یعنی الہام کے مساوی سمجھ لینا عظیم خطرات کا موجب ہوتا ہے بعض مرتبہ دُنیا میں تحریکِ طبعی کو القا کی شکل میں پیش کرکے پیغمبری اور رسالت کے جھوٹے دعوے پیش کئے جاتے ہیں بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ ایک احمق یا نیم خبطی قسم کا آدمی اُس انتشار کو جو اس کے دماغ میں ہر وقت جاری رہتا ہے۔ القا یا الہام سمجھ بیٹھتا ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ اس کی پیروی کریں اور دُکھ کی بات تو یہ ہے کہ وہ کئی بار اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ دُنیا میں یہ جو متضاد قسم کی لغویات مذہبی عقائد کی صُورت میں پھیلی ہوئی ہیں انھیں خبطیوں کے دماغ کی اختراعات ہی تو ہیں جو تحریکِ طبعی کو الہام سمجھ بیٹھے ہیں۔ حقیقی مذہب ان غیر معمُولی باتوں سے بہت گھبراتا اور ان سے کتراتا ہے۔ صحیح مذہبی تعلیم کی پہچان ہی یہ ہے کہ اس سے معقولات کی مخالفت اور تردید نہیں ہوتی۔ جن چار قسم کے لوگوں کا ذکر میں نے آپ سے کیا ہے وہ سب کے سب اس معیار پر پُورے اُترتے ہیں۔ آپ راج یوگ ہی کو لے لیجئے۔ اس یوگ کی نوعیت نفسیاتی ہے یہ ہے وصلِ الٰہی کے حاصل کرنے کا نفسیاتی طریقہ یہ موضوع بہت وسیع ہے۔ میں تو آپ سے صرف یہ عرض کروں گا کہ اس یوگ کا مرکزی تصوّر کیا ہے؟ حصُولِ علم کا صرف یہ ایک طریقہ یہ یوگ یکسوئی یعنی دھیان[۵۱] پر زور دیتا ہے۔ دُنیا میں کامیابی کا راز اور حصُولِ مقصد کا واحد طریقہ یکسوئی ہے انسان کا میدانِ عمل کچھ بھی ہو یکسوئی اور دھیان کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ دھن دولت ہو یا طبعی علم یا رُوحانی آگہی کوئی چیز بھی یکسُوئی کے بغیر دسترس میں نہیں آسکتی۔ ایک ادنٰے ترین انسان سے لے کر ایک بلند مقام یوگی تک سب حصُولِ مقصد کے لئے یہی طریقہ کام میں لاتے ہیں یہ عمل کیا ہے اِدھر اُدھر سے سمیٹ کر تمام توجہ کو ایک مرکز پر لے آنا۔ ایک کیمیاگر جب اپنی تجربہ گاہ میں کام کرتا ہے تو اپنی ساری طاقتوں کو یکسو کر لیتا ہے وہ ان کو ایک نقطہ ماسکہ پر لے آتا[۵۲] ہے اور پھر اپنی مجموعی دماغی قوتوں کی اس تیز شعاع کو اجزائے[۵۳] ترکیبی پر ڈالتا ہے جس سے ان اجزا کی ترکیب صاف نظر آنے لگتی ہے اور کیمیاگر کو نئی نئی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں اسی طرح منجّم بھی اپنی دماغی طاقتوں کو مرکوز کرکے دُور بین کے ذریعہ آکاش کے سیّاروں کو اپنی زد میں لے آتا ہے جس سے تمام نظام فلکی اپنے اسرار کا خزانہ

---

۵۱ Concentration.

۵۲ Brings them into focus.

۵۳ Elements.

www.taemeernews.com

اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ غور سے دیکھو تو ہر معاملے میں یہی صورتِ حال پیش آتی ہے پروفیسر اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا پڑھا رہا ہے تو اس کی تمام توجہ سبق پر لگی ہوگی۔ طالبِ علم اپنے ہاتھ میں کتاب لئے ہوئے پڑھ رہا ہے تو وہ گرد و نواح کی ہر چیز سے بے خبر ہوگا اسی لئے جو شخص بھی کچھ حاصل کرنے کے لئے کسی کام میں مصروف ہے اس کی یہی کیفیت ہوگی آپ میرا لکچر سن رہے ہیں اور اگر آپ کو میری باتوں سے دلچسپی ہے تو آپ کی توجہ ان باتوں کی طرف مرکوز ہو جائے گی فرض کیجئے کہ اس دوران میں گھڑی کا گھنٹہ بج جائے تو آپ کو اس کی آواز اس یکسوئی کے سبب سے سنائی نہیں دے گی آپ جس قدر دھیان دے کر میری باتیں سنیں گے اتنی ہی زیادہ میری یہ باتیں آپ کی سمجھ میں آئیں گی اور جتنی لگن سے میں آپ کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کروں گا اتنی ہی اچھی طرح میں اپنا مفہوم آپ کے سامنے واضح کر سکوں گا یا یوں کہیئے کہ آپ کے دل و دماغ تک پہونچنے کی جو خواہش میرے دل و دماغ میں ہے اس کی تکمیل کے لئے میں جس قدر زیادہ محبت اور باہمی تفہیم (understanding.) کے جذبات پر اپنی طاقت کو مرکوز پاؤں گا اتنا ہی میں آپ کے نزدیک ہوتا جاؤں گا اور آپ میرے مفہوم کو اچھی طرح پا سکیں گے۔ یکسوئی کی طاقت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی زیادہ علم حاصل ہو سکے گا کیونکہ علم و ہنر کے حاصل کرنے کا یہی اور صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ جوتوں پر پالش کرنے والا ادنےٰ ترین شخص بھی اگر یکسوئی سے کام لے گا تو زیادہ اچھی طرح پالش کرے گا۔ باورچی پورے دھیان سے کھانا پکائے گا تو کھانا زیادہ اچھا بنے گا خواہ روپیہ کمانا ہو خواہ خدا کی عبادت کرنا مقصود ہو خواہ کوئی اور کام درپیش ہو جتنی یکسوئی سے کام لیا جائے گا تکمیلِ مقصد میں اتنی ہی زیادہ کامیابی ہوگی یہی ایک آواز ہے یہی ایک دستک ہے جس سے فطرت کے دروازے ہم پر کھل جاتے ہیں اور ہمارے سامنے روشنی کا سیلاب رواں دواں ہو جاتا ہے علم کے خزانے کی واحد کنجی دل و دماغ کی یکسوئی ہی ہے۔ راج یوگ میں اسی طریقۂ یکسوئی کی تعلیم دی جاتی ہے ہماری روزمرہ کی عام زندگی میں ہماری توجہ بالعموم مرکز سے ہٹی ہوتی ہے اور اس طرح دماغی طاقتیں سینکڑوں قسم کے معاملات میں منتشر ہو جاتی ہیں۔ یہ ہم سب کے تجربے اور مشاہدے کی بات ہے کہ جب کبھی ہم اپنے خیالات کے جزر و مد کو ساکت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے دماغ کو کسی ایک علمی موضوع پر مرکوز کر دیں تو ہمارے دماغ میں سینکڑوں غیر مطلوبہ خواہشیں خود بخود ابھرنے لگتی ہیں۔ ہزاروں قسم کے خیالات دوڑ دوڑ کر ہمارے دماغوں میں آنے لگتے ہیں اور اس طرح دماغ منتشر ہو جاتا ہے اس انتشار کے عمل کو روکنے اور دماغ پر قابو پانے کا طریقہ ہی راج یوگ کا موضوع ہے۔ راج یوگی اسی طریقۂ کار کے ذریعہ خدا کو پا لیتا ہے اب کرم یوگ کو لیجئے۔ اس سے مراد ہے کرم یا عمل کے ذریعہ خدا کو پانا ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی جماعت میں اکثر ایسے اشخاص ہوتے ہیں جو ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگے رہنا

091 www.taemeernews.com

چاہتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کام کرنے کے لئے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے دل و دماغ صرف غور و فکر کے میدان میں مرکوز نہیں کئے جاسکتے۔ ان کو تو بس ٹھوس کام کرنے کا خیال ہوتا ہے ایسے لوگ دھیان گیان کے راستے سے شعور و احساس کے مقام سے آگے نہیں جاسکتے۔ کرم یوگ کام کرنے کا وہ راز ہے جس کی بدولت کرم یوگی کو بھی معرفت کے لطیف مقامات تک رسائی ہو جاتی ہے جس طرح راج یوگ انسانی قوتوں کو یکجا کر کے خدا کو پانے کا علم ہے اسی طرح کرم یوگ صحیح طریقے سے کام سرانجام دے کر خدا تک پہونچنے کی سائنس ہے ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا ہے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو اپنی طاقت کا صحیح استعمال کرنا نہیں جانتے جو اپنی طاقت کے بیشتر حصے کو متعدد چھوٹی چھوٹی باتوں میں لگا کر ضائع کر دیتے ہیں۔ درحقیقت ہمیں کام کرنے کا اصلی راز ہی نہیں معلوم ہے کرم یوگ ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیں کیا کام کہاں کرنا ہے اور کیونکر کرنا ہے اور کس طرح اپنی طاقتوں کو اپنے کام میں لاکر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ انسان ہر کام کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر کرتا ہے دوسرے یہ کہ ہر کام اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ دکھ بھی لاتا ہے کامیابی کی خوشی کے دامن میں بھی غم کی جھلک ہوتی ہے اور ناکامیابی تو دکھ کا باعث ہوتی ہی ہے یہ دکھ اس موہ یا لوث سے پیدا ہوتا ہے جو ہمیں اپنے کام کے ساتھ ہو جاتا ہے مثلاً جہاں میرے دل میں دوسروں کی بھلائی کے کام کرنے کا خیال پیدا ہوا وہیں دوسروں کی شکرگزاری کی امید اور اپنی عزت و شہرت کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ ساتھ ناکامیابی اور دوسرے لوگوں کی طرف سے مخالفت کا خوف بھی۔ اگر اول الذکر نوعیت کے جذبات غالب آجاتے ہیں تو میں کام کرنے لگتا ہوں اور اگر یہ سوچتا ہوں کہ نوے فی صد لوگ تو ناشکر گزار ہوتے ہیں اور اگر مخالفت کے خوف سے گھبرا جاتا ہوں تو کام شروع ہی نہیں کر پاتا بہت سے لوگ اس قسم کے خیالات سے مغلوب ہو کر عموماً کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ دکھ اور تکلیف کے ڈر سے کام نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی طاقتوں کا صحیح استعمال نہیں ہو پاتا اور بہت حد تک یہ طاقتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ کرم یوگ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کام محض کام کی غرض سے کرنا چاہیئے ہمارے کام میں کوئی ذاتی غرض شامل نہیں ہونا چاہیئے ہمیں اس بات کا ذرا بھی خیال نہ ہونا چاہیے کہ کس کی مدد کس لئے کی جا رہی ہے کرم یوگی کام اس لئے کرتا ہے کہ کام کرنا اس کی فطرت کا جزو بن گیا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کی بھلائی کام کرتے رہنے ہی میں ہے اس کے علاوہ اس کے کام کرنے کا کوئی اور مدعا یا مقصد نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کام سے کچھ حاصل نہیں کرنا چاہتا وہ تو اپنے کام کی بھینٹ چڑھانا چاہتا ہے وہ تو صرف دینا چاہتا ہے اس کے دل میں لینے کا خیال پیدا ہی نہیں ہوتا وہ کچھ دے کر اس کے عوض میں کسی چیز کا متمنی نہیں اسی وجہ سے وہ دکھ اور

092 www.taemeernews.com

مصیبت کی گرفت میں آنے سے بچ جاتا ہے کیونکہ تکلیف اور دُکھ تو انسان پر اسی حالت میں نازل ہوتے ہیں جب اس کے دل میں امید و بیم کے جذبات ہوتے ہیں کسی چیز کے حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور اس کے نہ ملنے کا خوف ۔ رنج و غم تو امید و بیم کا ردِ عمل ہیں اگر انسان موہ یا لوبھ کو دل سے نکال دے تو پھر اس میں دُکھ درد کا گزر ہی نہیں ہو سکتا۔

بھگتی یوگ کا مسلک تیسری قسم یعنی جذباتی لوگوں کے لئے ہے۔ پریمی (عاشق) عشق و محبت کے جذبات کو مجسم صورت دے کر محبوب حقیقی کے قدموں میں پیش کرتا ہے پوجا پاٹھ کی مختلف رسموں سے کام لیتا ہے وہ پھول اور خوشبو نیات بھینٹ چڑھاتا ہے خوبصورت پرستش گاہیں بناتا ہے یا موجودہ مقدس مقامات کی زیارت کرنے کے لئے جاتا ہے۔ مندر، مسجد، گرجے جہاں کہیں اسے اپنے محبوب کا کوئی نشان ملتا ہے اس کا سر سجدے میں جھک جاتا ہے اور وہ اپنی زندگی کی تمام قوتوں کو خدائے تعالےٰ کے سپرد کر دیتا ہے شاید آپ ان سب باتوں کو فضول اور غلط سمجھتے ہونگے۔ لیکن میں آپ سے اتنا ضرور کہوں گا کہ کبھی یہ بات نہ بھولئے کہ دُنیا کی بڑی بڑی رُوحانی ہستیاں وہیں پیدا ہوئی ہیں جہاں مذہبی رسوم و روایات نیز دیو مالا کی بہتات رہی ہے جس مذہب میں انسانی محبت اور جمالی تصورات کے اظہار کا سامان موجود ہے اُسی کے دامن سے وقتاً فوقتاً عظیم الشان رُوحانی ہستیاں اُٹھتی رہی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ دُنیا کے بڑے بڑے رُوحانی مشاہیر نے اُن مذہبی فرقوں میں جنم لیا ہے جن کے پاس دیو مالا اور پوجا پاٹھ کی رسموں کا خزانہ بھرا پڑا ہے۔ جن مت ماننے والوں نے کسی نشان یا پوجا پاٹھ کی رسوم کے بغیر ایشور کو پوجنے کی کوشش کی ہے انھوں نے انسان کے حسین اور بلند خیالات کو نہایت بیدردی کے ساتھ تباہ کر کے رکھ دیا ہے ان کا مذہب ایک نہایت خشک قسم کی چیز بن کر رہ گیا ہے جس میں رسم و رواج کی بے ضرر چیزوں کی جگہ خطرناک تعصب نے لے لی ہے اس سلسلے میں مجھے کوئی مثال پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ دُنیا کی تاریخ سے اس کی مستقل شہادت ملتی ہے میری تو آپ سے یہی درخواست ہے کہ آپ ان رسوم اور ان دیو مالائی روایتوں کی تضحیک نہ کیجئے۔ ان کی مذمت زبان پر نہ لائیے ان کی ہنسی اُڑانا آپ ایسے مہذب آدمیوں کو زیب نہیں دیتا۔ آپ ان باتوں کو نہ مانئے لیکن آپ کو ہر جگہ یہ بھی کہتے پھرنے کی ضرورت نہیں کہ "یہ لوگ احمق ہیں۔ ان کو ان چیزوں سے سر مارنے دیجئے" آپ ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیجئے۔ یہ لوگ اتنے بے وقوف نہیں ہیں جتنا آپ ان کو سمجھ بیٹھے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ رُوحانیت کے بلند ترین مقامات پر پہونچنے والی ہستیاں انھیں شرطی رسم و رواج کی پیداوار ہیں۔ کم از کم میرا ذاتی تجربہ تو یہی ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں جتنے عارف اور رُوحانی بزرگ دیکھے ہیں سب کے سب ضابطہ، رسم و رواج کے قائل تھے اور ان پابندیوں سے گزر کر آئے تھے۔ میں تو خود کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان

093 www.taemeernews.com

کے قدموں پر سر بھی رکھ سکوں چہ جائے کہ ان کے خلاف حرف گیری کروں۔ آخر ہمیں کسی کے خلاف نکتہ چینی کا حق ہی کیونکر حاصل ہوتا ہے کیا ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ رسم و رواج کی پابندی یا دیو مالا پر اعتقاد کا انسانی دماغ پر کیا عمل ہوتا ہے اور اگر ان معاملات میں ہمارا علم ہی محدود ہے تو ہم کیونکر بعض خیالات کو قبول کر کے دوسروں کو مسترد کر سکتے ہیں بات یہ ہے کہ کافی جواز کے بغیر ہمیں دُنیا کی ہر چیز پر نکتہ چینی کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے میں تو آپ سے بار بار یہی درخواست کروں گا کہ جن لوگوں کو دیو مالا کی روایتوں اور رواج سے لگاؤ ہے آپ انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیجئے۔ اگر وہ حُسنِ فطرت کے راز ان ذرائع سے پا سکتے ہیں ان کی مدد سے نغماتِ الہام کی مسرتوں کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ نشاط روح کی شراب سے سرشار ہو سکتے ہیں تو "آمین" کہئے۔ یہ مقام حرف گیری کا نہیں ہے یاد رکھئے کہ جذبات پرست طبائع حقیقت کی خشک توضیحات کو کبھی خاطر میں نہیں لاتیں خدا کی ہستی اُن کی نگاہ میں ایک ایسی ہستی ہے جسے وہ محسوس کر سکتے ہیں۔ اُن کے لئے اس کا وجود حقیقی ہوتا ہے۔ وہ اس محبوبِ حقیقی کو مجسم بنا لیتے ہیں وہ اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ہاتھوں سے چھوتے ہیں اور اپنی محبت کا تمام خزانہ اس کے قدموں پر نچھاور کر دیتے ہیں۔ آخر ہمیں کیا حق ہے کہ ایسے خدا کو ہم اُن سے چھیننے کی کوشش کریں۔ اُن کے محبوب کو اُن کے پاس رہنے دیجئے اپنی معقولیت پسندی کو اُن پر زبردستی مت ٹھونسئے۔ آپ جس شخص کو معقولیت پسند کہتے ہیں وہ تو اُن کی نظر میں ایک ایسا احمق ہوتا ہے جو ایک خوبصورت اور نایاب مجسّمے کو یہ دیکھنے کے لئے توڑ دیتا ہے کہ وہ کس چیز کا بنا ہوا ہے۔ بھگتی یوگ جذبات پرست لوگوں کو محبوبِ حقیقی سے بے غرضانہ محبت کرنا سکھاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ خُدا سے محبت کرنا بجائے خود خوب ہے وہ نیکی کی تعلیم دیتا ہے کیونکہ نیکی اپنا انعام آپ ہے بھگوان کے حقیقی بھگت دُنیا کی دھن دولت یا اولاد کی خاطر بھگوان سے پریم نہیں کرتے وہ اس کی پوجا اس لئے نہیں کرتے کہ اس کے عوض انھیں جنّت میں جگہ حاصل ہوجائے ان کے لئے تو محبت ہی خود اپنا بلند ترین صلہ ہے۔ خدا خود ہی محبت ہے بھگتی یوگ کی تعلیم یہ ہے کہ بھگت جس نام سے چاہے بھگوان کو پکارے۔ اس سے سچا پریم کرے جس صفت سے چاہے اس سے متصف کرے اس سے محبت کرے وہ اسے خالق قرار دے حاضر کُل کہے۔ ناظر کُل کے نام سے موسوم کرے اُسے حکمران مطلق کہے۔ باپ کہے ماں کہے، خدا سب کچھ ہے لیکن بھگتی یوگ کے مُطابق خدا کا بلند ترین تصور جو انسان کے ذہن میں آسکتا ہے وہ یہ ہے کہ خُدا محبوبِ مُطلق ہے۔ جہاں محبت ہے جہاں پریم ہے وہیں خُدا بھی ہے۔ محبت کا اظہار جہاں کہیں بھی اور جس کسی بھی صُورت ہو خُدا کے وجُود کا اظہار ہوتا ہے۔ خاوند اپنی بیوی کا بوسہ لیتا ہے تو خدا اس بوسے کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ ماں بچے کے مکھڑے کو چومتی ہے تو اس کے پیار میں خدا ہی کا جلوہ ہوتا ہے دو دوست ملتے ہیں یا آپس میں بغل گیر ہوتے ہیں تو ان کے تپاک میں بھی وہ خُدائے محبت موجود ہوتا ہے

www.taemeernews.com

اسی طرح جب کوئی شخص حقیقی فلاح عام کا کام کرتا ہے تو خود خدائے تعالیٰ ہی نیک کاموں کی صورت میں آشکار ہوتا ہے۔ اس کا جذبۂ محبت ہی بنی نوع انسان پر اپنے الطاف وکرم کی آزادانہ بارش کرتا ہوتا ہے۔

یہ ہے بھگتی یوگ کی تعلیم یہ ہے مسلک عشق کا اصل اصول اب مجھے عالمگیر مذہب کے چوتھے عنصر یعنی گیان یوگ کا ذکر کرنا ہے گیان یوگی یا سچا فلاسفر اور مفکر وہ ہے جو اس عالم شہود کی حدود سے بھی آگے نکل جانا چاہتا ہے یہی وہ انسان ہے جس کا دل دنیا کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے آسودہ نہیں وہ روزمرہ کے معمول یعنی کھانے پینے اور اس طرح کے دوسرے تمام مشاغل میں مصروف رہنے پر اکتفا نہیں کرتا اس کی زندگی کا نصب العین ان سے بہت دور نکل جاتا ہے۔ ہزاروں علم حاصل کر لینے پر بھی اس کی سیری ممکن نہیں ہوتی ایک جہاں نہیں کائنات کے لاکھوں اور کروڑوں نظام اس کے بس میں ہوں تو بھی اس کی تسلی ممکن نہیں یہ سارے نظام تو اس کی نگاہ میں بالکل ایسے ہیں جیسے اس عالم وجود کے سمندر میں ایک قطرہ اس کی روح اس تمام دنیائے آب و گل کے ماورا قلب وجود کے اندر سرایت کر جانا چاہتی ہے وہ حقیقت کو اس کی اصلی صورت میں دیکھنے کے لئے بے تاب ہے وہ حقیقت کا احساس اور انکشاف اپنی ذات میں کرنا چاہتی ہے من و تو کا فرق مٹا کر وحدت الوجود کا احساس بن جانا چاہتی ہے۔ ایسے یوگی کی روحانی پیاس اسوقت بجھتی ہے جب اس کی روح روح اعظم سے اصل ہو جاتی ہے۔ ایسے یوگی کی تسلی بس اسی حالت میں ہوتی ہے جب اس کی نجی ہستی حقیقت سے ایک ہو جاتی ہے ایسے یوگی کی نگاہ میں خدا کو باپ یا ماں یا خالق کائنات یا محافظ اور رہنما کے روپ میں دیکھنا حقیقت کو محدود کرنے کے برابر ہے اس قسم کے تصورات اس ہستی مطلق کو بیان کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔ اس کی نظر میں خدا اس کی زندگی کا اصلی جوہر ہے اس کی روح کی روح ہے خود اس کی ذات ہی خدا ہے۔ اسکے علاوہ اور کچھ نہیں اس کی ہستی کے تمام فانی اجزا فلسفہ اور گیان کی ضرب سے پاش پاش ہو کر کالعدم ہو جاتے ہیں اور باقی بس خود خدا کی ذات رہ جاتی ہے۔

گیان یوگ کے اس فلسفے کو ہمارے یہاں ایک مثال سے یوں واضح کیا گیا ہے۔ ایک درخت پر دو پرندے بیٹھے ہیں ایک پرندہ درخت کی چوٹی پر بیٹھا ہے اور دوسرا نیچے کی شاخ پر چوٹی کا پرندہ چپ چاپ اپنے آپ میں مست بیٹھا ہے اس کے چہرے سے ایک خاص دبدبہ اور رعب ٹپک رہا ہے دوسرا پرندہ ادھر ادھر پھدک کر پھل کھا رہا ہے کبھی کوئی میٹھا پھل اس کے کھانے میں آجاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے اور کبھی کڑوا پھل کھا لیتا ہے تو وہ اسکے ذائقہ کو خراب کر دیتا ہے اس کی طبیعت آزردہ ہو جاتی ہے ایک دن وہ ایک نہایت کڑوا پھل کھا لیتا ہے اور اپنی زندگی سے بے زار ہو کر چوٹی کے پرندے کی طرف دیکھنے لگتا ہے کہ وہ کس اطمینان اور سکون کے ساتھ مزے میں بیٹھا ہے نہ اس کو میٹھے پھل کھانے شوق ہے نہ کڑوے

095 www.taemeernews.com

پھل کھانے کا خوف وہ اپنے سنہری پنکھوں کے نور میں غلطاں بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہے اسے نہ خوشی کی فکر ہے نہ غم کا ڈر بس خاموش اور متین اپنی ہی ذات میں محو بیٹھا ہے جیسے اس کو اپنی ذات سے ماورا اور کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ یہ دیکھ کر نیچے والے پرندے کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ مجھ پر بھی یہی کیفیت طاری ہو جائے جس میں اُوپر والا پرندہ محو ہے۔ اس خواہش کے تحت وہ تھوڑا اُوپر کی جانب اُٹھتا ہے لیکن اس کی یہ خواہش دیرپا نہیں ثابت ہوتی۔ پھر جھٹ سے پھل کھانے کا شوق اس پر غالب آجاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ایک بے حد کڑوا پھل اس کے مُنھ میں آجاتا ہے جس سے اس کو سخت اذیت پہونچتی ہے وہ پھر اُوپر والے پرندے کی جانب حیرت سے دیکھنے لگتا ہے اور اس کے قریب پہونچنے کی کوشش کرتا ہے اب کے بار پھر تھوڑی دور جا کر رُک جاتا ہے اور اسی طرح وہ بار بار اُوپر کی جانب اُٹھتا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ چوٹی والے خوبصورت پرندے کے انتہائی قریب پہونچ جاتا ہے جہاں جا کر وہ کیا دیکھتا ہے کہ اسی پرندے کے پروں سے ایک نور کی شعاعیں نکل نکل کر خود اسکے اپنے جسم کے گرد گھیرا ڈال رہی ہیں۔ اس کو اپنے آپ میں ایک خاص قسم کی تبدیلی محسوس ہونے لگتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کا جسم بس پگھل رہا ہے پھر وہ اُوپر والے پرندے کے اور بھی قریب آجاتا ہے اور اس کے گرد و پیش کی ہر چیز پگھل جاتی ہے۔ آخر کار اس کی سمجھ میں آجاتا ہے کہ اس کی اپنی کبھی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی۔ وہ اور اُوپر والا پرندہ دونوں دراصل ایک ہیں وہ تو چوٹی والے پرندے کا محض عکس تھا۔ یہ سایہ جو بظاہر مجسم نظر آتا تھا اسے وہ غلطی سے اپنا علیحدہ وجود سمجھ بیٹھا تھا۔ یہ میٹھے اور کھٹے پھلوں کا کھانا یہ نچلی شاخوں پر بیٹھ کر رونا یا ہنسنا محض ایک وہم باطل ایک خواب تھا۔ حقیقت تھی تو اس چوٹی والے پرندے کی جو خاموش اور مست بیٹھا تھا جس پر اس تمام دوران میں سکون کی کیفیت طاری تھی جس کے خدوخال سے شکوہ و جلال ٹپک رہا تھا جس کے پاس رنج و ملال پھٹک نہیں پاتا تھا۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس مثال میں چوٹی والے پرندے سے مراد ہے خدا اس عالم کائنات کا آقا اور مالک اور نچلی سطح پر بیٹھنے والے پرندے سے مُراد ہے انسانی رُوح (جیو) جو دُنیا کے میٹھے اور کڑوے پھل کھا رہی ہے جب کبھی اس کے دل پر کوئی بڑی چوٹ لگتی ہے تو وہ تھوڑی دیر کے لئے پھلوں کا کھانا ترک کر دیتی ہے اور رنج و غم سے گھبرا کر ایسی زندگی کا خیال کرنے لگتی ہے جس میں ابدی سکون اور مُسرّت ہو وہ خود کو بھول کر اس باکمال ہستی کے متعلق سوچنے لگتی ہے جس کا پُر جلال تصور تو اس کے دماغ میں ہے لیکن جس کی حقیقت سے وہ ابھی واقف نہیں ہے اور ایسی حالت میں جب رُوح کا رُخ خدا کی نامعلوم ہستی کی طرف ہو جاتا ہے اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ اسکے گرد و پیش نور کا ایک سیلاب عظیم اُمڈ رہا ہے اس کو یہ تمام دُنیا محض ایک بے مصرف سا تماشا نظر آنے لگتی ہے لیکن یہ حالت دیر تک قائم

096 www.taemeernews.com

نہیں رہتی جلد ہی حواس اس کو اپنی طرف کھینچنے لگتے ہیں اور وہ پہلے ہی کی طرح دُنیا کے میٹھے اور کھٹے پھل کھانے لگتی ہے جب کبھی پھر اس کو کوئی سخت صدمہ پہونچتا ہے تو پھر اس کے دل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اس کو یزدانی روشنی نظر آنے لگتی ہے اس طرح وہ رفتہ رفتہ خُدا کے قریب پہونچ جاتی ہے اور جتنی جتنی اس کی رسائی خدا کے قریب ہوتی جاتی ہے اتنی اتنی خود اس کی ذاتی ہستی مٹتی جاتی ہے جب وہ اس کے بالکل قریب پہونچ جاتی ہے تو اس کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی اور خدا کی ہستی میں کوئی فرق ہی نہیں۔ اس منزل پر پہونچ کر وہ خوشی کا نعرہ لگاتی اور اعلان کرتی ہے کہ جس ہستی کے متعلق میں نے سُنا تھا کہ وہ اس عالم کائنات کی روح رواں ہے جس کے نور سے کائنات کے بے شمار سورج اور چاند روشن ہیں جس کی چمک ذرّے ذرّے میں بس رہی ہے وہی خود ہماری زندگی کی بنا اور ہماری رُوح کی رُوح ہے بلکہ ہمہ اوست ہے۔ یہ ہے تعلیم گیان یوگ کی۔ انسان کی ہستی بنیادی طور پر ربانی ہستی ہے حقیقتہً تو بس ایک ہے۔ خُدا اور بندہ دونوں کی دو علیحدہ علیحدہ ہستیاں نہیں ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص بذات خود وہ ربِّ مُطلق۔ وہ پرماتما ہے جس کا ظہور صفحۂ ارض پر ہو رہا ہے۔ ہمارے پاؤں تلے رینگنے والے ادنےٰ ترین کیڑے سے لے کر اُن بلند پایہ ہستیوں تک جن کے رعبِ جلال، جن کی عظمت اور شان و شوکت کے سامنے ہم سر نہیں اُٹھا سکتے۔ اُن سب میں اسی ایک ایشور اسی خداوند تعالےٰ کا جلوہ ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ زندگی واحد الوجود ہے۔

میں نے چار مختلف رُوحانی راستوں کا ذکر کیا ہے آپ اپنی طبیعت اپنے رُجحان کے مُطابق اپنا راستہ خود منتخب کر سکتے ہیں لیکن جو راستہ بھی آپ اختیار کریں اس پر پُورا عمل کرنا ہوگا۔ ان مختلف قسم کے یوگوں کی عملی مزاولت بہت ضروری ہے۔ صرف ان کے اُصولوں کو جان لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ روحانی زندگی کا پہلا قدم یہ ہے کہ ان اصولوں کا ذکر سُنا جائے اور پھر ان کو سمجھنے کیلئے ان پر غور کیا جائے اس کے لئے ہمیں عقل و دلیل سے پورا کام لینا ہوگا تاکہ انھیں اپنے دلوں پر نقش کر لیا جائے اس کے بعد ہمیں ان پر دھیان لگانا ہوگا تاکہ ہم ان کا عرفان حاصل کر لیں۔ اور یہ خیالات ہماری رگ رگ میں سما جائیں۔

تو یہ تھا بیان ان مختصر عناصر کا جو ایک عالمگیر مذہب میں ہونے چاہئیں تاکہ اپنے اپنے ارتقائی مرحلے کے مُطابق ہر شخص اپنی پسند کا راستہ اختیار کرلے۔ گیان یوگ بھگتی یوگ۔ راجیہ یوگ۔ یا کرم یوگ تو طریقۂ عمل کے اصطلاحی نام ہیں۔ میں کسی خاص مذہب کا پرچار نہیں کر رہا ہوں۔ اگر کسی مذہب کو ہمہ گیر ہونا ہے تو اس میں انسان کے ارتقا کی مدارج کے لئے گنجائش پیدا کرنا ہوگی لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ مذہبی اُصولوں کو عملی جامہ پہنائے بغیر رُوحانیت کا حاصل ہونا ممکن نہیں اس مقام

097 www.taemeernews.com

پر پہونچ کر مذہب عملی صورت اختیار کر لیتا ہے وہ محض عقلی نظروں کا سلسلہ نہیں رہتا۔ مذہبی اور روحانی اصولوں کو محض ذہنی طور پر تسلیم کرنا کافی نہیں ہوتا۔ وہ تو ہماری ذات میں داخل ہو جاتے ہیں۔

عقل و خرد کے فیصلوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دلیل اور منطق کی رو سے جس چیز کو آج ہم قبول اور تسلیم کرتے ہیں کل دوسری دلائل کے تحت اسی سے منکر بھی ہو جاتے ہیں یہی نہیں بلکہ بسا اوقات کل کی باتوں کو احمقانہ قرار دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ہمیں عقل اور ذہن سے کام ضرور لینا ہے لیکن یاد رہے کہ عقل کے فیصلے اٹل نہیں ہوتے۔ ان میں تغیر کا ہونا لازمی ہے عقل و خرد کا کام ہی تغیر کی سطح پر کرتی ہیں لیکن سچے مذہب کے بنیادی اصولوں میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ان ابدی اصولوں کو عملی طور پر اپنانا ہی سچی روحانیت ہے۔ مذہب خالی باتیں بنانے کا نام نہیں روحانیت کسی خاص نظریے کو تسلیم کرنے سے حاصل نہیں ہوتی خواہ وہ نظریہ کتنا ہی تسلی بخش کیوں نہ ہو مذہب انکشاف ذات کا دوسرا نام ہے۔ روحانیت عرفان کے مترادف ہے۔ مذہب اور روحانیت کی راہِ عمل میں سننے سنانے سے کام نہیں چلتا یہاں تو سوال زندگی کا رُخ بدل دینے کا خودی سے خدا بننے کا ہے اگر آپ کو مذہب اور روحانیت مطلوب ہے، تو اس شاہراہِ عمل پر گامزن ہونا پڑے گا۔ اپنے ایمان کو مجسم بنانا ہو گا۔ عمل ہی مذہب ہے باقی سب باتیں ہی باتیں ہیں۔

098
www.taemeernews.com

پارلیمنٹ آف ریلیجنز (مجلس مذاہب)

شکاگو میں خطبۂ استقبالیہ کا جواب

۱۱ ستمبر ۱۸۹۳ء

امریکی بہنو اور بھائیو۔

جس گرم جوشی اور محبت سے آپ نے ہم سب کا استقبال کیا ہے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے جو انتہائی خوشی محسوس ہو رہی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ میں دنیا کے قدیم ترین سنیاسیوں کی جماعت کی طرف سے آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میں اس دیش کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جہاں مذہب کا جنم ہوا اور میں وہاں کے کروڑوں ہندوؤں کی طرف سے بھی آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، میں اُن مقررون کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے مجھ سے پہلے اپنی تقریروں میں ہم مشرقی نمائندوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب اس کانفرنس سے اپنے دُور دراز ملکوں میں صلح و آشتی اور رواداری کا پیغام لے کر جائیں گے۔ اس سلسلے میں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں ایک ایسے مذہب کی نمائندگی کر رہا ہوں جس نے نہ صرف تمام دنیا کو صلح و آشتی کا سبق دیا ہے بلکہ ہمیشہ دنیا کے سب مذاہب کو اصولاً و عملاً اپنایا ہے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں اس قوم کا فرد ہوں جس نے ہر مذہب و ملت کے ستم زدہ پناہ گزینوں کو اپنے ہاں جگہ دی ہے۔ میں فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ جب روم کے مطلق العنان حکمرانوں نے عزرائیل قوم کی متبرک عبادت گاہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور جب اس قدیم قوم کی تہذیب کے علمبردار روم کے مظالم سے بھاگ کر ہندوستان آئے تو ہم نے انہیں گلے لگا کر اپنے یہاں جگہ دی یہ ہمارا ہی مذہب اور ہماری ہی قوم تھی جس نے زرتشت کے خود دار پیروؤں کو اس طرح اپنایا کہ وہ آج تک اپنے مذہب اور اپنی روایات پر چلتے ہوئے ہماری قوم کا ایک شاندار جزو بن گئے ہیں۔ دوسروں

www.taemeernews.com

کو اپنانا تو ہماری گھٹی میں پڑا ہے۔ میرے بھائیو میں آپ کے سامنے ایک پرارتھنا کا چھوٹا سا حصہ پیش کرتا ہوں جسے میں پچیس سال سے دہراتا چلا آیا ہوں اور جسے میری طرح میرے کروڑوں ہم مذہب ہر روز دہراتے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا میرا مذہب کیا ہے۔

"میرے خدا جس طرح مختلف ندیاں اپنے اپنے منبع سے نکل کر مختلف مقامات سے گزرتی ہوئی آخر کار سمندر میں آکر گھل مل جاتی ہیں اسی طرح وہ تمام رستے جو مختلف مذہبوں اور قوموں کے لوگ اپنی اپنی پسند یا روایت کے مطابق اختیار کر لیتے ہیں سب آخر تجھ ہی تک پہنچ جاتے ہیں خواہ وہ دیکھنے میں کتنے ہی عجیب و غریب اور اُلٹے سیدھے نظر آئیں۔"

ہماری یہ معتبر کانفرنس خود اس عالمگیر اصول کی تصدیق کرتی ہے جس کا اعلان ہزاروں برس پہلے گیتا نے ان الفاظ میں کیا تھا:-

"جو کوئی بھی میری شرن میں آتا ہے میں یقیناً اُس تک پہنچتا ہوں۔ تم جس صورت میں مجھے تلاش کرو گے میں اُسی صورت میں تمہیں ملوں گا۔ سب انسان مجھ تک آنے میں کوشاں ہیں اور آخر کار آ بھی پہنچیں گے کیونکہ میں ہی سب رستوں کی منزل ہوں[1]۔"

جماعت بندی، کینہ پروری، بغض و عناد، مذہبی تعصب نے دنیا پر صدیوں سے تسلط جما رکھا ہے، ان کی بدولت بارہا فساد ہوئے، جنگ و جدل تک نوبت آئی، انسان کے خون سے زمین لال ہوئی، قومیں تباہ ہو گئیں اور اُن کی تہذیب کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ اگر اُن شیطانی طاقتوں نے ہماری سوسائٹی پر غلبہ نہ پایا ہوتا تو ہماری تہذیب ارتقا کی کئی اور منزلیں طے کر چکی ہوتی، لیکن ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، ان شیطانی طاقتوں کے مٹنے کا وقت آ گیا ہے، مجھے پوری امید ہے بلکہ یقین ہے کہ گھنٹوں کی جس میٹھی اور سُریلی آواز سے اس کانفرنس کا آغاز ہوا وہی آواز ایک نعرہ بن کر تعصب اور کینہ پروری کی موت کا اعلان کرے گی۔ خواہ وہ تعصب تلوار کے زور پر قائم ہو یا قلم کے بل بوتے پر، اگر ہم سب یہ سمجھ لیں کہ ہم ایک ہی منزل کی طرف گامزن ہیں تو ہمارے سماجی اور سیاسی نظام میں تعصب کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی تمام تفرقات مٹ جاتے ہیں، بغض و عناد ختم ہو جاتا ہے اور ہم سب ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔

ابھی ابھی[2] جو آپ نے بلیغ اور شاندار تقریر سُنی اس میں مقرر نے ہم سے پُر زور اپیل کرتے ہوئے

---

[1] میانِ کعبہ و بت خانہ ہیچ فرقے نیست۔
بہر طرف کہ نظر می کنی برابر اوست۔ [2] اگلے صفحہ پر

www.taemeernews.com

کہا "آؤ ہم ایک دُوسرے کو بُرا بھلا کہنا چھوڑ دیں" میں یہ کہوں گا کہ آؤ ہم سوچیں کہ ہمارے آپس کے تفرقات پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں، اُن کی اصل ہی کیا ہے؟ اُن سب کا باعث ہماری لاعلمی اور جہالت ہے، میں آپ کو ایک چھوٹی سی کہانی سُناتا ہوں جس سے میری بات واضح ہو جائے گی۔ ایک تھا کنویں کا مینڈک وہ جنم سے وہیں رہتا آیا تھا۔ ایک دن کی بات ہے ایک اور مینڈک وہاں آنکلا، یہ مینڈک سمندر کے کنارے رہتا تھا۔ کنویں کے مینڈک نے پوچھا "بھئی کہاں سے آنا ہوا؟" اُس نے جواب دیا "سمندر سے آیا ہوں" کنویں کے مینڈک نے کنویں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھلانگ لگائی اور کہا "سمندر؟ کیا وہ بھی اس کنویں سے بڑا ہے؟" سمندر کا مینڈک مُسکرا کر بولا "بھئی کہاں سمندر اور کہاں تمہارا کنواں؟ ان دونوں میں مقابلہ ہو ہی کیا سکتا ہے؟" کنویں کے مینڈک نے ایک اور چھلانگ لگائی اور کہا "اچھا تو کیا تمہارا سمندر اتنا بڑا ہے؟" سمندر کے مینڈک نے کہا "ارے بھائی تم بھی کیا بے عقلی کی بات کرتے ہو، میں کہہ تو رہا ہوں کہ سمندر اور کنویں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں" کنویں کا مینڈک اکڑ کر بولا "تو تم جھوٹ کہتے ہو، چلو یہاں سے چلتے بنو، میرے اِس کنویں سے کوئی شے بڑی نہیں ہو سکتی۔"

غور سے دیکھا جائے تو ہم سب اپنے اپنے کنویں کے مینڈک ہیں۔ میں ہندوؤں میں اپنے کنویں میں بیٹھ کر سمجھ لیتا ہوں کہ تمام کائنات میری اس چھوٹی سی دُنیا میں بسی ہے، اسی طرح عیسائی اور مسلمان بھی اپنے اپنے کنویں پر ہی تمام عالم کا دار و مدار سمجھنے لگتے ہیں اب آپ خود ہی بتائیے کہ ہمارے تفرقات کی بنیاد لاعلمی اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟[۱]

میرے امریکی بھائیو میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہم سب کو یکجا کر کے عالمی یک جہتی کی طرف ایک زبردست قدم اُٹھایا ہے اور اُن دیواروں کو جو ہمارے درمیان حائل ہو رہی ہیں مٹانے کی ایک قابلِ قدر کوشش کی ہے میری دُعا ہے کہ خدائے تعالیٰ آپ کی اس کوشش کو کامیاب بنائیے۔

پچھلے صفحہ کا حاشیہ:۔ سوامی جی نے یہ چھوٹی سی تقریر ۱۵ ستمبر ۱۸۹۳ء کے دن کی لیکن چونکہ اس کا موضوع وہی جو اُن کی پہلی تقریر کا تھا۔ اس لئے میں نے اسے پہلی تقریر سے ملا دیا ہے۔

[۱] جنگِ ہفتاد و دو ملّت ہمہ را عذر بنہ ٭ چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

www.taemeernews.com

ہندو دھرم

یہ لیکچر پارلیمنٹ آف ریلیجنز شکاگو میں ۱۹ ستمبر ۱۸۹۳ء کو پڑھا گیا

دُنیا میں تین ایسے مذہب ہیں جو ابتدائے تاریخ سے بھی پہلے چلے آتے ہیں۔ یہ مذہب ہیں ہندو مت، زرتشت کا مذہب اور یہودیوں کا مذہب۔ اِن تینوں مذہبوں کو گذشتہ صدیوں کے دوران میں کئی بار دھکے لگے ہیں لیکن اُن میں کوئی ایسی اندرونی طاقت ہے جس نے انہیں آج تک بچائے رکھا لیکن یہودی مت عیسائیت کو اپنے میں جذب کرنے سے قاصر رہا اور عیسائی مذہب نے اُسے اپنی جنم بھومی ہی سے نکال دیا۔ اِسی طرح زرتشت کے شاندار مذہب کے نام لیوا بھی صرف چند پارسی رہ گئے ہیں۔ مگر ہندو مت آج تک اپنی پوری شان سے زندہ ہے۔ ہندوستان کی سرزمین سے ہزاروں مذہبی فرقے اُٹھے اور کئی بار تو ویدک دھرم کی بنیادیں تک ہل گئیں لیکن آخرکار سب فرقے اِسی میں سما گئے جیسے کہ زبردست بھونچال آنے پر کچھ دیر کے لئے سمندر کی لہریں پیچھے ہٹ جاتی ہیں لیکن جلد ہی اپنی پوری طاقت اور عظمت کے ساتھ واپس آجاتی ہیں ویسے ہی ویدک دھرم بھی ہر مذہبی زلزلے کے بعد ایک نئی شان اور نئی طاقت لئے بار بار نمودار ہوتا رہا اس طرح نہ جانے کتنے فرقے اِس پُرانے مذہب میں جذب ہو کر اسی کا جُزو بن گئے۔ یہ ہندو مت کی ہمہ گیر جامعیت ہی کی شان ہے کہ جہاں اس میں فلسفۂ ویدانت کی فلک شگاف رُوحانی بلندیاں رُونما ہیں وہاں بُت پرستی کی پستیاں بھی موجود ہیں خدا کے اقرار و انکار سے بالا بُدھ مت جہاں اِس مذہب کا جُزو بن گیا ہے وہاں خدا کی ہستی سے مُنکر جین مت بھی اس مذہب میں شامل ہو گیا ہے جہاں علم کے ذخیرہ ہیں جن کا پتہ سائنس کی تمام معلومات بھی پُوری طرح دینے سے قاصر ہیں۔ وہاں مائتھالوجی کی ایسی کہانیاں

www.taemeernews.com

بھی موجود ہیں جنہیں عقلِ سلیم ماننے کے لئے تیار نہیں۔

تو آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اس مذہب کا کوئی مرکز ہے جہاں یہ تمام نظرآن ملتے ہیں؟ ہندو مت میں وہ کیا ایسی چیز ہے جو ان تمام مختلف نظریوں کو یکجا کرتی ہے جو بظاہر ایک دوسرے کو قطع کرتے دکھائی دیتے ہیں؟ یا یوں کہیے کہ ہندو مت کے بنیادی اُصول کیا ہیں؟ آج میں اس سوال کا جواب آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

ہندوؤں کا مذہب الہامی مذہب ہے۔ اس الہام کا نام "وید" ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ "وید" لازوال اور ابدی حقیقت ہے۔ اس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ آپ سمجھتے ہوں گے میں یہ کیسی بے تکی بات کر رہا ہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کتاب کا نہ آغاز ہو نہ انجام۔ بات دراصل یہ ہے کہ ویدوں سے ہندوؤں کا مطلب محض وہ کتابیں نہیں جو اس نام سے مشہور ہیں؛ ویدوں کے معنی ہیں وہ تمام رُوحانی اُصول جو مختلف وقتوں میں مختلف رُوحانی ہستیوں نے دریافت کئے، جیسے کہ کششِ ارضی کا اُصول[1] نیوٹن کی دریافت کرنے سے پہلے بھی تھا اور اگر دُنیا پھر اس اُصول کو بھول جائے تو بھی یہ اُصول ویسے کا ویسا ہی اٹل رہے گا۔ اسی طرح عالمِ رُوحانی کے اُصول بھی ازلی ہیں، رُوحوں کے آپس کے اخلاقی اور رُوحانی تعلقات اور پھر ان رُوحوں اور رُوحِ اعظم کے تعلقات ہمیشہ سے موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گے خواہ ہمیں ان تعلقات کا علم ہو یا نہ ہو۔ ہندوؤں کی مُراد ویدوں سے یہی وہ لازوال اور ابدی رُوحانی اصول ہیں۔

ہندو ان اُصولوں کو دریافت کرنے والی ہستیوں کو رشی کے نام سے پکارتے ہیں اور ان تمام ہستیوں کی سچّے دل سے عزت کرتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اُن کی پُوجا کرتے ہیں۔ مجھے اس کانفرنس کو جہاں عورتیں کافی تعداد میں موجود ہیں یہ بتاتے ہوئے بہت خُوشی ہوتی ہے کہ ہمارے بڑے بڑے رشیوں میں بہت سی عورتیں بھی شامل ہیں۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ رُوحانی اصول لافانی سہی لیکن آخر کبھی تو اُن کی ابتداء ہوئی ہوگی کسی نے تو انہیں بنایا ہوگا۔ ویدوں کے مطابق کائنات کی نہ کوئی ابتداء ہے نہ انتہا۔ آج کل سائنس نے ثابت کر دیا ہے کائناتی انرجی (Universal Energy) کا حاصل ہمیشہ ایک رہتا ہے اس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ ناممکن ہے کہ کبھی کچھ بھی موجود نہ ہوا اور پھر یہ تمام عالم ظہور وجود میں آجائے۔ نیست سے ہست پیدا نہیں ہو سکتا بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تمام کائنات خدا کی ہستی میں ایک پوشیدہ قوت[3] کی صورت میں تھی۔ اگر اُسے سچ مان لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا کبھی مضمر ہوتا ہے اور کبھی آشکار کبھی خوابیدہ اور کبھی بیدار کبھی ساکن اور کبھی متحرک

---

[2] ماجرائے من و معشوق مرا پایاں نیست ٭ ہرچہ آغاز ندارد نپذیرد انجام

[1] Law of gravitation. [3] Potential.

www.taemeernews.com

کبھی چھوٹے سے بیج کی صورت میں مخفی طاقت اور کبھی شاخ و شجر کی شکل میں ظاہر عظمت یعنی کہ خدا کی کبھی قوت پوشیدہ (potential) کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی ظاہر (Kinetic) اس کے یہ معنی ہوئے کہ خدا کی صورت بدل سکتی ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر خدا لازوال نہیں، ہر چیز جو تغیر پذیر ہے وہ دو یا زیادہ جزو وں کی مل کر بنتی ہے۔ اور ہر ایسی شے کے جزو ایک نہ ایک دن علیحدہ ہو جاتے ہیں اور ہم اس تغیر کو موت کا نام دیتے ہیں اگر یہ دلیل ٹھیک ہے اور اگر خدا کی صورت بدل سکتی ہے یعنی کبھی پوشیدہ (potential) اور کبھی ظاہر (Kinetic) ہو سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک دن خُدا کی بھی موت ہو جائیگی اور یہ بالکل بے تکی اور بے معنی بات ہے۔ اس لئے نہیں ماننا پڑے گا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا[۱] یا یوں کہیئے کہ خدا اور اس کی دُنیا، خالق اور تخلیق دو متوازی لکیریں ہیں جو ہمیشہ ایک دُوسرے کے مقابل رہی ہیں اور رہیں گی۔ خدا ایک دائمی طاقت ہے جس کی بدولت جہان در جہان ظہور میں آتے ہیں، پردہ غیب میں چھپ جاتے ہیں اور پھر نمودار ہو جاتے ہیں اس خیال کو ہمارے یہاں ایک پرارتھنا میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ "چاند اور سُورج کو خالق نے پہلے یُگوں (time-cycles) کے چاند اور سُورج کی طرح تخلیق کیا ہے"۔

یہ ہے ہندو دھرم کا پہلا اصول۔ دُوسرا اصول یہ ہے کہ آدمی محض حواس خمسہ کا ایک مجموعہ نہیں ہے۔ جسم مر کھپ جاتا ہے لیکن رُوح لافانی ہے۔ دیکھئے میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں اگر میں اپنی آنکھیں بند کر لوں اور سوچوں کہ میں کیا ہوں تو سب سے پہلے مجھے اپنے جسم کا خیال آئے گا۔ تو کیا میں محض ہڈی اور ماس کا پتلا ہوں۔ اور اس کے علاوہ میری کوئی حقیقت نہیں، وید اعلان کرتے ہیں کہ میں فقط جسم نہیں ہوں میں اس مادّی جسم میں ایک زندۂ جاوید رُوح ہوں، جسم ایک دن مر جائے گا لیکن میں ازلی اور لافانی ہوں۔ نہ میری تخلیق ہوئی ہے نہ میری تخریب ہو سکتی ہے ماضی بھی میرا ہے حال اور مستقبل بھی میرا۔ مکان و زمان مجھ میں ہے میں اُن سے محدود نہیں۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ رُوح کی تخلیق ہوئی تو پھر اُس کی موت بھی لازمی ہے کیونکہ

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

اور اگر رُوح بھی فانی ہے اور کائنات محض مادّی اجزاء کے یکجا ہونے اور بکھرنے کا نام ہے تو ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کچھ لوگ خوشی اور مسرت کے لئے پیدا ہوتے ہیں، جسمانی صحت اور خوب صُورتی اُن کے

---

[۱] In that case God is sometimes potential and sometimes Kinetic which would make Him mutable. Everything mutable is a compound and everything compound must undergo that change which we call destruction. So God would die which is absurd. Therefore there never was a time when there was no creation.

www.taemeernews.com

حِصّے میں آتی ہے۔ وہ دماغی قوت سے مالامال ہوتے ہیں اور اُن کی ضرورت ہر خواہش پوری ہوتی رہتی ہے اور کچھ لوگ رنج والم لئے اس دُنیا میں آتے ہیں اُن کی ساری عمر مصیبتیں جھیلتے کٹتی ہے اور وہ جسمانی صحت سے محروم۔ دماغی توازن کے عاری مفلسی اور غریبی کے دن کاٹتے ہیں۔

کیا فلسفۂ مادّیات کے پاس اِس سوال کا جواب ہے ؟ کیا ایک رحیم و کریم خالق اس ناانصافی کو برداشت کرسکتا ہے ؟ اگر خدا ہم سب کی تخلیق کرتا ہے تو آدمی آدمی میں یہ فرق کیا ؟ یہ کوئی تسلی بخش جواب نہیں کہ جو لوگ یہاں مصیبت اور دُکھ کی زندگی کاٹتے ہیں اگلی دُنیا میں سُکھ چین پائیں گے ۔ آخر ایک رحیم خالق کی کائنات میں یہ کیوں ضروری ہے کہ آدمی اس دُنیا میں دُکھ سہے تاکہ دُوسری دُنیا میں آرام پائے یا تو یہ کہنا پڑے گا کہ ایسا خالق جس کی دنیا میں یہ سب ناانصافی جائز ہے ایک مطلق العنان ہستی ہے جو اپنی من مانی کرتا ہے یا یہ ماننا پڑے گا کہ خالق و تخلیق کا نظریہ ہماری تسلی کے لئے ناکافی ہے اور دنیاوی غمی اور خوشی آرام اور مصیبت کا سبب کچھ اور ہی ہے ۔ اور اگر ایسا ہے تو یہ سبب آدمی کی پیدائش سے پہلے وجود میں آتا ہے ۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اس جنم سے پہلے بھی ہماری کوئی زندگی تھی جس کا اثر ہم پھر اس دنیا میں لے آئے ہیں ۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اِس نظریہ کی چنداں ضرورت نہیں آدمی کے جسمانی اور دماغی رُجحان اُسے اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملتے ہیں لیکن آپ سوچیں تو یہ وضاحت کہاں تک تسلی بخش ہے ؟ ہمارے سامنے جسمانی اور دماغی وجود کی اپنی اپنی ہستی موجود ہے ہم اپنے تجربے کی بنا پر یہ ثابت نہیں کرسکتے کہ ہماری دماغی زندگی مادّی اجزا سے ہی پیدا ہوئی ۔ اگر ہم یقینی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری قوتِ خیال ۔ ہماری تخلیق و اختراع کی طاقت' ہماری سوال پوچھنے کی عادت' ہماری قدریں' ہمارے احساسات و جذبات' سب کے سب مادّی ہیں تو شاید مادیات کا نظریہ بھی ہمارے سب عُقدے حل کرنے میں کامیاب ہوجاتا لیکن ایسا نہیں ہے مجبوراً ہمیں مادیات سے اُوپر اُٹھنا پڑتا ہے اور ایک ایسی چیز کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جس سے مادّی اور غیر مادّی دونوں اجزا وجود میں آئے جیسے سائنس داں مادّی اشیا کی اصل تک پہنچنے کے لئے ایک بنیادی جُز کی تلاش کرتا ہے جس سے سب چیزیں مرکب ہیں اسی طرح فلسفی کو بھی اس چیز کی ضرورت پڑتی ہے ۔ جس میں مادّی اور غیر مادّی دونوں جز سما سکیں اس دلیل کی بنا پر وحدت الوجود کا نظریہ بھی ثابت کیا جاسکتا ہے لیکن میں محض دلیل سے کام نہیں لینا چاہتا مجھے اس سے انکار نہیں کہ انسان کے کئی رجحانات اسے ماں باپ سے ملتے ہیں لیکن اِن سب کا تعلق جسم سے ہوتا ہے ۔ جہاں تک دماغی تاثرات کا تعلق ہے وہ جسم کی وساطت سے پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ تمام جسمانی اور بالواسطہ دماغی رُجحانات انسانی کردار کی پوری طرح وضاحت نہیں کرتے ۔ انسانی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ کچھ اور رُجحانات بھی ہیں جو اس کے کیرکٹر کی تشکیل کرتے ہیں ۔ یہ ہیں وہ رُوحانی رُجحانات جو انسان اپنے پچھلے جنم سے اپنے ساتھ

www.taemeernews.com

لاتا ہےؔ۔ اور حق تو یہ ہے کہ یہی رجحانات ہی اُسے خاص خاص خاندانوں میں جنم لینے پر مجبور کرتے ہیں تاکہ وہ اس خاندان کے مخصوص ماحول میں اپنے اظہار کے مواقع حاصل کر سکے اور یہ بات سائنس کے تازہ تجربات کے بھی موافق ہے سائنس داں کہتے ہیں کہ انسانی کردار میں عادت کو بہت حد تک دخل ہے اور عادت آخر ایک ہی بات کو دُہرانے سے بنتی ہے اگر ہمارے رجحانات عادت کی ایک شکل ہیں تو یہ عادت ہم میں جنم سے پہلے ہی پڑی ہوگی کیونکہ نئے جنم کی عادتیں پڑنے میں تو وقت لگتا ہے۔

آپ مجھ سے پوچھ سکتے ہیں کہ اگر یہ سب سچ ہے تو ہمیں اپنے پچھلے جنم کے حالاتِ زندگی کیوں قطعاً یاد نہیں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ پچھلے جنموں کی یاد ہمارے تحت الشعور میں موجود ہے مثال کے طور پر دیکھئے کہ میں اسوقت آپ کے سامنے انگریزی میں تقریر کر رہا ہوں انگریزی میری مادری زبان نہیں ہے لیکن اس وقت میری مادری زبان کا ایک لفظ بھی میرے شعور میں داخل نہیں ہے لیکن اگر میں اپنے خیالات کو اپنی مادری زبان میں سوچنے لگوں تو فوراً میرے شعور میں اپنی زبان کے الفاظ کا طوفان اُمڈ پڑے گا ظاہر ہے کہ ہمارا روزمرّہ کا شعور ہمارے دماغی سمندر کی سطح ہے۔ اس سمندر کی تہ میں ہمارے سب تجربات ڈوبے ہوئے ہیں۔ کوشش کرنے سے ہم اپنی گذشتہ زندگی کو بھی شعور کی سطح پر لا سکتے ہیںؔ۔ یہ کچھ محض نظریہ ہی نہیں۔ اس کے ثبوت میں نہ صرف ہمارے رشیوں کے ذاتی تجربات موجود ہیں بلکہ انہوں نے وہ طریقے بھی بتا دیئے ہیں جن پر عمل کرنے سے ہم خود اس بات کا ثبوت بہم پہنچا سکتے ہیں۔ یہ چیلنج ہم تمام دنیا والوں کو دیتے ہیں کہ آؤ اور خود آزما کر دیکھو کہ تحت الشعور کے اتھاہ سمندر میں کس طرح ہلچل مچائی جا سکتی ہے اور کس طرح جنم کے حالات سے واقفیت حاصل ہو سکتی ہےؔ۔

ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ آدمی درحقیقت ایک لازوال رُوح ہے جسے نہ تلوار کاٹ سکتی ہے۔ نہ آگ جلا سکتی ہے نہ پانی بھگو سکتا ہے نہ ہوا سُکھا سکتی ہے۔ ہر رُوح ایک ایسا دائرہ ہے جس کا محیط مکان و زمان کی حدود سے باہر ہے اور جس کا مرکز ہمارے جسم کے اندر ہے موت کی حقیقت بس اتنی ہے کہ رُوح کا یہ مرکز ایک جسم سے دوسرے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ رُوح مادّی مجبوریوں کی کسی طرح بھی پابند نہیں۔ یہ دراصل

لہ ماے بیا نگِ چنگ نہ امروز می خوریم ، ؛ بس دور شد کہ گنبدِ چرخ ایں صدا شنید ،
ملاتم بخرابی مکن کہ مرشدِ عشق ، ؛ حوالتم بخرابات کرد روزِ نخست ؛
سہ بیادِ چشمِ تو خود را خراب خواہم ساخت ، ؛ بنائے عہدِ قدیم استوار خواہم کرد ؛
سہ اس سلسلے میں آجکل ہپناٹزم نے کافی معلومات بہم پہنچائی ہیں اور ثابت کر دیا ہے کہ انسان نہ صرف بچپن بلکہ جنم سے پہلے کے حالات کو بھی شعوری سطح پر لا سکتا ہے۔

106 www.taemeernews.com

مطلقاً آزاد ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں یہ پاک ہے متبرک ہے اور ہر لحاظ سے کامل ہے¹ لیکن وہ اپنی حقیقت کو بھول کر کسی طرح سے مادہ سے متعلق ہوگئی ہے اور سمجھنے لگی ہے کہ وہ خود مادہ ہے۔ مکان و زمان سے متعلق ہوگئی ہے اور سمجھنے لگی ہے کہ وہ مکان و زمان سے محدود ہے۔

یہاں قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک پاک متبرک اور آزاد ہستی مادہ (matter) کی غلامی میں کیسے پھنس گئی۔ کامل رُوح اپنے آپ کو کیسے بھول کر خود کو نامکمل سمجھنے لگی۔ ہندوؤں کے خلاف الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اس سوال کا جواب دینے سے کتراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سوال اُٹھتا ہی نہیں ہے² بعض مفکر اس سوال کے جواب میں ایک آدھ کم کوشش مکمل ہستی کی اختراع کرتے ہیں اور موٹے موٹے لفظ استعمال کر کے خیالات کو پریشان کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کسی چیز کا کوئی نام رکھ دینے سے اس کی وضاحت نہیں ہوجاتی سوال ویسے کا ویسا اور وہیں کا وہیں رہتا ہے کہ ایک مکمل ہستی غیر مکمل کیسے ہوگئی۔ ایک پاک اور متبرک ہستی آلائش سے کس طرح وابستہ ہوگئی ایک سچے ہندو کا صاف جواب یہ ہے کہ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ وہ لفاظی کا سہارا لینا نہیں جانتا' وہ صداقت سے منحرف ہوکر دلیل بازی اور منطق سے کام لینا نہیں چاہتا۔ وہ دلیری سے اپنے لاجواب ہونے کا اعتراف کرتا ہے اور کہتا ہے مجھے اس کا علم نہیں کہ مکمل متبرک پاک اور آزاد روح مادہ سے کیونکر منسلک ہوگئی اور کس طرح اپنے آپ کو بھول کر خود کو مادہ سمجھنے لگی لیکن میں اپنے ذاتی اور قومی تجربے کی بنا پر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ رُوح ہے اور مکمل متبرک پاک اور آزاد ہے مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ رُوح کے آزاد مکمل اور پاک ہونے کے باوجود ہر شخص اپنے آپ کو محض جسم تصور کرتا ہے لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے میں اس کا جواب دینے سے قاصر ہوں یہ کہنا کہ خدا کی مرضی ہی ایسی ہے اس سوال کا کوئی جواب نہیں سوال سے کترانا ہے۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ انسانی رُوح جسم سے منسلک ہوکر بھی لازوال ہے' زندۂ جاوید ہے' کامل ہے' لاانتہا اور لامکاں ہے۔ موت اس صورت کا نام ہے جب رُوح انسانی جسم کو چھوڑ دیتی ہے اور پیدائش وہ حالت ہے جب رُوح ایک نئے جسم میں جاگزیں ہوجاتی ہے' ہمارا حال ہمارے ماضی کے تاثرات کی پیداوار ہے اور ہمارے مستقبل کی تعمیر حال سے ہوتی ہے۔ رُوح اس جنم مرن کے لاانتہائی سلسلے میں ارتقا کی بلند سے بلند تر منزلیں طے کرتی جاتی ہے حالانکہ کبھی کبھی ترقی کی راہوں سے بھٹک کر تنزل کی پستیوں میں بھی گر جاتی ہے جہاں سے اُسے از سر نو ارتقا کی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان محض ایک ہلکی پھلکی کشتی ہے

---

¹ گفتی کہ حافظا ایں ہمہ رنگِ خیال چیست ✤ نقشِ غلط مخواں کہ ہماں لوح سادہ ایم

² در رہِ عشق نشد کس بیقیں محرمِ راز ✤ ہر کسے بر حسبِ وہم گمانے دارد

www.taemeernews.com

جو طوفانِ ہستی میں گھر گئی ہے جسے اچھے اور بُرے کرموں کی طوفانی لہریں کبھی اپنے ہاتھوں میں لے کر سر سے اُوپر اُچھال دیتی ہیں اور کبھی اپنے پاؤں میں دبے پٹختی ہیں۔ کیا یہ طوفان زدہ کشتی ہمیشہ اسی طرح زندگی اور موت کی تیز و تند لہروں کا کھلونا بنی رہے گی جسے جب چاہا توڑ دیا اور جب چاہا پھر بنا کر تھپیڑوں کے حوالے کر دیا! کیا انسان اس قدر بے بس ہے؟ کیا انسان اتنا مجبور ہے؟ کیا انسان کی ہستی ایک چیونٹی کے برابر ہے جسے کرم (اعمال) کا بے پروا پہیہ بیدردی سے کچلتے ہوئے نکل جاتا ہے؟ کیا کرم کا قانون اس قدر اندھا اور بہرا ہے کہ بیواؤں کے آنسو اُس کے لئے بالکل ان دیکھے ہیں اور یتیموں کی چیخیں اس کے لئے قطعاً ان سُنی ہیں؟ کیا یہی قانونِ فطرت ہے؟ جس سے کوئی چھٹکارا نہیں؟ یہ ہے انسانی دل کی آواز جو مایوسی اور دُکھ درد کی گہرائیوں سے ہمیشہ نکلتی آئی ہے' یہ ہے وہ بنیادی سوال جس کا جواب انسان کا دردبھرا دل ہمیشہ سے تلاش کرتا چلا آیا ہے' ہزاروں سال پہلے جب یہ آواز ہمارے یہاں اُٹھی۔ جب یہ سوال ہمیں پیش آیا تو ہمارے ایک دلبر رشی نے یہ الہامی اعلان کیا "نشاطِ ابدی کے برخوردارو شنو زمین اور آسمان کے رہنے والو سنو میں نے اُس لازوال ہستی کو پا لیا ہے جو سراپا نور ہے' سراپا حقیقت ہے' جس کے سامنے ظلمت اور جہالت ناپید ہو جاتی ہے جس کو جان کر تم موت کے ہتھکنڈوں سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارہ پا جاؤ گے"

سُنا آپ نے 'نشاطِ ابدی کے برخوردارو' کیا القاب ہے! کیا بلند پایہ نام ہے جو رشی نے بنی نوعِ انسانؑ کو بخشا ہے! مسرت کی شگفتگی سے لبریز اُمید کے نور سے درخشاں' یہ ہے وہ نام جو ہماری اصل کی جھلک لئے ہوئے ہے اور میں اسی نام سے آپ سب کو خطاب کروں گا آپ ہیں مسرتِ ابدی کے وارث بحیثیت ہندو ہونے کے میں کسی بھی حالت میں آپ کو گنہ گار نہیں کہہ سکتا۔[1]

آپ ہیں خدا کی اولاد نشاط و سرور کے حصے دار' پاک و صاف ہر طرح سے مکمل اور بے عیب آپ تو دیوتا ہیں' آپ کو کون گناہ گار کہہ سکتا ہے میں تو کہوں گا کہ انسان کو گنہگار کہنا ہی گناہ ہے' انسانی فطرت کے نورانی ماتھے پر سیاہ دھبہ لگانا ہے' آؤ میرے بھائیو! اپنی حقیقت کو پہچانو تم شیر ہو شیر' اپنے آپ کو بُزدل دیے بس بھیڑ بکری مت سمجھو' اپنے آپ کو دھوکا مت دو' اپنے احساسِ کمتری کو جھٹک کر پھینک دو۔ تم لازوال روح ہو' مطلقاً آزاد ہو' پاک اور متبرک ہو تم مادی نہیں' تمہاری حقیقت تمہارا جسم نہیں' تم عالمِ مادی کے خدا ہو خادم نہیں۔[2]

---

[1] پیرِ ما گفت خطا بر قلمِ صنع نرفت ؛ آفریں بر نظرِ پاکِ خطا پوشش باد

[2] تو از کنگرۂ عرش می زنند صفیر ؛ ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد است

www.taemeernews.com

یہ ہے ویدوں کا اعلان، یہ ہے نعرۂ تکبیرِ آدم، بظاہر یہ جہان جارحانہ قوانین کی مشق گاہ سہی، دیکھنے میں انسان قوانینِ فطرت کے ہاتھوں مجبور اور بے بس بھی، زندانِ موت و حیات میں پابہ زنجیر قیدی ہی لیکن درحقیقت وہ آزاد ہے فطرت کے سارے قانونوں سے بالا کیونکہ اس تمام عالمِ شہود کے پس پردہ بس ایک ہی حقیقت ہے اور انسان دراصل بذاتِ خود بھی ایک حقیقت ہے جس میں تمام دنیا سمائی ہے اور جو دنیا کی ہر شے میں بسی ہے اُسی کے حکم سے ہوا چلتی ہے، آگ جلتی ہے، بادل برستے ہیں اور اُسی کے اشارے پر موت دندناتی پھرتی ہے۔"

آپ پوچھیں گے اس ہستی کے خواص کیا ہیں؟ اُسے کیسے پہچانا اور پایا جاسکتا ہے۔ یہ ہستی ہر جگہ موجود و حاضر و ناظر ہے، پاک اور متبرک ہے، اس ہستی کی کوئی معین صورت نہیں۔ رحیم و کریم ہے، قادرِ مطلق ہے، ہمارے ویدک رشیوں نے اُسے یوں خطاب کیا ہے "تم ہی ماتا ہو تم ہی پتا، تم ہی ہمارے پیارے دوست، تم ہی تمام طاقت کا منبع ہو، ہمیں قوت بخشو، تم ہی نے تمام کائنات کا بوجھ اٹھا رکھا ہے ہمیں طاقت دو کہ ہم اپنی زندگی کا تھوڑا سا بار اٹھا سکیں"۔

اِس ہستی کو پایا جاسکتا ہے خلوص اور محبت سے اس کی پوجا ہوتی ہے، پریم سے رشیوں نے کہا ہے "اُس کی پوجا کرو اُسے اپنا محبوب جان کر، اس سے پیارا محبوب دونوں عالم میں نہ ملے گا"۔

یہ ہے عشقِ الٰہی (پریم بھگتی) کا مسلک جس کا پتہ ہمیں ویدوں میں ملتا ہے۔ اِس طریقۂ حیات کو سری کرشن نے جنہیں ہم بھگوان کا اوتار مانتے ہیں، اور بھی زیادہ وضاحت سے گیتا میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ انسان کو اس دنیا میں کمل کے پتے کی طرح زندگی کرنا چاہیئے۔ کمل کا پتا پانی میں اگتا ہے لیکن وہ کبھی پانی میں غرق ہو کر نہیں رہتا وہ پانی سہی مگر ہمیشہ سربلند رہتا ہے۔ عین اسی طرح انسان کو دنیا میں رہنا چاہیئے اس کے ہاتھ پاؤں اپنا اپنا کام کرتے رہیں لیکن اس کے دل و دماغ ہمیشہ بھگوان کے چرنوں لگے رہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کہ اے بلند نظر شاہبازِ سدرہ نشیں، ؏ نشیمنِ تو نہ ایں کنجِ محنت آباد است،

۴۔ من بہر آں یکے دو جہاں دادہ ام بباد ؏ عیبم مکن کہ حاصلِ ہر دو جہاں یکے ست

۵۔ نہ نام ہے نہ ترا روپ ہے مگر تو ہے، ؏ نسیم ہے نہ چمن ہے نہ گُل مگر تُو ہے،

۶۔ ترا مقام معین نہیں تو ہر سُو ہے، ؏ تو چھپ کے آپ ہی اپنی نظر سے خود بخود ہے

۷۔ غلامِ ہمتِ آنم کہ زیرِ چرخِ کبود ؏ زہر چہ رنگِ تعلق پذیرد آزاد است،

www.taemeernews.com

اور وہ بھی اس طرح کہ پریم بھگتی میں نہ کسی دنیاوی خواہش کی لاگ ہو اور نہ ہی جنت کی آرزو کا پرتو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ خدا سے کسی چیز کے لئے دعا مانگنا بُرا ہے۔ اپنی جگہ پر خدا کو اس طرح یاد کرنا بھی اچھا ہے لیکن ہمیں اس ابتدائی مرحلے سے گزر کر (خدا سے عشق) بھگوان سے پریم محض اس لئے کرنا ہے کہ اُس سے پریم کرنا ہماری فطرت ہے اور ہمارا سچّا اور پوتر پریم اُس کا حق ہے' ہمارے رشی پرماتما سے دعا بھی مانگتے ہیں تو اس طرح بھگوان مجھے دھن دولت نہیں چاہیئے۔ مجھے اولاد نہیں چاہیئے۔ مجھے علم و ہُنر کی بھی ضرورت نہیں۔ مجھے مکتی تک نہیں چاہیئے اگر تیری یہی رضا ہے تو مجھے یہ بھی منظور ہے کہ میں بار بار جنم لے کر اس آواگون کے چکر میں مبتلا رہوں لیکن مجھے اپنا پوتر پریم بخشو تاکہ میں صلہ کی اُمید اور انعام کی خواہش کو ترک کر کے تجھے محض تیری خاطر پوجتا رہوں۔"

بھگوان سے سچّے پریم کی ایک اعلیٰ مثال خود سری کرشن کے ایک بھگت مہاراجہ یدھشٹر کی زندگی سے ملتی ہے' دشمنوں نے مہاراجہ یدھشٹر سے راج پاٹ چھین لیا اور وہ اپنی مہارانی اور اپنے بھائیوں سمیت ہمالیہ کے پہاڑوں میں جا پناہ گزیں ہوا' محلوں کے سُکھ اور چین بس خواب و خیال ہو کر رہ گئے' ایک دن مہارانی نے پُوچھا 'مہاراج میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسے ایماندار اور نیک آدمی پر کیوں اتنی مصیبتیں ٹوٹ پڑی ہیں' یدھشٹر نے کہا "دیوی سامنے دیکھو ہمالیہ پربت کس شان سے سربلند کھڑا ہے۔ میں جتنا اس پربت کی شان اور سُندرتا کو دیکھتا ہوں اتنا ہی میرے دل میں مسرت کی لہریں موجزن ہوتی ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اس سے پریم ہے اس پہاڑ سے مجھے کوئی خاص چیز تو نہیں ملتی لیکن میرے دل میں اس کے لئے پیار بھرا ہے۔ ہر عالیشان شے سے متاثر ہونا' ہر حسین چیز سے محظوظ ہونا میری فطرت میں داخل ہے' یہی حقیقت میں وہ جذبہ ہے جسے عشق کہتے ہیں مجھے ہر خوبصورت اور ہر عظیم شے سے عشق ہے میں بھگوان سے پریم کرتا ہوں کیونکہ اس سے زیادہ عظیم اور حسین دُنیا میں کوئی شے نہیں ہے۔ بلکہ وہی دُنیا کی ہر حسین شے کا حُسن ہے اور وہی ہر عظیم شے کی عظمت۔ حقیقی محبت بس صرف بھگوان سے ہی ہو سکتی ہے' محبت میری سرشت ہے اس لئے میں بھگوان سے والہانہ محبت کرتا ہوں مجھے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں چاہیئے' میں اس کے علاوہ بھگوان سے مانگوں بھی تو کیا؟ جہاں اُس کی مرضی ہو جس حال میں وہ چاہے مجھے رکھے' میں ہر جگہ اور ہر حال میں خوش ہوں' میرا کام تو بس اسی کے چرنوں میں اپنا پریم ارپن کرنا ہے' میں عشق کا تاجر نہیں ہوں کہ بھگوان سے سودا بازی کروں' میری محبت بذاتِ خود ایک مسرت انگیز جذبہ ہے۔ اس کے بدلے میں مجھے بھگوان سے کچھ نہیں چاہیئے میرے لئے میری محبت خود اپنا انعام ہے۔"

لہ تو بندگی چو گدایاں بشرطِ مزد مکن ؛ کہ دوست خود روشِ بندہ پروری داند'

۲ہ حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس ؛ در بندِ ایں مباش کہ نشنید یا شنید

www.taemeernews.com

یہ ہے ویدوں کی تعلیم کا عملی پہلو وید ہمیں بتاتے ہیں کہ رُوح درحقیقت یزدانی ہے یعنی آتما پرماتما کا جُزو ہے نہ جانے کیونکر مگر یہ مادی زنجیروں میں جکڑ جاتی ہے تو ہم اپنی حقیقت کو بھول جاتے ہیں جونہی ہم ان بیڑیوں کو توڑ پائیں گے ہمیں اپنی مکمل آزادی کا احساس ہوجائے گا اسی احساس تکمیل کا نام ویدوں نے مکتی رکھا ہے، رنج وغم سے مکتی، موت سے چھٹکارا حیات جاوداں اور مکتی ہمیں مل سکتی ہے تو بھگوان کی دَیا سے اس کی کرپا (رحمت) سے اور بھگوان کی یہ دیا صرف ان لوگوں پر ہوتی ہے جو دل کے صاف ہوں جو ہر پہلو سے پاکیزہ ہوں[1] اِن پاک دل لوگوں پر بھگوان کی دَیا یوں ہوتی ہے کہ وہ خود بھگوان کے درشن کر لیتے ہیں۔ اُن کی زندگی بدل کر راہِ راست پر آجاتی ہے اور دل کی سب میل دُور ہوجاتی ہے، سب شک مِٹ جاتے ہیں اور آواگون کا چکر ختم ہوجاتا ہے۔

یہ ہے ہندو دھرم کا بنیادی اُصول جس کے مطابق ہر ہندو اپنی زندگی کی تشکیل کرتا ہے۔ یہ ہے وہ مرکزی نقطہ جس کے گرد ہندوؤں کی تمام انفرادی اور قومی زندگی گھومتی ہے، ہندو محض نظریوں پر اکتفا نہیں کرتا کھوکھلے لفظوں سے اُس کی تسلی نہیں ہوتی، اگر حواسِ خمسہ کی دُنیا کے علاوہ کوئی اور دُنیا ہے تو وہ اس دُنیا کو حاصل کرنے کے لئے ہر عملی قدم اُٹھانے کے لئے تیار ہے اگر زندگی کا کوئی پہلو ایسا بھی ہے جو حواس کی زد سے باہر ہے تو وہ زمان ومکان کی حدود کو چیر کر اس سے دوچار ہونا چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے جان کی بازی تک لگانے کے لئے تیار ہے، اگر اس مادی جسم میں غیر مادی رُوح موجود ہے اگر اس جہانِ شہود کے پس پردہ کوئی رُوحِ اعظم کارفرما ہے تو وہ براہِ راست اُس تک جانے کی ہر کوشش کرنے کے لئے تیار ہے اور اسکے لئے ہر قربانی کو جائز سمجھتا ہے اگر خدا ہے تو وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے وجہ یہ ہے کہ ہندو دھرم نے رُوح اور خدا کی ہستی کے ثبوت میں اپنے ذاتی تجربے کو پیش کیا ہے اور کہا ہے "میں نے خود خدا کو دیکھا ہے۔"

---

[1] حجابِ چہرۂ جاں می شود غبارِ تنم ، خوشا دمے کہ ازیں چہرہ پردہ بر فگنم

[2] چشمِ آلودہ نظر از رُخِ جاناں دُور است ، بر رُخِ او نظر از آئینۂ پاک انداز ،

[3] اور ابچشمِ پاک تو آں دید چوں ہلال ، ہر دیدہ جائے جلوۂ آں ماہ پارہ نیست ،

" غسل در اشک زدم کاہلِ طریقت گویند ، پاک شو اول وپس دیدہ برآں پاک انداز

" صوفی بیا کہ خرقۂ سالوس برکشیم ، وین نقشِ زرق را خطِ بطلان بسر کشیم

[4] گشتہ ام در جہان و آخر کار ، دلبرے برگزیدہ ام کہ مپرس

سوے من لب چہ می گزی کہ بگو ، لب لعل گزیدہ ام کہ مپرس

www.taemeernews.com

اور اگر تم چاہو تو تم بھی اُسے دیکھ سکتے ہو عین اسی طرح جیسے میں تمہیں دیکھ رہا ہوں یا تم مجھے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت سے" یہ ہے تکمیلِ خودی کا وہ مقام جس کی تلقین ہندو دھرم کرتا ہے۔ یہ مذہب کسی نظریے یا اُصول پر اعتقاد لانے پر زور نہیں دیتا اس کی تعلیم بس اسی پر منحصر ہے کہ آؤ خود اپنی کوشش سے خُدا کو پاؤ خدا پر محض یقین لانا کافی نہیں۔ یقین سے بذاتِ خود تمہاری زندگی پوری طرح یزدانی نہیں ہو سکتی خدا کو پاکر ہی تمہاری زندگی مکمل اور پاک ہو سکتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ زندگی کا مقصد یہی ہے تکمیلِ خودی اور بس مذہب کا کام یہی ہے کہ انسان کو خدا تک لے جائے شروع سے آخر تک ہندو دھرم کی تعلیم کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے انسان کو تلاشِ حق کے لئے آمادہ کرنا، اسے اس مشکل معیار کو حاصل کرنے کے لئے جدّ وجہد کی تلقین کرنا، اس کی مشکلات کو دُور کر کے اس کی ہمت بندھانا تاکہ آخر کار یہ خاک کا پتلا خدائے عرش نشیں کے مقام کو پالے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ آخر کمالِ خُودی کا حاصل کیا ہے اور خُدا رسیدہ بندوں کو آخر رُوحانی جدّ وجہد سے کیا ملتا ہے؟ ہندو دھرم کہتا ہے کہ وہ چیز جو خود شناس رُوح کے ہاتھ آتی ہے ابدی مسرت ہے نشاطِ روح ہے یہ ایسی خوشی ہے جس میں تمام مسرتیں سما کر رہ جاتی ہے اور انسان اس حقیقی اور بنیادی خوشی میں سدا مگن ہو جاتا ہے اپنے خدا کو پاکر، اپنے بھگوان سے لین ہو کر آدمی یزدانی مستی میں ڈوب جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نقطۂ کمال پر بندہ و خدا دونوں کی اپنی اپنی ہستی قائم رہتی ہے اور اگر ایسا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے نقطۂ کمال تو مطلق و واحد ہی ہو سکتا ہے اس میں دُوئی کی گنجائش کہاں ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ من و تو کا سلسلہ نقطۂ کمال پر پہنچتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ رُوح جب اپنی حقیقت سے آشنا ہو کر اپنے کمال کو پہنچتی ہے تو خدا سے ایک ہو جاتی ہے، دُوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ خود شناس رُوح اور خدا دراصل ایک ہی چیز ہیں۔ بھگوان کا بھگت جب بھگوان میں لین ہو جاتا ہے تو بھگوان ہو جاتا ہے

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ) من بگوشِ خود از دہانش دوش ؛ سخنانے شنیدہ ام کہ مپرس
- ہمچو حافظ غریب در رہِ عشق ، ؛ بمقامے رسیدہ ام کہ مپرس
- بے خود از شیشۂ پرتوِ ذاتم کردند ؛ بادہ از جامِ تجلّیٔ صفاتم دادند
- آخر چہ گویم ہست از خود خبرم چوں نیست ؛ در بہر چہ گویم نیست با او نظرم چوں ہست
- از دل و جاں شرفِ صحبتِ جاناں غرض است ؛ ہمہ آنست وگرنہ دل و جاں ایں ہمہ نیست
- سالہا دل طلبِ جامِ جم از ما می کرد ؛ وانچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد
- گوہرے کز صدفِ کون و مکاں بیرون است ؛ طلب از گم شدگانِ لبِ دریا می کرد

112 www.taemeernews.com

اور اس بھگوان کی حقیقت ہے ستیہ، چیت آنند یعنی حقیقی علم، ابدی یعنی ابدی مسرت جس کا اندازہ صرف وہی کر سکتے ہیں جو اس حدِ کمال تک پہنچ گئے ہیں، یہ کہنا کہ ایسی حالت میں انسان اپنی انفرادیت کھو بیٹھتا ہے اور اُس کی حقیقت ایک بے جان پتھر سے زیادہ نہیں رہتی، محض انجان لوگوں کی باتیں ہیں جنہوں نے کبھی زخم نہ کھائے ہوں وہ دُوسروں کے داغوں پر ہنس ہی سکتے ہیں، اُن کے تجربے میں شرکت نہیں کر سکتے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وصلِ الٰہی ہرگز اس قسم کی موت نہیں ہے اگر انسان کو اس ناچیز جسم کے احساسات پاکر سرور ملتا ہے۔ تو یقیناً دو یا دو سے زیادہ جسموں کے احساسات بیک وقت پانے پر تو اور بھی زیادہ خوشی ہوگی کیونکہ جسم ہماری اندرونی طاقت کا ایک کرشمہ ہے، جتنی ہی ہماری جسمانی قوتیں زیادہ ہوں گی اُتنا ہی شدید احساس ہمیں اپنی برتری کا ہوگا اور اس احساس کی شدت ہی ہماری خوشی کا معیار ہے۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ اگر آپ کے جسم میں ایک نہیں ہزاروں انسانوں کا شعور و احساس پیدا ہو جائے تو آپ کس قدر مسرور ہوں گے خدا رسیدہ انسان کی بس یہی حالت ہوتی ہے۔ اس کے شعور و احساس میں سب کائنات سما جاتی ہے اور وہ نشاطِ رُوح میں ڈوب جاتا ہے، اس حالت کو انفرادی موت سمجھنا لاعلمی نہیں تو اور کیا ہے، آخر جوانی آتی ہے تو بچپن مر نہیں جاتا بلکہ جوانی بذاتِ خود بچپن ہی کا ایک رنگین اور پُر لطف رُخ ہے کون ہے جو جوانی کے ولولوں کی خاطر اپنے لڑکپن کے کھیل کود سے آگے گزرنے سے گھبراتا ہے؟ اسی طرح اگر رُوح کی وسعتوں کو پانے کے لئے انفرادیت کی کال کوٹھری سے نکلنا پڑتا ہے تو یہ قطعاً ہماری موت نہیں بلکہ زندگی کی تکمیل کی صورت ہے یہ وہ مقام ہے جہاں تمام ذی حس چیزوں کا شعورِ خودی اناالحق کے نقطہ پر یکجا ہو جاتا ہے[1]۔

ظاہر ہے کہ وحدت الوجود کے احساس کو پانے کے لئے انفرادیت کا کھو دینا لازمی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ موت سے نجات تب ہی مل سکتی ہے جب انسان کو بس زندگی ہی زندگی کا احساس ہو۔ ایک اَبدی زندگی جس کا نہ آغاز ہے نہ انجام اسی طرح رنج والم کا خاتمہ اُسی حالت میں ہی ہو سکتا ہے جب انسان کا وجود محض ایک شعورِ نشاط ہو جائے سراپا مسرت۔ جہالت اور غلط روی کا اختتام اُسی صورت میں ہوتا ہے جب انسان مجسم علم ہو جائے، اب آپ خود ہی بتائیے کہ ایسی حالت کو موت سے تعبیر کیا جائے یا عین زندگی سے، انفرادی شعور جب پھیل کر کائناتی شعور بن جائے تو حیات کی تمام وسعتیں انسان کے حصے میں آتی ہیں اس کی ہستی مٹتی نہیں ہے، بڑھ کر حدِ نگاہ سے باہر ہو جاتی ہے۔

سائنس کے نقطۂ نظر سے بھی یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے۔ سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارا جسم ہر گھڑی

---

[1] گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں ٭ کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

تغیر پذیر ہے جسم جب تک زندہ ہے مسلسل تبدیل ہوتا رہتا ہے ہر سانس میں ہزاروں سل (cell.) مرتے ہیں اور ہزاروں نئے سل (خلیہ) پیدا ہوتے ہیں ہماری جسمانی انفرادیت بھی درحقیقت نظر کا دھوکا ہے اگر کسی چیز کو ثبات ہے تو وہ ہے ہماری رُوح ۔

دُوسرے سائنس خود بنیادی طور پر اُس چیز کی تلاش میں ہے جس سے باقی سب چیزیں مرکب ہو کر تشکیل ہوتی ہیں ۔ سائنس اس اسٹیج سے کہیں آگے نکل گئی ہے جب تمام مادّی اشیا کے بنیادی مرکب چند عناصر (elements) قرار دیئے جاتے تھے اب تو سائنس ایٹم سے الیکٹران تک آگئی ہے سائنس میں بےحس مادّہ کی جگہ ایک محرک قوت (energy) نے لے لی ہے ۔ سائنس جب اس ایک چیز کو پالے گی جس کی اُسے تلاش ہے تو سائنس بھی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گی ۔ اسی طرح مذہب بھی اپنے کمال کو اُس وقت پہنچ جائے گا جب وہ اُس ہستی کو ڈھونڈ لے گا جس سے تمام عالم ظہور وجود میں آیا ہے وہ رُوحِ اعظم جس سے تمام ذی رُوح جانیں پیدا ہوئی ہیں جو موت کی زد سے باہر ہے اور زندۂ جاوید ہے ۔

سائنس اور مذہب دونو ایک واحد بنیادی چیز کی تلاش میں ہیں ۔ دونو آخر اپنے اپنے راستے سے ایک ہی منزل تک آ پہنچیں گے آج سائنس کی دنیا میں نئے خیالات کے اظہار کے لئے نئے لفظ استعمال میں لائے جارہے ہیں کیونکہ پُرانے لفظ بےمعنی سے ہو چلے ہیں ۔ مثلاً سائنسداں اب چیزوں کی تخلیق و تشکیل کی بات نہیں کرتے، اُن کے ظہور کا ذکر کرتے ہیں، میرے لئے اور میرے ہم مذہب بھائیوں کے لئے یہ مسرت کا مقام ہے کہ فلسفہ اور مذہب کے جن خیالات کو ہم صدیوں سے سینہ بہ سینہ لئے چلے آئے ہیں آج اُن کا پرچار سائنس کے پُر زور الفاظ میں ہو رہا ہے اور سائنس کے تجربات اور اُس کی روز بروز بڑھتی ہوئی معلومات کی روشنی میں یہ عظیم خیالات اور بھی چمک رہے ہیں ۔

آپ کہیں گے کہ محض فلسفہ کے بلند پایہ اُصولوں کو چھوڑ دو ۔ بھلا ان سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے، بات کرو عوام کے مذہب کی جس سے ہندو دھرم کے عملی پہلو پر بھی کچھ روشنی پڑے، اس سلسلہ میں ایک بات میں خصوصاً آپ کی خدمت میں عرض کروں گا اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں درحقیقت ایک سے زیادہ خدا نہ کبھی مانا گیا نہ مانا جاتا ہے، آپ کو میری بات پر آسانی سے یقین نہیں آئے گا اور بہت حد تک آپ کا شک بجا بھی ہے جس دیش کے ہر مندر میں مختلف دیوی دیوتاؤں کی پوجا ہوتی ہے اُس کے متعلق یہ کہنا کہ وہاں معبود متعدد نہیں ہیں سراسر غلط معلوم ہوتا ہے، لیکن یقین مانیے میں غلط بیانی سے کام لے کر آپ کو

لہ حُسنِ رُوئے تو بیک جلوہ کہ در آئینہ کرد ٭ ایں ہمہ نقش در آئینۂ اوہام اُفتاد،

www.taemeernews.com

دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ آیئے میرے ساتھ چل کر دیکھئے۔ مندر میں خواہ کسی دیوی۔ دیوتا کی مورتی ہو بھگوان کی پرارتھنا ایک ہی ہے، سنیئے تو ہر مندر میں پجاری اپنے اپنے دیوتا کو حاضر و ناظر پر ماتما کہہ کر پکار رہے ہیں وہی خالق ہے وہی رازق، وہی زندگی بخشتا ہے وہی جان لے بھی لیتا ہے۔

اب آپ خود ہی بتایئے کہ ایسی پرارتھنا کرنے والے کیا محض بت پرست دھمی بندے ہو سکتے ہیں؟ مجھے اس سلسلے میں اپنے بچپن کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک عیسائی مشنری ایک بڑے بھاری مجمع میں تبلیغی تقریر کر رہا تھا تقریر کے دوران میں علاوہ اور میٹھی باتوں کے اس نے سوال کیا اگر میں آپ لوگوں کے دیوتا کی مورتی کو اپنی چھڑی سے پیٹوں تو تمہارا دیوتا میرا کیا بگاڑے گا؟ سامعین میں سے ایک دلیر آدمی جھٹ بول اٹھا "اگر میں تمہارے خدا کو گالی دوں تو وہ میرا کیا کرے گا"، مشنری نے کہا "جب تم مرجاؤ گے تو خدا تمہیں سزا دے گا" اس نے کہا کہ "میرا دیوتا بھی تمہیں مرجانے کے بعد خوب سزا دے گا"۔

ظاہر ہے کہ ایسی باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، سچ تو یہ ہے کہ جیسے کسی درخت کی خوبی کا اندازہ اس کے پھل سے لگایا جاتا ہے، اسی طرح کسی مذہب کی اچھائی یا برائی کا اندازہ اس مذہب کے لوگوں ہی کے کردار سے لگایا جا سکتا ہے۔ میں نے اُن لوگوں میں جنہیں طنز و حقارت سے بت پرست کا نام دیا جاتا ہے ایسے ایسے انسانوں کو پایا ہے جن کا اخلاق، روحانیت اور پریم میں کوئی مقابل نہیں۔ ان پاک ہستیوں کو دیکھ کر میں نے اپنے آپ سے بارہا یہ سوال کیا ہے اگر بھگوان کو مورتی کی وساطت سے پوجنا گناہ ہے تو بھلا گناہ سے اس قدر پاکیزگی اور روحانیت کیوں کر نمودار ہو سکتی ہے؟ یہ سچ ہے کہ ضعیف الاعتقادی انسان کی دشمن ہے لیکن تعصب اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہے، ذرا انصاف کی نظر سے دیکھئے کون ہے جو بت پرست نہیں آخر عیسائی گرجا کیوں جاتے ہیں؟ خدا کی پرستش تو ہر جگہ ہو سکتی ہے، پرستش کے وقت آسمان کی طرف کیوں منہ اٹھاتے ہیں، زمین پر بھی تو خدا موجود ہے اور پھر کیتھولک چرچ میں تو نجانے کتنی مورتیاں لگی رہتی ہیں، رہے پروٹسٹنٹ خود ان ہی سے پوچھ لیجئے کہ پوجا کے وقت اُن کے دماغ میں کتنے بت موجود ہوتے ہیں، میرے بھائیو، حقیقت یہ ہے کہ ہماری سرشت ہی ایسی ہے کہ بغیر دماغی تصویر کے ہم کسی شے کے متعلق کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ دماغی نقشے اور تصاویر ہمارے لئے اتنے ہی ضروری ہیں جیسا جینے کے لئے سانس لینا، قانونِ فطرت یہی ہے کہ کسی مادی چیز کو دیکھ کر اس کی دماغی تصویر اُبھر آتی ہے، یا اس کے برعکس جب ہم کسی چیز کے متعلق سوچتے ہیں تو اس کی مادی شکل ہماری نظر میں پھر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مادی اور بیرونی علامتوں اور نشانوں (Symbols) کی مدد سے اپنے بھگوان کی پوجا کرتے ہیں اگر آپ کسی ہندو سے پوچھیں کہ وہ بت کیوں پوجتا ہے تو وہ کہے گا کہ اس کی مدد سے میں اپنے بھگوان کے خیال کو دیر تک جمائے رکھ سکتا ہوں وہ جانتا ہے کہ بت بذاتِ خود خدا نہیں

www.taemeernews.com

نہ ہی وہ حاضر و ناظر ہے۔ اور اگر آپ سوچیے کہ جو آدمی خدا کو حاضر و ناظر جان کر بغیر کسی بیرونی نشان (Symbol) کے اس کی پوجا کرتے ہیں، اُن کے دماغ میں بھی زمین و آسمان کی حدود کی ایک تصویر ہوتی ہے خدا کا تصور جیسا بھی کیوں نہ ہو ہمارے دماغ کی حدود میں گھرا ہوتا ہے۔ بت پرستی اِن حدود کو تسلیم کرتی ہے لیکن بت شکنی بھی اِن حدود سے باہر نہیں جا سکتی خواہ وہ انہیں مانے یا نہ مانے ہماری فطرت کا تقاضا کچھ لامکانیت، کا خیال بھی مکان کی حد تک آ کر رُک جاتا ہے، جب ہم لامکاں ہستی کا خیال کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے دماغ میں نیلگوں، آسمان کی وسعتوں کی تصویر کھنچ جاتی ہے یا اُفق تک پھیلے ہوئے سمندر کی۔ اسی طرح جب ہم تبرک اور پاکیزگی کا خیال کرتے ہیں تو ہماری نظر میں مندر، مسجد یا گرجے اور کراس (cross) کی تصویریں اُبھر آتی ہیں، ہندو دھرم فطرت کے اِس قانون کو پوری طرح سمجھتا ہے، اس لئے اس مذہب میں روحانیت، پاکیزگی سچائی، لامکانیت اور اس طرح کے دوسرے خیالات کو مختلف رنگ اور روپ دے کر مجسم کر دیا گیا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہندو ان بیرونی نشانوں (symbols) میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں، اُن کا مذہب انہیں بھگوان سے ایک ہو جانے کی دعوت دیتا ہے اور خود شناسی کی راہ بتاتا ہے جہاں دوسرے مذاہب میں یہی کافی سمجھا جاتا ہے کہ دینی نظریوں کو تسلیم کر لیا جائے اور نیکی کے کام کئے جائیں، ہندو دھرم کا مرکزی مقصد خدا کو پانا ہے اپنے آپ کو پرماتما تک لے جانا ہے مورتیاں اور مندر، مسجدیں اور گرجے محض مقامات رہ گزر ہیں بلکہ یوں کہیے کہ ادائی روحانیت کے سہارے ہیں جن کی ضرورت آگے چل کر قطعاً نہیں رہتی۔ ویدوں میں لکھا ہے کہ خارجی پوجا روحانیت کی راہ میں ایک ادنیٰ مقام ہے، اس سے آگے بڑھو تو دل ہی دل میں پوجا کرنے کا درجہ آتا ہے لیکن سب سے اعلیٰ مقام وہی ہے جہاں بھگوان کے درشن ہو جاتے ہیں بھگوان بھگت کے اور بھگت بھگوان کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور بھگت اعلان کرتا ہے کہ "چاند سورج اور ستاروں کی روشنی اس ازلی نور کے آگے ہیچ ہے بجلی کی چمک اور آگ کے شعلے بے معنی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان تمام نورانی اجسام میں وہی ایک نور جلوہ فگن ہے"۔

مگر ہندو دھرم اس بات سے بھی بخوبی واقف ہے کہ اس مقام تک آنے کے لئے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے ہندو دھرم روحانیت کے رستے کے کسی بھی مقام کو غلط یا جھوٹا نہیں سمجھتا اس کی نظر میں سب طریق عمل برابر ہیں اور اپنی اپنی جگہ سچے ہیں اس کی ہدایت تو بس یہی ہے کہ کسی بھی مقام پر نہ رکو۔[1] اگر مورتی پوجا سے کسی آدمی کو اپنی روحانیت پانے میں مدد ملتی ہے تو اس میں گناہ کیا ہے۔ یہ بھی روحانی رستے

---

[1] مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم ✧ جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

www.taemeernews.com

کا ایک پڑاؤ نکل جائے گا۔ ہندو دھرم کا کہنا ہے کہ انسان گناہ سے پاکیزگی، اندھیرے سے روشنی، جہالت سے آگہی اور جھوٹ سے سچائی کی طرف گامزن نہیں ہے بلکہ اُس کی اصل پاکیزگی، روشنی خود آگہی اور سچائی ہے، اس کی ارتقا سچائی کے ایک مقام سے دُوسرے بلند تر مقام کی طرف ہوتی ہے۔ اِس طرح اُس کی نورانی زندگی اور بھی زیادہ منور ہوتی ہے، وہ پاکیزہ تر ہوتا چلا جاتا ہے اور اسرارِ حقیقت سے اور زیادہ واقف و آگاہ۔ اِس نگاہ سے دیکھا جائے تو دُنیا کے تمام مذاہب، خواہ وہ محض توہمات پر مبنی ہوں، خواہ وحدت الوجود کے حامی ہوں، سب کے سب رُوحِ انسانی کی خود تلاشی کے وسائل نظر آتے ہیں، آدمی ارتقا کی جس منزل پر ہوتا ہے اُسی کے مطابق وہ خدا کی لاانتہا اور مطلق ہستی کو پانے کی کوشش کرتا ہے، مختلف مذہب اور اعتقاد انہیں کوششوں کا خارجی لباس ہیں۔ اِس لئے سب کے سب سچے ہیں۔ سب عزت کے قابل ہیں، ہر شخص اپنے جنم، اپنے ماحول اور اپنی بساط کے مطابق اپنا رستہ اختیار کرتا ہے، اور رُوح کے طویل سفر میں اپنی پسند کے موافق دینی پڑاؤ پر رک کر سستا لیتا ہے اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے یا یوں کہیئے کہ ہر رُوح ایک شاہین ہے، جو مہرِ جہاں تاب کی طرف پرواز میں ہے، اور اپنی اُڑان میں کہیں کہیں سفید و سیاہ بادلوں میں پر تول کر دم لیتا ہے اور پھر تیر کی طرح بادو باران کو چیرتا ہوا اپنی نورانی منزل کی طرف نکل جاتا ہے، جہاں سے دُنیا کا تاریک سے تاریک حصّہ بھی ایک روشن ستارہ نظر آتا ہے۔

اب آپ خود ہی بتائیے کہ جب انسان کو ایسی بصیرت مل جائے تو وہ کسی مذہب کو کیونکر جھوٹا یا بُرا کہہ سکتا ہے، ہندو جو تمام مذاہب کی عزت کرتے ہیں، وہ محض رواداری نہیں، وہ اصولاً ہر مذہب کو سچا مانتے ہیں لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میرا مذہب آپ کے لئے یا آپ کا مذہب میرے لئے عین اسی طرح غیر مناسب ہے جیسے میرے کپڑے آپ کے لئے غیر موزوں ہیں اور آپ کے کپڑے میرے لئے۔ ہر انسان کا یا ہر سوسائٹی کا اپنا اپنا رستہ ہے اور وہی اس کے لئے زیادہ مناسب ہے، خود قدرت کا اپنا اصول بھی کثرت میں وحدت ہے جہاں دیکھئے گوناگوں تفرقات میں یگانگی کا رنگ بھر رکھا ہے، اب اگر کسی مذہب والے اپنے قالب میں دُوسروں کو زبردستی ڈھالنے کی کوشش کریں تو یہ سراسر غلطی نہیں تو اور کیا ہے۔ ایسی غلطی کرنے والے ہی مورتی پوجا پر اعتراض کرتے ہیں۔ ہندو دھرم یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہستی مطلق کا ادراک و بیان اضافی اور نسبتی ہے جس کا احساس رُوح کی خوشی میں ہوتا ہے اُس کا بیان کسی نشان کی اضافت کے بغیر نہیں ہو سکتا[1] مورتی ہو یا ہلال کا چاند سب

حاشیہ صفحۂ گذشتہ: در عشق خانقاہ و خرابات فرق نیست ، ٭ ہر جا کہ ہست پر تو رُوئے حبیب است

[1] میانِ کعبہ و بتخانہ ہیچ فرقے نیست ، ٭ بہر طرف کہ نظر می کنم برابر اوست،

www.taemeernews.com

ایک ہی ہستی کے نشان (symbols) ہیں اور اس لئے ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کو ان خارجی سہاروں کی ضرورت ہو لیکن جو لوگ ان سہاروں سے بے نیاز ہو چکے ہیں اُنہیں بھی کسی حالت میں اپنے دُوسرے بھائیوں پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اِس سلسلے میں مجھے اتنا اور کہنا ہے کہ ہندو دھرم میں مُورتی پُوجا لازمی نہیں ہے بلکہ بھگوان کے سچے بھگتوں کے لئے تو ایک اسٹیج پر دینی کتابوں کا مطالعہ بھی غیر ضروری سمجھا گیا ہے۔ جب بھگوان سے لگن لگ جائے تو پھر اور کسی چیز کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ دُوسرے یہ کہ مُورتی پوجا بذاتِ خود کوئی خوفناک چیز نہیں ہے اور نہ ہی بُرائیوں کی جڑ بات اصل میں یہ ہے کہ یزدانی حقیقتوں کو سمجھنے اور پانے کے لئے انسان کی اوّلین کوشش مُورتی پوجا کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور بالآخر انسانیت اس مرحلے سے کہیں آگے نکل جاتا ہے۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ ہندو دھرم میں کوئی خامی یا کمی نہیں۔ ان کے ہاں بھی کئی خامیاں اور برائیاں ہیں لیکن یہ کمزوریاں دُوسروں کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتیں، ہاں خود ہندوؤں کے لئے مُضر ضرور ہیں مثلاً یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی سر پھرا ہندو چِتا پر چڑھ کر اپنے آپ کو زندہ جلا دے لیکن ایسا کبھی نہیں ہو گا کہ وہ اُن لوگوں کو جو اس کے مذہب پر ایمان نہ لائیں پکڑ پکڑ کر زندہ جلا دے اور پھر اپنے جسم کو جلانا یا اس طرح کی اور حرکات کرنا ہندو دھرم نہیں سکھاتا اور اس کا الزام اُس کے سر نہیں تھوپا جا سکتا ایسا کرنا اتنا ہی ناجائز اور غلط ہو گا جیسے یہ کہنا کہ عیسائی مَت "بے دینوں" "چڑیلوں" کو زندہ جلانا سکھاتا ہے۔

مختصر یہ کہ ایک ہندو کی نظر میں دین اور مذہب انسانی ارتقا کے رستے ہیں جن پر سب مرد و زن اپنے اپنے حالات کے مطابق آہستہ یا تیز چل کر آخر ایک ہی منزل پر پہنچ جاتے ہیں، ہر مذہب کا مقصد آدمی کو انسان بنانا ہے اور پھر انسانیت کو بلند کر کے خدا تک لے جانا ہے اُس خدا تک جو ہر مذہب کا واحد خدا ہے جس سے سب مذہب نازل ہوئے ہیں۔

آپ پُوچھ سکتے ہیں کہ اگر ایسا ہی ہے تو یہ جھگڑے فساد کیوں یہ تمام متضاد باتیں کیا ہیں، میں یہ کہوں گا یہ سب ہماری بے بصری کے سوا کچھ اور نہیں" اگر ہم غور سے دیکھیں تو یہ سب تفرقات ایک ہی حقیقت کے مختلف حالات میں مختلف پہلو نظر آئیں گے، یا یوں کہئے کہ ایک ہی روشنی ہے جو مختلف رنگوں کے شیشوں سے چھن کر آ رہی ہے اور سچ پوچھو تو اس ست رنگی ہی سے دُنیا کی رونق ہے، اسی سے ہی کائنات کا حُسن چمکتا ہے اسی کثرت ہی کی بدولت ہر شخص اپنی طبیعت اور طاقت کے مطابق قدرت اور خالق کو کچھ نہ کچھ سمجھ سکتا ہے

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ، بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر (غالبؔ)

www.taemeernews.com

اگر دُنیا میں ایک ہی مذہب کا بس ایک ہی راستہ سب کے لئے مقرر ہو جائے تو تیز گام مسافر اکتا جائیں اور سست رفتار تو غریب ہار کر ہی بیٹھ جائیں اس لئے میں تو ہر مذہب کو نہ صرف اپنی جگہ پر ضروری سمجھتا ہوں بلکہ ہر مذہب کو سچا مانتا ہوں کیونکہ سب میں ایک ہی حقیقت جلوہ گر ہے بھگوان کرشن نے خود گیتا میں کہا ہے "میں ہر مذہب کی بنیاد ہوں جیسے موتیوں کی مالا کا ہر موتی ایک ہی تار پر قائم ہوتا ہے اسی طرح دنیا کا ہر مذہب مجھ سے متعلق ہے تمہارے لئے اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ تمہیں جہاں کہیں ایسی غیر معمولی پاکیزگی یا ایسی غیر معمولی قوت نظر آئے جس سے بنی نوع انسان کی اخلاقی اور روحانی ارتقا ہوتی ہے تو جان لو کہ میں وہاں موجود ہوں"

یہی تعلیم ہندومت کی بنیادی تعلیم ہے آپ ہندو دھرم کا تمام اتہاس اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو کہیں کوئی ایسا دعوٰی نظر نہیں آئے گا کہ فقط ہندو ہی رحمتِ حق (بھگوان کی دیا کے) مستحق ہیں۔ ہمارے ایک بڑے رشی ویاس نے کہا ہے "ہمیں ہر مذہب و ملت میں مردانِ کامل ملتے ہیں ایسے لوگ فقط ہماری ہی قوم میں پیدا نہیں ہوتے"

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر ہندو دھرم کا مرکزی اصول خدا کی ہستی کو ماننا اور اُسے پانا ہے تو ہندو کو صرف اُن مذاہب کو سچا ماننا چاہیئے جو خدا کی ہستی پر یقین رکھتے ہیں لیکن ہندو تو بدھ کی بھی پوجا کرتے ہیں اور اور بدھ مت کو بھی مانتے ہیں حالانکہ بدھ مت خدا پر یقین رکھنا ضروری نہیں سمجھتا۔ اسی طرح ہندو جین مت کو بھی مانتے ہیں حالانکہ جین مت خدا کی ہستی کو نہیں مانتا آخر اس تضاد کے معنی کیا ہیں؟ میں یہ کہوں گا گو بظاہر بدھ اور جین مت خدا کی ہستی کو ماننا ضروری نہیں سمجھتے لیکن درحقیقت ان دونوں مذاہب کی مرکزی تعلیم اور اُن کا عملی پروگرام دوسرے مذاہب کی طرح انسان کے کردار کو اس قدر بلند بنا دیتا ہے کہ خود انسان میں وہ خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو دوسرے مذہب کے لوگ خدا سے منسوب کرتے ہیں۔ آپ خود ہی بتایئے کہ ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ بدھ یا جین مت ناستکوں کے مذہب ہیں۔

مانا کہ بدھ اور جین مت والوں نے خدا کو نہیں پایا لیکن انہوں نے انسان کو تو یزدانی خوبیوں کا مرکز بنایا ہے جس مذہب میں یزداں صفت انسان کا تصور موجود ہو وہ خدا کا ذکر کرے یا نہ کرے خدا کی حقیقت سے دُور نہیں یا بقول عیسٰے مسیح جس نے خدا کے بیٹے کو دیکھا ہے سمجھ لیجئے کہ اس نے خود خدا کے درشن پائے ہیں اس لحاظ سے بدھ اور جین مت اتنے ہی سچے مذہب ہیں جتنے کوئی اور ہندوؤں کو ان مذاہب کے قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا جیسے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں - ہندوؤں کا مذہب ہی دوسرے مذہبوں کو اپنے مذہب جیسا سچا مان کر اُن کی عزت کرتا ہے ؛

تو بہنے بھائیو یہ تھا مختصر سا خاکہ ہندوؤں کے مذہبی خیالات کا جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا،

119
www.taemeernews.com

میں یہ نہیں کہتا کہ اپنے آدرش کو عمل میں لانے کے دوران میں ہندوؤں سے بھی کبھی کوئی غلطیاں سرزد نہیں ہوئیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے آج تک اپنے معیار کو بدستور قائم رکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر دنیا میں کوئی ایک مذہب قبول ہو سکتا ہے تو وہ ہے سب مذہبوں کی قبولیت کا مذہب، ایسا عالمگیر مذہب مکان و زمان کی بندشوں سے بالا ہوگا۔ وہ جس خدا کی تبلیغ کرے گا اس خدا کی وسعتیں بیکراں ہوں گی۔ اُس کے نور کا سورج مومن اور گنہ گار پر یکساں چمکے گا! اُس کے ہاں کرشن کے پجاریوں، عیسےٰ کے پرستاروں، محمد کے معتقدوں، بدھ کے پیروؤں ہی کے لئے نہیں بلکہ ناستکوں اور لامذہبوں کے لئے بھی جگہ ہوگی۔ ایسا مذہب فقط ہندو دھرم، بدھ مت، اسلام، عیسائیت اور دوسرے مذاہب کے اصولوں کا مجموعہ نہیں ہوگا بلکہ اس میں اتنی وسعت ہوگی کہ ان سب مذہبوں کو اپنے میں جذب کر لینے پر بھی اس میں مسلسل ارتقا کے لئے ہمیشہ گنجائش رہے گی۔ اس کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہوگا کہ ایک طرف تو وہ ایسے وحشی انسانوں کو بھی گلے لگائے گا جو جانوروں کے مقام سے کچھ زیادہ دور نہیں ہیں۔ اور دوسری طرف ایسے انسانوں کو اپنائے گا جن کی روحانی عظمت کو دیکھ کر دنیا حیران رہ جاتی ہے اور اُن کو دیوتا سمجھ کر اُن کے آگے سر جھکا دیتی ہے ایسے مذہب میں تعصب اور بیگانگی اور نفرت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ ایسا مذہب ہر مرد و زن کی بنیادی روحانیت کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کرے گا اور اس کی تمام قوت اس روحانیت کو بیدار کرنے میں صرف ہوگی، اگر ہمارے پاس ایسا مذہب ہے تو تمام قومیں اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہوں گی مہاراجہ اشوک نے ہزاروں سال پہلے دینی رہنماؤں کی کونسل بلوائی تھی مگر یہ کونسل بدھ مت کے پیروؤں تک محدود تھی۔ اکبر بادشاہ نے مذہبی یکجہتی کا ذریعہ نکالنا چاہا لیکن اُن کی سکیم محض درباری فیشن بن کر رہ گئی خوشی اور فخر کی بات ہے کہ آج امریکہ نے پھر ایک بار دنیا بھر کے کونے کونے میں اعلان کیا ہے کہ سب مذہبوں کا خدا ایک ہے، میں امریکہ کو مبارکباد دیتے ہوئے آمین کہتا ہوں میری دعا ہے کہ آپ کو اپنے ارادے میں کامیابی نصیب ہو، میری دعا ہے کہ وہ ہستی مطلق جسے ہندو برہمہ کہتے ہیں اور جسے زرتشت کے پیرو آہورمزدہ کے نام سے پکارتے ہیں جسے بودھ مہاتما بدھ کی صورت میں پوجتے ہیں اور جسے یہودی "جہوواہ" کا لقب دیتے ہیں جسے عیسائی "فادر اِن ہیون" اور مسلمان اللہ کا نام دیتے ہیں وہ آپ کو اپنے نیک اور عظیم ارادوں کو کامیاب بنانے کی طاقت دے۔

مذہب اور روحانیت کا سورج مشرق سے اُبھرا تھا دنیا کی تاریخ کے پچھلے ہزاروں سالوں میں آہستہ آہستہ مغرب کی طرف چلتا رہا کبھی اس کی روشنی ایسے مدھم پڑتی ہوئی معلوم ہوتی جیسے کہ وہ گہن میں آگیا ہو یا بادلوں میں گھر گیا ہو لیکن ہر عہد ظلمت کے بعد وہ پھر اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ نمودار ہوتا رہا، آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تہذیب کا یہ درخشاں ستارہ دنیا کے گرد چکر پورا لگا کر عین مشرق کے اُفق پر ایک

www.taemeernews.com

نئی شان سے اُبھر رہا ہے اور اس کی اُٹھتی ہوئی کرنیں کہہ رہی ہیں کہ اُس کی درخشندگی پہلے سے ہزار گُنا زیادہ ہو گی ۔

اے مادرِ آزادی 'کولمبیا' تجھے یہ شان و مرتبہ مبارک ہو' تیرے پاک ہاتھ آج تک کسی کے خون سے داغدار نہیں ہوئے' تو نے اپنے آپ کو مالا مال کرنے کے لئے کسی کو لوٹا نہیں ۔ اسی وجہ سے یہ سُرخروئی تیرے حصے میں آئی ہے کہ دورِ حاضرہ میں تہذیب در واداری وہم آہنگی کا عَلم تیرے ہاتھ میں سپرد کیا گیا' اے میرے علمبردار سربلند کئے چلتا جا تمام دنیا تیرے قدموں پر چلے گی ۔

www.taemeernews.com

دُنیا کے مذہبی رہنما[1]

ہندوؤں کے عقیدے کے مُطابق کائنات زندگی کے مدو جذر کا ایک لاانتہا سلسلہ ہے۔ زندگی کی ایک لہر اُٹھتی ہے اور اپنے عرُوج تک پہنچ کر گر جاتی ہے۔ اور پھر کچھ عرصہ اس اُتار کے خلا میں رہ کر دوبارہ اُبھرتی ہے، اِس طرح یہ مدو جذر کا چکر قائم رہتا ہے اور عروج و پستی اور پستی و عرُوج کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہ عالمی تسلسل کائنات کے ہر جزو پر بھی عائد ہوتا ہے۔ انسانی کاروبار بھی اِسی قانونِ فطرت کے مطابق چلتا ہے، دُنیا کی مختلف قوموں کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔ قومیں ارتقا کے عرُوج تک پہنچ کر پستی کی گہرائیوں میں گر جاتی ہیں لیکن گر کر پھر اُٹھتی ہیں اور نئی آب و تاب سے سربلند و سرفراز ہوتی ہیں زندگی کا کوئی پہلو ہو سماجی، اقتصادی یا مذہبی یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ مذہبی دُنیا میں بھی اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ قوموں کی مذہبی زندگی کا مطالعہ کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ہر قوم پستی اور عرُوج کے مراحل سے بار بار گزرتی ہے کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گر کر دوبارہ اُٹھنا ناممکن ہو گا۔ قوم کا شیرازہ کچھ یوں بکھر جاتا ہے کہ قوم قوم ہی نہیں رہتی لیکن پھر بھی یہ گری ہوئی قوم سنبھل جاتی ہے اس کی رگ رگ میں طاقت و توانائی بھر جاتی ہے۔ اور قومی زندگی کی لہر پُوری عظمت اور شان سے بلند ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات یہ لہر جوار بھاٹے کی صُورت اختیار کر لیتی ہے۔ جب کبھی بھی کسی قوم کی

---

[1] یہ لیکچر سیکسپیر کلب پسڈینا کلیفورنیا میں ۳۔ فروری سنہ ۱۹۰۲ء کو دیا گیا۔
Shakespeare Club, Pasadena, California.

زندگی میں بلندی اور سرفرازی کا ایسا وقت آتا ہے تو عموماً اُس کی رہنمائی کے لئے کوئی عظیم الشان پیغمبر کوئی اوتار جنم لیتا ہے۔ اُسی کے زور سے قومی زندگی کی لہر پھر سے محرک ہوتی ہے اور اونچی اُٹھنے لگتی ہے، اس لہر کی چوٹی پر اس پیغمبر یا اوتار کی درخشاں رُوح نُور پاش ہوتی ہے۔ دراصل یہ بلند مرتبہ ہستی خود ہی خالق ہے اور خود ہی تخلیق اُسی کی برکت سے قوم کو تازہ زندگی نصیب ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ پیغمبر اور اوتار اپنے وقت اور ماحول کے موافق پیدا ہوتے ہیں وہ بھی اس قومی لہر کا جزو ہوتے ہیں جو اس وقت اُٹھ رہی ہوتی ہے جہاں وہ قومی زندگی کی اس لہر کو محرک کرکے اُسے عروج پر لے جاتے ہیں وہاں وہ خود اس کی مخصوص سرشت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے پیغمبر اور اوتار کی بے حساب طاقت کا عمل سماج پر ہوتا ہے لیکن سماج کی حالت پیغمبر یا اوتار کے کردار اور لائحہ عمل کی تشکیل کرتی ہے۔ یہی ہستیاں، یہی اوتار اور پیغمبر ہی دُنیا کے عظیم ترین مفکر بھی ہیں یہی تو وقتاً فوقتاً ایک نئی فکر اور ایک نئی نظر پیدا کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ یہی تو زندگی کو از سرِ نو تازگی و توانائی بخشتے ہیں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ دُنیا میں ایک ہی سچا مذہب، ایک ہی کامل پیغمبر یا اوتار ہو سکتا ہے۔ ہر مذہب کے لوگ اپنے اپنے مذہب اور پیغمبر یا اوتار کے متعلق یہی خیال رکھتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ خیال صحیح نہیں۔ دُنیا کے مذہبی رہنماؤں، پیغمبروں اور اوتاروں کی زندگی کا مطالعہ صاف بتاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنا مخصوص پیغام لے کر ایک مخصوص کام کرنے آیا تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ کامل تھے لیکن ہر ایک کی حیثیت راگ کی نہیں بلکہ سُر کی سی ہے۔ زندگی کی نغمگی ان سب سُروں سے مل کر بنتی ہے۔ جنہیں ہم مختلف مذہبوں کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے مختلف فرقوں اور قوموں سے مل کر نسلِ انسانی کا مجموعی شعور پیدا ہوتا ہے۔ کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بلند سمجھ کر دُنیا کی اچھی اچھی چیزیں سب اپنے لئے مخصوص کر دے۔ نہ کوئی قوم یا نسل فقط عیش اور آرام کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اور نہ کوئی دوسری قوم یا نسل غلامی اور خدمت گزاری کے لئے زندہ ہے، ہر قوم یا نسل کا ایک مخصوص مقام ہے۔ اِنسان کی مجموعی زندگی کی تکمیل کے لئے ہر قوم کا ایک خاص مقصد ہے۔ ہر قوم کا اپنا اپنا فرض مُعین ہے نسلِ انسانی کے سب سُروں سے مل کر ہی زندگی کا راگ پیدا ہوتا ہے؛

اس لئے میں کہتا ہوں کہ کوئی ایک پیغمبر یا اوتار تمام دُنیا پر ہمیشہ کے لئے اپنا سکہ جمانے نہیں آیا۔ نہ آج تک ایسا ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ تہذیبِ انسانی کی تشکیل میں بھی عموماً اور رُوحانی ارتقا کی تکمیل میں خصوصاً ہر ایک دُنیا کو اپنی اپنی مخصوص نعمت عطا کر جاتا ہے۔ البتہ اِتنا ضرور ہے کہ جس خاص اصول

123 www.taemeernews.com

یا صداقت کی مثال کوئی پیغمبر یا اوتار قائم کر جاتا ہے اُس کے لئے دُنیا ہمیشہ اُسی پیغمبر یا اوتار کی ممنون رہے گی کیونکہ وہ اُسی کی بخشش ہے، اپنے خاص پیغام کے لحاظ سے اُس پیغمبر یا اوتار کو سب سے اعلیٰ مانا جا سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ تمام دُنیا پر اُس کا راج ہے۔ اور تمام مخلوقات اُس کے مطیع ہے۔

ہم میں سے بیشتر لوگ کسی خاص مذہبی راہنما پر ایمان لائے ہی کو مذہب کہتے ہیں جنم ہی سے ہم خاص پیغمبر یا اوتار کو اپنا لیتے ہیں اور اسی کو مذہب سمجھ لیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم اکثر اُصولوں کی باتیں کرتے ہیں عقائد اور نظریوں کا ذکر کرتے ہیں اور ایسا کرنا بہت حد تک صحیح بھی ہے اور مفید بھی۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو ہمارا ہر خیال اور ہر عمل اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہم کسی اصول یا خیال کا ادراک تب ہی کر پاتے ہیں جب وہ کسی بلند معیار شخص کی ذاتی زندگی میں مثال کے طور پر قائم ہو جاتا ہے۔ بجائے خود کسی خیال یا اُصول کا شعور ہمارے تصور کے لئے تقریباً ناممکن ہے ہم اُسے مجسّم دیکھ کر ہی سمجھ سکتے ہیں اور اس پر عمل کر سکتے ہیں خُدا کرے کہ ہمارا دماغ اس مقام تک ترقی کر جائے کہ ہمیں زندگی کے غیر مرئی اُصول سمجھنے کے لئے کسی مجسّم مثال کی ضرورت نہ رہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک ہم اس مقام سے بہت دُور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بنی نوع اِنسان کی اکثریت ہمیشہ پیغمبروں اور اوتاروں کی عظیم ہستیوں کے قدموں میں سر جُھکائے رکھتی ہے۔ عیسائی، بودھ اور ہندو ان عظیم ہستیوں کو اوتار مان کر پوجتے ہیں، اہلِ اِسلام ہمیشہ اس قسم کی پرستش کے خلاف رہے ہیں۔ وہ کسی بھی اوتار یا پیغمبر کی پُوجا روا نہیں رکھتے۔ لیکن انسانی فطرت کا کیا کیا جائے اُن کے یہاں بھی ایک اوتار یا پیغمبر کی پُوجا کی بجائے ہزاروں پیروں اور اولیاء کی پرستش ہوتی ہے۔ مانا کہ اِسلام اس کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔ لیکن عملی طور پر مجسّم رُوحانی طاقت کی پوجا کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اور میں تو کہوں گا کہ اس میں کوئی ہرج ہی نہیں ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب آپ کے عظیم پیغمبر حضرت عیسیٰ مسیح سے لوگوں نے کہا کہ "مالک ہمیں آسمانی باپ کے درشن کروا دیجئے"[1] تو انہوں نے جواب دیا "جس نے بیٹے کو دیکھ لیا ہے۔ اُس نے باپ کو بھی پا لیا ہے"[2] آپ سوچئے تو ہم میں کون اس قابل ہے کہ خدا کا تصور انسان کی صورت کے علاوہ کر سکے؟ ہم تو اپنی انسانی شکل ہی میں اس کا دھیان کر سکتے ہیں۔ جیسے کہ روشنی کی شعاعیں ہر طرف اور ہر وقت مرتعش ہو رہی ہیں۔ لیکن ہم تو چراغ ہی کو دیکھ کر روشنی کا تصور کر سکتے ہیں۔ اِسی طرح خدا تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے ہماری فطرت کی سرشت کچھ

---

[1] Lord show us the Father in Heaven.

[2] He that hath seen the Son hath seen the Father

 www.taemeernews.com

ایسی ہے کہ ہمیں اُس کے وجود کا ادراک اور احساس تبھی ہوتا ہے۔ جب وہ کسی شخصی خدا کی صورت میں مجسّم ہو کر ہمارے سامنے آجائے۔ اسی لئے تو جب کوئی پیغمبر یا اوتار دُنیا میں آتا ہے تو عام اِنسان بھی خُدا کے وجود کو محسوس کرنے لگتے ہیں جب نورِ خدا انسانی قالب میں مُجسّم ہو کر ایک عالمتاب آفتاب کی طرح طلُوع ہوتا ہے تو سب کی آنکھیں خُدا کے جلوے سے روشن ہو جاتی ہیں۔

عام اِنسان دُنیا میں بھکاری بن کر آتے ہیں عمر بھر کسی نہ کسی شے کے لئے ہاتھ پھیلائے رہتے ہیں۔ یہ عظیم الشان ہستیاں شہنشاہِ عالم ہو کر جلوہ گر ہوتی ہیں پیغمبر اور اوتاروں کی تمام کائنات پر حکومت ہوتی ہے اور وہ ہر طرف رُوحانیت کی بے بہا دولت بکھیرتے ہوئے اس جہان سے یوں گزر جاتے ہیں کہ صدیوں تک لوگ اس دولت کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہم جیسے عام آدمی دُنیا میں یتیموں کی طرح ہیتے ہیں جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ ہماری حالت عموماً اُن لوگوں کی سی ہے جو اپنا رستہ بھُول گئے ہوں لیکن جنہیں اپنی گم گشتگی کا احساس تک نہ ہو ہمیں ایسی حالت میں کچھ سُوجھتا ہی نہیں کہ کیا کریں اور کدھر جائیں زندگی ہمارے لئے بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہم لاکھ سرماریں۔ زندگی کے مقصد اور مدعا کو سمجھ نہیں سکتے ہماری سرگردانی کی یہ صورت ہوتی ہے کہ آج کچھ کرتے ہیں تو کل کچھ اور، ہماری حالت اُن تنکوں کی طرح ہوتی ہے جو متلاطم دریا کی لہروں پر اِدھر سے اُدھر ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں یا اُن ٹوٹے ہوئے پَروں کی طرح جنہیں آندھی جہاں چاہے اُٹھا کر پھینک دے۔ اس کے برعکس تاریخ شاہد ہے کہ پیغمبر اور اوتار اپنا اپنا خاص مقصد لے کر پیدا ہوتے ہیں، اُن کے کام کا تمام نقشہ پہلے ہی سے تیار ہوتا ہے۔ اور وہ اُس سے رتی بھر منحرف نہیں ہوتے اور چونکہ اُن کا مقصد مقرر ہوتا ہے۔ اور وہ ایک مشن[1] لے کر آتے ہیں۔ اِس لئے وہ عام طور پر بحث و مباحثہ میں وقت ضائع نہیں کرتے وہ دلائل اور منطق سے کام نہیں لیتے، بلکہ براہِ راست ذاتی علم و تجربہ کی بنا پر بات کرتے ہیں۔ آج تک کوئی ایسا اوتار یا پیغمبر نہیں ہوا جس نے دلائل اور منطق سے اپنے پیغام کو سمجھانے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ آخر جو شخص حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو، اُسے بحث و مباحثہ اور دلائل اور منطق کے سہارے کی بھلا کیوں تلاش ہو گی۔ اوتار اور پیغمبر تو نہ صرف خود حق و صداقت کو اپنے سامنے جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ بلکہ جسے چاہیں اِس جلوہ سے فیض یاب کر سکتے ہیں، اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ کیا خدا کی واقعی کوئی ہستی ہے اور میں کہوں "ہاں ہے" تو آپ مجھ سے کہتے ہیں اچھا ثابت کرو کہ خدا ہے اور مجھ غریب کو سارا زور لگا کر اپنی تمام دلائل پیش کرنا پڑتی ہیں۔ تا کسی طرح ذہنی طور پر خدا کی ہستی کا

---

[1] Mission.

www.taemeernews.com

ثبوت مہیا کرسکوں لیکن اگر آپ عیسیٰ مسیح سے پوچھتے کہ کیا خدا ہے تو اُن کا جواب یہ ہوتا "ہاں ہے"۔ دیکھو خدا تمھارے سامنے ہے" اور آپ اپنی آنکھوں سے خُدا کا جلوہ دیکھ کر اس کی ہستی کے قائل ہو جاتے اور اُس پر ایسا ایمان لے آتے کہ اُسے کوئی طاقت ہلا نہ سکتی۔ یہ ہے خدا کو براہِ راست دیکھنے کی صورت یہاں ذہنی تگ و دو کی چنداں ضرورت نہیں یہ ہے نُورِ جلوہ کی چکا چوند روشنی، یہاں اندھیرا ٹھہر ہی کہاں سکتا ہے۔ یہاں دماغی کاوشوں کی گنجائش ہی کہاں ہے؟ میرے سامنے یہ میز رکھی ہے کسی قسم کے منطق سے مجھ پر یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں کوئی میز نہیں ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہے۔ اس میز کی ہستی پر میرا ایمان ہے اُسے کوئی نہیں ہلا سکتا۔ یہی حال ہمارے پیغمبروں کا ہے وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اور اس پر ایمان لاتے ہیں یہی ایمان ہی اُن کی ہستی ہے۔ انہیں خُدا کے بتائے ہوئے نصب العین پر اور خدا کے سوچے ہوئے کام پر پُورا اعتبار ہوتا ہے۔ اس اعتبار کی بدولت یہ نُورانی ہستیاں اپنے آپ پر کامل یقین رکھتی ہیں۔

عام طور پر لوگ ایک دوسرے سے پُوچھتے ہیں "کیا تم خدا کو مانتے ہو؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ مرنے کے بعد ایک نئی زندگی حاصل ہوگی؟ فلاں فلاں بات کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے"؟ اس قسم کے سوال اپنے مقام پر بجا ہیں، کیونکہ اُن سے تلاشِ حق کی خواہش ظاہر ہوتی ہے لیکن اس مقام پر جس بنیادی چیز کی کمی ہے وہ ہے خود اعتمادی جس شخص کو اپنے پر اعتماد نہیں وہ بھلا کسی اور ہستی پر کیا ایمان لاسکتا ہے۔ کسی پر ایمان لانا بھی تو خود اعتمادی ہی کی ایک حسین صورت ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اکثر شش و پنج میں پڑے رہتے ہیں ہمیں تو خود اپنی ہستی کا پُورا یقین نہیں ہے۔ اپنے ہی متعلق ہمارے خیالات لمحہ بہ لمحہ بدلتے رہتے ہیں ایک گھڑی تو ہم سوچتے ہیں کہ ہماری ہستی قائم و دائم ہے۔ اور ہمیں کوئی طاقت ہٹا نہیں سکتی لیکن دوسری گھڑی جو موت کا خیال آتا ہے تو ہم خوف سے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں کبھی ہم سمجھتے ہیں کہ ہم لازوال ہیں، امر ہیں، زندۂ جاوید ہیں۔ کبھی جو کسی خطرے کا سامنا کرنا پڑے تو ہمارے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا ہیجان پیدا ہو جاتا ہے کہ سوچ بچار کی طاقت ہی سلب ہو جاتی ہے اور ہمیں کچھ پتا نہیں رہتا کہ ہم ہیں تو کہاں ہیں؟ زندہ ہیں یا مرچکے ہیں! اسی طرح کبھی تو ہم اپنے آپ کو اخلاق اور روحانیت کے پتلے سمجھتے ہیں لیکن کبھی جو کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو ہمارے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ اور ہم سب رُوحانیت اور اخلاق کو بھول جاتے ہیں آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہمارے قول و فعل میں یہ فرق کیوں ہے؟ اس سوال کا بس یہی جواب ہے کہ ہمیں اپنے آپ پر یقین نہیں رہا۔ رُوحانیت اور اخلاق کی پشت پناہ خود اعتمادی ہے، اگر انسان میں خود اعتمادی نہ رہے اگر اُس کا احساسِ خودی برٹ جائے تو روحانیت اور اخلاق

www.taemeernews.com

کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔

یہی تو فرق ہے عام آدمی اور پیغمبر اور مذہبی رہنما میں، ایک کو اپنے پہ اعتبار نہیں اور دوسرے کی خود اعتمادی کا یہ عالم ہے کہ کوئی چیز اُس کے سامنے رُک نہیں سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ایمان و یقین کو جو پیغمبروں اور اوتاروں کو اپنی ذات پر ہوتا ہے ہم جیسے آدمی تو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اِن رہنماؤں کے احکام اور اعمال کی اپنے اپنے طریقے سے تفسیر و تشریح کرتے ہیں۔ اور اُن کے رُوحانی تجربات کے تعلق جنہیں وہ تمثیل و استعارے سے بیان کرتے ہیں۔ ہزاروں نظریے اختراع کرتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہماری فکر و نظر ہی مختلف ہے۔ ہمارا زاویۂ نگاہ ہی دوسرا ہے۔ اِس لئے ہم اُن کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتے۔

ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب کبھی پیغمبر اور اوتار کچھ کہتے ہیں تو دُنیا اُسے سُنے بغیر نہیں رہ سکتی وہ جو کچھ کہتے ہیں ذاتی تجربہ کی بنا پر کہتے ہیں۔ اُن کا ہر لفظ دل سے نکلتا ہے اور اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُس میں اتنی کشش اور طاقت ہوتی ہے کہ دُنیا اُس کی تاب نہیں لاسکتی۔ وہ دُنیا پر بم کے گولے کی طرح پھٹتا ہے، آخر وہ بات ہی کیا ہوئی جس میں زور نہیں جس کے پس پشت روحانی طاقت نہیں؟ زبان کوئی ہو، طرزِ بیان کوئی ہو، دیکھنا تو یہ ہے کہ الفاظ کے پیچھے اور زبان و بیان کے پردے میں رُوحانی طاقت کہاں تک کارفرما ہے؟ بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کوئی گرامر کے اُصولوں کے مطابق بات کرتا ہے یا نہیں یا کسی کے بیان میں لطافت اور فصاحت ہے یا وہ فقط سادہ سے سادہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ مطلب تو اس سے ہے کہ کہنے والے کے پاس کسی کو کچھ دینے کے لئے کچھ ہے بھی سہی یا نہیں، الفاظ تو تحفہ پیش کرنے کا ذریعہ ہیں خدا کی بخشی ہوئی نعمت کو دوسروں تک پہنچانے کا وسیلہ ہیں۔ بعض اوقات تو الفاظ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ خاموشی ہی زبان بن جاتی ہے۔ سنسکرت کے ایک شلوک میں خموشی کی زبان کی یوں وضاحت کی گئی ہے۔ لکھا ہے "میں نے دیکھا کہ گرُو دیو درخت کے نیچے بیٹھے ہیں۔ اُن کے سامنے اُن کا شاگرد بیٹھا ہے۔ دونوں خاموش ہیں۔ گرُو دیو خاموشی سے چیلے کو گیان دے رہے ہیں اور چیلے کے تمام شک چپ چاپ دُور ہوتے جارہے ہیں۔"

مطلب یہ کہ ایسے بلند مقام جگت گرو نہ بولنے پر بھی حق کی تدریس کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی خاموشی سے بھی صداقت برستی ہے اور سب کو نہال کر دیتی ہے۔ وہ بغیر الفاظ کی وساطت کے اپنے دماغ سے دوسرے کے دماغ تک براہِ راست رُوحانی مطالب پہنچا دیتے ہیں۔ وہ رُوحانیت کی یزدانی نعمت لے کر آتے ہیں۔ اور اس بے بہا دولت سے سب کو مالا مال کر دیتے ہیں۔ اِس شاہانہ شان کا تقاضا ہے کہ وہ حاکمانہ لہجے میں بات کرتے ہیں۔ ہم سب کو اُن کے احکام بجالانا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ یاد کیجئے کہ خود آپ کے اوتار یسوع مسیح کا لہجہ کتنا شاہانہ ہے۔ اُن کی ہر بات سے حاکمانہ شان ٹپکتی ہے۔

www.taemeernews.com

سنیئے تو وہ کیا کہتے ہیں" جاؤ اور اقوام عالم کو میرا پیام دو۔ جاؤ انھیں میرے احکام بجالانے کی تلقین کرو۔ وہ احکام جو میں نے تمہارے لئے صادر کئے ہیں اور جن پر عمل کرنا تمھارا فرض ہے"۔ یہی نہیں بلکہ اُن کی ہر بات اسی لہجہ میں ادا ہوتی ہے، انھیں اپنے پر اور اپنے پیغام پر یقین کامل ہے۔ اور اس اٹل یقین سے اُن کی طاقت کا سرچشمہ پھوٹ نکلتا ہے۔ یہی حال دوسرے پیغمبروں اور اوتاروں کا ہے۔

کیوں نہ ہو یہ پیغمبر اور اوتار بذاتِ خود خدا کا زندہ مجسمہ ہیں۔ حقیقت مجاز کی صورت اختیار کرتی ہے تو اوتار یا پیغمبر بن کر رُوئے زمین پر نمودار ہوتی ہے۔ سچ پوچھیے تو اِن کے علاوہ ہم کس کی پرستش کرسکتے ہیں؟ ہمارے دماغ کسی غیر مرئی ہستی کا تصور ہی نہیں کرسکتے۔ ہم لاکھ کوشش کریں کہ خدا کا خیال کسی نہ کسی صورت میں مجسّم ہوکر ہی ہمارے دماغ میں آسکتا ہے، اور جو چیز مجسّم ہو جاتی ہے وہ کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو محدود ہوکر رہ جاتی ہے۔ خدا کا ایسا محدود تصوّر خدا سے کوسوں دُور ہو جاتا ہے۔ اِس لئے اگر ہمیں کسی مجسّم و محدود شئے ہی کے تصوّر سے خدا کی ہستی کا شعور و ادراک کرنا ہے تو کیوں نہ اِن پیغمبروں اور اوتاروں ہی کے تصور کا سہارا لیا جائے۔ آخر ان کا تصور اُن تمام تصورات سے بلند تر ہے جو ہمارے دماغ میں آسکتے ہیں۔ ان کی عظیم الشان زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ اُن کی زندہ مثال ہمارے لئے شمع راہ بن چکی ہے اُن کے روشن قدم ہمارے ہدایت کار اور امام ہیں۔ ذرا سوچیے تو ہم لوگ جو کسی غریب کو روٹی کا ایک ٹکڑا چرا لینے پر جیل بھیج دیتے ہیں، خُدا کی رحمت کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں ہم جو ہر وقت ہاتھ دھو کر دوسروں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ خدا کے عفو و کرم کو کیونکر تصور میں لاسکتے ہیں ہم تو اپنی خود غرضی نے محدود و محبوس کر رکھا ہے۔ ہم جو جسم اور حواس کی قید میں پڑے ہیں۔ کائنات کی وسعتوں میں کیونکر سموسکتے ہیں، اور اگر بفرض محال جسم کا خیال ترک بھی ہو جائے تو دماغ (من) کی حدود سے کیونکر نکل سکتے ہیں، اس دائرہ چاہ میں گھر کر جہاں ہر قدم پر خود غرضی اور لین دین کا دور دورہ ہے۔ ہم لامحدود اور پاک یزدانی محبت کا اندازہ ہی کیونکر لگا سکتے ہیں۔ ہمارا تجربہ تو اُن تعلقات پر محدود ہے جنہیں ہماری خوش فہمی نے محبت کا نام دے رکھا ہے۔ جو بات ہمارے تجربے میں نہیں، اس کا ادراک و شعور ممکن ہی نہیں جو چیز ہم پر گزری نہیں اس کا احساس ہو ہی نہیں سکتا، اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ خدا کا ذہنی تصور پیدا کرنے کی تمام کوششیں بے سُود ہیں۔ اگر ہمیں واقعی روحانیت حاصل کرنے کی خواہش ہے تو ہمیں اُن پیغمبروں اور اوتاروں کی پُوجا کرنا ہوگی جنہوں نے ذاتی تجربہ کی بنا پر خدا کو پایا ہے۔ ان کے وجود میں وہ تمام خاصیتیں مجسّم ہوگئی ہیں۔ جن کا ہمارے لئے تصور تک ممکن نہیں۔ ان کے یہاں خیالی آدرش کی بات نہیں۔ واقعی تجربے کا ذکر ہے۔ یزدانی محبت، پاکیزگی، عفو و رحمت سب انسانی قالب میں ڈھل کر ہماری آنکھوں کے سامنے

www.taemeernews.com

کھڑی ہیں۔ اگر میرا سر خود بخود اُن کے قدموں میں جھک جاتا ہے تو اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے، اگر میں اِن زندۂ جاوید ہستیوں کو خدا مان کر پُوجتا ہوں تو کون سی عجیب بات ہے؟ آخر میں اور کر ہی کیا سکتا ہوں۔ مجھے تو آج تک کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو خُدا کے تصوّر کو ذہن میں لے آیا ہو البتہ باتیں ضرور بہت لوگ کرتے ہیں لیکن باتوں میں واقعیت تھوڑا ہوتی ہے۔ خدا اور اس کی غیر شخصی ہستی کی باتیں اپنی جگہ پر اچھی ہیں لیکن عملی طور پر پیغمبر اور اوتار ہی دُنیا کی تمام نسلوں اور قوموں کے خدا ہیں۔ اِن یزدانی ہستیوں کی ہمیشہ پُوجا ہوتی آئی ہے اور جب تک انسان کی سرشت بدل نہیں جاتی۔ اُن کی پُوجا اسی طرح ہوتی رہے گی۔ اسی میں نسلِ انسانی کی نجات ہے۔ اسی پُوجا کی بدولت ہمیں ایمان اور اُمید کی نعمتیں نصیب ہوتی ہیں۔ اِسی میں ہماری ارتقا کا راز مضمر ہے محض خیالی اُصولوں سے کاروبارِ جہاں نہیں چل سکتا۔

بہر حال میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ کم از کم میرے لئے تو دُنیا کے سب پیغمبر اور اوتار قابلِ پرستش ہیں۔ میں ہر ایک کی پُوجا کرتا ہوں، اور ہر آنے والے جگت گُرو کی پُوجا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ بچہ چاہے جتنے بھی لباس بدل بدل کر ماں کے سامنے آئے ماں اُسے ہر صورت میں پہچان لیتی ہے۔ وہ ماں ہی کیا جو اپنے بچے کو نہ پہچان سکے۔ اگر آپ میں سے کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ روحانیت اور خدا کا جلوہ صرف آپ ہی کے مخصوص پیغمبر یا اوتار میں نظر آتا ہے۔ اور اس ہی کی معرفت حقیقت کو پایا جا سکتا ہے کسی دوسرے کی معرفت نہیں تو میں اُس کی خدمت میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ میرے دوست تم میری نظر میں ابھی یزدانیت کو پہچانتے ہی نہیں بلکہ تمہیں خود اپنے پیغمبر کی عظمت اور رُوحانیت کا اندازہ نہیں۔ تم نے تو صرف کچھ فقرے رٹ لئے ہیں۔ کچھ الفاظ کو اپنا لیا ہے اور بس۔ تم تو ایک مخصوص فرقے کے فرد ہو کر رہ گئے ہو۔ یہ مذہب نہیں۔ یہ تو فرقہ پرستی ہے۔ تم جیسے سیاسی پارٹی کے ممبر بن گئے۔ ویسے ہی کسی مذہبی فرقے میں شامل ہو گئے۔ میں اُسے مذہب نہیں کہتا۔ مذہب تو ذاتی تجربے کی بات ہے۔ ذہنی رائے کی نہیں۔ مذہب تو رُوحانی ارتقا کا نام ہے۔ مذہب کا تعصب سے کوئی تعلق نہیں۔ رُوحانیت کا سچا طالب ہر پیغمبر اور ہر اوتار کی تعلیم سے فائدہ اُٹھاتا ہے وہ اپنے آپ کو کسی مخصوص تعلیم کے دائرے میں محدود نہیں کر لیتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس دنیا میں کئی ایسے بے وقوف بھی ہیں جو ہر طرف میٹھے پانی کے چشمے دیکھ کر بھی اپنے جدی کنوئیں کا کھارا پانی ہی اس لئے پیئے جاتے ہیں کہ وہ کنواں اُن کے باپ دادا کا بنایا ہوا ہے۔ مذہب میں اس قسم کے دیوانہ پن کی کوئی گنجائش نہیں۔ مذہب اِس معاملے میں بدنام ضرور ہے۔ لیکن جہاں تک میرا اپنا محدود تجربہ اور علم پہونچ سکا ہے۔ باوجود اِس کے کہ مذہب کے نام سے ہر قسم کی شیطنت منسوب کی گئی ہے۔ مذہب کا کوئی قصور نہیں نہ تو مذہب نے آج تک کسی پر ظلم ڈھانے کی اجازت دی ہے۔ اور نہ ہی مہتیسنہ

چڑیلوں کو زندہ جلانے کو روا رکھا ہے، مذہب نے کبھی ایسی باتوں کو گوارا نہیں کیا، اگر کسی چیز نے لوگوں کو ان شیطانی حرکتوں کے لئے اُکسایا ہے تو وہ سیاست ہے۔ مذہب نہیں، اور اگر سیاست مذہب کا نام لے کر ان حیوانی کرتوتوں کا ارتکاب کرتی ہے تو اس میں مذہب کا کیا قصور؟ شیطان فرشتے کے بھیس میں آ کر شیطانی کرے تو اس میں فرشتوں پر کیا الزام عائد کیا جا سکتا ہے؟

تو یاد رکھیئے کہ اگر کوئی شخص یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ فقط اُس کا مذہب سچا ہے اور اس کا پیغمبر رُوحانیت کا واحد علمبردار ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ شخص مذہب اور رُوحانیت کے ابجد سے بھی واقف نہیں۔ مذہب نہ تو زبانی باتیں ہیں نہ بحث و مباحثہ نہ نظریہ بازی ہے نہ دماغی طور پر کسی خاص اعتقاد کا اعتراف، مذہب اور روحانیت تو نام ہے اِس احساسِ لطیف کا جو دل کی گہرائیوں سے اُٹھتا ہے جس کی بدولت انسان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، اپنے ہاتھوں سے چھُو رہا ہے، مذہب تو وہ لطیف شعور ہے جب آدمی اپنے آپ کو رُوح سمجھنے لگتا ہے اور جان جاتا ہے کہ وہ کائنات کی رُوحِ اعظم کی تمام جلوہ ریزیوں سے منسلک ہے۔ اگر آپ کو مذہب اور رُوحانیت سے واقعی لگاؤ ہے تو آپ کی نظر میں وسعت اور آپ کی فکر میں گہرائی لازمی ہوگی، آپ مذہب اور رُوحانیت کو کسی خاص پیغمبر یا اوتار کی ذاتی ملکیت شمار ہی نہیں کر سکیں گے۔ بھلا اگر آپ کی رسائی خدا کے گھر[ل] تک ہے تو کیا آپ خدا کے اِن مایۂ ناز فرزندوں کو پہچان نہیں سکیں گے جنہیں ہم پیغمبر کہتے ہیں۔ اور اگر آپ اُن کو پہچان نہیں پاتے تو آپ ابھی خدا کے گھر سے بہت دُور ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ ماں اپنے بچّے کو ہر لباس میں پہچان لیتی ہے اسی طرح خدا کے سچے بندے خدا کے ہر پیغمبر میں اُسی کا جلوہ دیکھتے ہیں، یہ عظیم الشان روحانی ہستیاں جو وقتاً فوقتاً مختلف مُلکوں میں جلوہ گر ہوتی رہی ہیں۔ سب ایک ہی حقیقت کا پیغام لے کر آتی رہی ہیں۔ کسی نے اس حقیقت کے ایک پہلو پر زور دیا۔ تو کسی نے دوسرے پہلو پر، مگر ان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں کوئی اختلاف نہیں۔ آؤ ہم اِن سب کو اچھی طرح پہچانیں۔ اور آپس کے ظاہری تفرقات کو مٹا کر اس بنیادی حقیقت تک جانے کی کوشش کریں جس کی تعلیم ہر جگت گُرو نے دی ہے۔ یاد رکھیئے کہ جہاں کہیں اور جب کبھی بھی انسان نے عملی طور پر مذہب کے معنی کو سمجھا ہے اور سچی روحانیت کو پایا ہے۔ جہاں کہیں اور جب کبھی بھی انسان نے خدا کی ہستی کے وجود کو محسوس کیا ہے۔ اور اس کی رُوح کو خدا کی قربت حاصل ہوئی ہے۔ وہاں ہمیشہ انسان کی فکر و نظر میں اتنی وسعت پیدا ہوئی ہے کہ اُسے ہر طرف

[ل] The House of the Father.

130 www.taemeernews.com

انوارِ جلوہ کی چمک نظر آنے لگی ہے۔ مثال کے طور پر اہلِ اسلام کو دیکھئے اُن کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک ہے اس کے علاوہ دوسرا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اُس کے رسول ہے (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ) اِس مقدس کلمے کی صداقت میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ لیکن جب اُس کا مطلب یہ لیا جانے لگا کہ انسان کو اُس واحد خدا تک صرف اسلام ہی کا پیغمبر لے جا سکتا ہے تو مذہب نے ایک سیاسی صورت اختیار کرلی۔ اور اہلِ اسلام کے علاوہ سب کو کافر قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ یہ بات پیغمبرِ اسلام کی تعلیم کے موافق نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحرِ الکاہل سے لے کر بحرِ اوقیانوس تک مذہب کے نام پر پانچ سو سال تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ لیکن ہر اُس مسلمان نے اِس خون ریزی کے خلاف آواز اُٹھائی جس نے اپنے مذہب اور اپنے پیغمبر کو عملاً اپنایا اور سمجھا، اور یزدانی حقیقت کو محسوس کیا۔ یہ سچے مسلمان مذہب کو سیاسی آلۂ کار بنانے سے ہمیشہ انکار کرتے رہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مذہب یا روحانیت کسی کی موروثی ملکیت نہیں ہے، مذہب تو وہ راہِ عمل ہے جس پر گامزن ہو کر انسان حقیقت تک جا پہونچتا ہے۔ اور اس راہ پر ہر انسان کو حق ہے کہ اپنی اہلیت اور اپنے رجحانِ طبع کے مطابق قدم اُٹھائے۔

پیغمبروں اور اوتاروں کے کردار کو سمجھنے کے لئے ایک اور بات کا خیال رکھنا ضروری ہے، آجکل ایک طرف تو ہم زمانۂ حال کے نظریۂ ارتقا کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف مذہب کے معاملے میں گذشتہ زمانے کے بوسیدہ نقشوں پر اپنی زندگی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ دو رجحانات ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ اِس لئے ہمیں عہدِ جدید کے حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اپنے مذہبی خیالات کو نئے سرے سے تشکیل کرنا ہوگا۔

فکر کی نئی راہ نکالنا: نظر کا نیا انداز پیدا کرنا آسان نہیں ہے ہم سے غلطیاں ہوں گی۔ لیکن اس میں کیا مضائقہ ہے۔؟ کیا ہم غلطی کے ڈر سے اپنے دماغ سے کام لینا چھوڑ دیں؟ کیا ہم ٹھوکر کے خوف سے دینی منزل تک جانے کی کوشش ہی ترک کر دیں؟ آخر غلطیوں ہی سے تو آدمی سیکھتا ہے۔ ہمیں غلطیوں سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ علم و آگہی غلطیوں کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ آپ کے سامنے یہ دیوار کھڑی ہے۔ کیا اس دیوار نے عمر بھر کبھی جھوٹ بولا ہے؟ یہ تو چپ سادھے ہمیشہ اسی طرح کھڑی رہتی ہے۔ لیکن آخر یہ دیوار کی دیوار ہی تو رہ جاتی ہے اسی طرح جانور کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ لیکن کیا اس وجہ سے گائے بھینس ہم سے بلند تر ہیں؟ آدمی جھوٹ بولتا ہے۔ لیکن وہی جھوٹ بولنے والا آدمی ترقی کرتے کرتے دیوتاؤں اور فرشتوں کے مقام تک بھی تو پہنچ جاتا ہے۔ ضرورت تو عمل کی ہے اس کی پروا نہیں کہ عمل کبھی غلط راہ پر چل نکلتا ہے۔ چلنے والا آدمی ضرور ٹھیک رستے پر آجائے گا۔ قابلِ رحم تو وہ آدمی ہے جو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتا ہے، ہمیں کچھ کرنا ہے تو دست و بازو کو عمل کی اور دل و دماغ کو فکر کی عادت ڈالنا ہوگی۔ اِس سے تو ہرگز کام نہیں چلے گا کہ ہم باپ دادا

www.taemeernews.com

کے خیالات کی اندھا دُھند پیروی کرتے رہیں، اگر ہم اِسی پر اکتفا کریں گے اور اپنے لئے کوئی نئی راہ نہیں نکالیں گے تو ہمارے احساس اور شعور کی طاقت مٹ جائے گی۔ اِس سے تو موت ہی بہتر ہے۔ اگر ہمارے دماغ سے تر و تازہ اور زندہ خیالات پیدا نہیں ہوتے تو پھر جینے کا مزا ہی کیا ہے۔ مذہب اور رُوح کے متعلق ذاتی فکر و احساس کی بنا پر ہمارا کوئی راسخ اعتقاد ہی نہیں ہے تو ہماری زندگی زندگی ہی نہیں۔ اگر ہم محض تقلید کرنا ہی جانتے ہیں تو ہم سے ناستک بھی کہیں بہتر ہیں۔ اُنہیں ایمان والوں سے اختلاف سہی لیکن اُن میں خود سوچنے کی اہلیت تو ہے۔ آخر اسی قوتِ فکر، اِسی آزاد خیال اور جرأتِ اِنکار ہی کی بدولت اُمید کی جا سکتی ہے کہ ایک دن وہ خدا تک جا پہونچیں گے لیکن اُن لوگوں کا کیا جائے جن میں سوچ بچار کا مادّہ ہی مٹ گیا ہو۔ ایسے لوگوں میں تو جان ہی نہیں ہے، اُن کے لئے مذہب اور رُوحانیت کے میدانِ عمل میں ایک قدم اُٹھانا بھی مشکل ہے جو اپنے دماغ سے کام لینا ہی نہیں جانتا۔ وہ بھلا مذہب اور روحانیت کو کیا سمجھے گا۔ ہاں مُنکر اور ناستک کم از کم اپنی عقل کو استعمال میں تو لاتے ہیں، وہ اِسی راستے سے رُوحانیت حاصل کر سکتے ہیں، اِسی لئے تو میں بار بار یہی کہتا ہوں عقل سے کام لیجئے خود سوچئے۔ بچارئیے غور کیجئے۔ یہ دماغی کاوش یہ جد و جہد ہی تلاشِ حق میں آپ کی مددگار ہوگی۔ بیٹھے بٹھائے خُدا نہیں ملتا۔ اگر کامیابی نصیب نہیں ہوتی تو کوئی بات نہیں، اپنی کوششوں کو جاری رکھئے۔ اگر ذاتی غور و فکر سے آپ کسی عجیب و غریب نتیجے پر پہنچے ہیں تو گھبرانے کی ضرورت نہیں یہی غور و فکر کی قابلیت آپ کو آخر منزلِ مقصود تک لے جائے گی۔ اگر آپ کو اس بات کا ڈر ہے کہ دُنیا آپ پر انگلیاں اُٹھائے گی، تو اپنے خیالات کو خود اپنے تک محدود رکھئے، انہیں اپنے ہی سینے میں ذرا اور تھام رکھئے۔ لیکن اپنی تلاش کو جاری رکھئے۔ اپنی جد و جہد کو ترک نہ کیجئے۔ آخر کامیابی ضرور ہوگی۔ روحانیت کا آفتاب آخر ضرور اپنی پوری آب و تاب سے نور پاش ہوگا۔ یاد رکھئے کہ اگر کسی کو برد تک بچائی بل جائے وہ آرام سے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہے تو اُسے ہاتھ سے کام لینا ہی بھول جائے گا، روحانی زندگی میں بھی یہی ہوتا ہے اگر ہم اِس میدان میں بس ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی بھیڑ چال ہی چلتے رہیں تو آخر روحانی موت واقع ہو جاتی ہے۔ جہاں عمل نہیں وہاں موت ہی کی بے حسی رہ جاتی ہے۔ عمل کو ہاتھ سے کبھی نہ جانے دیجئے عمل مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ جہاں عمل ہے۔ وہاں فرق اور امتیاز بھی ضرور ہوگا۔ فرق اور اختلاف ہی تو زندگی کی نشانی ہے۔ اِسی سے تو زندگی میں رنگینی پیدا ہوتی ہے۔ یہی تو زندگی کا جمال ہے۔ اسی سے تو کائنات کے حسین نقش و نگار پیدا ہوتے ہیں۔ فن کارِ عالم کا ہُنر اسی سے تو آشکار ہوتا ہے۔ فرق اور اختلاف سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اس کے پسِ پشت جو ایک حقیقت ہے۔ اُس کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

مجھے آپ سے اتنی لمبی تمہید کے لئے معافی مانگنا ہے لیکن میرے خیال میں اس کے بغیر دُنیا کے اوتاروں اُور پیغمبروں کو سمجھنا مشکل تھا۔ اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اُن کو کسی حد تک سمجھ سکیں گے ہم نے تاریخ پر سرسری نظر ڈال کر دیکھا کہ بے جان اور بے حس آدمیوں کو چھوڑ کر جب کبھی بھی انسانی فکر اپنی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوئی ہے۔ جب کبھی بھی انسان کو خدا سے سچی لگن لگی ہے۔ اُسی کی رُوح خدا کے قریب تر ہوتی گئی ہے۔ اور بالآخر اُس کی روشن آنکھوں کو خدا کا براہِ راست اور مکمل جلوہ نصیب ہو جاتا ہے۔ یہ احساسِ ایزدی لمحہ بھر ہی کے لئے کیوں نہ ہو۔ انسان کی زندگی کا رُخ بدل دیتا ہے۔ سب شک ہمیشہ کے لئے دُور ہو جاتے ہیں۔ دل و دماغ کے سب بَل نکل جاتے ہیں۔ چالاکی اور ریاکاری کا نشان تک مٹ جاتا ہے۔ دُنیا و مافیہا کی سب بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ انسان "کرم" (عمل) کے بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے اور اُسے اُس پرماتما کے درشن ہو جاتے ہیں جو دُور سے دُور چیز سے بھی بہت پَرے ہے۔ اور نزدیک سے نزدیک شئے سے بھی بہت قریب تر ہے۔ یہی مذہب ہے یہی روحانیت ہے۔ باقی جو کچھ بھی ہے محض عقیدوں اور نظریوں کا سلسلہ ہے۔ اُن کی اہمیت بس یہی ہے کہ یہ شعور و ادراک اور احساس ذات (کی منزل) کی راہ دکھاتے ہیں۔ لیکن عموماً ہوتا یہ ہے کہ ہم اپنی کم نظری کی وجہ سے یہی راہ کو منزل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ہر شخص اپنے مقام پر رُک جاتا ہے۔ اور پھر اس بات پر تکرار ہونے لگتی ہے کہ کس کا مقام اعلیٰ ہے۔ ہماری مثال یوں ہے کہ ہم پھل کی ٹوکری کے بارے میں لڑ جھگڑ رہے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس کشمکش میں پھل بندروں میں جا گرے ہیں۔ مذہب کے نام پر لڑنے والوں سے مجھے تو یہی پوچھنا ہے کہ کیا آپ کو اُن تمام باتوں کا ذاتی تجربہ ہے جن کے متعلق آپ اتنی باتیں کرتے ہیں؟ کیا آپ کے دعوؤں کی پشت پر ذاتی ادراک و شعور موجود ہے۔؟ مثلاً اگر کوئی کہتا ہے کہ یسوع مسیحؑ خدا کا واحد پیغمبر ہے تو میں اس سے پوچھوں گا کہ کیا آپ نے اپنے پیغمبر کو دیکھا ہے، کیا آپ کے باپ دادا نے اُسے دیکھا ہے۔ کیا آپ نے دوسرے پیغمبروں کو دیکھا ہے؟ اور اگر نہیں تو یہ سب دعوے کیسے؟ یہ سب بحث و مباحثے اور تکرار کیوں؟ پہلے اپنے پیغمبر کے کہنے پر عمل کرنا سیکھو، پہلے رُوحانیت کو اپنی ذات میں پیدا کرو، موازنے اور مقابلے کا سوال ہی نہیں اُٹھے گا۔ جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ وہ کبھی اِن فضول جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔

دراصل سب اوتار اور پیغمبر سچے ہیں۔ سب کا مقام بہت ہی بلند ہے۔ اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہر ایک ہمیں اپنا مخصوص اُصول سکھانے کے لئے نازل ہوا اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہمیں متعدد سُنہری اُصول وراثت میں ملے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنی زندگی میں تبرک اور تقدس بھر سکتے ہیں بھگوان سری کرشن کو لیجئے۔ آپ نے گیتا کو پڑھا ہو گا۔ ایک سرے سے لے کر دوسرے تک جس واحد اُصول کی تلقین کی گئی ہے۔ وہ ہے بے تعلق ہو کر کام کرنے کا اُصول۔ دُنیا میں کنول کے پھول کی طرح بے تعلق ہو کر رہئے

www.taemeernews.com

تعلق واجب ہے تو بس ایک ہی ہستی سے۔ محبت کرنا ہے تو اُسی ایک پرماتما سے جو لازوال اور لافانی ہے جو کبھی تغیّر پذیر نہیں ہوتا۔ دل دینا ہے تو اُسی محبوبِ واحد کو دیجئے۔ دُنیا کی کسی اور چیز سے دل لگانا دُکھ درد اور مصیبت کو مول لینا ہے۔ یہاں کی ہر چیز فانی ہے۔ آدمی سے پیار کیا اور وہ مر گیا تو عمر بھر کا رونا دے جائے گا۔ دوست سے محبت برتی اور وہ وفادار نہ نکلا تو دُکھ ہی ملے گا اور تو اور خاوند اور بیوی کا پیار بھی ذرا سی غلط فہمی اور رنجش سے مٹ جاتا ہے۔ اور دل پر چوٹ لگتی ہے یا موت محبوب کو چھین لیتی ہے اور آدمی ایسا محسوس کرتا ہے کہ دُنیا ہی تباہ ہو گئی۔ دُنیا کا تو کاروبار ہی اسی طرح چلتا ہے، یہاں ہر چیز فانی ہے۔ یہاں کی محبت اور دوستی بھی مٹ جاتی ہے۔ اِسی لئے بھگوان سری کرشن گیتا میں کہتے ہیں "پرماتما سے پیار کرو۔ وہی ایک واحد ہستی ہے جس کو ثبات حاصل ہے، اُسی کی محبت لازوال ہے۔ ہم جہاں کہیں بھی ہوں، ہمارا محبوب ازلی ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ ہم پر ہر وقت اُس کی عنایت ہوتی ہے۔ اُس کے دل میں ہمارے لئے محبت بھری ہے۔ اُس کے لطف و کرم کی کوئی حد ہی نہیں، اُس کی محبت میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ ہم جو کچھ بھی کریں وہ ہم سے ناراض نہیں ہوتا وہ تو صرف محبت کرنا ہی جانتا ہے۔ بھلا خدا بندوں سے ناراض کیونکر ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کا بچہ کوئی شرارت کرے تو کیا اُس کی وجہ سے بچے کے لئے آپ کی محبت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ کیا آپ اُس سے ناراض ہو جاتے ہیں؟ تو خدا کے ناراض ہونے کے کیا معنی؟ وہ تو دانائے کل ہے۔ کیا اُسے معلوم نہیں کہ ہماری منزل کیا ہے؟ ہماری زندگی کی معراج کیا ہے؟ ہماری اصل مکمل اور پاکیزہ ہستی ہے اور آخر کار ہمیں کمال تک پہنچنا ہے۔ پرماتما صبر و تحمل کا مجسمہ ہے، وہ نہایت اطمینان اور صبر سے انتظار کر رہا ہے۔ آؤ ہم اپنی ساری محبت اُسے سونپ دیں۔ اور پھر اُس کی محبت میں سرشار ہو کر دُنیا سے پیار کریں۔ کیونکہ یہ تمام سنسار اُسی کا ہے۔ وہی اس کائنات میں بس رہا ہے۔ دُنیا کے تعلقات میں بھی اُسی کی کشش ہے آؤ ہم دُنیا سے اندھی محبت کی بجائے آنکھیں کھول کر پیار کریں۔ ہر چیز میں پرماتما کو جلوہ گر دیکھ کر اپنی محبت اس پر نچھاور کریں۔ ماں باپ سے دوستوں سے۔ بچوں سے بیوی سے سب سے پیار کریں۔ لیکن اُن تعلقات کی خاطر نہیں جو ہمیں اُن سے ہیں۔ بلکہ اُس واحد رشتہ کی خاطر جو پرماتما کو اُن سب میں دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ اِسی لئے تو کہا ہے "میری محبوب خاوند سے اِس لئے پیار نہیں ہوتا کہ وہ خاوند ہے بلکہ اس لئے کہ پرماتما خاوند میں جلوہ گر ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ خاوند اور بیوی کے رشتے میں بیوی اور خاوند ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ کشش جسے ہم محبت کہتے ہیں۔ خود بھگوان کی کشش ہے۔ کیونکہ خود بھگوان ہی سے تو دونوں کا وجود قائم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عموماً ہم بھگوان کی موجودگی کو محسوس نہیں کرتے۔ اور ایک دوسرے سے دُنیاوی اور جسمانی تعلقات کی بناء

www.taemeernews.com

پیار کرتے ہیں۔ جب تک غفلت کا یہ پردہ ہماری آنکھوں پر پڑا رہتا ہے اس وقت تک ہماری محبت میں سکھ کے ساتھ دکھ بھی لگا رہتا ہے لیکن جب ہم پرماتما کی موجودگی سے آگاہ ہو کر محبت کرتے ہیں تو محبت پاک ہو کر سراپا مسرت ہو جاتی ہے اور ہم پر نجات کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ ویدانت کے فلسفے کے مطابق محبت کا یہی راز ہے۔ ہماری مقدس کتابوں میں لکھا ہے کہ جہاں کہیں محبت کی روشنی ہے اور جہاں کہیں مسرت کا شعلہ نمودار ہوتا ہے۔ وہاں خدا خود موجود ہوتا ہے کیونکہ وہی سب نور کا مطلع ہے اور وہی سب نشاط کا مخزن سب چیزیں اُسی کے نور سے روشن ہیں۔ سب مسرتیں اُسی کی خوشی سے ماخوذ ہیں۔ اُسی کی ذات کا دوسرا نام محبت تبرک اور مسرت ہے اُس کے بغیر نہ کہیں محبت مل سکتی ہے نہ مسرت۔

بھگوان سری کرشن کی تعلیم کا موضوع یہی ہے کہ اپنا سب کچھ پرماتما کے ارپن کر دو۔ بے تعلق ہو کر کام کرنے کا مطلب یہی کہ اسے بھگوان سے متعلق کر دو۔ خود سپردگی کے اس اصول کو بھگوان سری کرشن نے اپنی قوم کے کردار کا جزو بنا دیا ہے یہ طریقۂ عمل ہندوؤں کی سرشت میں داخل ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ ہندو پانی بھی پیتے ہیں تو یہ پرارتھنا دُہراتے ہیں کہ پربھو اگر اس کرم" (عمل) میں کوئی خوبی ہے تو اُسے قبول کرو بودھ لوگ خدا کو نہیں مانتے۔ لیکن سری کرشن کی تعلیم کا اثر اُن پر بھی ہوا ہے۔ اگر کسی بودھ سے کوئی نیک کام سرانجام ہو پاتا ہے تو وہ کہتا ہے "میرے کام کا ثواب اس دُنیا کو پہنچے اگر میرے 'کرم' میں کوئی خوبی ہے تو اس کا پھل مجھے نہیں تمام دُنیا کو پہنچے بلکہ اگر ہو سکے تو دُنیا کے پاپوں کا پھل بے شک مجھے مل جائے تاکہ سب جہان کا تو بھلا ہو" بات وہی ہے جسے ہندو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ اپنے کرموں کا پھل بھگوان کے ارپن کر دُ ہندو پرماتما کی ہستی میں اعتقاد رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ پرماتما قادر کُل ہے وہی تو واحد رُوحِ اعظم ہے ہے جس سے ہر روح پردۂ شہود پر نمودار ہوتی ہے۔ وہی کائنات کی روحِ رواں ہے' وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ اس لئے سب کچھ اسی کا ہے اور اُسی کو ارپن کر دینا چاہئے۔ ثواب کی اُمید اور عذاب کے خوف کو ترک کر دینا ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ اپنے نیک اعمال کا پھل پرماتما کو بھینٹ کر دینا ہی سب سے بڑی قربانی" ہے۔ اس سے تمام کائنات کا بھلا ہو گا کیونکہ سارا جہان پرماتما ہی کا رُوپ تو ہے۔

بھگوان سری کرشن کہتے ہیں کہ "اُس دُنیا میں رہ کر جو اپنے تمام کرموں کا پھل پرماتما کی بھینٹ کر دیتا ہے اُسے دنیا کی کوئی بُرائی چھو ہی نہیں سکتی۔ جیسے کنول کا پھول پانی کی تہ سے اُٹھتا ہے لیکن کھِلتا ہمیشہ سطح پر ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی دنیا کے بندھنوں سے آزاد ہے جو دُنیا کے کاروبار میں مشغول رہ کر بھی بھگوان سے غافل نہیں رہتا اور اپنا ہر کام اُسی کے ارپن کر دیتا ہے"۔

بھگوان سری کرشن ترکِ دُنیا کی تعلیم نہیں دیتے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ کام سے کنارہ کش ہو جاؤ بلکہ

www.taemeernews.com

اُن کی تعلیم کا لُبِ لباب تو یہ ہے کہ متواتر کام کیے جاؤ۔ دِن رات کام کرو۔ آپ پوچھیں گے کہ اس بے تحاشہ کام میں آرام کہاں ہے، اس میں سکون کیونکر ملے گا؟ بھگوان کہتے ہیں "سکون ضرور ملے گا۔ لیکن کام سے بھاگنے سے نہیں"۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے کبھی کو نہ سکون ملا ہے نہ ملے گا۔ اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہوکے دیکھ لیجیے۔ شہروں سے دُور پہاڑوں کی چوٹیوں پر جاکر بھی آدمی کا مَن تو چکر ہی میں رہتا ہے۔ اس سے تو لمحہ بھر چین نہیں، لٹّو کی طرح گھومتا رہتا ہے۔ ایک سنیاسی سے جو ہمالیہ کے پہاڑوں میں گھومتا رہتا تھا کسی نے پُوچھا "مہاراج کیا آپ کو ابھی تک کوئی اچھی جگہ قیام کرنے کے لئے نہیں ملی؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ یہاں ہمالیہ کے پہاڑوں میں کتنے عرصے سے گھوم رہے ہیں"" سنیاسی نے کہا۔ چالیس برس سے یہیں گھوم رہا ہوں۔ یہ سُن کر اُس آدمی کو حیرانی ہوئی اور اُس نے پُوچھا "مہاراج یہاں تو ایک سے ایک خوبصورت جگہ ہے۔ کیا آپ کو یہاں ٹھہرنے کے لئے کوئی جگہ پسند نہیں آئی"۔ سنیاسی نے جواب دیا۔ "ٹھہرنے کا سوال ہی کہاں اُٹھتا ہے۔ اِن چالیس برسوں میں میرے چنچل مَن نے مجھے رُکنے ہی نہیں دیا" دیکھا آپ نے مَن کا چین حاصل کرنا اتنا آسان نہیں سکون فقط کام چھوڑ دینے سے نہیں مل سکتا۔ آپ نے اُس سپاہی کی کہانی تو سُنی ہوگی جو تاتار ڈاکو کو پکڑ لایا تھا۔ یہ سپاہی جب اپنی بارکوں کے نزدیک پہنچا تو اُس نے زور سے آواز دی۔ دیکھو میں تاتار ڈاکو کو پکڑ لایا ہوں۔ اندر سے آواز آئی "اسے بارک میں لے آؤ۔ سپاہی نے جواب دیا "یہ بارک میں نہیں آتا"۔

"اچھا تو تم اندر آجاؤ"۔

"یہ مجھے چھوڑتا ہی نہیں۔ میں کیسے اندر آؤں"۔

یہی حال ہمارے مَن کا ہے۔ اس پر قابو پانا مشکل ہے۔ ہم اس مَن سے کہتے ہیں "چین سے رہو صبر وتحمل سے کام لو"۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے کہنے سے ہمیں اطمینانِ قلب نصیب ہو جائے گا۔ کہنے کو تو بیچ بھی سکون اور آرام کی باتیں کرسکتے ہیں لیکن دل کا سکون حاصل کرنا مشکل کام ہے۔ میں یہ بات اپنے تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ میں نے بھی اپنی ذمہ داریوں کو پسِ پشت ڈال کر چاہا کہ مجھے سکونِ دل مل جائے۔ میں بھی برسوں پہاڑوں میں گھومتا رہا۔ میں غاروں اور جنگلوں میں رہتا رہا۔ لیکن مَن کا چین کہیں نہ ملا۔ تاتار ڈاکو کی طرح میری دُنیا نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہ ڈاکو ہمارے مَن کی صورت میں ہمارے ہی اندر موجود ہے۔ اس لئے دوسروں کو دل کی بے چینی کا باعث قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ کچھ حالات سکونِ قلب کے لئے موافق ہوتے ہیں اور کچھ منافق۔ اطمینان اور سکون تو داخلی چیز ہے۔ خارجی دُنیا نہ ہمیں تسکین دے سکتی ہے۔ اور نہ ہمارے سکون کو ہم سے چھین سکتی ہے۔ اگر ہم اپنے اندر کے ڈاکو کو

www.taemeernews.com

چپ کروا سکتے ہیں تو ہمیں یقیناً شانتی نصیب ہوگی۔ اور اگر ہم ایسا نہیں کرسکتے تو کام کاج چھوڑ دینے سے تو ہمیں سکون اور چین ملنے سے رہا۔

اسی لئے تو بھگوان سری کرشن ہمیں کام ترک کرنے کو نہیں کہتے۔ وہ ہمیں اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی کی تعلیم ہرگز نہیں دیتے بلکہ اُن کا کہنا تو یہ ہے کہ ان ذمہ داریوں سے مردانہ وار نبرد آزما ہونا ہمارا فرض ہے، شرط صرف یہ ہے کہ نتائج کی پروا نہ ہو جو کام ہمارے حصے میں آیا ہے اُسے پھل کی فکر کئے بغیر بجا لانا لازمی ہے ہم تو بھگوان کے خدمت گار ہیں ہمیں بحث و مباحثے سے کیا ہم تو اُس کے سپاہی ہیں۔ ہمارا منطق اور دلیل سے کیا واسطہ۔ ہمارا فرض بس یہی ہے کہ اپنا کام کئے جائیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہمارا حق تو محض اسی پر ہے کہ اپنے کام کی نوعیت اور درجہ کا خیال نہ کرتے ہوئے اسے پوری دیانتداری اور تندہی سے کرتے جائیں۔ ہمیں تو بس ایک ہی بات کا خیال رکھنا ہوگا۔ ہر کام سے پہلے اپنے من سے یہ سوال ضرور پوچھ لینا چاہیئے کہ کیا وہ کام بے غرضانہ ہے۔ یا اُس میں ہماری کچھ غرض مضمر ہے۔ اگر کسی کام میں خود غرضی شامل نہیں ہے تو بے فکر ہو کر اُس کام کو کرتے جاؤ۔ جہان کی کوئی طاقت تمہیں روک نہیں سکتی ہچکچانے کی چنداں ضرورت نہیں، دریائے عمل میں غوطہ زن ہو جاؤ۔ حق و صداقت کے موتی ہمیں ضرور ملیں گے بھگوان سری کرشن کا یہی پیام ہے۔ اُن کے اپنے مبارک الفاظ کو سنیئے فرماتے ہیں: یوگی وہی ہے۔ کام کرنے کا راز وہی جانتا ہے جو کام کی شدت ہی میں آرام ڈھونڈھ لیتا ہے۔ جسے شور و تلاطم میں بھی سکون و عافیت کی جھلک نظر آتی ہے اور ساتھ ہی مکمل اطمینان اور شانتی میں بھی زندگی کی تیز رفتاری اور شدت سے غافل نہیں ہوتا۔ ایسا شخص رُوحانی ارتقا کی بلند ترین منزلوں سے ہوتا ہوا ہستی کے کمال کو حاصل کر لیتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ بھگوان سری کرشن نے یہ تعلیم دے کر عمل کا یہ راز بتا کر ہمارے سب دنیاوی فرائض کو تبرک اور تقدس بخش دیا ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے دُنیا کا کوئی کام ایسا نہیں ہے جسے ہم کم درجہ کہہ سکتے ہیں۔ کوئی شخص ایسا نہیں جسے ہم اس کے کام یا پیشہ کی وجہ سے پنچ کہہ سکیں۔ ہر شخص کا کام اپنی جگہ اہم اور متبرک ہے جب کام بھگوان ہی کے اَرپن کرنا ٹھہرا اور جب بھگوان سب کی بھینٹ کو برابر قبول کرتے ہیں تو فرق و امتیاز کہاں رہ جاتا ہے۔

جس دوسرے جگت گرو کا مجھے آج ذکر کرنا ہے وہ ہیں مہاتما بدھ۔ اُن کا معرکتہ الآرا پیغام سُنیئے جنے دُنیا کو ہلا دیا جس میں آج بھی زبردست طاقت ہے۔ اور جسے سُن کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ خود ہمارے دل میں اس کا مقام ہے۔ بھگوان بدھ کہتے ہیں خود غرضی کو کُلیتاً مٹا دو۔ اس کو جڑ سے اُکھاڑ پھینک دو۔

137 www.taemeernews.com

ہر اُس چیز سے احتراز کرو جو خودغرضی کی طرف لے جاتی ہے۔ دُنیا کے غلام نہ بنو۔ اپنی چھوٹی خودی کو ختم کر دو مکمل طور پر بے غرض بن جاؤ۔ دُنیا دار بے غرض ہونے کا دعوے کرتے ہیں لیکن جہاں عملی ثبوت دینے کا موقع آتا ہے۔ خودغرضی کی طرف جھک جاتے ہیں۔ مثلاً خاوند اپنی بیوی کو دیکھ کر بے غرضی کے سارے دعوے بھول جاتا ہے یا ماں اپنے بچے کو سامنے پاکر تمام دُنیا کو اس پر قربان کرنے پر تُل جاتی ہے دُنیا کی ہر شئے کا یہی حال ہے۔ مہاتما بدھ کہتے ہیں کہ جب انسان کے دل میں اپنی غرض پوری کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اور اس خواہش سے متحرک ہو کر انسان خودغرضی کی راہ پر چل دیتا ہے۔ تو اس کی حقیقی ہستی، اس کی سچی خودی غائب ہو جاتی ہے۔ وہ خواہشات کا غلام ہو کر وحشی حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے اُسے دوسرے انسانوں سے ہمدردی نہیں رہتی وہ کبھی دوسروں کو اپنے پر ترجیح نہیں دیتا، "پہلے آپ" اس کی زبان سے نکلتا ہی نہیں۔ اس کی زندگی کا تو یہی اصول بن جاتا ہے کہ مجھے تو اپنے کام سے مطلب ہے مجھے دوسروں کی کیا پڑی وہ اپنے مفاد کا خود خیال رکھ لیں گے۔

آپ نے دیکھا کہ جہاں ہمیں بھگوان سری کرشن کے قوت بخش پیام کی ضرورت ہے۔ وہاں مہاتما بُدھ کی انسانیت خیز تعلیم کے بغیر بھی ہماری زندگی بلند نہیں ہو سکتی بھگوان کرشن کے بتائے ہوئے اُصول پر عمل کرنے سے ہی دُنیا کا کاروبار ٹھیک چل سکتا ہے نہیں تو ہم ہل بھی نہیں سکتے انہیں کی تعلیم کی بدولت ہم اپنے ہر فرض کی ادائیگی سے سکون اور خوشی حاصل کر سکتے ہیں۔ ورنہ ہر ذمہ داری وبالِ جان بن کر رہ جائے۔ وہ کہتے ہیں اگر تمہارے کام کا کوئی پہلو اچھا نہیں تو گھبرانے کی کیا بات ہے۔ دُنیا کا کوئی کام ایسا نہیں جس میں کچھ نہ کچھ بُرائی نہ ہو۔ تم بے تعلق ہو کر کام کئے جاؤ۔ کام کے نتائج بھگوان پر چھوڑ دو۔" یہ سب کچھ بجا ہے اور اس پر عمل کئے بغیر جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے دل میں سکون اور چین کی جو زبردست خواہش ہے۔ اُس کو مہاتما بدھ کی تعلیم ہی پورا کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وقت تیزی سے گزر جاتا ہے۔ دُنیا کی ہر شئے محدود اور فانی ہے۔ ہر طرف دُکھ اور مصیبت ہے۔ اگر ایک کے پاس کھانے کو اچھا کھانا، اور پہننے کو اچھا کپڑا ہے تو ہزاروں بھوکے مرتے ہیں۔ اور لاکھوں ننگے رہتے ہیں۔ خوش حال لوگوں کو غریبوں کے دُکھ کا احساس کم ہی ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی تو ہر شخص کی زندگی میں کچھ لمحے ایسے آتے ہیں کہ انسان سمجھتا ہے کہ چاروں طرف دُکھ ہی دُکھ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ آدمی پیدا ہی روتے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ جہان تو آہ و زاری کا مقام ہے۔ اس سے نجات کیونکر حاصل ہو سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب مہاتما بدھ دیتے ہیں اُن کا دُنیا کو یہی پیام ہے کہ اس دُکھ کا علاج چاہتے ہو تو یہ خودغرضی چھوڑ دو۔ دوسروں کے لیے جیو۔

www.taemeernews.com

لیکن ہماری رُوحانی تکمیل کے لیے بھگوان سری کرشن اور مہاتما بدھ کے ہی پیام کافی نہیں۔ حضرت یسوع مسیح رُوحانی زندگی کے ایک اور پہلو پر زور دیتے ہیں وہ کہتے ہیں" یزدانی دولت کی نعمت تمہارے اندر موجود ہے۔ اپنے آپ کو اس بے بہا نعمت کے قابل بناؤ" ہمیں اس اُمید افزا پیام کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی بھگوان سری کرشن اور مہاتما بدھ کے پیاموں کی۔ فرض کیجیے کہ میں بھگوان سری کرشن کے اُصول کے مطابق بے تعلق ہو کر اپنے فرائض کو انجام دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کوشش میں بسا اوقات میں اپنے معیار تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایسے موقع پر جب میرے دل میں کسی چیز کے لئے خاص لگاؤ پیدا ہونے لگتا ہے تو مہاتما بدھ کا پیام آکر مجھے اپنی کمزوری سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مجھے آواز آتی ہے" خبردار۔ اس دُنیا کی ہر شئے فانی ہے دُنیا سے جی لگانے سے دُکھ کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا" میں یہ آواز سُنتا ہوں اور کچھ سنبھل جاتا ہوں لیکن اس بات کا فیصلہ نہیں کر پاتا کہ دُنیا کے کام کاج میں لگا رہوں۔ یا اس سے کنارہ کش ہو جاؤں اس مقام پر حضرت یسوع مسیح کا پیغام بجلی کی کڑک کی طرح گونج اُٹھتا ہے۔ تیار ہو جاؤ۔ یزدانی دولت تمہارے ہاتھ میں آیا ہی چاہتی ہے۔ دیر مت کر۔ کل تک کوئی بات نہ چھوڑو۔ اپنے آپ کو اس نعمت کے قابل بناؤ نہیں تو ہاتھ ملتے رہ جاؤگے۔ اس پیام کا اپنا مقام ہے۔ ہم اس پیام کو بھی قبول کرتے ہیں اور اس پیغمبر پر بھی بار بار سلام بھیجتے ہیں۔ ہم خدا کے اس اوتار کے آگے بھی سر جُھکاتے ہیں۔

اس کے بعد رسُول خدا حضرت محمدؐ مساوات کا پیام لے کر ہمارے درمیان آتے ہیں۔ یہی مساوات کی تعلیم ہی اِسلام کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اسی مساوات کی تعلیم کی بدولت ہی اِسلام دنیا کے کونے کونے میں پھیلا اور اسی کی بدولت یہ مذہب زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اور حضرت محمدؐ اس مساوات کے پیغمبر ہیں۔ اُنہوں نے دُنیا کو انسانی اخوت کا سبق دیا اور اس اُصول پر عمل کرنے کا طریقہ بتایا۔

تو دیکھا آپ نے کس طرح ہمارے یہ پیغمبر اور اوتار اپنا اپنا مخصوص پیغام لے کر دُنیا میں آئے اور ہماری مذہبی اور روحانی زندگی کو مالا مال کر گئے۔ اگر کوئی اِس پُوری وراثت کو سنبھال نہیں سکتا اور اس میں سے صرف کچھ حصے ہی کو قبول کرتا ہے تو یہ کم ظرفی ہے۔ مگر اس میں اس وقت تک کوئی بُرائی نہیں جب تک دوسروں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور نکتہ چینی اور جھگڑے فساد تک نوبت نہ آئے۔ لیکن رونا تو اس بات کا ہے کہ کم ظرف اور کم علم لوگ نہ صرف اپنے مخصوص پیغمبر یا اوتار کی تعلیم ہی تک اپنے آپ کو محدود کر لیتے ہیں بلکہ دوسرے رہنماؤں کے پیام کو اپنے خیالات کے مطابق توڑ موڑ کر ایک ہی مرکز پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان خود ساختہ نظریوں کو ان مذہبی رہنماؤں سے منسوب کر بیٹھتے ہیں۔ اس لئے یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ہمیں دُنیا کے عظیم اوتاروں، اور پیغمبروں کو سمجھنے کے لئے تبصروں اور تفسیروں کی ضرورت

www.taemeernews.com

نہیں، اِن ہستیوں نے اپنے اُصولوں کو خود اپنی زندگی میں مجسّم کرکے ہمارے سامنے مثالیں قائم کردی ہیں۔ اُن کی تعلیم کی بہترین تفسیر خود اُن کی زندگی ہے۔ اس کے مطالعے سے ہی اُن کے اُصولوں کی تشریح ہوجاتی ہے۔ کسی پیغمبر کے پیام پر غور کرو اور پھر اُن کی زندگی کو دیکھو تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اُن کا پیام اُن کی زندگی کا نچوڑ ہے۔ اور اُن کی زندگی اُن کے پیام کا مجسّم ثبوت۔ گیتا کو پڑھیئے اور پھر بھگوان سری کرشن کی زندگی کا مطالعہ کیجئے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہوجائے گی۔ اِس طرح حضرت محمدؐ نے اپنی زندگی ہی میں یہ دکھا دیا کہ اہلِ اِسلام میں مکمّل مساوات اور اخوت کے کیا معنی ہیں۔ اُن کے یہاں نسل، قوم، ذات، رنگ یا جنس کا فرق روا نہیں ہے۔ مثلاً اگر ترکی کے سُلطان کا زرخرید افریقی غلام اِسلام قبول کرلیتا ہے تو یہ سب باتیں مٹ جاتی ہیں کہ وہ پابزنجیر لایا ہوا غلام ہے وہ افریقی ہے۔ سیاہ فام ہے۔ دوسری نسل کا ہے۔ مُسلمان ہوکر وہ سلطان کے برابر ہوجاتا ہے۔ اور اگر اس میں قابلیت ہو اور آزاد ہوکر اس قابل ہوجائے کہ شہزادی سے شادی کرسکے تو یہ شادی بھی ممکن ہوسکتی ہے۔ اسلام کی اِس مساوات کا مقابلہ کیجئے۔ اُس طرزِ عمل سے جو آپ کے مُلک میں نیگروں اور ریڈ انڈین لوگوں سے برتا جاتا ہے۔ یا جو اُونچی ذات کے ہندو میرے مُلک میں اُن لوگوں پر روا رکھتے ہیں جنہیں وہ ملیچھ یا نیچ ذات کے لوگ کہتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی عیسائی کا ہاتھ ان کے کھانے کو لگ جائے تو وہ اسے ناپاک سمجھ کر پھینک دیں گے اور یہ حالت ہے ہماری باوجود ویدانت کے عظیم الشان فلسفے کے وارث ہونے کے، دُنیا میں اِنسانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ اس قسم کا سلوک دیکھ کر ہی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اہلِ اسلام کی نسل اور رنگ وغیرہ سے بالا مساوات کی عظمت کیا ہے اور حضرت محمدؐ کی عملی مساوات اور اخوت کی ہمیں کس قدر ضرورت ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اِس بات سے اتفاق کرینگے کہ ہم دُنیا کے تمام اوتاروں اور پیغمبروں کے مخصوص اور بنیادی اُصولوں کو نہ صرف اپنا سکتے ہیں۔ بلکہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اُن پر عمل بھی کرسکتے ہیں اور اگر ہمیں سماجی اور مذہبی ترقی مطلوب ہے۔ اگر ہمیں انسانی تہذیب کی معراج کو پانا ہے تو ہمیں اصولاً اور عملاً سب اوتاروں اور پیغمبروں کو اپنانا ہوگا۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں اس عام سوال کے بارے میں بھی کچھ کہوں کہ کیا آیندہ اور بھی اعلیٰ مقام پیغمبر پیدا ہونگے، مجھے اِس میں رتی بھر شک نہیں کہ آیندہ بھی بلند مرتبہ اوتار اور پیغمبر ہماری رہنمائی کے لئے پیدا ہونگے۔ یہ امر یقینی ہے لیکن ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں مستقبل کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ ہماری رہنمائی کے لئے گزشتہ پیغمبروں اور اوتاروں کی زندۂ جاوید روشن مثالیں موجود ہیں۔ میں آپ میں سے ہر ایک کو زمانۂ حال کے اُس نئے مذہب کا پیغمبر بننے کی تلقین کرتا ہوں

140 www.taemeernews.com

جس میں سب پُرانے پیغمبروں کو عزت کا مقام حاصل ہو۔ جس کی مقدس کتاب پُرانی مقدس کتابوں کو اپنی وسعتوں میں سموئے ہوئے ہو۔ پُرانے سب اُصولوں کو اکٹھا کر لیجیے۔ اور اُن پر عمل کر کے آگہی اور عرفان کے اُس مقام پر پہونچ جائیے جہاں نہ صرف اِن اُصولوں کی حقیقت آپ کی ہستی میں مُدغم ہو جائے بلکہ اگر ضرورت ہو تو آپ اِن میں اضافہ بھی کر سکیں۔ یہی مقام پیغمبروں کا مقام ہے۔ اور آپ سب کو ایک دن اِس مقام پر پہنچنا ہے۔ پُرانے پیغمبر اور اوتار سب کے سب تعظیم اور پرستش کے قابل ہیں۔ ہمیں سب کی عظمت کا اعتراف ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو اُن کا غلام سمجھتے ہیں تو بالکل بجا ہے وہ ہمارے رہنما ہیں۔ وہ ہمارے لئے رُوحانی راستے کھول گئے ہیں ہم اُنہیں اوتار اور رسول مان کر پوجتے ہیں اور پُوجنا چاہیئے بھی لیکن اس پوجا میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہماری اپنی حقیقی خودی بھی پرستش کے قابل ہے۔ اگر وہ پیغمبری کے مقام تک پہنچ سکتے تھے۔ اگر اُنھیں خدا کی قربت حاصل ہو سکتی تھی۔ اور وہ خدا کے فرزند کہلا سکتے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم سب جو اُن کی طرح انسان ہیں۔ اُن کے مقام تک نہ جا سکیں[۱]۔ وہ اپنے وقت میں درجۂ کمال تک پہنچ گئے۔ آج ہمیں بھی اپنے کمال تک جانا ہے حضرت یسوع مسیح کے اِن الفاظ کو یاد رکھیئے "یزدانی دولت تمہارے ہاتھ آنے والی ہے"۔ آؤ آج ہم میں سے ہر ایک اِس بات کا مصمم ارادہ کرلے کہ میں بھی خدا کا پیغمبر بن کر رہوں گا۔ میں بھی نُورِ حقیقت کا عالمتاب آفتاب بن کر چمکوں گا۔ میں بھی فرزندِ خدا کا وہ مقام حاصل کر کے رہوں گا۔ جہاں قربت میں من و تو کا فاصلہ مٹ جاتا ہے۔ اور انسان اور خدا ایک ہو جاتے ہیں جہاں میں میں نہیں رہوں گا۔ جہاں میرا احساسِ خودی احساسِ خدا بن جائے گا۔

۱؎ طالبِ لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید
ہمچناں در عملِ معدن و کان است کہ بود

www.taemeernews.com

نعرۂ حق

سوامی وویکانند

کی

تقاریر اور تصانیف سے انتخاب

RAMAKRISHNA MATH

جلد دوم

www.taemeernews.com

2

NÂRA-É-HÂQ

Selections from speeches and writings of

SWAMI VIVEKANANDA

VOLUME : II
FIRST EDITION : 1964

Published by
SWAMI SWAHANANDA
Secretary
Sri Ramakrishna Mission
NEW DELHI

Ordinary Binding
Rs. 8-00

Deluxe Binding
Rs. 10-00

Kapur Printing Press, Delhi

www.taemeernews.com

پبلشر

سوامی سواہ آنند

سیکرٹری

شری رام کرشن مشن۔ نئی دہلی

یہ پہلا ایڈیشن

قیمت

عام جلد آٹھ روپیہ

مجلد، فل کلاتھ دس روپیہ

مؤلف اور مترجم

دھرم پال

بیرسٹر

144 www.taemeernews.com

5

उत्तिष्ठत जाग्रत प्राप्य वरान्निबोधत

اُٹھو! جاگو! اور تب تک نہ رُکو جب تک منزل نہ پالو

دیباچہ

سوامی وویکانندجی کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب کے سلسلہ میں میرے ایما پر سوامی جی کی تقاریر اور تصانیف سے چند منتخب شدہ مضامین کا پہلا گلدستہ اردو داں طبقہ کی خدمت میں "نعرۂ حق" جلد اوّل کے زیرِ عنوان پیش کیا جا چکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اِس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس کا نام "نعرۂ حق" جلد دوم ہے اور یہ سوامی جی کے کلام کا دوسرا انتخاب ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ پہلے انتخاب کی طرح یہ بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

اِس کتاب میں سوامی وویکانند کی تقاریر اور تصانیف سے مرتب شدہ ایسی انگریزی کتابوں کا ترجمہ شامل کیا گیا ہے جو گردش زمانہ کے انقلابی تقاضوں کو پورا کرتی ہیں اور ملک و قوم، بلکہ کل بنی نوعِ انسان کے لئے ایک ایسا لاثانی سرمدی پیغام ہیں جو اس کی جملہ آفتوں، مشکلوں اور کلفتوں کو دور کرنے کا واحد علاج ہے۔

کتابوں کی اِس فہرست میں سب سے پہلے کتاب "تعلیم" لی گئی ہے جسے انگریزی میں شری ٹی۔ ایس۔ اویناشی لنگم نے مرتب کیا تھا۔ دوسری کتاب "ہندوستان اور اس کے مسائل" ہے جس کو مرتب کرنے کا سہرا شری سوامی نرویدانند کے سر ہے۔ تیسری کتاب "ذات پات، تمدن اور سوشلزم" ہے۔ چوتھی کتاب "راج یوگ" ہے جو سوامی وویکانندجی کی شہرۂ آفاق

www.taemeernews.com

تصنیف ہے۔اس کے بعد سوامی وویکانند جی کے کچھ منتخب خطوط اور مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

سوامی وویکانند جی تقریر و تحریر دونوں کے دھنی تھے۔ان کی نوکِ قلم پہ آیا ہوا اور شعلہ نوا زبان سے ادا کیا ہوا ایک ایک لفظ حیات بخش اور جادوئی اثر سے معمور ایسا جواہر پارہ ہے جس کی ہر نور افشاں ضیا میں پر شباب انفرادی اور قومی تعمیر کا پیغام مضمر ہے۔

اس کتاب کو اردو لباس پہنانے کا کام شری دھرم پال جی گلشت کو سونپا گیا تھا جنہیں سوامی وویکانند جی سے والہانہ عشق و عقیدت ہے اور جو اردو اور انگریزی کے ممتاز لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

اگرچہ مترجم کی ہر چند کوشش یہی رہی ہے کہ سوامی وویکانند جی کی سحر طرازیاں اور گل ریزیاں اردو ترجمہ میں بھی بکھری رہیں اور سوامی جی کا کلام جس بے مثال بلاغت اور لازوال آب و تاب کا حامل ہے اردو ترجمہ اس کی حتی المقدور عکاسی و آئینہ داری کر سکے۔ لیکن مترجم کی مودبانہ التجا ہے کہ اگر ناظرین کرام کو اس کتاب سے کچھ لطف و سرور حاصل ہو تو وہ اسے شری سوامی جی کا فیض ان کی رحمت سمجھ کر سینہ سے لگالیں اور اگر کہیں کوئی خامی، کمی یا تشنگی نظر آئے تو اسے مترجم کی کوتاہی اور لغزش سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔

6 جنوری 1964
سوامی وویکانند جی کا
102 واں جنم دن

سوامی سوا آنند
سیکرٹری
شری رام کرشن مشن، نئی دہلی

www.taemeernews.com

8

تعلیم

صفحہ نمبر

- فلسفۂ تعلیم —— 148
- تعلیم کا واحد طریقہ —— 153
- سیرت و اخلاق کیلئے تعلیم —— 157
- تعمیر شخصیت —— 161
- اُستاد اور شاگرد —— 167
- مذہبی تعلیم —— 173
- مقاصد اور اسباب —— 181
- تعلیم نسواں —— 191
- عوام کی تعلیم —— 195
- فرض کیا ہے؟ —— 202
- مالک کی طرح کام کرو —— 208

www.taemeernews.com

7

تعلیم

EDUCATION

www.taemeernews.com

9

فلسفۂ تعلیم

تعلیم اس لیاقت وخوبی کے جمال و کمال کا نام ہے جو پہلے سے ہی انسان کے اندر موجود ہوتی ہے علم انسان کو ورثہ میں ملتا ہے جب ہم کہتے ہیں کہ ایک انسان اتنا کچھ جانتا ہے تو نفسیاتی زبان میں اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انسان نے اتنا کچھ دریافت یا منکشف کیا ہے۔ انسان وہی کچھ سیکھتا ہے جو وہ دریافت کرتا ہے' معلوم کرتا ہے۔ وہ اپنی رُوح اور آتما سے' جو بے پایاں علم کی کان اور خزینہ ہے' پردہ ہٹا کر' کچھ دریافت کرتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ نیوٹن نے اصول کششِ ثقل دریافت کیا۔ کیا یہ اصول کششِ ثقل کسی کونہ میں سمٹا بیٹھا نیوٹن کا انتظار کر رہا تھا؟ نہیں' یہ اس کے اپنے دل میں موجود تھا۔ وقت آیا اس نے اسے پہچان لیا۔ معلوم کر لیا۔ دُنیا نے جس قدر علم و ہنر حاصل کیا ہے' وہ اُسکے دماغ سے اُترا ہے کائنات کی بے پایاں لائبریری (کتب خانہ) آپ کے دل و دماغ میں ہے۔ خارجی دُنیا تو محض ایک تحریک' ایک ترغیب ہے' جو آپ کے دل و دماغ کو مطالعہ اور تحقیق و جستجو کے لئے اُکساتی ہے۔ سیب کے درخت سے گرنے سے نیوٹن کو تحریک ملی۔ اس نے اپنے دل و دماغ کا مطالعہ کیا۔ سلسلۂ خیال کی پہلی تمام کڑیوں کو اُس نے ازسرِ نو آراستہ کیا اور اس عمل میں ایک نئی کڑی' ایک نئی زنجیر کو پا لیا۔ جسے ہم قانونِ کششِ ثقل کہتے ہیں۔ یہ اُصول نہ سیب میں تھا اور نہ ہی کرۂ ارض کے مرکز میں پنہاں تھا

اس لئے تمام علم کیا دُنیاوی اور کیا رُوحانی' انسان کے دل و دماغ میں پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے بیشتر حالتوں میں اس کو دریافت نہیں کیا جاتا۔ یہ ڈھکا' چھپا' پڑا رہتا ہے' جب پردۂ جہالت کو آہستہ سے پرے سرکایا جاتا ہے تو ہم پکار اُٹھتے ہیں کہ ہم سیکھ رہے ہیں۔ علم کی ترقی اس پردہ

www.taemeernews.com

کو دور ہٹانے کے عمل کا ہی دوسرا نام ہے جب انسان کے ہاتھوں یہ پردہ اور ڈھکنا پرے ہٹایا جاتا ہے وہ زیادہ صاحب علم اور واقف راز انسان ہوتا ہے جس انسان پر یہ پردہ پڑا رہتا ہے وہ انجان ہے، جاہل ہے جس کا پردہ کلیتاً ہٹ جائے وہ سب کچھ جاننے والا ہمہ بین انسان ہوتا ہے چقماق میں چھپی آگ کی طرح، علم دل ودماغ میں پنہاں رہتا ہے۔ ذہنی تحریک وہ رگڑ ہے جس سے یہ آگ روشن ہوجاتی ہے۔ تمام علم، طاقت اور قوت انسان کے اندر پنہاں ہے۔ ہم سب جنہیں قدرت کی قوتیں، قورت کے راز کہتے ہیں، یہ سب اندر ہی پنہاں ہیں۔ تمام علم انسان کے دل ودماغ سے اُترتا ہے۔ بندہ تو محض اُس علم کا اظہار کرتا ہے۔ اس کو اپنے اندر دریافت کرلیتا ہے۔ یہ ازلی ذخیرہ ہے، پہلے بھی وہیں موجود تھا۔

حقیقت میں کوئی کسی کو نہیں پڑھاتا۔ ہم میں سے ہر ایک کو خود اپنے آپ کو پڑھانا ہوتا ہے۔ بیرونی اُستاد تو محض ایک تحریک پیدا کرسکتا ہے۔ یہ ترغیب وتحریک اندرونی اُستاد کو چیزیں سمجھنے کے کام پر مامور کرتی ہے تب ہمارے اپنے ہی شعور اور اپنے ہی خیال کی قوت سے یہ چیزیں ہمیں صاف سمجھ میں آنے لگ جاتی ہیں۔ اور ہم اُنہیں اپنے ہی دل ودماغ کے اندر معلوم کرلیتے ہیں۔ بڑ کا اتنا بڑا درخت جو کئی سو گز زمین پر پھیلا ہوا ہے، کبھی اس چھوٹے سے بیج کے اندر موجود تھا جو سرسوں کے ایک دانے کے آٹھویں حصہ سے بڑا نہیں ہوتا۔ بے پناہ قوت کا یہ ذخیرہ وہاں پنہاں تھا۔ اسی طرح عظیم الشان عقل، مادۂ حیات کے ایک ذرّہ میں لپٹی پڑی تھی۔ آپ کو یہ بات مہمل سی لگتی ہو، لیکن ہے یہ بالکل درست۔ ہم میں سے ہر ایک اسی مادۂ حیات کے ایک ذرّہ کی تخلیق ہے۔ اور تمام طاقتیں جو ہمیں حاصل ہیں اس مادے کے ذرّہ کے اندر سانپ کی طرح کنڈلی مارے لپٹی پڑی تھیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ طاقتیں غذا سے بنیں تھیں۔ کیونکہ اناج اور غلہ کے پہاڑ جیسے ڈھیر لگا دو، کیا وہاں سے طاقت ملے گی؟ حق تو یہ ہے کہ تمام قوت اجمالی طور پر وہاں موجود تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان اسے جانے یا نہ جانے۔ کیفیت انسانی رُوح کی بے پایاں طاقت کی ہے۔

نورِ حق، بیشتر انسانوں کے اندر اسی طرح چھپا ہوتا ہے۔ جیسے کوئی لیمپ لوہے کے ڈبہ میں بند ہو، روشنی کی ایک بھی شعاع جس کے باہر نہ جھانک سکتی ہو۔ آہستہ آہستہ نفس کشی اور ایثار نفسی سے ہم اس ڈھکنے اور پردے کو رقیق وشفاف بناتے ہیں اور بالآخر یہ غلاف، یہ پردہ شیشہ کی طرح شفاف ہوجاتا ہے۔ شری رام کرشن لوہے کے ایک ایسے ہی غلاف تھے، جو شیشے کی طرح اس قدر منوّر اور شفاف بن چکے تھے کہ ان کے اندر کے نور وجمال کو جوں کا توں دیکھا جاسکتا تھا۔

بچہ کو پڑھانا پودے کو بونے جیسا عمل ہے جیسے پودہ اپنی فطرت سے نشوونما پاتا ہے اسی

www.taemeernews.com

II

طرح بچہ اپنے آپ کو پڑھاتا ہے بس آپ اسے اپنے راستہ پر آگے بڑھنے میں مدد دے سکتے ہیں جو کچھ بھی آپ کریں گے۔ مثبت نوعیت کا نہیں منفی نوعیت کا ہوگا۔ آپ رکاوٹیں اور اڑچنیں دور کر دیں گے تو علم اپنے آپ آجائے گا۔ زمین کو ذرا نرم بنا دو۔ تاکہ بیج کو اُگنے میں سہولت ہو جائے۔ اس کے آس پاس باڑ لگا دو تاکہ کوئی اُسے تباہ نہ کر دے آپ اُگ رہے بیج کو ایسا ضروری سامان بہم پہنچا دیں جس سے اس کا جسم اور تن بن سکے اس مقصد کے لئے اسے مٹی پانی اور ہوا جس چیز کی بھی ضرورت ہو بہم پہنچائیے یہاں آپ کا کام ختم ہو جاتا ہے اب جس جس چیز کی اسے ضرورت ہوگی، یہ خود بخود فطری طور پر حاصل کرتا چلا جائے گا۔ یہی کیفیت بچّے کی تعلیم کی ہے۔ بچّہ اپنے آپ کو پڑھاتا ہے۔ استاد کا یہ سوچنا کہ وہ بچّہ کو پڑھا رہا ہے، سب کچھ بگاڑ دیتا ہے۔ انسان کے اندر ہی سب علم پنہاں ہے اسے محض جگانے اور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ استاد کو فقط اتنا ہی کام کرنا ہوتا ہے کہ بچّے اس قدر علم سیکھ لیں کہ وہ اپنے ہاتھوں، پاؤں کانوں اور آنکھوں، سب اعضا کا درست استعمال کر سکیں! ایسا نظامِ تعلیم، جس کا مقصد ہمارے بچّوں کو اسی طرح کی تعلیم و تربیت دینا ہے جس طرح ایک شخص نے کسی کے کہنے پر اپنے گدھے کو اس لئے زدوکوب کرنا شروع کر دیا کہ شاید ایسا کرنے سے گدھا گھوڑا بن جائے گا، ختم کر دینا چاہیئے اپنے والدین کے غیر ضروری دباؤ اور دبدبہ کی وجہ سے ہمارے بچّے ترقی کے لئے آزادانہ مواقع نہیں حاصل کر پاتے۔ ان میں سے ہر ایک بچّہ میں عظیم رجحانات پنہاں ہوتے ہیں جو اپنی تشنگی بجھانے کے لئے مناسب اور سازگار ماحول کے حاجت مند رہتے ہیں۔ اصلاح کی متشدّدانہ کوشش ہمیشہ اصلاح کو روک دیتی ہیں۔ اگر آپ کسی کو شیر بننے کی اجازت نہیں دیں گے، وہ لومڑی بن کر رہ جائے گا

ہمیں بچّوں کو مثبت اور حقیقی خیال و فکر دینا چاہیئے۔ منفی خیال و فکر انسان کو کمزور بنا دیتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جہاں کہیں والدین اپنے بچّوں کو سخت سُست کہہ کر پڑھنے لکھنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ جہاں والدین بچّوں کو ہر وقت یہ کہتے رہتے ہیں کہ تم کبھی کچھ بھی نہیں سیکھ سکتے۔ جہاں بچّوں کو ہر وقت بیوقوف اور نکمّا کہہ کر پکارا جاتا ہے وہاں بچّے فی الحقیقت ایسے ہی بن جاتے ہیں۔ اگر آپ ان سے شفقت سے پیش آئیں۔ میٹھے بول سے ان کا حوصلہ بڑھائیں، تو یقینی طور پر بچّے وقت پاکر بہتر بن جائیں گے اور ترقی کر جائیں گے۔ اگر آپ انہیں مثبت خیالات دیں تو وہ یہ سیکھ جائیں گے کہ اپنے پاؤں پر کس طرح کھڑا ہوا جاتا ہے ان کی نثر و نظم میں۔ زبان و ادب میں، ہمیں غلطیوں کا شمار نہیں کرنا چاہیئے اور نہ ہی اُن پر نکتہ چینی کرنی چاہیے بلکہ انہیں بتانا چاہیئے کہ وہ کس طرح اپنی اصلاح کر سکتے ہیں۔ بچّے کی ضرورتوں کے مُطابق طریقہ تعلیم میں اصلاح کی جانی چاہیئے۔ پہلی زندگیوں نے ہمارے رجحانات کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس لئے طالب علموں کو ان کے رجحانات کے مُطابق تعلیم دینی چاہیئے۔ جہاں کوئی کھڑا ہے اُسے وہاں سے سنبھالئے اور آگے کی طرف ڈھکیلئے، آگے بڑھائیے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ شری رام کرشن نے کس طرح ایسے افراد کی بھی حوصلہ افزائی کی جنہیں ہم نکمّے سمجھا کرتے تھے۔ اور کس طرح انہوں نے ان افراد کی زندگیوں کا رُخ

www.taemeernews.com

موڑ کر رکھ دیا۔ انہوں نے ایک بھی فردِ واحد کے مخصوص رجحانات کو تباہ و تلف نہ کیا۔ وہ ہمیشہ حوصلا اور اُمید دلاتے تھے ایسے افراد کو بھی جو انتہائی بگڑے ہوتے تھے، اُنہوں نے اِسی طرح ان کا بیڑا پار کر دیا۔

آزادی، ترقی کی پہلی شرط ہے! اگر آپ میں سے کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں عورت یا بچّہ کی نجات کے لئے محنت کروں گا تو یہ غلط بات کہتا ہے۔ سو فی صدی غلط۔ خاطر جمع رکھئے، یہ بچّے اپنے مسائل کو خود حل کریں گے۔ آپ کون ہوتے ہیں جو یہ سوچنے لگ جائیں کہ آپ سب کچھ جانتے ہیں؟ کس طرح آپ یہ سوچنے کی جرأت کرتے ہیں کہ آپ کو نظامِ قدرت پر کوئی حق و اختیار حاصل ہے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ ہر روح، خُدا کی رُوح ہے۔ ہر ایک کو خدا کو سمجھو۔ آپ صرف خدمت کر سکتے ہو۔ آپ میں ہمت و توفیق ہو تو خدا کے بندوں، ایشور کے بچّوں کی خدمت کرو۔ اگر بھگوان نے آپ کو اس قابل بنایا ہے کہ آپ اس کے کسی بچّہ کی خدمت کر سکیں تو آپ مُبارک اور خوش نصیب ہیں کہ یہ ہمت و توفیق آپکے حصہ آ ئی ہے، دوسروں کو نہیں ملی۔ اس خدمت کو پرستش اور پُوجا سمجھ کر کرو۔

تعلیم سے مُراد اطلاعات کے اس انبار سے نہیں ہوتی جو آپ کسی کے دل و دماغ میں بھر دیتے ہیں اور ایک محشر برپا کر دیتے ہیں! اس سے مُراد ایسے علم سے بھی نہیں جو زندگی بھر ہضم نہ ہو سکے۔ ہمیں تو تعمیرِ زندگی کرنا ہے، تعمیرِ اخلاق کرنا ہے، تعمیرِ مزاج کرنا ہے۔ بلند اور عظیم خیالات کو زندگی میں جذب کرنا ہے۔ آپ نے اگر صرف پانچ خیالات کو اپنالیا، انہیں زندگی میں جذب کر لیا۔ اپنی زندگی اور اپنا اخلاق ان کے مُطابق ڈھال لیا تو آپ ایسے شخص سے زیادہ علم رکھتے ہیں جس نے سارے کُتب خانہ کو حفظ اور ازبر کر لیا ہو۔ اگر تعلیم کا مطلب اطلاعات اور علم ہی ہوتا تو کتب خانے، دُنیا کے سب سے زیادہ دانش ور اور دانا ہوتے اور قاموس العلوم (انسائیکلوپیڈیا) رشی اور فرزانے ہوتے۔

دوسروں کے خیالات کو غیر ملکی زبان میں حِفظ کر لینے اور انہیں دماغ میں کوٹ کوٹ کر بھر لینے یا کسی یونیورسٹی سے چند سندیں اور ڈگریاں حاصل کرنے سے ہی کیا آپ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ سمجھنے لگے ہیں؟ کیا یہ تعلیم ہے؟ آپ کی تعلیم کا مقصد اور نصب العین کیا ہے؟ کلرک یا وکیل بننا اور بہت ہوا تو ڈپٹی مجسٹریٹ کا عہدہ سنبھالنا جو دراصل کلرکی کا ہی دوسرا نام ہے۔ کیا یہی ہے آپ کا نصب العین؟ اس سے آپ کا یا ملک و قوم کا کیا بھلا ہو گا؟ اپنی آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ کس طرح بھارت ورش میں اناج اور روٹی کے لئے بلکنے والوں کی دردناک چیخیں اُٹھ رہی ہیں۔ کیا آپ کی تعلیم اُن کی شکم پروری کر سکے گی؟ جو ایسی تعلیم جس سے عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، جس سے وہ زندگی کی جدوجہد کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہو پاتے، جس سے اخلاق کی قوت نہیں ملتی۔ جس سے خدمتِ خلق کا ولولہ بیدار نہیں ہوتا اور آپ کے دل کو شیر جیسی ہمت نہیں ملتی، کیا یہ تعلیم، تعلیم کہلانے کی مستحق ہے؟

ہم تو ایسی تعلیم چاہتے ہیں جس سے اخلاق بن سنور سکے۔ دل کی قوت بڑھ سکے، فہم و فراست وسیع

www.taemeernews.com

ہو سکے اور ہر شخص اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو سکے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم غیر ملکی اقتدار اور غلبہ دُور کر کے اپنے علم وہنر کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کریں اور اس کے ساتھ ہی انگریزی زبان اور مغربی سائنس پڑھیں ہمیں ٹیکنیکل تعلیم اور ایسی ہر دوسری تعلیم کی ضرورت ہے جس کی بدولت صنعتیں ترقی کر سکیں۔ تاکہ آدمی نوکری اور ملازمت کی خاطر سرگرداں ہونے کے بجائے اتنا کما سکے کہ نہ صرف اس کا گذارہ چل سکے بلکہ مصیبت کے لئے بھی کچھ جوڑ سکے۔

ساری تعلیم، ساری تربیت کا مقصد انسان سازی اور اخلاق سازی ہونا چاہیئے۔ کُل تربیت کا مقصد اور انجام یہی ہے کہ انسان ترقی کر سکے۔ جس تعلیم کی بدولت انسان اپنی قوتِ ارادی کی روانی اور اس کے اظہار کو قابو میں رکھ سکے اور مفید بن سکے صحیح تعلیم کہلاتی ہے۔ ہمارے ملک کو اس وقت ضرورت ہے لوہے کے پٹھوں اور فولاد کی نسوں کی! ایسی عظیم الشان قوتِ ارادی کی جس کے آگے کچھ بھی نہ ٹھہر سکے۔ جو کائنات کے سربستہ رازوں اور اسراروں کو کھول سکے اور جو اپنے ہر مقصد کو حاصل کر سکے خواہ اُس کا مطلب غوطہ لگا کر سمندر کی گہرائیوں میں موت کی آنکھوں سے آنکھیں ڈالنا ہی کیوں نہ ہو۔ ہر سو، ہر جگہ، ہمیں اسی انسان ساز، تعمیرِ اخلاق کرنے والی تعلیم کی ضرورت ہے۔

ایک بے مثال منتسم

www.taemeernews.com

تعلیم کا واحد طریقہ

علم حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے یکسوئی قلب. جوہرِ تعلیم کیا ہے؟ دل کی یکسوئی، من کی ایکاگرتا انتہائی بلندیوں سے ادنیٰ ترین انسان تک، سب کو علم حاصل کرنے کے لئے اسی طریقۂ تعلیم کو بروئے کار لانا ہوتا ہے. ایک کیمسٹ (کیمیاگر) جو اپنی لیبارٹری (تجربہ گاہ) میں کام کرتا ہے جب اپنے دل و دماغ کی سب طاقتیں ایک ہی نکتہ پر اکٹھی کر دیتا ہے اور اسے مختلف اجزاؤں اور عناصروں پر مرکوز کرتا ہے تو سب عناصر کا صحیح صحیح تجزیہ ہو جاتا ہے اسے ایک نیا علم حاصل ہوتا ہے جب ایک ہیئت دان اپنے دل و دماغ کی قوتوں کو ایک ہی مرکز پر جمع کرتا ہے. اور اپنی دُوربین کے ذریعہ انہیں سیاروں پر ڈالتا ہے تو یہ ستارے اور سیارے یہ سارا اجرامِ فلکی دیوانہ وار آگے بڑھ کر اپنے رازوں کو اس ہیئت دان پر افشا کر دیتا ہے. یہی کیفیت ہے کرسی پر بیٹھے ہوئے پروفیسر کی، کتاب پر جھکے ہوئے طالب علم کی اور ہر اُس انسان کی جو کچھ جاننے کے لئے کوشاں ہے۔

یہ قوت یکسوئی جتنی زیادہ ہوگی، اسی قدر زیادہ علم حاصل ہوگا. حتیٰ کہ ادنیٰ بوٹ پالش کرنے والا بھی اگر زیادہ توجہ سے کام لے تو جوتوں کو زیادہ چمکا سکے گا. یکسوئی قلب کے ساتھ باورچی کہیں بہتر کھانا پکا سکے گا. روپیہ کماتے ہوئے یا یادِ خدا اور عبادت وریاضت کرتے ہوئے غرض کہ ہر ایک کام کرتے ہوئے یکسوئی قلب جتنی زیادہ ہوگی، اتنا ہی وہ کام بہتر ہوگا. یہی وہ ایک صدا اور دستک ہے جس سے اسرار قدرت کے دروازے کھلتے ہیں، اور روشنی کا سیلاب اُمڈ آتا ہے۔

عام آدمی نوّے فی صدی قوتِ خیال ضائع کر دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ پیہم غلطیاں کرتا ہے تربیت یافتہ انسان کا دل و دماغ کبھی غلطی نہیں کرتا. انسانوں اور حیوانوں کے درمیان سب سے بڑا فرق ان کی قوتِ

www.taemeernews.com

یکسوئی میں ہے۔ جانور کی قوت یکسوئی بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ جو لوگ جانوروں کو سدھاتے ہیں اکثر وہ اس بات سے پریشان رہتے ہیں کہ جو کچھ جانوروں کو پڑھایا جاتا ہے، وہ اُسے بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ ادنیٰ ترین اور اعلیٰ ترین انسان کا مقابلہ کر دیکھیے۔ فرق یکسوئیِ قلب کی مقدار اور درجہ میں ہوتا ہے۔

کسی بھی پختہ کار کی تکمیل، کامیابی اسی (یکسوئی قلب) کی مرہونِ منت ہے۔ علوم و فنون، موسیقی اور مصوری میں جو عظیم کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں یکسوئی قلب کے طفیل حاصل ہوتی ہیں جب دل و دماغ یکسو ہو جائیں جب دل و دماغ دوسری سب باتوں سے بیگانہ اور بے تعلق سے بن جائیں، تب اندر کی سب طاقتیں ہماری غلام اور فرمانبردار ہوتی ہیں۔ آقا نہیں ہوتیں۔

یونانیوں نے یکسوئی قلب کو خارجی دنیا پر استعمال کیا اور نتیجہ نکلا کہ انہوں نے فنونِ لطیفہ، اور علم و ادب میں کمال کر دکھایا۔ ہندوؤں نے یہ یکسوئی اندرونی دنیا پر انسانی ذات کی ان دیکھی کائناتوں کے اسرار و رموز جاننے پر مرکوز کر دی، اور یوگ کی سائنس کو پروان چڑھایا۔ دنیا اپنا ہر راز ہم پر کھولنے کو تیار ہے بشرطیکہ ہم یہ جانتے ہوں کہ صدا کس طرح بلند کرنی ہے۔ دستک کس طرح دینی ہے اور دروازہ کھولنے کے لئے ضرب کس طرح لگانی ہے قوتِ ضرب یکسوئی سے ملتی ہے۔

یکسوئی کی قوت ہی علم کے خزانہ کی واحد کنجی ہے۔ اس وقت ہم بہت پریشان و حیران ہیں اور اپنی قوتوں کو سینکڑوں باتوں پر ضائع کر رہے ہیں جونہی ہم خیالات کو ایک مرکز پر لانے اور اپنے دل و دماغ کو علم کے ایک گوشے پر یکسو کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ہزاروں غیر پسندیدہ موجیں سطحِ دماغ پر اُبھرنی شروع ہو جاتی ہیں۔ دل و دماغ میں ہزاروں خیالات کا طوفان آجاتا ہے اور یکسوئی قلب درہم برہم ہو جاتی ہے۔ اسے کیسے روکا جائے، اور کس طرح دل و دماغ کو قابو میں لایا جائے؟ راج یوگ اسی سے عبارت ہے۔ ریاضت و عبادت کی مشق اور طہارت سے یکسوئی قلب حاصل ہو جاتی ہے۔

میرے نزدیک تعلیم کا جوہر محض حقائق کو جمع کرنا نہیں بلکہ یکسوئیِ قلب حاصل کرنا ہے۔ اگر مجھے ایک بار پھر سے تعلیم حاصل کرنی ہو تو میں بھول کر بھی حقائق کا مطالعہ نہیں کروں گا۔ بلکہ میں یکسوئی اور بے تعلقی کی طاقت میں اضافہ کروں گا اور بعد ازاں اس سلیم العقلی سے سب حقائق فراہم کروں گا۔

گراں بہا طاقت اور قوت اُس فرد کو نصیب ہوتی ہے جو مسلسل بارہ برس تک برہمچریہ اور پاک دامن رہے مکمل نفس کشی سے بے پناہ ذہنی اور روحانی طاقت ملتی ہے۔ با ضبط خواہش اعلیٰ ترین نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اپنی جنسی اور شہوانی قوت کو روحانی طاقت میں تبدیل کر لو جتنی مضبوط یہ طاقت ہوگی اتنا ہی زیادہ کام اس سے لیا جا سکے گا۔ بالکل ایسے جس طرح پانی کی صرف تیز و تند روانی سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ یہ پرہیزگاری

www.taemeernews.com

اور ایثار نفس کی کمی ہے جس کی وجہ سے ہمارے ملک میں ہر چیز تباہی کے دہانے تک پہنچ چکی ہے نفس کشی کرنے اور برہمچریہ رہنے سے سب علم بہت تھوڑے وقت میں حاصل کیا جا سکتا ہے اس کی بدولت کبھی نہ دھوکہ دینے والی ایسی قوتِ حافظہ حاصل ہو جاتی ہے کہ جو ایک بار سنا یا دیکھا اسے پھر کبھی نہ بھولیں۔ پارسا اور نیک دل و دماغ بے پناہ طاقت اور غضبناک قوتِ ارادی رکھتا ہے۔ پرہیزگاری اور پارسائی کے بنا کوئی روحانی پیشوائی نہیں مل سکتی۔ اس ضبط و پرہیز سے بنی نوعِ انسان کو حیران کن اختیارات مل جاتے ہیں۔ روحانی پیشوا اور مہا پرش بہت سخت پرہیزگار اور پارسا ہوا کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ انہیں اس قدر طاقت حاصل ہوتی تھی۔

ہر ایک بچے کو تربیت دی جانی چاہیے کہ وہ مکمل پرہیزگار رہے ایسا کرنے اور صرف ایسا کرنے سے ہی آسے صدق و ایمان وشواس اور شردھا نصیب ہوگی۔ من بچن کرم سے مکمل پرہیزگاری کا نام برہمچریہ ہے نفس پروری کا خیال اتنا ہی خراب اور مضر ہے جس قدر غیر پرہیزگاری۔ برہمچاری کو من بچن اور کرم سے مکمل طور پر پرہیزگار ہونا چاہیے۔ اسے اپنے دل اپنی زبان اور اپنے فعل پر قادر ہونا چاہیے۔ شردھا ایمان و اعتقاد کا نظریہ اور خیال ایک بار ہمیں پھر سے زندہ کرنا ہوگا ۔ ہمیں اس جذبہ خود اعتمادی کو پھر سے بیدار کرنا ہوگا۔ تب کہیں جا کر وہ تمام مسائل جو ملک کے در پیش ہیں حل ہو سکیں گے۔ ہمیں اس وقت ضرورت صدق و ایمان کی ہے۔ ایک انسان اور دوسرے انسان میں جو فرق و امتیاز ہے وہ شردھا کی کمی بیشی کا فرق ہے اور کچھ نہیں۔ کوئی بڑا بن گیا۔ کوئی چھوٹا بن گیا۔ یہ سب کم و بیش شردھا اور اعتقاد کی کرشمہ سازی ہے جیسے استادِ کامل گورودیو کہا کرتے تھے کہ جو اپنے آپ کو کمزور اور ناتواں کہتا ہے۔ وہ ناتواں اور کمزور بن جائے گا۔ اس سچائی میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں یہی شردھا ہمارے خون میں رچ جانی چاہیے۔ مغربی نسلوں نے جس قدر مادی ترقی کی ہے وہ صرف شردھا کا ہی نتیجہ اور ثمر ہے کیونکہ وہ اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ رکھتے ہیں - اگر آپ روح میں وشواس رکھیں تو دیکھیے کہ یہ روح کس قدر زیادہ کام کرتی ہے میں آپ سے پر زور درخواست کرتا ہوں کہ اسی نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ اس آدمی سے کوئی بھلائی اور اچھائی نہیں ہو سکتی جو دن رات یہی کہتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ اگر کوئی آدمی دن رات یہی سوچتا رہے گا کہ وہ ادنےٰ حقیر اور ہیچ ہے تو ایک دن وہ ضرور ادنےٰ بن جائے گا۔ آپ شام و سحر جو کچھ کہتے رہیں گے۔ ایک دن وہی کچھ بن جائیں گے۔ یہ بڑے گُر کی بات ہے جو آپ کو ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ ہم ایشور کی سنتان اللہ کی اولاد ہیں۔ ہم بے پناہ خدائی آگ کے شعلے ہیں۔ ہم حقیر و ناچیز کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہم سب کچھ ہیں اور سب کچھ کرنے کے درپے ہیں۔ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اپنے آپ میں یہ وشواس اور اعتقاد ہی ہمارے بزرگوں اور آبا و اجداد کے دلوں میں تھا۔ یہ وشواس اور اعتقاد ہی وہ محرک قوت بنا جس کے بل بوتے پر انہوں نے دنیا کے تہذیب و تمدن میں تہلکہ مچا دیا اگر کہیں ابتری نمودار ہوئی اگر کہیں ناکامی یا خرابی دیکھنی پڑی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے اپنے آپ میں بھروسہ کرنا ترک کر دیا تھا۔ وہ دولت خود اعتمادی

156 www.taemeernews.com

سے محروم ہو گئے۔

شردھا کا یہی اصول پڑھانا اور حقیقی جذبہ خود اعتمادی پیدا کرنا ہی میری زندگی کا نصب العین ہے۔ میں مکرر کہتا ہوں کہ یہ اعتقاد اور بھروسہ ہی بنی نوع انسان کی سب سے بڑی، بے پناہ قوت کا سرچشمہ رہا ہے۔ پہلا آپ اپنے پر بھروسہ رکھنا سیکھو۔ یہ جان لو کہ خواہ ایک شخص بلبلہ ہو اور دوسرا شخص اس کے مقابلہ میں کوہ پیکر لہر ہو، لیکن ہر لہر اور بلبلہ کے پیچھے ایک بحر بیکراں ہے۔ یہی بحر بیکراں میری پشت پناہ ہے، وہی آپ کی پشت پناہ ہے۔ جس طرح میرے لئے یہ سرچشمۂ حیات، قوت اور معرفت ہے اسی طرح آپ کے لئے ہے۔ اس لئے میرے بھائیو! اپنے بچوں کو یہی حیات بخش، عظیم خوبیاں پیدا کرنے والا، عالیشان اصول پیدائش کے ساتھ ہی پڑھانا شروع کر دو۔

سوامی وویکانند کی ماتا، بھونیشوری دیوی

www.taemeernews.com

18

سیرت و اخلاق کے لئے تعلیم

آدمی کا اخلاق اور اس کی سیرت کیا ہے؟ اس کے چند رجحانات کا مجموعہ، اس کے دل و دماغ کے میلان کا میزان جیسے جیسے خوشی اور غمی کے پرتو اس کی رُوح کے سامنے سے گذرتے چلے جاتے ہیں ویسے ویسے اس کی رُوح پر مختلف نقوش بنتے چلے جاتے ہیں۔ ان ملے جلے نقوش، اور خاکوں کے مجموعہ کو ہم انسان کا اخلاق کہتے ہیں۔ ہم وہی ہیں جو کچھ ہمیں ہمارے خیالات نے بنایا ہے۔ گویا ہر خیال ہتھوڑے کی ایک چوٹ، ضرب ہے جو ہمارے جسموں پر پڑتی ہے اور ہمیں وہی کچھ بناتی جاتی ہے جو کچھ ہم بننا چاہتے ہیں۔ الفاظ تو محض ثانوی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ خیالات زندہ رہتے ہیں اور بہت دُور تک سفر کرتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ آپ سوچتے ہیں، اس کا بہت دھیان رکھیئے اور اسے اولین اہمیت دیجئے۔

سیرت و اخلاق کی تعمیر میں رحمت بھی اتنی ہی ذمے دار ہے جتنی زحمت۔ بلکہ بعض حالتوں میں لطف و کرم کی نسبت رنج والم بہت زیادہ تعلیم دیتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے انسانوں کی زندگی کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بیشتر حالتوں میں آپ دیکھیں گے کہ یہ رنج و عذاب تھا جس نے لطف و کرم کی نسبت ان کو زندگی کو عظمتوں سے سرفراز کیا۔ یہ غربت تھی جس نے انہیں فارغ البالی سے کہیں زیادہ پڑھایا۔ اور یہ مخالفت و مزاحمت کی پیہم ضربیں اور چوٹیں تھیں جنہوں نے تعریف سے کہیں زیادہ اندرونی آگ کو بھڑکایا۔ نازو ادا کوں سے پلنے والا۔ اور پھولوں کی سیج پر سونے والا، جس نے عمر بھر ایک آنسو نہ بہایا ہو، بھلا کہیں ایسا شخص بھی بڑا انسان بنا ہے؟ جب انسان کے دل میں درد محبت جاگتا ہے جب رنج والم کی ضربیں مارنے والا طوفان چاروں طرف سے گھر آتا ہے جب محسوس ہوتا ہے کہ اب شاید کبھی روشنی کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوگی۔ جب امید و ہمت

www.taemeernews.com

19

کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ جب انساں ہیبت ناک روحانی طوفان میں محصور ہو جاتا ہے۔ تب اس وقت، اس کے اندر خانۂ دل میں روشنی پھوٹتی ہے

ذہن ایک جھیل کی طرح ہے۔ دل و دماغ میں جو جو لہریں اُٹھتی ہیں جب فرو ہوتی ہیں تو کلیتاً نہیں مرتیں بلکہ کچھ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ کچھ ایسے نقوش جو مستقبل میں نہ جانے کس وقت ادجاگر ہو جائیں۔ ہر فعل جو ہم کرتے ہیں اور ہر حرکت جو جسم کرتا ہے، ہر خیال جو ہم سوچتے ہیں۔ اسی طرح دُنیا پر ایک نقش جما تا چلا جاتا ہے۔ یہ نقوش اور تاثرات خواہ سطحی طور پر بہت نمایاں نہ ہوں، باطنی طور پر بہت پائیدار ہوتے ہیں۔ ہم کیا ہیں، انہی نقوش اور تاثرات کا میزان اور مجموعہ۔ اگر اچھے تاثرات غالب ہوں گے تو سیرت اچھی بن جائے گی اگر خراب ہوں گے تو سیرت خراب بن جائے گی۔ اگر ایک انسان پیہم بُرے الفاظ سُنتا ہے، بُرے خیالات سُنتا ہے، بُرے کام کرتا ہے تو اُس دل و دماغ پراگندہ تاثرات اور نقوش سے معمور ہو گا اور یہ تاثرات اور نقوش لازمی طور پر اُس کے اخلاق و کردار پر اثر انداز ہوں گے، خواہ وہ فرد اس امر سے آگاہ ہو یا نہ ہو حقیقت یہ ہے کہ یہ بُرے تاثرات ہمیشہ کام کرتے رہتے ہیں۔ اِن بُرے تاثرات کا کُل میزان کسی دن ایک ایسی محرک قوت بن جائے گا جس سے انسان خواہ مخواہ بُرے کام کرنے لگ جائے گا وہ اپنے ان تاثرات کے ہاتھوں میں ایک آلۂ کار بن کر رہ جائے گا

اسی طرح اگر ایک شخص اچھی باتیں سوچتا ہو، اچھے کام کرتا ہو تو ان کل تمام تاثرات کا میزان اچھا ہو گا اُسی طرح اُسے اچھے کام کرنے پر مجبور کر دے گا خواہ اُس کی مرضی ہو یا نہ ہو جب ایک فرد اس قدر اچھے کام کر لیتا ہے اور اچھے خیالات سوچ لیتا ہے تو اس کے اندر اچھے کام کرنے کا ایک ناقابلِ مزاحمت، قدرتی میلان اور رُجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اگر وہ کبھی کوئی بدی کرنا بھی چاہے تو اس کا من، اس کا دل و دماغ جو اس کے اپنے رُجحانات کا ہی مجموعہ اور میزان ہے، اسے بدی نہیں کرنے دیگا۔ وہ مکمل طور پر اچھے اور نیک رجحانات کے زیر اثر ہو گا جب ایسی حالت ہو جائے، تب انسان نیک چلن اور نیک سیرت بن جاتا ہے اگر آپ ایک آدمی کی سیرت کا پتہ لگانا چاہتے ہیں تو آپ اس کے بڑے بڑے کارہائے نمایاں پر نہ جائیے بلکہ دیکھئے کہ یہ انسان اپنے بیشتر کام کس طرح کرتا ہے۔ اس طرح آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس بڑے آدمی کی اصل سیرت کیسی ہے۔ بڑے حالات اور مواقع نے انتہائی بد طینت آدمیوں سے بڑے کام کروا دئے لیکن حقیقی معنوں میں صرف وہی شخص بڑا ہو گا جس کا اخلاق ہمیشہ ہمیشہ اچھا اور نیک رہے صرف ایسا آدمی، خواہ وہ کہیں رہے، بڑی بات کریگا۔

جب ایسے بہت سے تاثرات دِل میں رہیں تو عادت بن جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عادت، فطرتِ ثانی ہے۔ یہی انسان کی پہلی اور اصلی کیفیت ہے۔ ہم جو کچھ بھی ہیں، اس عادت کا نتیجہ ہیں اس سے ہمیں ایک

www.taemeernews.com

20

ڈھانچے سی ملتی ہے کیونکہ ہم جب چاہیں اس عمارت کو بنا بگاڑ بھی سکتے ہیں اور رد و قبول بھی کر سکتے ہیں بُری عادت کا واحد علاج اُن کے متضاد ــــ اچھی عادتیں ہیں. اچھے کام کرتے جاؤ۔ اچھی باتیں سوچتے چلو، مُسلسل اور پیہم۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ تاثرات کو ختم کیا جا سکتا ہے کبھی کسی آدمی کو نکما نامراد اور ناامید نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ صرف ایک سیرت و کردار کی نمائندگی کرتا ہے. وہ چند عادتوں کا مجموعہ ہے جنہیں نئی اور بہتر عادتوں سے روکا اور بدلا جا سکتا ہے کردار اور سیرت پیہم اور تمام تر عادتوں کا ہی نام ہے اور صرف متواتر اور پیہم عادتیں ایک کردار اور سیرت کی اصلاح کر سکتی ہیں۔

ہر واقعہ بدی اور بُرائی کی وجہ ہم خود ہوتے ہیں، اس کے لئے کسی غیر قدرتی اور بالا تر قوت پر الزام نہ لگائیے۔ نہ ہی ناامید اور مایوس ہوئیے۔ اور نہ ہی کبھی یہ سوچئیے کہ ہم ایک ایسی پستی میں آگرے ہیں جس سے ہم اُس وقت تک نہیں نکل سکتے۔ جب تک کوئی آکر ہماری امداد نہ کرے۔

ہم ریشم کے کیڑوں کی مانند ہیں۔ ہم اپنے ہی آپ خیالات کا ایک جال بُن کر اپنے آپ کو اس میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ کڑیوں کا بندھن ہم نے اسی طرح اپنے اردگرد ڈال لیا ہے لیکن ہم جہالت اور ناسمجھی کی وجہ سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم گرفتار اور بندھے ہوتے ہیں، اسی لئے ہم مدد کے لئے روتے اور آہ و زاری کرتے ہیں۔ لیکن مدد کہیں باہر سے نہیں آئے گی. یہ جب آئے گی، ہمارے اندر سے ہی آئے گی۔ دُنیا بھر کے خداؤں اور دیوتاؤں کو پُکار دیکھو۔ میں نے برسوں پُکارا اور بالآخر میں نے محسوس کیا کہ میری مدد کی گئی ہے لیکن جب آئی یہ مدد اندر سے آئی۔ اور میں نے غلطی سے جو کچھ پہلے کیا تھا، اس کی تلافی کرنی پڑی مجھے وہ جال، اور بندھن تار تار کرنے پڑے جو میں نے اپنے اردگرد بُن لئے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی غلطیاں کیں لیکن آپ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ان غلطیوں کے بغیر میں کچھ نہیں بن سکتا تھا جو میں آج ہوں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ گھر میں جا کر دیدہ و دانستہ طور پر غلطیاں شروع کر دیں، میرا مطلب ہرگز یہ نہیں میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ محض اس لئے افسردہ خاطر اور دلگیر نہ ہو جاؤ کہ تم سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں پشیمان ہونے کی کیا بات ہے؟ اُن کی اصلاح کیجئے۔

ہم غلطیاں اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کمزور اور ناسمجھ ہوتے ہیں لیکن ہمیں نادان کون بناتا ہے؟ ہم خود! ہم اپنے ہاتھ آنکھوں پر پردے ڈال لیتے ہیں اور یہ کہہ کر آہ و زاری شروع کر دیتے ہیں کہ ہم اندھیرے میں مر گئے۔ اپنے ہاتھ پرے ہٹا دو، روشنی ہو جائے گی۔ یہ روشنی اور جیوتی تو ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتی ہے کیونکہ انسان کی رُوح اور اس کی آتما سبھاؤ سے ہی جیوتر مئے اور منوّر ہے کیا آپ نے نہیں سنا کہ عصرِ جدید کے سائنس دان کیا کہتے ہیں؟ وجہ ارتقا کیا ہے؟ خواہش۔ جانور، حیوان ایک کام کرنا چاہتا ہے لیکن نہیں

www.taemeernews.com

21

رہا کیونکہ سازگار ماحول نہیں پاتا۔ اس لئے وہ ایک نئے جسم کو اپنا لیتا ہے۔ نیا جسم کون دیتا ہے؟ یہ جانور خود، اس کی قوتِ ارادی قائم بھی نہیں قوتِ ارادی سے کام لیجئے تو یہ آپ کو اونچا لے جائے گی۔ یہ قوت ارادی ہی سروشکتی مان، قادرِ مطلق ہے۔ آپ کہیں گے کہ اگر یہ قادرِ مطلق اور سروشکتی مان ہی ہے تو پھر میں سب کچھ کیوں نہیں کر لیتا! لیکن آپ صرف اپنی محدود سی ذات کے متعلق سوچ رہے ہیں! اپنی اس حالت پر غور کریں جب آپ محض انسانی وجود کے پرمیا جیسے ایک کیڑے تھے پھر کس نے یہ سب کچھ بنا دیا۔ یہ کائنات کہاں سے بن گئی۔ جس نے آپ کو اس قدر لمبے قامت بنا دیا؟ وہ آپ کو اور بھی اوپر لے جائے گی جس چیز کی آپ کو ضرورت ہے وہ ہے آپ اپنی سیرت، کردار اور قوتِ ارادی کو مضبوط و مستحکم بنائے۔

اگر آپ گھبرا کر کفارہ، توبہ اور پراسچت کے لئے ٹاٹ کا جامہ پہن کر راکھ اور بھسم جسم پر رما کر اس لئے رونا دھونا شروع کر دیتے ہیں کہ آپ سے بعض غلط کاریاں سرزد ہو گئی ہیں تو اس سے آپ کا کچھ نہیں بنے گا۔ بلکہ اس سے آپ اور بھی کمزور ہو جائیں گے۔ اگر یہ کمرہ ہزاروں برسوں سے تاریک ہے اور آپ اس کمرے میں آ کر اس کی تاریکی کا ماتم کرنا شروع کر دیتے ہیں تو کیا اس گریہ زاری سے تاریکی مٹ جائے گی؟ نہیں! اندھیرا مٹانا چاہتے ہو تو دیا سلائی جلاؤ۔ جھٹ سے روشنی ہو جائے گی۔ زندگی بھر یہ گریہ زاری کرتے رہو کچھ نہیں بنے گا افسوس! صد افسوس! میں نے بدی کر دی۔ میں نے من مانی غلطیاں کی ہیں۔ ایسا سوچنے سے کیا بنے گا؟ روشنی جلاؤ اور دیکھو؟ ایک دم اُجالا ہو جائے گا۔ اپنی سیرت بناؤ۔ اپنا اخلاق تعمیر کرو اور اپنی اصل کیفیت کو آشکار کرو۔ اور دیکھو کہ آپ کی اصل کیفیت کیا ہے جگمگاتی روشنی، نورِ ازلی روحِ پاک، ابدی طہارت جسے بھی دیکھو ایسا ہی سمجھو اسی جگمگاتی روشنی، نورِ ازل روحِ پاک اور ابدی طہارت کو ہی دیکھو اور اسے ہی پکارو۔

---

www.taemeernews.com

22

تعمیرِ شخصیت

آپ دیکھ رہے ہو کہ ہمارے اردگرد کیا کچھ ہو رہا ہے۔ یہ دنیا دراصل ایک تاثر ہے ہماری قوت کا کچھ حصّہ تو اپنے جسموں کو برقرار رکھنے کی نذر ہو جاتا ہے۔ جو باقی بچتا ہے، اس قوت کا ہر حصّہ شام وسحر دوسروں کو متاثر کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ ہمارے جسم، ہماری خوبیاں، ہماری فہم وفراست، عقل ودانش اور روحانیت ہماری یہ سب چیزیں دوسروں کو متاثر کرنے پر ہی صرف ہو رہی ہیں اور اسی طرح ہم اُلٹا دوسروں سے بھی متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے اردگرد یہی کچھ ہو رہا ہے آیئے ایک ٹھوس مثال لے لیں۔ ایک آدمی آپ کے سامنے آیا ہے، آپ جانتے ہیں کہ وہ بہت دانا اور بینا، عالم اور فاضل ہے۔ اس کی زبان بہت شگفتہ ہے چاہے تو گھنٹوں بول سکتا ہے لیکن وہ آپ کے دِل ودماغ پر کوئی خاص اثر پیدا نہیں کر پاتا۔ تب ایک دوسرا انسان آتا ہے وہ بہت کم بولتا ہے اور اس کے الفاظ ٹوٹے پھوٹے اور بے قرینہ اور شاید صرف ونحو کے اعتبار سے غلط بھی ہوتے ہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ آپ کے دل ودماغ پر بہت گہرا اثر پیدا کرتا ہے۔ آپ میں سے اکثر نے ایسا دیکھا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ صرف الفاظ ہی تاثر پیدا نہیں کرتے۔ الفاظ اور خیالات صرف ایک تہائی تاثر پیدا کر سکتے ہیں۔ دو تہائی تاثر تو انسان پیدا کرتا ہے۔ وہ انسان جسے آپ شخصی مقناطیسیت اور شخصی کشش کہتے ہیں، وہ آگے بڑھ کر آپ کے دل ودماغ پر تاثر پیدا کر دیتی ہے۔

مشاہیرِ عالم کو لے لیجئے۔ ہم ہمیشہ دیکھتے چلے آتے ہیں کہ یہ ان انسانوں کی جادوئی شخصیت تھی جس کا بول بالا ہوا۔ عہدِ ماضی کے تمام عظیم مصنفوں کو اور عظیم مفکروں کو لے لیجئے حق یہ ہے کہ انہوں نے کس قدر حقیقی اور [illegible] خیالات سوچے؟ اسی طرح عہدِ سلف کے تمام بڑے بڑے لیڈروں نے ہمارے لئے جو کتابیں

www.taemeernews.com

لکھیں، انہیں دیکھ لیجئے۔ ان کی ایک ایک کتاب کو لے لیجئے، اور ان کا وزن کر دیکھیں۔ وہ حقیقی اور اصلی خیالات جو اس دنیا میں اب تک سوچے گئے ہیں محدود سے چند، ہیں۔ ان کے وہ خیالات پڑھ لیجئے جو انہوں نے کتابوں میں لکھے ہیں۔ ان کے مصنفین ہماری نگاہوں میں غیر معمولی طور پر عظیم نظر نہیں آتے لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اپنے عہد میں لاجواب انسان تھے کس بات نے انہیں عظیم المرتبہ بنایا؟ محض ان خیالوں نے نہیں جو انہوں نے سوچے۔ نہ ہی ان تقریروں نے، جو انہوں نے کیں۔ نہ ہی ان کتابوں نے جو انہوں نے لکھیں۔ وہ کوئی اور چیز تھی جس نے انہیں غیر معمولی طور پر عظیم بنایا، وہ چیز اب نابود ہو چکی ہے وہ تھی ان کی شخصیت جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں انسان کی شخصیت دو تہائی ہوتی ہے اور اس کے الفاظ اور اس کی عقل و دانش صرف ایک تہائی ہوتی ہے۔ یہ انسان کی اصل حقیقت، انسان کی اصل شخصیت ہوتی ہے جو ہم پر اثر پیدا کرتی ہے۔ ہمارے افعال کیا ہیں، محض تاثرات جب انسان زندہ ہو تو افعال لازمی طور پر سرزد ہوں گے کیونکہ علت سے فعل ہونا لازم و ملزوم ہے۔ ساری تعلیم، ساری تربیت کا نصب العین، آدرش، انسان سازی ہونا چاہیئے لیکن اس کی بجائے ہم ہمیشہ باہر کو چمکانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اگر اندر ہی کچھ نہیں تو باہر کو چمکانے سے کیا حاصل ہوگا؟ ساری تربیت کا مقصد اور انجام یہ ہے کہ انسان ترقی کرے، پھلے پھولے، ایک ایسا انسان بنے جو دوسروں کو متاثر کر سکے، جو دوسروں پہ اپنا جادو ڈال سکے۔ ایسا انسان ایک بجلی گھر ہوتا ہے جو دوسروں کو متاثر کرتا رہتا ہے۔ جب انسان اس طرح بن جاتا ہے تو وہ جو چاہے کر سکتا ہے ایسی شخصیت جس شے پر پڑے گی، وہ یہ شے حرکت کرنے لگ جائے گی۔

اگرچہ مندرجہ بالا بات ایک مسلّم حقیقت ہے لیکن کوئی بھی فطری قاعدہ قانون، جو ہم دیکھتے ہیں، اس کی وضاحت اور تشریح نہیں کر سکتا ہے۔ ہم اس حقیقت کو کیمیائی اور جسمانی علم کے ذریعے کیسے بیان کر سکتے ہیں؟ کتنی اوکسیجن (oxygen) کتنی ہائیڈروجن (hydrogen) کتنی کاربن، carbon کتنے ذروں، کتنے مساموں سے یہ شخصیت بن گیا اس طرح کہیں ہم کسی شخصیت کی تعریف کر سکتے ہیں؟ لیکن اس کے باوجود ہم شخصیت کو دیکھتے ہیں، یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے اور صرف یہی نہیں، یہی شخصیت حقیقی انسان ہوتی ہے اور یہی حقیقی انسان زندہ رہتا ہے، حرکت کرتا ہے۔ کام کرتا ہے، دوسروں کو متاثر کرتا ہے اپنے ساتھیوں کو حرکت دیتا ہے اور پھر مرجاتا ہے۔ اس کی علم و دانش بھری باتیں اور کتابیں کیا ہیں؟ ایسے چند نقوش جنہیں وہ باقی چھوڑ جاتا ہے اس حقیقت پر غور کرو۔ مذہب کے بڑے بڑے رہبروں اور رہنماؤں کا مقابلہ بڑے بڑے فلاسفروں سے کرو۔ فلاسفروں نے شاید ہی کسی کے اندر کے، اصل انسان کو متاثر کیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے کمال کی کتابیں لکھ ڈالیں۔ دوسری طرف مذہبی رہنما ہیں، جنہوں نے اپنی زندگی میں ملکوں اور مملکتوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ فرق و امتیاز شخصیت نے پیدا کیا۔ فلاسفروں میں وہ شخصیت ذرا سی ہوتی ہے

www.taemeernews.com

جو متاثر کرتی ہے پیغمبروں میں یہ شخصیت بے پناہ ہوتی ہے۔ فلاسفروں میں ہم صرف عقل و دانش کو دیکھتے ہیں لیکن مؤخر الذکر (مذہبی پیغمبروں) میں ہم حقیقی زندگی کو چھوتے ہیں۔ ایک حالت میں یہ ایک کیمیائی تجربہ سا ہوتا ہے جیسے چند کیمیائی اشیا کو اکٹھا کر ملا دیا جائے آہستہ آہستہ محض سازگار حالات میں، شاید روشنی کی ایک شعاع پیدا ہو جائے یا ممکن ہے کہ تجربہ ہی ناکام رہ جائے۔ لیکن دوسری طرف یہ ایک ٹارچ اور بیٹری ہوتی ہے جس سے جھٹ دوسروں کو روشنی ملنے لگ جاتی ہے۔ یوگ ودیا دعوے کرتی ہے کہ اس نے ایسے قاعدے، قانون دریافت کیے ہیں جن سے شخصیت بنائی جا سکتی ہے اور ان قوانین و ضوابط پر پوری توجہ دیکر ہر ایک شخص اپنی شخصیت کی نشو و نما کر سکتا ہے، اسکو مضبوط و توانا بنا سکتا ہے۔ یہ نہایت اہم عملی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت ہے اور یہی تمام تعلیم کا ماحصل ہے یہ کل عالم پر حاوی ہونے والی حقیقت ہے۔ گرہستی کی زندگی میں۔ امیر اور فقیر کی زندگی میں، شاہ و گدا کی زندگی میں کسی کی زندگی میں سب سے اہم بات یہی ہے کہ شخصیت کو مضبوط و توانا بنایا جائے۔ جیسا کہ ہمیں پتہ ہے، ایسے قوانین، اچھے قوانین ہیں جو مادی قوانین کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں۔ لیکن، مادی، ذہنی اور روحانی دنیاؤں میں، پراکرتک مانک اور ادھیاتمک جگت میں ایسی حقیقتیں نہیں ہوتیں۔ یہاں تو روح کے اوپر پڑے ہوئے غلافوں کو اتارنا اور روح کو لطیف تر بنانا ہے۔ جہاں کہیں اس پر زیادہ موٹا پردہ ہو گا وہاں ان پردوں کو تحلیل کرنے یا اتارنے کی زیادہ ضرورت ہو گی۔ ستھول کو سوکھشم بنانا ہے۔ لطیف ترین، سب سے زیادہ سوکھشم روح ہے۔ سب سے زیادہ کثیف اور ستھول جسم ہے یہی نہیں جو کچھ اس براہمنڈ میں ہے وہی پنڈ میں ہے یہی کیفیت کل کائنات کی ہے سنسار کی ہے۔ اسے اتنا لطیف بنانا ہو گا کہ یہ ایشور بن جائے۔

ہم جانتے ہیں کہ عظیم ترین طاقت لطیف شے میں ہے کثیف میں نہیں آپ نے کسی آدمی کو بھاری بوجھ اٹھاتے دیکھا ہو گا۔ اس کا سارا جسم مشقت کرتا ہے لیکن یہ اس کے پٹھے ہوتے ہیں جو بہت مضبوط ہوتے ہیں، وہ بوجھ اٹھاتے ہیں یہ لیکن دھاگے کی طرح پتلی نسیں اور رگیں ہوتی ہیں جو طاقت کو پٹھوں تک لے جاتی ہیں۔ ان چھوٹی سی باریک سی نسوں اور رگوں میں سے کسی ایک کو کاٹ دیں۔ یہ پٹھے کام نہیں کرینگے۔ جس طرح پٹھوں کو طاقت رگیں اور نسیں پہنچاتی ہیں، اسی طرح نسوں اور رگوں کو طاقت اور بھی لطیف مخزن یعنی خیالات سے ملتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ لطیف شے ہی طاقت کا خزانہ اور سرچشمہ ہے۔ حالانکہ حرکت ہم کثیف سی ہی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جب لطیف حرکتیں ہوتی ہیں۔ ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ کوئی جسیم چیز حرکت کرے۔ ہم دیکھنے لگ جاتے ہیں اور اس طرح ہم حرکت کی نسبت کثیف چیزوں سے کر دیتے ہیں۔ لطیف چیزوں کی حرکات کو تو ہم دیکھ ہی نہیں سکتے، شاید اس لئے کہ یہ حرکات اس قدر شدید ہوتی ہیں کہ ہماری آنکھ ان کا مشاہدہ کر ہی نہیں سکتی لیکن اگر کہیں سائنس یا کسی تجربہ اور نئی کھوج

www.taemeernews.com

کی بدولت ہم ان لطیف قوتوں کو دیکھنے لگ جائیں جو گویائی کا سرچشمہ ہیں تو ہماری قوت گویائی ان کی تعریف کرنے میں بے بس اور بے زبان ہو کر رہ جائے گی جھیل کی پہنائیوں سے اٹھ رہے چھوٹے سے بلبلہ کو ہم اس وقت تک نہیں دیکھ سکتے جب تک یہ سطح آب پر پہنچ کر پھٹ نہیں جاتا یہی کیفیت خیالات کی ہے۔ ہم ان کی طاقت کا اس وقت تک کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اور نہ خیالوں کی قوت کو محسوس کر سکتے ہیں تاوقتیکہ وہ کافی حد تک پنپ نہ جائیں یا وہ اعمال و افعال کی صورت اختیار نہ کریں۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ یہی شکوہ شکایت کرتے ہیں کہ نہ ہمیں اپنے اعمال و افعال پر قابو ہے نہ اپنے خیالات اور افکار پر۔ ہو بھی کیسے؟ ان پر قابو تبھی پایا جا سکتا ہے اگر ہم لطیف حرکات پر قابو پا سکیں۔ اگر ہم خیال کو اس سے پہلے کہ وہ عمل کی صورت اختیار کرے، اسے پکڑ سکیں تب ہم سب کچھ قابو میں کر سکتے ہیں۔ اگر ہمیں کوئی ایسا طریقہ آتا ہو جس سے ہم لطیف قوتوں اور لطیف حرکات کی تحقیقات کر سکیں۔ ان کی جانچ پڑتال کر سکیں۔ اور ان قوتوں کو مطیع کر سکیں صرف اسی صورت میں ہم اپنے آپ پر قابو پا سکتے ہیں۔ ایک انسان جس نے اپنے من پر قابو پا لیا ہو یقینی طور پر دوسرے دلوں پر قابو پا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کا نشان ہمیشہ ایثار نفسی اور نفس کشی نیکوکاری اور حسن عمل رہا ہے۔ کیونکہ ایک صاف، نیکوکار، پارسا انسان اپنے اوپر قابو رکھ سکتا ہے۔ اور تمام دل ایک سے ہیں۔ ایک بڑی آتما پرآتما کے حصے ہیں۔ جس کسی نے مٹی کے بنے ہوئے ایک ڈلے کی حقیقت کو جان لیا اس نے گویا دنیا بھر کی مٹی کو پہچان لیا۔ وہ جو اپنے من کو جانتا ہے اور اسے قابو میں رکھتا ہے دوسرے دلوں پر قابو پانے کا راز بھی جانتا ہے۔ اور ہر ایک دل کے اوپر طاقت و قدرت رکھتا ہے۔

ہر انسان اپنے بچپن میں ایسے مراحل سے گذرتا ہے جن مرحلوں سے اس کی ساری نسل گذری ہے نسل نے ان مرحلوں میں سے گذرنے پر ہزاروں لاکھوں برس لگا دیئے جبکہ بچے نے انہیں چند برسوں میں ہی طے کر لیا بچہ ایک قدیم بے رحم جنگلی جیسا ہوتا ہے جو تیتلیوں کو اپنے پاؤں تلے مسل دیتا ہے کیونکہ وہ شروع میں اپنی نسل کے قدیم ترین آبا و اجداد کی طرح بیباک ہوتا ہے آہستہ آہستہ وہ بڑھتا ہے پھلتا پھولتا ہے، مختلف مراحل میں سے گذرتا چلا جاتا۔ حتٰے کہ وہ اپنی نسل کے نکتہ عروج تک پہنچ جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ وہ ان مراحل کو بہت عجلت و سرعت کے ساتھ طے کر لیتا ہے۔ ساری انسانی نسل کو لے لیں یا پھر انسانوں، حیوانوں، کیڑے مکوڑوں، سب پر مشتمل دنیا کو لے لیں۔ کل کائنات جس طرف جا رہی ہے، اس کا ایک نکتہ انجام ہے۔ جسے نکتہ کاملیت کہا جاتا ہے محض ایسے مرد اور ایسی عورتیں پیدا ہوتی ہیں جو بنی نوع انسان کی ساری ترقی کی پیش دستی کر لیتی ہیں۔ انتظار کرنے اور مدتوں اس وقت تک جب ساری انسانی نسل درجہ کمال تک نہ پہنچ جائے، بار بار جنم لینے کی بجائے، اپنی زندگی کے چند مختصر سے برسوں میں ہی وہ تیزی کے ساتھ ان تمام مرحلوں میں سے گذر جاتے ہیں۔ ایسا ہم نے

www.taemeernews.com

اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اگر ہم میں حق دو دینؐ تو ان ترقیوں کو جلدی حاصل کرسکتے ہیں۔ اگر چند انسانوں کو جو کسی تہذیب سے بہرہ ور نہ ہوں، ایک دور افتادہ جزیرہ پر زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے اور انہیں قرت روٹی، کپڑا اور سر چھپانے کو جگہ دیدی جائے، تو وہ رفتہ رفتہ انسانیت اور تمدن کی اعلا سے اعلا منزلوں کو حاصل کرنے میں جُٹ جائیں گے۔ ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس ترقی اور نشوونما کو مزید سامان ولوازمات سے تیز تر کیا جاسکتا ہے۔ ہم درختوں کو جلدی نشوونما کرنے میں سامان مہیا کرتے ہیں یا نہیں؟ نظامِ قدرت پر چھوڑ دینے سے بھی یہ ترقی کرلیتے، لیکن اس طرح انہیں بہت لمبا عرصہ لگتا۔ لیکن ہم ان کی مدد کرتے ہیں تاکہ وہ عام وقت سے پہلے، جلدی نشوونما پائیں۔ ہم ہر وقت یہی کام کرتے رہتے ہیں یعنی مصنوعی محرکات اور لوازمات سے دوسروں کی نشوونما تیز تر کرتے رہتے ہیں۔ ہم چاہیں تو یہ کام بطور نسل بھی کرسکتے ہیں دوسرے ملکوں میں استادوں کو کیوں بھیجا جاتا ہے؟ تاکہ ہم اس طریقہ سے ان نسلوں کی ترقی و نشوونما کو تیز تر کرسکیں۔ کیا ہم اس طرح افراد کی نشوونما کو بڑھاوا نہیں دے سکتے؟ بلاشبہ ہم دے سکتے ہیں کیا اس سریع رفتاری اور ترقی کی کوئی حد و قید مقرر کی جاسکتی ہے؟ نہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ایک انسان اپنی زندگی میں کس قدر ترقی حاصل کرسکے گا کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ اتنے عرصہ میں فلاں انسان اتنا کچھ ہی سیکھ سکے گا اور اس سے آگے ترقی نہیں کر پائے گا؟ ساز گار و موافق حالات کی مدد سے یہ انسان حیرت انگیز ترقی کرسکتا ہے۔ کیا درجۂ کمال تک پہنچنے تک کوئی حد و قید لگائی جاسکتی ہے؟ اس سے کیا نتیجہ حاصل ہوگا؟ ایک مردِ کامل، جو اس نسل میں مدتوں کے بعد، شاید کروڑوں برسوں کے بعد پیدا ہوتا تھا، ایسا مردِ کامل آج بھی پیدا ہوسکتا ہے۔

تمام بڑے بڑے اوتار، اولیا اور پیغمبر ایسے ہی کامل انسان تھے، اُنھوں نے درجۂ کمال ایک ہی زندگی میں حاصل کرلیا۔ دنیا کی تاریخ کے ہر دور میں، ہر ملک میں، ہر نسل میں ایسے کامل اِنسان آتے رہے ہیں حال ہی میں ایک ایسا ہی مردِ کامل زندہ تھا جس نے ساری نسلِ انسانی کی زندگی پر عبور پالیا اور اپنی اسی زندگی میں معراجِ حیات — درجۂ کمال کو — حاصل کرلیا تھا۔

قاعدے قانون لیکن نشوونما کو تیز تر کرنے کا عمل بھی تو محض قواعد و ضوابط کے ماتحت ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ہم اس قاعدے قانون کی کھوج کرتے ہیں اور ان رازوں کو جان لیتے ہیں اور ان کا اطلاق اپنی ضرورتوں پر کرتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم ترقی کر جائیں گے۔ ہماری نشوونما سُرعت پذیر ہوگی۔ ہماری ترقی تیز تر ہوجائے گی اور ہم اسی زندگی میں کامل انسان بن جائیں گے۔ یہ ہماری زندگی اور دلوں کی ترقی کے علم کا اعلےٰ ترین مقصد ہے۔ اس علم کا مقصد یہی ہے کہ دل کی قوتوں کا مطالعہ کیا جائے اور ان میں کمال پیدا کیا جائے۔

www.taemeernews.com

27

اس سائنس اور اس علم کا فائدہ تو اسی بات میں مضمر ہے کہ ایک مرد کامل پیدا کیا جائے، اور اُسے نہ مدتوں تک انتظار کرنا پڑے اور نہ ہی مادی دنیا کے ہاتھوں میں آلۂ کار بنکر ٹھوکریں کھانا پڑے یا اس بحر بیکراں میں لکڑی کے ایک تختہ کی طرح غضبناک موجوں کے تھپیڑے سہنے پڑیں۔ سائنس مطالبہ کرتی ہے اور علم یہ تقاضا کرتا ہے کہ آپ مضبوط بنیں۔ اپنے کام کو خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیں اور اسے کسی دوسرے کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیں اور نہ ہی اس کی تکمیل کسی دوسری زندگی کے لئے اٹھا رکھیں۔

www.taemeernews.com

اُستاد اور شاگرد

تعلیم کے متعلق میرا نظریہ ہے گورو گریہہ واس"۔ اُستاد اور مدرس کی ذاتی زندگی کے بغیر کوئی تعلیم ممکن نہیں ہو سکتی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان بچپن سے ہی ایک ایسے نیک نام اور باسیرت انسان کے ساتھ رہے جس کی فطرت اور جس کا کردار شعلہ زن، بھڑکتی ہوئی آگ کی مانند ہو۔ انسان کے سامنے اعلیٰ ترین تعلیم و تربیت کی جیتی جاگتی تصویر رہنی چاہیے۔ ہمارے ملک میں تعلیم و تدریس کا کام شروع سے ہی نفس کش اور تارک الدنیا انسانوں کے سپرد تھا۔ ضرورت ہے کہ تعلیم و تربیت دینے کا کام ایک بار پھر تیاگیوں کے کندھوں پر ڈال دیا جائے۔

ہندوستان میں قدیم طریقۂ تعلیم جدید طریقہ سے بالکل مختلف تھا۔ اس وقت طلبا کو کچھ دینا نہیں پڑتا تھا۔ نظریہ یہ تھا کہ علم و حکمت اس قدر مقدس ہے کہ کسی انسان کو اسے بیچنا نہیں چاہیے۔ علم و حکمت کی دولت مفت، اور بے قیمت دی جانی چاہیئے۔ اُستاد یا گورو شاگردوں کو مفت پڑھایا کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اپنے شاگردوں کو روٹی کپڑا بھی مہیا کیا کرتے تھے۔ اُستادوں کی خاطر امیر لوگ بنے نذرانے اور بھینٹ وغیرہ دیا کرتے تھے اور اس کے عوض یہ ان کے بچوں کو رکھا کرتے تھے۔ عہد قدیم کا شاگرد گورو کے حجرہ اس کے آشرم کی سیوا کیا کرتا، اپنے ہاتھوں سے ایندھن وغیرہ اُٹھا کرتا یا مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا۔ گورو شاگرد اور چیلے کی استعداد اور صلاحیتوں کو دیکھ کر اسے ویدوں کی تعلیم دیتا، اسکی کمر سے ساتھ تین رشتوں کی مُنج (ایک قسم کی گھاس) کی ڈوری اس بات کی نشاندہی کے لیے باندھ دیتا تھا کہ شاگرد اپنے مَن، بچن اور کرم سے پاک و صاف رہے گا۔

168 www.taemeernews.com

شاگرد اور اُستاد، دونوں کو بعض شرائط پوری کرنا لازمی ہے۔ شاگرد کے لئے لازم ہے کہ وہ نیک نفس اور پاک دامن ہو، تحصیلِ علم کی سچی جستجو رکھتا ہو اور ثابت قدم ہو۔ مَن بچن اور کرم سے اس کی نفس کشی انتہائی ضروری ہے۔ جہاں تک علم و حکمت حاصل کرنے کی سچی جستجو رکھنے کی بات ہے یہ ایک ازلی دستورِ حیات ہے کہ ہمیں وہی کچھ ملتا ہے جس کی ہمیں تلاش ہوتی ہے ہم جس شئے کو دل کی آرزوؤں کا مسکن بنا دیتے ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ حاصل ہی نہیں کرتے۔ جب تک اعلیٰ درجہ کی خواہش پیدا نہیں ہوتی۔ اور ہمیں فتح و کامرانی نہیں مل جاتی، اس وقت مسلسل جد و جہد کرنے، پیہم کشمکش جاری رکھنے اور اپنی ادنیٰ فطرت کے خلاف بر سرِ پیکار رہنے کی اشد ضرورت ہے۔ وہ طالب علم جو اس ثابت قدمی سے تحصیلِ علم میں جُٹ جاتا ہے۔ بالآخر کامیابی اور کامرانی حاصل کر لیتا ہے۔

جہاں تک مدرس اور اُستاد کا تعلق ہے ہمیں اس بات کا اطمینان کر لینا چاہئے کہ وہ مقدس کتابوں کی رُوحِ تحریر سے بہرہ ور ہے۔ یوں تو ساری دُنیا بائیبل، وید اور قرآن پڑھتی ہے لیکن وہ صرف الفاظ، اُن کی نحوی ترکیب، علم زبان، اور فلسفہ کو پڑھتی ہے۔ حالانکہ یہ سب چیزیں روحِ تحریر نہیں، بلکہ مذہب کی خشک، سُوکھی ہوئی ہڈیاں ہیں۔ وہ اُستاد جو لفظوں پر بہت زیادہ زور دیتا ہے اور دل کو قوت الفاظ کے تیز و تند روانی میں بہا دیتا ہے، روحِ تحریر سے کورا اور خالی رہ جاتا ہے۔ صرف مذہبی کتابوں کی رُوحِ تحریر کا علم ہی کسی کو سچا اُستاد بناتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہمیں اُستاد کے کردار اور شخصیت کو جاننے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ایک غلط سی بات ہے ایسا جاننا اشد ضروری ہے کیونکہ جس کی بدولت انسان اپنا آپ جان سکتا ہے یا دوسروں کو سچائی اور پاکیزگی کی خدائی دولت دے سکتا ہے۔ وہ شئے ہے دل و دماغ، رُوح و قلب کی پاکیزگی اور نفس کُشی اس لیے اُستاد کو لازمی طور پر نیک نفس اور پاک دامن ہونا چاہیئے۔ اس کے الفاظ میں ایثار نفسی سے ہی عظمت قیمت۔ وقعت اور تاثیر پیدا ہو گی۔ اُستاد کا کام محض شاگرد کی موجودہ دماغی یا دوسری صلاحیتوں کو تیز تر کرنا ہی نہیں ہوتا، بلکہ اپنے پلّے سے کچھ دینا بھی ہوتا ہے۔ اُستاد کو اپنے اثرات سے طالب علم کو ایک حقیقی اور قابل قدر علم و دانش سے سرفراز کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اُستاد کو پرہیزگار، نفس کُش اور نیک باطن ہونا چاہیئے۔

تیسری شرط نیت اور مقصدِ تعلیم کے متعلق ہے۔ اُستاد کو کسی در پردہ یا خود غرضانہ مقصد کے لئے یا دولت، شہرت اور عزّت کی خاطر تعلیم و تدریس نہیں کرنی چاہیئے۔ اس کا ہر کام خلوص و محبت بنی نوع انسان کی بے لوث محبت کے سرچشمہ سے موجزن ہونا چاہیئے۔ وہ واحد طریقہ جس کے ذریعہ

رُوحانی قوت دوسرے کے قلب و جگر میں منتقل کی جاسکتی ہے عشق و محبت ہے، ظاہر ہے کہ شہرت و عزت کا خود غرضانہ جذبہ اس محبت کو جڑ سے ہی قلم کر کے رکھ دے گا۔

شاگرد بننا آسان نہیں۔ ایسے طالب علم اور شاگرد کے لئے جو متلاشیٔ حق ہو اوّلین شرط یہ ہے کہ وہ شہرت و دولت کی تمام آرزوؤں کو اپنے دل سے نکال باہر کرے۔ کیونکہ جب تک ہمارے دلوں میں کوئی نہ کوئی خواہشیں موجزن رہتی ہے، تب تک ہم حقیقت اور سچائی کا جالیاتی رُخ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ جب تک دل کے کسی نہ کسی گوشے میں دُنیا کی ایک یا دوسری تمنا چٹکیاں لیتی رہتی ہے، تب تک سچائی نہیں ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ غریبوں کی نسبت امیر سچائی کو بہت کم سمجھ پاتے ہیں۔ امیر کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ اپنی دولت و امارت، شان و شوکت، طاقت و حکومت نفس پرستی اور سامان عیش کے سوا کچھ اور سوچے۔ بیں اس پر کبھی اعتبار نہیں کرتا جس کی آنکھیں کبھی نمناک نہ ہوئی ہوں۔ کیونکہ ایسا شخص اپنے سینہ میں دل نہیں، پتھر کی بے حس سِل رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سچی خوشیاں اور حقیقی مسرّت سے ہمکنار ہونے کے لئے، انسان کو ان دُنیاوی خواہشوں کو خیرباد کہنا ہو گا۔ اور سچائی کی اور صرف سچائی کی جستجو کرنی چاہیئے۔ بے غرضی ہی زیادہ ثمرآور سود مند ہے، صرف انسان ہی اس کو مشغلِ عمل بنانے کا حوصلہ و صبر نہیں رکھتے صحت کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو زیادہ مفید ہے۔ محبت، سچائی اور بے غرضی صرف کہنے ہی کی اخلاقی باتیں نہیں بلکہ فی الحقیقت وہ انتہائی بلند نصب العین اور آدرش ہے کیونکہ یہ تمام قوتوں کی مخزن اور خزانہ ہیں۔ اندھا دُھند جو کچھ مَن میں آئے کرگزرنے کی بجائے برداشت اور ایثارِ نفس کہیں زیادہ طاقت ور ہے خود غرضی کے اندر نفس پرستی کے لئے خرچ کی گئی ہر قوت رائیگاں چلی جاتی ہے۔ برباد ہو جاتی ہے۔ اس کی بدولت قوت آپ کو واپس نہیں مل سکتی لیکن اگر اُسے ضبط میں رکھا جائے تو طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا خود ضبطی عظیم الشان قوتِ ارادی پیدا کرتی ہے ایک ایسے کردار اور ایک ایسی سیرت کو جنم دیتی ہے جو عیسیٰ اور بدھ بنا دیتی ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ شاگرد لازمی طور پر اندرونی اور بیرونی قوتوں، حواس پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مسلسل اور کٹھن محنت، ریاضت اور طہارت سے اُسے اس مقام تک پہنچ جانا چاہیئے جہاں سے وہ اپنے نفسیاتی اور قدرتی تقاضوں اور محرکات کے خلاف اپنے اعلیٰ ضمیر کی بات ملنے اس میں اتنی ہمت اور طاقت ہونی چاہیئے کہ اپنے مَن اور دل سے کہہ سکے کہ "تم میرے ہو، میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم کچھ بھی نہ سُنو، کچھ نہ بھی دیکھو"۔ اس کے بعد ہی مَن کی اُچھل کود بند ہوتی ہے۔ سیمابی فطرت کا یہ پُتلا اِدھر اُدھر کی دوڑ بھاگ میں ہلکان ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ مکروہ اور نفرت انگیز ہے۔ مَن ایسے دچار

www.taemeernews.com

ہی کیوں سوچتا ہے جنہیں میں سوچنا نہیں چاہتا۔ میں تو دل کا غلام بن کر رہ گیا۔ جب تک مَن بے چین اور بے قابو ہے، کوئی بھی شخص علم معرفت نہیں سیکھ سکتا۔ اس لئے شاگرد کو لازم ہے کہ وہ مَن کو قابو کرنا سیکھے۔

اور پھر شاگرد میں بُردباری اور تحمل مزاجی ہونی چاہیئے۔ آپ سکھ چین کی زندگی بسر کر رہے ہوں اور سب کچھ معمول کے مطابق ظہور پذیر ہو رہا ہو۔ آپ مسرّتوں کے گہوارے میں جھول رہے ہوں لیکن جونہی ذرا گڑبڑ ہوئی۔ آپ کے دل و دماغ نے توازن کھو دیا۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔ رنج و غم کو لبوں پر حرفِ شکایت لائے بغیر اور گلہ و شکوہ کیئے بغیر برداشت کرو۔ درد و کرب کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دو۔ مزاحمت، علاج یا انتقام کی کیوں سوچتے ہو؟ سچا اور حقیقی تحمل مزاجی اور بُردباری تو یہی ہے۔ جب میرے ست گُورو اور پیر و مُرشد سری رام کرشن بیمار ہوئے، ایک برہمن نے اُن سے کہا کہ وہ اپنی آتمک شکتی رُوحانی قوّت کو استعمال کر کے صحت یاب کیوں نہیں ہو جاتے۔ اس برہمن کا کہنا تھا کہ پرم ہنس جی کو اور کچھ کرنے کرانے کی ضرورت ہی کیا ہے، صرف اپنا دھیان اور اپنی توجہ جسم کے بیمار حصہ پر لگانا اور مرتکز کرنا ہے، بیماری مٹ جائے گی سری رام کرشن بولے:۔ "کیا کہا آپ نے؟ جس مَن کو ایشور ارپن کر چکا ہوں، اُسے پھر سے اس حقیر جسم میں لاؤں؟" اُنہوں نے جسم اور بیماری کی بات تک سوچنے سے انکار کر دیا اُن کا مَن ہر وقت الیشور چنتن میں لگا رہتا تھا۔ دل و دماغ خدا کے ہی ذکر و فکر میں محو رہتا تھا۔ مکمل طور پر حوالہ خدا کیا جا چکا تھا۔ وہ اُسے اور کسی مقصد کے لئے استعمال ہی نہیں کرنا چاہیئے تھے اور پھر حضرت یسوع مسیح کو ہی دیکھ لیجیے جنہوں نے انھیں تختہ دار پر لٹکایا اور سُولی پر چڑھایا، حضرت عیسٰے نے ان پر بھی ترس و رحم کھایا۔ سب کا بوجھ اپنے ذمے لیتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا میری پناہ میں آجاؤ۔ آپ سب جو محنت و مشقت کرتے ہیں اور بھاری بوجھ اٹھانے سے مرے جا رہے ہو۔ میری سرن میں آجاؤ۔ میں تمہیں آرام و سکون دے دوں گا" یہ ہے سچا تحمل اور اعلیٰ ترین قوت برداشت حضرت یسوع مسیح اس زندگی سے کتنے بلند و بالا تھے، اتنے بلند اور بالا کہ ہم اس کا پُورا احساس تک بھی نہیں کر سکتے۔

شاگرد کے لیئے اگلی شرط یہ ہے کہ اس میں آزاد اور مُکت ہونے کی انتہائی شدید خواہش ہونی چاہیئے لیکن جیسے دیکھیئے۔ اس جسم و جان سے پرے کی کوئی خواہش و تمنا ہی نہیں رکھتا۔ یہ دُنیا کیا ہے؟ جسم و جنس کا مرکب اور اتحاد ہی تو ہے۔ کروڑہا مردوں اور عورتوں کو دیکھیئے وہ اُسی نفس پرستی میں غلطاں ہیں جسم و جنس ان سے چھن جائے تو زندگی ان کے لئے سُولی، بے چین اور ناقابل برداشت بن کر رہ جائے ایسے ہیں ہم۔ اور ایسا ہے ہمارا دل، یہ دن رات، ہر وقت جسم و جنس کی کبھی نہ مٹنے بجھنے والی بھوک اور تشنگی دُور کرنے کے ہی حیلے وسیلے سوچتا رہتا ہے۔ لیکن نفس پرستی، جسمانی خواہشات کی تکمیل سے صرف ایک عارضی

www.taemeernews.com

سی، مختصر سی راحت و تسکین ملتی ہے ۔ حالانکہ ان کا انجام ہے کبھی ختم ہونے والی آفت و اذیت ۔ ایک مسلسل عذاب ۔ یہ تو ایک ایسا جام پینے کے مترادف ہے جس کی سطح پر تو امرت ہو لیکن زیر سطح زہر ہو لیکن اس کے باوجود ہم ہر وقت ان کے ذکر و فکر میں ہی ہلکان ہوئے جاتے ہیں ۔ خوابوں اور خواہشوں سے دست کشی اور نفس کُشی واحد ذریعہ ہے جس سے ہم آفت و عذاب سے بچ سکیں ۔ یہی آپ کا منتہائے مقصود ہونا چاہیئے خواہشوں اور خوابوں کی اس دُنیا سے کنارہ کش ہو جاؤ ۔

حقیقی طلب و آرزو صرف ایک ہے اور وُہ ہے تلاشِ حق، رُوحانیت کو اثاثۂ حیات بنالو تو کوئی مادہ پرستی، نفس پروری، یا خود پرستائی باقی نہیں رہے گی ۔ میں پرستارِ رُوحانیت بنوں گا ۔ یہی آرزو اور یہی تمنا شدید اور مضبوط ہونی چاہیئے ۔ اگر ایک انسان کی مُشکیں کس دی جائیں ۔ اس کے ہاتھ پاؤں اس طرح باندھ دیئے جائیں کہ جنبش تک نہ کر سکے ۔ اس وقت اگر جلتا ہوا دہکتا انگارہ اس کے جسم پر رکھ دیا جائے تو وہ اپنی تمام قوت کے ساتھ اُسے دُور ہٹانے کی تدبیر کرے گا ۔ میں اسی طرح کی انتہائی شدید تمنا سے کب روشناس ہوں گا ؟ اس جلتی ہوئی دُنیا کو دُور پھینک دینے والی بے قرار کشمکش اور جدّوجہد کب میرے دل میں موجزن ہوگی ۔ جب تک یہ آرزو دل و جان میں نہیں بس جاتی ۔ تب تک وہ مبارک گھڑی نہیں آئے گی ۔ جب میں خُدائی حقیقت کی صُورت دیکھ سکوں گا ۔

ہماری زندگیوں کا واحد مطلب و مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ ہم عظیم ترین حقیقت سے روشناس ہو جائیں ہمارا مقصدِ حیات شاندار ترین بن جائے ۔ آیئے ہم اِس آتما رُوح، میں اُس آتما کی پُوجا کریں ۔ سچ تو یہ ہے کہ بُنیادِ بندگی بھی ہو تو رُوح ہو ۔ وسطی حصہ میں بھی آتما ہونی چاہیئے ۔ اور بلندی اور معراج بھی آتما ہونی چاہیئے ۔ آتما میں ہی دھیان لگایئے ۔ یہی نصب العین ہونا چاہیئے ۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم اس مقام کو ابھی نہیں پا سکتے ۔ لیکن کوئی مضائقہ نہیں اُمید مت چھوڑو ۔ ہمت ہار کر مت بیٹھو ۔ اور نہ ہی اپنے مرکزِ تصور اور نصب العین کو پسِ پشت ہونے دُو اہم بات تو یہ ہے کہ آپ کتنا کم وقت اس سوچ و فکر میں کھوئے رہتے ہیں کہ آپ اور آپ کا یہ جسم مُردہ، بے جان اور بے روح مادّہ ہے اور کتنا زیادہ آپ کے دل و دماغ میں یہ خیال سمایا رہتا ہے کہ میں ایک جگمگاتی ہوئی امر آتما (لافنا رُوح) ہوں جس قدر آپ کے دل و دماغ پر ایسے خیالات محیط و حاوی رہیں گے ۔ آپ اتنی جلدی مکمل طور پر، مادہ، جسم اور حواسوں سے آزاد ہو جائیں گے ۔ آزاد و مُکت ہونے کی یہی آرزو انتہائی شدید آرزو ہونی چاہیئے ۔

یہ ہیں وہ شرطیں جو ایک شاگرد کو پُوری کرنی چاہیئے ۔ اُن کو پُورا کیئے بنا کوئی شخص ست گورو کے چرنوں تک، پیر و مُرشد کے قدموں تک نہیں پہنچ سکتا ۔ اور اگر خوش قسمتی سے ایسا ست گورو مل بھی

www.taemeernews.com

جائے تو بھی گرو جو برتی رو اور ربی قوت اُس کے اندر پھونکے گا، اس سے شاگرد متاثر نہیں ہو گا۔ ان شرطوں میں کمی بیشی یا رعایت کا کوئی سوال نہیں، ان شرطوں کو پورا کر لینے سے ہی شاگرد کے دل کا کنول کھلے گا اور تبھی اس پر منڈلانے کے لیے بھنورا کھنچا چلا آئے گا۔ اسی وقت شاگرد کو یہ معلوم ہو گا کہ مرشد اور گرو تو اس کے اندر ہی تھا۔ تب اس کے اندر نئی کائناتیں اور نئی دنیائیں کھل جاتی ہیں۔ وہ اصل حقیقت ہو جاتا ہے۔ انبھو کر لیتا ہے۔ وہ زندگی کے بحرِ بےکراں کو پھاند کر دور پرے کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر رحم و کرم کرتا ہوا شہرت یا سود و زیاں کے متعلق تمام خیالوں سے اوپر اُٹھ کر دوسروں کو اس سنسار ساگر سے پار ہونے میں مدد دیتا ہے۔

اُستاد اور گرو کے ساتھ ہمارا رشتہ ناطہ ویسا ہی ہے جیسے جدِ امجد اولاد کا جب تک ہمارے دلوں میں اُستاد اور گرو کے لیے وشواس، اعتماد و اعتقاد حلیمی و انکساری، اطاعت اور فرمانبرداری عزت اور تعظیم نہیں ہوگی، تب تک ہم کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔ جن ممالک میں اس قسم کے رشتہ کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے، وہاں اُستاد محض ایک لیکچرار بن کر رہ جاتا ہے۔ اُستاد کی نظریں حقِ خدمت اور تنخواہ کے روپیوں پر رہتی ہے اور شاگرد چند پیسے دے کر چاہتا ہے کہ اس کے دل و دماغ میں دنیا بھر کے علم بھر دیئے جائیں۔ اُستاد روپے اور شاگرد چند الفاظ لے کر اپنی اپنی راہ لگتے ہیں لیکن اس حقیقت کو فراموش مت کیجیے کہ کسی شخصیت پر بے حد وشواس کمزوری اور بُت پرستی ہوتی ہے۔ اپنے گرو کو ایشور اور خدا سمجھ کر اس کی پرستش اور پوجا کیجیے، لیکن اندھ وشواسی نہ بن جایئے، ہزار دل سے اللہ سے محبت کیجیے لیکن اپنی سوچ و فکر کے کواڑ بند نہ کر دیجیے۔ انہیں کھلا رہنے دیجیے۔

اُستاد کو اپنی پوری قوت شاگرد کے میلانِ طبیعت پر لگا دینی چاہیے۔ دلی ہمدردی کے بنا، ہم اچھی طرح نہ پڑھا سکتے ہیں اور نہ پڑھ سکتے ہیں۔ کسی انسان کے اعتقاد اور وشواس کو درہم برہم نہ کیجیے۔ آپ میں ہمت اور توفیق ہو تو اسے کچھ بہتر شے دیجیے لیکن جو کچھ پہلے ہی اس کے پاس موجود ہے اُسے تباہ و برباد نہ کیجیے۔ سچا اُستاد وہی ہے۔ جو ایک لمحہ کے اندر اندر اپنے آپ کو ہزار شخصیتوں میں ڈھال لیتا ہے۔ سچا اُستاد وہی ہے جو اپنے آپ کو شاگرد کی سطح پر لے آتا ہے۔ اپنی روح کو شاگرد کی روح میں منتقل کر دیتا ہے۔ اور اس کے دل و دماغ کی کیفیتوں سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ صرف ایسا اُستاد ہی حقیقی معنوں میں تعلیم دے سکتا ہے۔ دوسرا کوئی یہ کام نہیں کر سکتا۔

---

www.taemeernews.com

مذہبی تعلیم

تعلیم کا حقیقی لب لباب اور حقیقی مقصد دین و مذہب ہے۔ مذہب سے میری مراد یہ نہیں کہ میں یا آپ مذہب کے متعلق کیا فکر و نظر رکھتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کے سامنے حقیقی اور ابدی اصول رکھے جائیں۔ سب سے پہلے ہمیں بڑے بڑے سنتوں۔ درویشوں اور خدا رسیدہ انسانوں کی تعظیم و پرستش شروع کرنی چاہیے۔ وہ عظیم الرتبہ روحیں، وہ مہا پرش جنہوں نے ان ابدی سچائیوں کو پالیا تھا جیسے کہ شری رام چندر، شری کرشن، مہاویر، ہنومان پرم ہنس رام کرشن تھے، ہمیں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ ان کے نقشِ قدم پر چل سکیں۔ اور ان کی تقلید کر سکیں۔ بھگوان کرشن کی سوانح حیات کے وندرابن کے باب کو سرِ دست بالائے طاق رکھ دیجئے اور صرف ایسے بھگوان کرشن کی پوجا، پرستش کو قرب و جوار میں پھیلا دیجئے جو گیتا میں شیر کی طرح گرج رہے ہیں اور اپنی روزمرہ کی زندگی کو شکتی رشی دیوی ماں کو جو سب طاقت قوت کا سرچشمہ ہے کی پوجا کے سانچے میں ڈھال دیجئے۔ آج ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ایک ایسے آدرش ہیرو کی ہے۔ جس میں رجس کی بے پناہ شکتی ہو ایسے سراپا، جس کے جسم کی رگ رگ اور نس نس میں جوش، ہمت کے چشمے پھوٹ رہے ہوں۔ ایک ایسے ہیرو کی جو تلاشِ حق کی خاطر جان تک کی بازی لگا دینے کی ہمت رکھتا ہو۔ ایک ایسے ہیرو کی جس کا زرہ بکتر نفس کشی اور تیاگ ہو۔ اور جس کی تلوار حکمت و دانش، فہم و فراست کی ہو۔ اس وقت ہمیں ضرورت ایسے ہیرو، شورویر اور مردِ شجاعت کی ہے جو زرہ بکتر پہنے میدان جنگ میں اُتر چکا ہو۔

ہنومان کو اپنا آدرش اور اپنا نصب العین بنایئے۔ شری رام چندر کے حکم کی تعمیل میں وہ سمندروں کو چیرتے چلے گئے۔ انہیں اپنی زندگی یا موت کا کوئی خیال تک نہیں تھا۔ انہیں اپنی خواہشوں اور خوابوں پر

www.taemeernews.com

مکمل قابو حاصل تھا۔ اور بے حد زیرک اور کمال کے صاحب عقل و ہوش تھے اس آدرش کی بدولت دوسرے لفظا ارفع خیالات اور بلند مقاصد زندگی میں اوجاگر ہونے شروع ہو جائیں گے گورو کی غیر مشروط اور بے حیل وحجت فرمانبرداری اور بر تبحیہ پرسختی کے ساتھ پابندی ۔۔۔ ان دونوں باتوں میں کامیابی کی کنجی ہے۔ ہنومان جہاں سیوا اور خدمت کی علمبرداری کرتے ہیں وہاں وہ ایسی شیرہمتی اور ہمت و شجاعت کے پرچم بردار بھی ہیں جس سے دُنیا میں تہلکہ سا مچ گیا۔ بھگوان رامؑ کی سیوا کی خاطر انہیں جان تک کھیل جانے میں بھی عار نہیں تھی۔ بھگوان رام کی خدمت و اطاعت کے سوا دوسری ہر بات سے وہ بیگانہ اور غیر آشنا تھے انہوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ میں بھگوان رام کی ہی آگیا پالن کروں گا۔ ان کی زندگی وقفِ رام تھی ہمیں بھی ایسی ہی عقیدت، بندگی، بھگتی اور ریاضت کی ضرورت ہے۔

اس مرحلہ پر ہمیں بھگوان کرشن کی گوپیوں کے ساتھ لیلا کو یاد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں محض بانسری بجانے یا ایسے دوسرے کام کرنے سے ملک و قوم کی مردہ رگوں میں حیات نو نہیں پھونکی جاسکتی۔ ہاتھوں میں کھڑتالیں لیکر، گلے میں ڈھولک لٹکا کر کیرتن کے وجد و کیف میں ناچنے سے ساری قوم ذلیل و خوار ہو کر رہ گئی۔ بلند ترین زہد، تقویٰ اور سب اونچی ریاضت اور عبادت، جس کے لئے شرط اولین مکمل پرہیزگاری، نفس کشی اور صفائی باطن ہے۔ کی نقل اُتارتے ہوئے یہ لوگ تمرّد ہکار گہرے تاس یعنی بدترین نفس پروری کا شکار بن کر رہ گئے ہیں۔ کیا ہمارے دیش میں نقارے اور ڈھول نہیں بنتے؟ کیا یہ نقارے اور ڈھول ہمیں نہیں مل سکتے؟ اپنے بچوں کو ان چنگ و رباب کی آوازوں میں گم مت ہونے دیجئے، بلکہ انہیں طبل و نقارے کی رُوح پرور آوازوں سے مانوس ہونے دیجئے۔ بچپن سے ہی ایسے زنانہ سازوں کی موسیقی سُننے کی وجہ سے یہ ملک ہیجڑوں اور عورتوں کا ملک بن کر رہ گیا ہے لیکن وقت آگیا ہے کہ ڈمرو اور ڈھول، طبل و نقارہ پر چوٹ لگا کر دلوں میں جوش اور ولولہ بھر دینے والے رزمیہ نغموں کو چھیڑا جائے۔ اور 'ہر ہر مہادیو' کہتے ہوئے ہم ہر ہر مہادیو کے ایسے فلک شگاف نعرے لگائیں کہ در و دیوار تک گونج اٹھیں۔ اس سنگیت اور موسیقی کو کچھ وقت کے لئے بند کر دیجئے جسے سُن کر کمزوری اور بُزدلی جاگے۔ ضرورت اِس امر ہے کہ ہماری لوگ دھرو پد راگ، رزمیہ موسیقی کے عادی بن جائیں۔

ہمیں مقدس وید منتروں کے ہنگامہ خیز نغموں کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں ایک بار پھر زندگی پھونکنی ہے ہمیں اپنی ایک بات میں شیر دلی اور مردانگی، سختی اور توانائی پیدا کرنی ہو گی۔ اگر آپ اس آدرش کو نصب العین بنا کر اپنے کردار اور اپنی سیرت کی تعمیر کرا سکیں تو ہزاروں آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کو تیار ہو جائیں گے لیکن یہ بات ملحوظ نگاہ رہنی چاہیئے کہ آپ اپنے آدرش کی راہ سے ایک اِنچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہونے پائیں

www.taemeernews.com

آپ کے قدموں میں کسی وقت بھی لغزش نہیں آنی چاہیے اور نہ ہی دل میں شکستہ پائی کا احساس آنا چاہیے۔ کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، گاتے ہنستے، مسرور کن شاداب گھڑیاں ہوں یا رنج و کرب کی المناک برسائیں، آپ کے ہر قول و فعل سے اعلیٰ ترین اخلاقی جرأت برسنی چاہیے۔ مہابیر کو یاد رکھئے، دیوی ماں کو یاد رکھئے، آپ دیکھیں گے کہ ہر قسم کی کمزوری، شکستہ پائی، بزدلی اور کم ہمتی فوراً کافور ہو جائے گی۔

پرانے مذاہب کہتے تھے کہ جو شخص ایشور پر وشواس نہیں رکھتا وہ ناستک اور دہریہ ہے۔ لیکن نیا مذہب کہتا ہے کہ ناستک وہ ہے جسے اپنے اوپر وشواس نہیں۔ وشواس سے مراد خود غرضانہ وشواش سے نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ کل میں اعتماد ہونا چاہیے، کیونکہ آپ سبھی کچھ ہیں۔ آپ کے لئے مہر و محبت کے معنی ہیں سب کے لئے مہر و محبت، حیوانوں تک کے لئے پیار، ہر ایک شے سے محبت۔ کیونکہ آپ سب ایک ہیں۔ صرف اعلیٰ اعتماد اور یقین ہی آپ کی دنیا میں جانفزا انقلاب لائے گا۔ خود اعتمادی کا آدرش ہی ہمارے لئے سب سے اعلیٰ ترین سہارا ہے۔ اگر ہمیں خود اعتمادی کا درس زور شور سے پڑھایا گیا ہوتا اور اس خود اعتمادی اور آتم وشواش کو مشعل راہ بنایا گیا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ بیشتر بدعتیں بدعنوانیاں اور برائیاں جو اس وقت ہمارے دامن سے لپٹ کر رہ گئی ہیں، کافور ہو چکی ہوتیں۔ بنی نوع انسان کی ساری تاریخ کی ورق گردانی کر لیجئے، اگر بڑے انسانوں کی زندگیوں میں کوئی محرک اور ولولہ انگیز مقصدِ حیات دوسرے تمام مقاصد سے کہیں زیادہ قوی اور عظیم الشان تھا تو وہ جذبۂ خود اعتمادی تھا اور پیدائش سے ہی انہیں یہ شعور تھا کہ وہ بڑے بنیں گے، اور وہ بڑے بن گئے۔

مذہب و ایمان بے پایاں قوت ہے۔ طاقت نیکی ہے، کمزوری گناہ۔ تمام گناہوں اور تمام بدیوں کو اگر ایک ہی ساتھ بیان کرنا ہو تو وہ لفظ ہے، "کمزوری"۔ یہ کمزوری اور ناتوانی ہوتی ہے جو ہر بدی اور برائی کی محرک بنتی ہے۔ یہ کمزوری اور ناتوانی ہوتی ہے جو سب خود غرضیوں کو جنم دیتی ہے۔ یہ کمزوری اور ناتوانی ہوتی ہے جس کی وجہ سے انسان دوسروں کو تکلیف و ضرر پہنچاتا ہے۔ سب انسانوں کو اس حقیقت سے روشناس کرا دیجئے کہ وہ کون ہیں۔ شب و روز انہیں اس حقیقت کا ورد کرنا چاہیے کہ وہ کون ہیں "سوہنگ" یہ نام انہیں شیر مادر کے ساتھ لوریوں کے ذریعہ پلا دینا چاہیے۔ بے پناہ شکتی کے اس وچار کو گھٹی میں ہی دینا چاہیے کہ میں وہی کچھ ہوں جو وہ ہے۔ پہلے اس بات کو دھیان دیکر سنئے۔ پھر اس پر سوچئے، اس خیال و فکر سے ایسے ایسے معرکے سر ہوں گے کہ دنیا دنگ رہ جائے گی۔ سچ بخوبی اور جرأت سے بولئے کل حقیقت ابدی اور آفاقی ہے۔ سب آتمائیں ست ہیں۔ سب روحوں کی فطرت صداقت ہے۔ اور صداقت کی پرکھ یہ ہے کہ جو بات آپ کو جسمانی طور پر، دماغی طور پر کمزور بناتے، اسے زہر کی طرح

37

ترک و مسترد کر دیجئے۔ اس میں حیات و بقا کا نام و نشان تک نہیں۔ یہ حق و صداقت بھی نہیں کیونکہ صداقت قوت بخش اور طاقتور ہوتی ہے۔ پرہیزگاری اور نفس کشی حق و صداقت ہے۔ سب علم و گیان حق و صداقت ہے۔ حق و صداقت کو لازمی طور پر قوت بخش، بصیرت افروز اور روح پرور اور فرحت بخش ہونا چاہیئے۔ پھر اپنے اپنشدوں کی طرف رجوع کیجئے جن کا فلسفہ نور افشاں، حیات پرور اور آب و تاب والا ہے۔ اس فلسفہ کو اپنائیے عظیم ترین صداقتیں دنیا کی سہل ترین، آسان ترین زبان میں درج ہیں۔ اس طرح کی سہل اور آسان جس طرح آپ کی ہستی ہے آپنشدوں کی سچائیاں اور صداقتیں آپ کے سامنے ہیں۔ انہیں مشعل عمل بنا لیجئے۔ زندگی ان کے سانچے میں ڈھال لیجئے۔ پھر ہندوستان کی نجات اور رستگاری میں دیر نہیں لگے گی۔

ہماری ایک تہائی تباہیوں اور مصیبتوں کی وجہ جسمانی کمزوری ہے۔ ہم سست کاہل اور کام چور ہیں۔ اور پھر ہم اکٹھے اور متحد نہیں ہو سکتے۔ ہم طوطے کی طرح رٹی ہوئی بہت سی باتوں کا فکر و ذکر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان باتوں پر کبھی عمل نہیں کرتے۔ ہم باتوں کے غازی ہیں کردار کے نہیں۔ زبان سے کچھ کہنا ہاتھوں سے کچھ نہ کرنا یہ ہمارا دستور زندگی بن چکا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ جسمانی کمزوری۔ اس طرح کا کمزور دماغ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ہمیں اسے توانا بنانا ہوگا۔ اولین ضرورت اس بات کی یہ ہے کہ ہمارے دیش کے نوجوان مضبوط اور ہمت والے بنیں۔ مذہب کی ضرورت ثانوی ضرورت ہے۔ میرے نوجوان دوستو! میری آپ کے لئے یہی نصیحت ہے، میری آپ کے لئے یہی تعلیم و تلقین ہے کہ آپ مضبوط بنیں۔ گیتا کے مطالعہ کی نسبت فٹ بال کھیلتے ہوئے آپ ایشور کے زیادہ قریب پہنچ سکیں گے۔ اپنی رگ و پے میں ذرا جوانمردی اور اپنے جسم میں ذرا توانائی پیدا کر لیجئے، پھر آپ بھگوان کرشن کی عظیم الشان عالی ہمتی اور ان کی غیر معمولی ذہنیت و فہم و فراست کو بہتر سمجھ سکیں گے۔ اگر آپ کے جسم میں زیادہ ہمت ہو گی، اور آتما کو مرد میدان سمجھنے لگیں گے تو اپنشدوں کے اسرار حقیقت آپ پر سہل سے کھلنے لگیں گے اور آتما کے نورانی حسن و جمال اور اس کی رفعتوں سے بہتر شناسا ہو سکیں گے۔

اُپنشدوں کا ایک ایک ورق مجھ سے یہی کہتا ہے۔ کل عالم میں یہی وہ واحد تصنیف ہے جس میں 'ابھے' بے خوفی اور نڈرتا کا لفظ بار بار استعمال کیا گیا ہے۔ دنیا کی کسی دوسری روحانی کتاب میں ایشور یا انسان کے لئے اس صفت کا استعمال نہیں کیا گیا۔

میرے پردہ ذہن پر عہد رفتہ کے عظیم مغربی شہنشاہ سکندر اعظم کی تصویر ابھرتی جا رہی ہے۔ اور یوں لگتا ہے جیسے کہ نگاہیں اِس تصویر کو دیکھ رہی ہیں، اس عظیم فرماں روا کو دریائے سندھ پر کھڑا جنگل میں رہنے والے ایک سنیاسی سے محو گفتگو دیکھ رہا ہوں۔ وہ ایک عمر رسیدہ انسان سے ہم کلام ہے۔ جو شاید ننگا ہے۔ بالکل برہنہ۔ ایک پتھر کی چٹان پر بیٹھا ہوا۔ شہنشاہ اِس صاحب دانش کی فہم و فراست پر حیران

www.taemeernews.com

دشتشدر ہوا۔ اسے دولت اور شہرت کا لالچ دیکر یونان جانے کے لئے آمادہ کر رہا ہے۔ لیکن یہ شخص اس کی دولت و امارت اور اس کے لالچ اور اسکی ' ترغیب و تحریص کی ہنسی اڑا دیتا ہے۔ اور یونان جانے سے انکار کر دیتا ہے تب فرمانبردا حکومت اور تاج تخت کے بل بوتے پر تکبر کے ساتھ کہتا ہے " اگر تم یونان نہیں چلو گے تو میں تمہیں موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔" یہ الفاظ سن کر وہ شخص قہقہہ لگاتا ہے اور کہتا ہے کہ " جتنی دروغ بیانی تم نے اس وقت کی ہے اس سے پہلے کبھی اس قدر جھوٹ نہ بولا ہوگا۔ مجھے کون مار سکتا ہے؟ کون قتل کر سکتا ہے؟ کیونکہ میں ایک ' اجر' امر' دخا ' آزادی ' آتما ہوں جسے فنا نہیں قضا نہیں۔"

یہ ہے طاقت اور قوت!

ہمیں کمزور ناتواں بنانے والے ہزاروں ہیں۔ ان کے قصے کہانیوں کو دہرانے سے کیا حاصل؟ اس لئے میرے دوستو! آپ کا ہم وطن ہونے کے ناطے سے ایک ایسے شخص ہونے کے ناطے سے جس کا جینا اور مرنا آپ کے ساتھ ہے میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں طاقت، قوت اور ہر وقت توانائی کی ضرورت ہے۔ اپنشد طاقت قوت اور توانائی کی عظیم کان اور سرچشمہ ہیں۔ ان میں اتنی طاقت بھری پڑی ہے کہ ساری دنیا میں تہلکہ مچ جائے اور کل عالم میں نئی روح پھونکی جا سکے۔ ان کے ذریعہ ساری دنیا میں مضبوط اور توانا بنایا جا سکتا ہے۔ اس میں نئی روح ڈالی جا سکتی ہے۔

یہ اپنشد بہ بانگ دہل کمزوروں ' ناتوانوں اور تمام نسلوں اور قوموں کے نامرادوں ' پسے ہوئے پسماندہ لوگوں اور تمام فرقوں اور تمام گروہوں کو اس بات کی دعوت عمل دے رہے ہیں کہ اٹھو ' اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ اور آزاد و آتا ہو جاؤ۔ آزادی ' جسمانی ' ذہنی اور قلبی آزادی ' روحانی اور دینی آزادی ' یہ ہے اپنشدوں کا لب لباب ' ان کی تعلیم کے حقیقی معنی۔

لیکن میں یہ بات واضح کر دوں کہ مقدس روحانی کتابیں ہمیں مذہبی اور روحانی نہیں بنا سکتیں۔ بھلے ہی ہم دنیا بھر کی تمام کتابوں کا مطالعہ کر لیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ ہم پھر بھی مذہب و خدا ' دھرم اور ایشور کے متعلق ایک حرف تک نہ سمجھ پائیں۔ زندگی بھر اس موضوع پر گفتگو کرتے یا ان کے متعلق بحث مباحثہ کرتے رہیں۔ ان باتوں کو عقل و دلیل کی کسوٹی پر پرکھتے رہیں لیکن اس کے باوجود حق و صداقت کو اس وقت تک سمجھ ہی نہیں سکتے۔ تاوقتیکہ ہم اس کا تجربہ خود نہ کریں۔ اور یہ حقیقت ہماری آزمائش اور مشاہدہ میں نہیں آ جاتی۔ کسی انسان کو چند کتابیں دیکر اسے ڈاکٹر نہیں بنایا جا سکتا۔ کسی ملک کے دیکھنے کے متعلق جو شوق میرے دل میں انگڑائیاں لے رہا ہے اس ملک کے مجھے محض نقشے دکھا کر مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ نقشوں سے تو ذہن و قلب میں مزید واقفیت اور علم حاصل کرنے کی پیاس اور بھڑک اٹھے گی۔

www.taemeernews.com

اس سے زیادہ نقشوں کی کوئی وقعت نہیں۔ مندر اور مسجدیں، کلیسے اور گرجا گھر، کتابیں اور رسم و رواج تو مذہب کے ابتدائی مرحلے ہیں! ایسے مکتب اور مدرسے، جہاں بچوں کو کھلونوں کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کا مقصد اور ان کی غرض و غایت صرف اتنی ہے کہ بچے روحانی منزل کی طرف قدم اٹھانے کے قابل اور اہل بن جاتے۔ مذہب و دین اصولی طرح میں ہے، نہ ہی کسی عقیدہ میں ہے اور نہ ہی کسی بحث یا ذہنی دلیل بازی میں پنہاں ہے مذہب تو جاننا اور سمجھنا ہے اس کا مشاہدہ تو کیا جا سکتا ہے مناظرہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو تجربہ ہے اور ذاتی علم و مشاہدہ ہے۔

ہم بھلے ہی دنیا کے سب سے بڑے عالم و فاضل بن جائیں لیکن ممکن ہے کہ اس علم و دانش کے باوجود ہم خدا سے کوسوں دور رہیں اور ہمارے دل خدائی صداقت سے ناآشنا رہ جائیں۔ اور پھر یہ ہماری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ اعلےٰ ترین ذہنی تعلیم و تربیت نے بسا اوقات لا مذہبی انسان ہی پیدا کئے۔ مغربی تہذیب و تمدن کی خام کاریوں اور بدعتوں میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اس میں ذہنی اور دماغی تعلیم تو دی جاتی ہے۔ لیکن قلب و روح پر دھیان ہی نہیں دیا جاتا۔ ایسی تعلیم سے انسان دس گنا زیادہ خود غرض بن جاتے ہیں جب کبھی ذہن اور قلب میں ٹکراؤ اور کشمکش پیدا ہو تو ہمیشہ قلب و روح کا کہا مانئے اور جس ڈگر پر وہ ڈالے، اس پر قدم بڑھایئے، ذہن کی پہنچ ان رفعتوں اور بلندیوں تک کہاں ہو سکتی ہے جن تک قلب و روح کی پرواز ہے۔ قلب و روح عقل و فہم سے بہت پرے، بہت آگے نکل کر مشاہدہ، مجاہدہ اور الہام کی دنیا تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ قلب و روح کے ذریعہ طہارت میں لگے رہیئے کیونکہ خدا دل کے ذریعہ گفتگو کرتا ہے۔ اور قلب و روح کے ذریعہ ہمکلام ہوتا ہے۔ وہ شدید ترین جذبہ عشق و محبت جس سے بنی آدم اور نوع انسان شاید ہی کبھی روشناس ہوتی، خود مذہب کی ہی تخلیق و پیداوار تھا۔ امن و آشتی کے متعلق نفیس ترین الفاظ جب کبھی دنیا نے سنے، مذہب و دین کے پرستاروں کی زبان مبارک سے سنے۔

لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ دنیا نے اگر بدترین قسم کی ملامت خیز تلخ نوائی سنی تو مذہبی انسانوں سے سنی کیونکہ ہر مذہب و فرقہ نے اپنے ہی اصولوں پر زور دیا اور اس بات کو ہٹ دھرمی سے کہا کہ صرف ان کے اصول ہی درست اور صحیح ہیں۔ کسی ایک نے تو دوسروں کو ہم عقیدہ اور ہم مذہب بنانے کی خاطر تلواریں سونت لیں۔ اور خنجر ہاتھوں میں تھام لئے۔ کسی خباثت یا دماغی خرابی کی وجہ سے نہیں بلکہ انسانی دل و دماغ کے اس مرض کی وجہ سے جسے تشدد آمیز تعصب کہتے ہیں۔ لیکن اس جنگ و جدل، مذہبی فرقوں اور گروہوں کے تعصب اور حسد و عناد کے باوجود گاہے گاہے بے پناہ تاثیر رکھنے والی آوازیں امن و آشتی، اتحاد اور میل ملاپ کے لئے بلند ہوتی رہی ہیں۔

اور پھر وہ مبارک زمانہ آ پہونچا جب ایک شخص اس عالم رنگ و بو میں پیدا ہوا جو سب مذہبوں، سب فرقوں اور سب گروہوں اور سب انسانوں میں ایک ہی روح اور ایک ہی آتما کو جلوہ گر اور

www.taemeernews.com

حرکت پذیر دیکھے۔ سب میں ایک ہی ایشور کو کارفرما دیکھے جس کے لیے ہر فرد و بشر خدا کا تصور ہو جو دُکھیوں اور غریبوں کو دیکھے تو اس کا دل پگھل کر آنسوؤں کے ذریعہ بہنے لگ جائے جو کمزوروں اور ناتوانوں کو دیکھے تو ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ اُٹھے جو پسماندہ اور ٹھکرائے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر رُونے لگ جائے۔ ایک ایسا انسان جو اس قدر ذکی حس اور نرم دل ہوتا ہوا بھی اِسں بے پناہ، جگمگاتی، ضَو افشاں فہم و فراست سے مالا مال تھا جو نہ صرف ہندوستان کے بلکہ ہندوستان کے باہر کے تمام متصادم اور مصروفِ کش مکش مذہبوں اور فرقوں میں رشتۂ یگانگت و رفاقت پیدا کرسکے، اور حیرت خیز اخوت، عالم گیر مذہب کی داغ بیل ڈال سکے۔ ایسا اِنسان پیدا ہوا تھا۔ اور مجھے اس کے قدموں میں برسوں تک بیٹھنے کا فخر و اعزاز نصیب ہوا ہے۔ میں نے اپنے پیر و مُرشد اور ست گورو سے یہی حقیقت سیکھی کہ دنیا کے مذہبوں اور فرقوں میں تضاد و عناد نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب ایک ابدی مذہب کی مختلف صورتیں اور مختلف پہلو ہیں۔ پرم ہنس شری رام کرشن نے کبھی کسی کے خلاف ایک بھی تلخ و ترش لفظ اپنے مُنہ سے نہیں نکالا تھا۔ وہ اس قدر فراخ دل، بردبار اور متحمل اور شیریں مزاج تھے کہ ہر فرقہ اور ہر مذہب والے یہی سوچتے تھے کہ وہ اُن کے ہیں وہ ہر ایک سے ہمدرد محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کے نزدیک تمام مذاہب سچّے اور درست تھے۔ اُن کی ساری زندگی ان دیواروں کو گرانے اور ہٹانے میں ہی بیت گئی جو دیواریں تنگ نظریوں اور کج اصولوں پر کھڑی کی گئی تھیں۔

ہمارا مُدعائے حیات اور فکر نظر قبول و رضا ہونا چاہیئے، اِنکار و محرومی نہیں۔ فقط رواداری اور بُردباری سے بات نہیں بنے گی۔ کیونکہ رواداری اکثر کفر و شرک ہوا کرتی ہے۔ رواداری اور بردباری کے معنی یہ ہیں کہ میں یہ بخوبی جانتا ہوں کہ آپ غلط ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں آپ کی غلط کاریوں سے چشم پوشی کر دوں گا۔ یہ کفر و تعصب نہیں تو کیا ہے کہ میں اور آپ، دونوں ایک دوسرے کو اس طرح گھٹے دل سے برداشت کریں۔ عہد ماضی میں جس قدر بھی مذاہب اور دین ہو چکے ہیں۔ میں ان کا حامی اور پرستار ہوں۔ میں ان میں سے ہر ایک کے ہم دوش اور ہم صف بیٹھ کر ایک پروردگارِ عالم کی پرستش و عبادت کرتا ہوں۔ قطع نظر اس بات کے، کہ ان کا .... طریقۂ عبادت کیا ہے اور ان کا عقیدہ و ریاضت کیا ہے۔ مجھے مسلمانوں کی مسجد میں جانے سے انکار نہیں اور نہ عیسائیوں کے کلیسا میں جا کر صلیب اور سولی کے سامنے سجدہ ریز ہونے میں کوئی عار ہے۔ میں بودھ مندر میں جا کر بھگوان بدھ کی پناہ اور شرن میں جانے کو تیار ہوں اور جنگل و ویرانہ میں جا کر ایک ایسے ہندو کے ساتھ بیٹھ کر سمادھی لگانے کو بھی تیار ہوں جو اُس جیوتِ مطلق ایشور کے تیج اور نور کو دیکھنے کی کوشش میں مگن ہے جو سبھی دلوں کو منور کرتا ہے اور سب کے باطنوں کو روشن کرتا ہے۔

تکلیم

www.taemeernews.com

بیس برس نہیں' میں مستقبل میں آنے والے تمام مذاہب اور عقائد کے لئے بھی کشادہ دلی ، اور خندہ پیشانی' رکھتا ہوں۔ کیا ربّی کتابیں ختم ہو گئی ہیں؟ کیا اس خدا کا سرچشمۂ فیض و صداقت سوکھ گیا ہے؟ یا اس کے اسرارِ مخفی افشا ہونے کا عمل پیہم جاری و ساری ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ خدائی رازوں سے بڑھ کر اور کوئی کتاب نہیں۔ دنیا کے رُوحانی اسرار و رموز کے انکشافات کی یہ کتاب لاثانی ہے۔ بائبل' وید' قرآن اور دوسری مقدس کتابیں کیا ہیں؟ اسی مقدس کتاب کے چند ورق ہیں نہ جانے کہ اس کتاب کے کتنے اور ورق اور صفحات ابھی اور نازل ہونگے اور ہمارے اُوپر کیا کیا اسرار و رموز افشا کریں گے۔ آیئے ہم تمام تر صدق دل سے ماضی کے مقدّس مذاہب کے لئے اظہار تشکر کرتے ہوئے عہدِ حاضر کی رُوحانی روشنی سے پُورا پُورا لُطف و سرور حاصل کریں اور اپنے دل کے کواڑوں اور کھڑکیوں کو مستقبل میں طلوع و نمودار ہونے والے مذاہب و عقائد کے لئے کھلا رکھیں۔ آیئے ہم دلی احترام کے ساتھ ان سب پیغمبروں نبیوں اور ریشیوں کے آگے سجدہ کریں' جو عہدِ رفتہ میں ہو چکے ہیں' عصرِ حاضر میں موجود ہیں اور مستقبل میں آنے والے ہیں۔

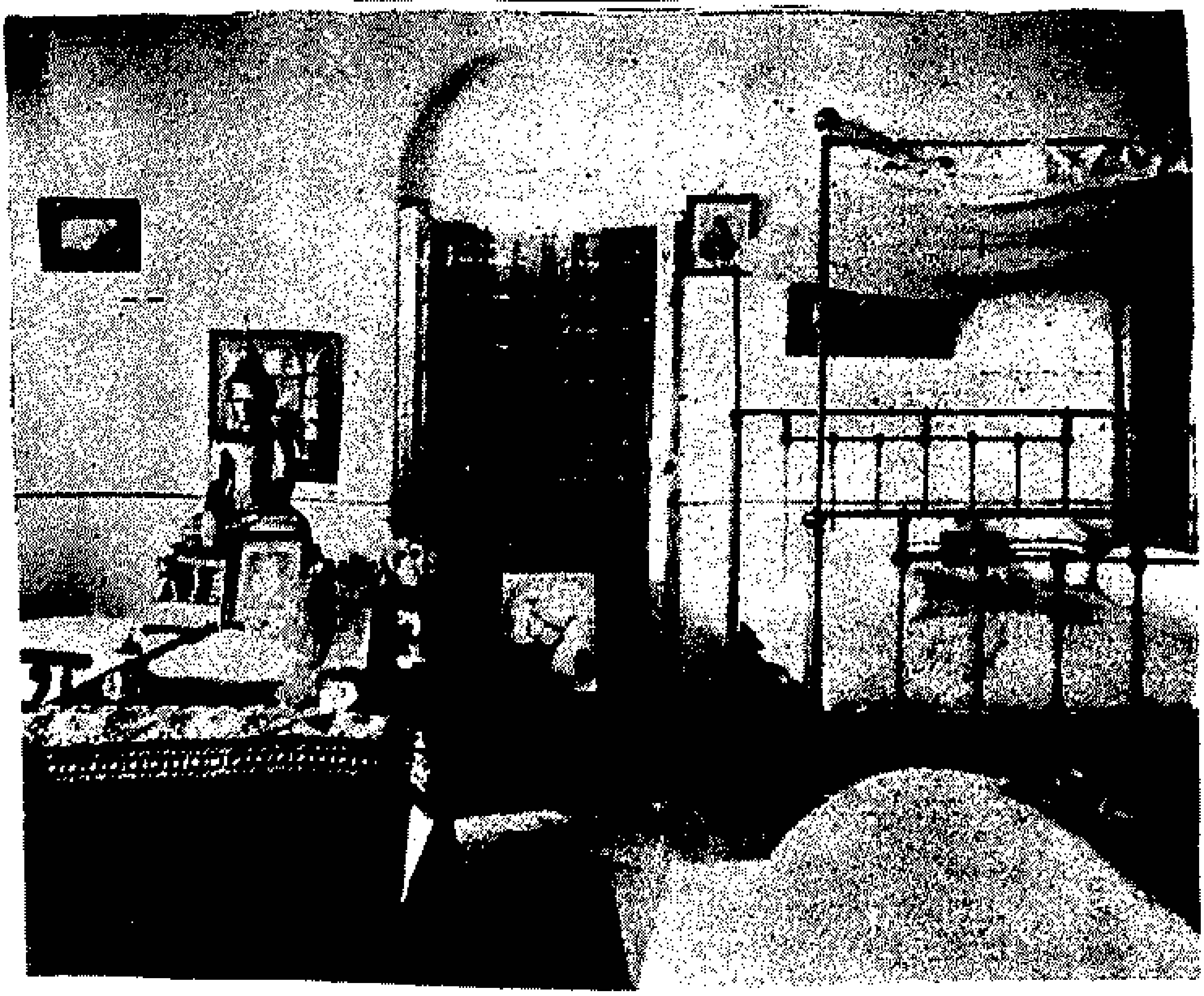

بیلور مٹھ کا وُہ کمرہ جہاں سوامی وویکانند رہتے تھے

www.taemeernews.com

مقاصد اور اسباب

سب سے بڑا سبق جو میں نے اپنی زندگی میں پڑھا ہے وہ یہ ہے کہ جس قدر اہمیت اور توجہ مقصد و مدعا پر دی جائے۔ اُسی قدر توجہ اور اہمیت اس کے اسباب اور ذرائع کو دی جانی چاہیئے۔ جس سے میں نے یہ سبق سیکھا وہ ایک جہاں پرُش تھے۔ اور اُن کی زندگی اسی عظیم اصول کی جیتی جاگتی مثال تھی۔ میں نے اِسی ایک اصول کی بدولت بہت سی عمدہ باتیں سیکھی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ میری تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کا راز اسی اصول میں پنہاں ہے۔ اور وہ اُصول یہی ہے کہ اسباب اور ذرائع پر اتنی ہی توجہ دی جائے، جس قدر مقصد و مُدّعا کو دی جاتی ہے۔

ہماری زندگی کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ہم نصب العین کے متعلق اس قدر مگن اور سرشار ہو جاتے ہیں۔ مقصد و مدعا ہمارے دِلوں پر اور ہمارے ذہن و فکر کے اُفق پر اس قدر محیط ہو جاتا ہے اس کی تفصیلات اور اسباب ہماری آنکھوں سے بالکل اوجھل رہ جاتے ہیں۔

کبھی ناکامی دیکھنی پڑے یا رُسوائی و ہزیمت اُٹھانی پڑے، اور ہم دقیقہ شناس بن کر اسبابِ ناکامی کا تجزیہ کریں تو نوّے فی صدی حالتوں میں ہم دیکھیں گے کہ وجہِ ناکامی یہ تھی کہ ہم نے حصولِ مقصد کے اسباب و ذرائع پر پر توجہ نہ دی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان اسباب اور ذرائع کو پختہ و مضبوط بنائیں۔ اُنھیں شائستگی اور توجہ دیں۔ تکمیلی اسباب درست ہوں تو مُدعا اور مقصد لازمی طور پر پُورا ہو گا۔ ہم بھُول گئے ہیں کہ یہ علت ہے جو معلول و اثر پیدا کرتی ہے۔ معلول اور نتیجہ خود بخود پیدا نہیں ہوتا۔ اور جب تک علتیں اور اسباب درست، موزوں اور مضبوط و کافی نہیں ہوں گے، نہ مُدعا پورا ہو گا۔ نہ ہمارے دل گوہر مقصود کو حاصل کر سکیں گے۔ ہم کیا

www.taemeernews.com

مقصد و مدّعا کا انتخاب کرلو اور اس کے اسبابِ حصول کا فیصلہ کرلو، پھر چاہے مقصد و مدّعا فراموش ہی ہوجائے کیونکہ یہ ایک امر مسلّم ہے کہ اگر اسباب بے عیب اور تمام و کمال ہیں تو مدّعا پورا ہو کر رہے گا۔ علّت ٹھیک ہو تو معلول کے متعلق شک و شبہ یا مشکل و دقت کیوں ہوگی وہ تو خود بخود لازمی طور پر پیدا ہو کر رہے گا ہم اگر علّت اور اسباب پر دھیان دیں گے تو نتیجہ اور معلول خود بخود اپنی فکر کرلے گا۔ نصب العین کا حصول اسباب پر انحصار رکھتا ہے۔ ذرائع ہی مقاصد ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسباب و ذرائع پر زیادہ توجہ دی جانی چاہئے اسی میں زندگی کا راز پنہاں ہے۔ گیتا میں اسی راز اور بھید کو کھول کر سمجھایا گیا ہے۔ گیتا کہتی ہے ہمیں کام کرنا ہوگا۔ مسلسل کام پوری طاقت سے، پوری یکسوئی سے، بلا لحاظ اس بات کے کہ کام کی نوعیت کیا ہے۔ ہمیں کرم کرنا ہی ہوگا۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم کام میں کبھی نہ پھنسیں۔ کیونکہ لگاؤ اور تعلق بندھن ہے مطلب یہ ہے کہ جب ہم کوئی کام کر رہے ہوں تو اس قدر یکسوئی قلب سے کریں کہ ہماری توجہ اِدھر اُدھر کہیں نہ جانے پائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری دلی کیفیت یہ ہونی چاہیئے کہ ہم جب چاہیں اس کام سے دستکش ہوسکیں۔

ہم اگر اپنی زندگیوں کو ٹٹولیں تو دیکھیں گے کہ ہمارے رنج و کرب کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے ایک کام میں خون پسینہ ایک کردیا۔ لیکن جب نتیجہ ناکامی اور نامرادی نکلا تو ہم اس کام کو ترک بھی نہ کرسکے۔ حالانکہ ہم یہ جانتے ہوتے ہیں کہ یہ ہمارے لیئے وجہ کوفت اور باعثِ نقصان بنتا ہے ہم اگر کنارہ کش نہ ہوئے تو اس سے اور آفتیں نازل ہوں گی لیکن پھر بھی ہم اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ بھنورا شہد بھرا رس چوسنے کی غرض و غائت سے آیا تھا۔ لیکن یہاں آکر وہ خود اسیر بنکر رہ گیا۔ اور اسیر بھی ایسا کہ کہیں اُڑ کر جانے کی ہمت و سکت باقی نہ رہی۔ بار بار ہم اپنے آپ کو اس صورتِ حالات میں پھنسا ہوا پاتے ہیں۔ یہی اس عالم ہستی کا رازِ حقیقی ہے۔ ہم اس جہانِ رنگ و بو میں کیوں وارد ہوئے۔ ہم یہاں پھولوں کی مہک اور ان کے رس لُوٹنے کے لیئے آئے تھے، لیکن اب اپنے پیروں کو بیڑیوں، ہاتھوں کو ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا دیکھ رہے ہیں ہم کسی کو پکڑنے اور قید کرنے آئے تھے مگر کیسے خود ہی اسیر غلام بن کر رہ گئے۔ ہم دوسروں سے سرشاریاں اور سرمستیاں حاصل کرنے آئے تھے۔ لیکن یہاں دوسروں نے ہم سے سرور و کیف لُوٹنا شروع کردیا۔ ہم یہاں دوسروں پر حکومت کرنے آئے تھے۔ لیکن یہاں دوسروں کے مطیع بن کر رہ گئے۔ ہم یہاں دوسروں سے کام کروانے آئے تھے لیکن دوسروں نے ہمیں بیگار میں پکڑ لیا۔ ہمیشہ سے ازل سے ہی ہمارے ساتھ یہی کچھ ہوتا آرہا ہے۔ اور یہ سب باتیں ہماری زندگیوں میں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ہم لگاتار اور مسلسل

www.taemeernews.com

دوسروں کے اشارے پر رقص کرتے ہوئے کام کر رہے ہیں۔ اور ہر وقت دوسروں کے دلوں کے تابع و ماتحت رہتے ہیں۔ ہم نے سوچا تھا کہ دُنیا کی نعمتوں اور خوشیوں کو جی بھر لُوٹیں گے لیکن ان خوشیوں اور نعمتوں نے ہماری رگ رگ سے خُون نچوڑ لیا۔ ہمارے شوق و طلب کا ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ قدرت کے ہر راز اور خزانہ کو اپنی باہنوں میں سمیٹ لینا چاہتے تھے لیکن ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ ہم خود نظام قدرت کے ہاتھوں لُٹ کر رہ گئے۔ اور خانماں برباد ہو گئے۔ اس نظام ہفت رنگ و بُو نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا ہر خوشی ہم سے نوچ لی۔ اور ہر مزہ ہم سے چھین لیا اور حالت یہاں تک جا پہنچی کہ ہمیں لوٹ کر ننگا کر کے پرے پھینک دیا۔

ہماری مصیبت اور بدنصیبی کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم دام اُلفت کے اسیر ہیں اور موہ مایا اور ممتا میں جکڑے ہوئے ہیں جنھیں اپنی گرفت میں لینے کے لیے آئے تھے، اُن کے اسیر و غلام بن کر رہ گئے۔ اسی لئے تو گیتا کہتی ہے: مسلسل کام کرتے جاؤ۔ زنسترکرم کرتے جاؤ۔ اور تعلق اور دل بستگی کی زنجیروں کے قیدی نہ بنو۔ اپنے آپ کو سب سے کنارہ کش کرنے کے اور سب سے ترکِ اُلفت کرنے کی قوت کو اپنے آپ میں بچا کر محفوظ رکھو اور کوئی شئے کتنی ہی عزیز و محبوب کیوں نہ ہو۔ اس کے لئے ہمارا دل کتنا ہی بے تاب اور بے قرار ہو کر کیوں نہ مچل مچل جائے۔ اس سے جُدا اور دُور ہونے سے کتنا ہی رنج و عذاب اور درد و کرب کیوں نہ ہو لیکن جب چاہیں اس سے دامن جھاڑ کر، اُس کی اُلفت سے مُنہ موڑ کر، اُس سے رشتۂ محبت توڑ کر آگے بڑھ جائیں۔

اِس زندگی میں یا دوسری کسی زندگی میں، غریب کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ کمزوری کی وجہ سے ہی غلامی اور اسیری جنم لیتی ہے۔ کمزوری سے ہی جسمانی اور ذہنی تمام قسم کی آفتیں اور مصیبتیں پیدا ہوتی ہیں۔ کمزوری موت ہے۔ لاکھوں کروڑوں جراثیم ہمارے اِرد گرد پھیلے ہوئے ہیں لیکن یہ اس وقت ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، جب تک کہ ہم خود کمزور و لاغر نہ ہو جائیں۔ اور ہمارا بیمار و مریض جسم اُن کا خیر مقدم کرنے کے لیے آمادہ و تیار نہ ہو۔ عذاب و آلام کے لکھو کھا اور کروڑہا جراثیم ہمارے اِرد گرد ہوا میں تیر رہے ہوں، ہمیں کیا؟ اُن کی پرواہ نہ کرو۔ ان میں اتنی ہمت و جرأت ہی کہاں؟ کہ ہمیں چھُو سکیں! اُن میں اتنی تاب کہاں کہ ہمیں ہاتھ تک لگا سکیں؟ ہم پر وہ غلبہ اُسی وقت پا پائیں گے جب ہمارے ذہن و فکر میں کمزوری ہو گا اور بے ہمتی آئے گی۔ اس پند سُود مند کو ہمیشہ یاد رکھیئے۔ طاقت و ہمت ہی زندگی ہے۔ کمزوری اور ناتوانی موت ہے طاقت و ہمت ہی سرشاری اور مستی ہے یہی ابدی اور ازلی زندگی ہے یہ غیر فانی ہے۔ یہ حیات جاوداں ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں کمزوری اور بے ہمتی ایک مبہم عذاب، ایک مسلسل آفت، ایک نہ مٹنے والی مصیبت ہے۔ کمزوری ہلاکت ہے۔

تعلیم

www.taemeernews.com

45

اِس وقت ہماری سب خوشیوں اور مسرّتوں کا سرچشمہ تعلق اور اُلفت ہے۔ ہمیں دوستوں سے خوشی ملتی ہے۔ اِس لئے ہم اُن سے وابستہ ہیں اور اُن کی محبت و اُلفت کے اسیر ہیں۔ ہمیں رشتہ داروں اور عزیزوں سے مسرّت ملتی ہے کیونکہ ہم ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہیں۔ ہمیں اگر اپنے ذہنی اور رُوحانی کاموں سے مسرّت اور شادمانی ملتی ہے تو اِس لئے ہم ان میں اپنا مَن لگا بیٹھتے ہیں۔ ہم بیرونی چیزوں سے اپنی دابستگی دل بستگی اور محبت کی وجہ سے ہی فرحت و راحت حاصل کرتے ہیں۔ جائے حیرت ہے کہ پھر یہ رنج و عذاب، یہ ذلّت و خواری یہ خستہ حالی اور بدنصیبی کہاں سے آٹپکتی ہے؟ اسی تعلق سے، اسی اُلفت سے، اسی اُنس و پیار سے۔ ہم اپنے دامن کو اگر سچّی مسرّت و شادمانی سے بھرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے آپ کو ان کے دامِ اُلفت سے آزاد کرانا ہوگا۔ اور اُن سے بے نیاز اور لاتعلق ہونا ہوگا۔ اگر ہم میں یہ ہمت و قوت آجائے کہ ہم جب چاہیں اُن سے دست کش ہو جائیں تو پھر نہ کوئی رنج و عذاب ہوگا نہ ذلّت و خواری۔ وہی اِنسان قدرت کی رحمتوں اور برکتوں سے سب سے زیادہ شادکام اور لطف اندوز ہو سکتا ہے جو یہ قدرت رکھتا ہو کہ جب چاہے جی جان کے ساتھ کسی بات سے جُڑ جائے۔ اور جب چاہے دامن جھاڑ اس سے بے تعلق اور بے نیاز ہو جائے۔ چاہیئے تو یہ کہ اُنس و پیار، اُلفت و محبت کی شہرت بھی اُسی قدر ہونا چاہیئے جس قدر بے تعلقی اور کنارہ کشی کی۔ ممتا اور محبت اتنی ہی تیز ہونی چاہیئے جتنی بیگانگی اور بے نیازی۔ اِس عالمِ رنگ و بو میں ایسے انسان بھی ہیں جو کسی کے دامِ اُلفت کے اسیر نہیں وہ کبھی کسی کو پیار نہیں کر سکتے۔ یہ سنگ دل، بے نیاز، اور لاپرواہ ہوتے ہیں۔ اور حیات و بقا کی اکثر و بیشتر آفتوں اور عذابوں سے بے نیاز رہتے ہیں لیکن ایک پتھر کی دیوار بھی تو تمام دُکھوں اور آفتوں سے بے نیاز ہوتی ہے وہ کسی کو محبت بھی نہیں کرتی کسی کو رنج و عذاب بھی نہیں دیتی۔ لیکن ہے تو بالآخر پتھر کی بے حس دیوار! میں یہ نہیں کہتا کہ تم پتھر کی دیوار بن جاؤ۔ ہرگز نہیں۔ ایسی دیوار بننے سے کہیں بہتر ہے کہ ہم پیار و محبت کریں۔ اور کسی کے اسیر بن جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسا انسان جو کبھی کسی کو محبت نہیں کرتا جو پتھر کی طرح سخت اور بے حس ہے، جو زندگی کے دُکھوں اور عذابوں سے بچا ہوا ہے۔ قدرتی طور پر زندگی کی مسرتوں اور راحتوں سے بھی بے فیض اور محروم رہ جاتا ہے۔ ہم ایسا نہیں بننا چاہتے۔ یہ تو کمزوری اور ناتوانی ہے۔ موت اور قضا ہے۔ جس رُوح نے کبھی کمزوری چکھی نہیں، اس میں کمزوری کہاں سے آئے گی، وہ دُکھ اور عذاب کب محسوس کر سکتی ہے یہ عالم تو بے دردی، بے حسی اور سنگدلی کا عالم ہے۔ ہمیں اِس سے کیا سروکار؟

ہم آرزومند ہیں کہ ہمارے دل بے مثال اور عظیم ترین قوت رکھنے والی محبت سے سرشار اور شادکام ہو جائیں۔ پیار اور اُنس اور دولتِ الطاف و کرم سے مالا مال ہو جائیں۔ ہمیں وہ یکسوئی محبت عطا ہو جائے

www.taemeernews.com

کہ ہم جب چاہیں اپنی رُوح کو ایک واحد شئے پر اس قدر مرکوز کر دیں کہ ہمیں اپنی شدھ بدھ تک نہ رہے۔ ہم اپنے آپ میں سما جائیں اور ایک ایسے عالم فنا میں پہنچ جائیں جہاں ہمارا مَن مٹ جائے۔ ہم دوسروں کی خاطر مر مٹیں۔ کاش ہمارا دامنِ دل فرشتوں اور دیوتاؤں کی ہمہ گیری اور طاقت کو پا سکے بلکہ ہم محبت و اُلفت میں فرشتوں اور دیوتاؤں سے بھی کہیں آگے نکل جائیں۔ مردِ کامل تو وہی ہے جو محبت کی ساری کائنات کو اپنی رُوح میں گھول کر دوسروں سے پیار کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سب سے بے تعلق بے لوث اور بے نیاز ہوتا ہے۔ یہ قدرت کیسے حاصل ہوتی ہے؟ سمجھنے کی بات تو یہی ہے۔

بھکاری کبھی مسرور و شادکام نہیں ہوتا۔ جھولی اور دامن پھیلا کر بھکاری دوسروں سے خیرات اور بخشش مانگتا ہے لیکن یہ خیرات، در بخشش کبھی ہمدردی اور رحم دلی سے ملتی ہے تو کبھی حقارت و نفرت کے ساتھ۔ یہ نہ ہو تو کم از کم یہ خیال تو ضرور کارفرما ہوتا ہے کہ بھکاری حقیر و ذلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھکاری کو جو کچھ نصیب ہوتا ہے، جو کچھ اس کے کشکول میں پڑتا ہے، اس سے سرشار اور شادکام نہیں ہو سکتا۔

ہم سب بھکاری ہیں ہمارے ہر ایک قول و فعل میں صلہ اور خوشنودی کی طلب چھپی ہوتی ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں فائدہ اور نفع کی خاطر کرتے ہیں۔ ہم سب تاجر ہیں، زندگیوں اور جانوں کے بیوپاری، حسن و سیرت اور نیکی و اخلاق کے بیوپاری۔ دین و ایمان کے بیوپاری، مذہب اور دھرم کے بیوپاری۔ یہیں پر بس نہیں۔ ہائے افسوس یہ ہے کہ ہم محبت و اُلفت کے بھی بیوپاری ہیں۔ حالانکہ محبت تجارت نہیں، یہ جنس، سودا بازی کی جنس نہیں۔ محبت لوٹتی نہیں، لٹاتی ہے۔ لیتی نہیں، دیتی ہے۔ قرار محبت کا حصہ ہے، تسکین اس کی دولت ہے، اعتماد اس کا سرمایہ ہے۔ لیکن تجارت میں یہ سرشاریاں کہاں؟

اور اگر ہم اسے تجارت سمجھ لیں۔ لین دین کا ہی معاملہ ہے۔ طلب و قیمت کا ہی رشتہ ہے، خرید کا ہی قصہ ہے تو پھر دستورِ تجارت پر ہی عمل کیجیے۔ اور خرید و فروخت کے اصولوں کو مشعلِ ہدایت بنائیے۔ تجارت میں اچھے دن بھی آتے ہیں، اور بُرے بھی۔ قیمتوں میں اُتار چڑھاؤ بھی آتا ہے، بلکہ ہر تاجر کو ہر وقت یہ اندیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ نہ جانے کب مندہ آ جائے۔ تجارت کیا ہے؟ آئینہ میں اپنا منہ دیکھنا۔ آئینہ میں آپ کی ہی صورت کا عکس نظر آتا ہے۔ آپ منہ بنائیں گے تو آئینہ منہ بنائے گا۔ آپ تیور چڑھائیں گے تو آئینہ تیور چڑھائے گا۔ آپ ہنسیں گے تو آئینہ ہنسے گا۔ آپ روئیں گے تو آئینہ روئے گا۔ یہ سودا بازی نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک ہاتھ دیتے ہیں، دوسرے ہاتھ لیتے ہیں ایک ہاتھ بیچتے ہیں، دوسرے ہاتھ خریدتے ہیں!!!

47

کبھی سوچا آپ نے کہ ہم کیوں پھنس جاتے ہیں، کیوں اسیر و غلام بن جاتے ہیں؟ اس وجہ سے نہیں کہ ہم کیا دیتے ہیں، بلکہ اس وجہ سے ہم کیا طلب کرتے ہیں۔ ہمیں محبت کے بدلے میں بھی نامرادی اور وفا کے بدلے جفا ملتی ہے۔ اس لیے ہی کہ ہم نے محبت کی بلکہ اس لیے کہ ہم نے محبت کی آڑ میں سودا بازی کی تجارت کی۔ ہم نے محبت دے کر اس کا عوضانہ لینا چاہا۔ لیکن جہاں طلب اور آرزو ہی نہیں۔ وہاں رنج و عذاب کہاں آئے گا۔ کرب و درد کہاں ہو گا۔ محرومی اور نامرادی کہاں سے آئے گی؟ یہ اُمید و آرزو ہی سب دُکھوں اور سب مصیبتوں کی ماں ہے۔ ہر طلب اُمید کامیابی اور ناکامی کے آئین و قانون کی پابند ہے۔ ہر آرزو ایک آفت لاتی ہے۔ ہر طلب ایک مصیبت میں پڑتی ہے۔ ہر اُمید ایک نامرادی کو دعوت دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ سچی راحت اور حقیقی مسرت کا راز اس بات میں ہے کہ انسان کچھ دے تو اس کا عوضانہ طلب نہ کرے۔ امرِ واقع یہ ہے کہ مکمّل طور پر بے غرض انسان ہی سب سے زیادہ مسرور و سرشار ہوتا ہے اور اس کی زندگی کامیابیوں اور کامرانیوں سے، راحتوں اور مسرتوں سے بھری ہوتی ہے۔

بظاہر یہ بات خلاف قیاس اور بعید از عقل و اقع نظر آتی ہے۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ سادہ لوح اور بے غرض انسانوں کو دھوکا دیا گیا۔ اُنہیں نقصان پہنچایا گیا؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب اثبات میں ہے بھگوان بدھ بے غرض اور بے لوث تھے لیکن انہیں مار ڈالا گیا۔ سقراط بے غرض اور بے لوث تھا اُسے زہر کا پیالہ پلا دیا گیا۔ حضرت عیسٰی بے غرض اور بے لوث تھے لیکن اُنہیں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ دُرست ہے۔ اور بجا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ یہ اُن کی بے غرضی بے نیازی اور ایثار کا ثمر تھی جس کے صدقے جس کے طفیل انہیں اس قدر عظیم الشان کامیابی ملی کہ لاکھوں اور کروڑوں زندگیوں کو سچی دولت سے مالا مال کر دیا۔ اور ان کے دامنوں کو خوشیوں اور حقیقی مسرتوں سے بھر دیا۔

دامنِ اُمید نہ پھیلاؤ، دستِ سوال دراز نہ کرو۔ عوض اور بدلہ نہ مانگو۔ جو کچھ دے سکتے ہو، دے دو جو کچھ لُٹا سکتے ہو، لُٹا دو۔ جو دو گے، لوٹ کر آپ تک آئے گا۔ جو لُٹاؤ گے آپ کو پھر واپس مل جائے گا لیکن معاوضہ اور بدلہ کی ہر آرزو کی اور ہر اُمید کی مسرت دل سے نکال دو۔ یقین رکھو کہ جو کچھ دو گے۔ ہزار گنا ہو کر تمہیں واپس ملے گا۔ لیکن سر دست اس کا خواب و خیال بھی دل سے نکال دو۔ تمہیں دینے کی توفیق حاصل ہے تو دو۔ تمہارا کام دینا ہی تھا، سو ختم ہوا۔ آگے کی مالک جانے۔ سیکھنی ہے تو یہ بات سیکھو کہ یہ ساری زندگی دینے کے لیے ہے۔ آپ نہ دینگے تو نظامِ قدرت آپ کو دینے پر مجبور کر دے گا۔ پھر کیوں نہیں رضامندی اور خوشی سے دیتے۔ جلد یا بدیر تمہیں سب کچھ دینا ہی پڑے گا۔

کتنی حسرت ناک ہے۔ زندگی تمہاری۔ تم دُنیا میں آئے تو سمجھ بیٹھے کہ ہم جوڑنے کے لیے آئے ہیں۔ تم

www.taemeernews.com

48

دونوں مٹھیاں بھر کر اس دُنیا سے جانا چاہتے ہو۔ لیکن قدرت تمہارے گلے پر قضا کا ہاتھ رکھ دیتی ہے اور تمہاری کی مٹھیاں کھلوا دیتی ہے۔ یہاں تمہاری مرضی اور تسلیم و رضا کا سوال ہی نہیں۔ تمہارا دل مانے یا نہ، تمہیں دینا ہی پڑے گا۔ جوں ہی تم نے کہا کہ میں نہیں دوں گا "قہرِ قضا کا مُکا تمہاری گردن پر پڑ جائے گا۔ کس میں تاب و طاقت ہے کہ اس قاعدے اور قانون سے بچ سکے۔ بالآخر تمہیں سب کچھ دینا پڑے گا اور دُنیا سے خالی ہاتھ جانا پڑے گا۔ جتنا کوئی اس دستورِ فطرت اور آئینِ قدرت کے خلاف جدوجہد کرتا ہے، اتنا ہی نیاز ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ ہماری شامتِ اعمال، کلفت و ہلاکت کی وجہ یہی ہے کہ ہم دینے کی سعادت حاصل نہیں کرتے۔ ہم قدرت کے اس عظیم دستور اور فطرت کے اس بنیادی تقاضے کو تسلیم اور قبول نہیں کرتے۔

دیکھتے نہیں کہ سارا نظامِ قدرت لینے اور دینے کے دستور ہی کا پابند ہے۔ سُورج کو ہی دیکھو یہ اپنی شعاؤں سے پانی کے بخارات بنا کر کھینچ لیتا ہے۔ لیکن اس کے عوض ابرِ رحمت برساتا ہے، ندیوں، نالوں اور دریاؤں کو دیکھو، دیوانہ وار اپنا پانی سمندر کی آغوش میں پھینکنے کے لیئے رواں دواں بہتے چلے جارہے ہیں لیکن کیا دینے سے اُن کا دامن خالی ہو جاتا ہے؟ نہیں! قدرت کے ہاتھ اُن کے دامنوں کو پانی کی نئی روانیوں اور جولانیوں سے سرشار کرتے چلے جاتے ہیں۔ کسی نے راہِ اخراج کو بند کیا نہیں۔ کہ ہلاکت و قضا آئی نہیں۔ جس کمرے میں تم بیٹھے ہو۔ اُسے لے لیجیے۔ اُس کے اندر جو ہوا بھری ہوئی ہے۔ جتنی جلدی اُسے باہر خارج کرو گے۔ اتنی جلدی تر و تازہ ہوا اندر آئے گی لیکن اگر تم نے اس کمرے کی تمام دروازوں اور کھڑکیوں کو بند کر دیا اور تازہ ہوا کے اندر آنے کی راہیں بند کر دیں اور جو ہوا اندر ہے اُسے اندر ہی قید و بند کر دیا تو اس ہوا میں جمود، سڑانڈ اور بُو پیدا ہو جائے گی اور یہ زہر آلود بن کر رہ جائے گی۔

اِس لیئے میں کہتا ہوں کہ بھکاری نہ بنو۔ داتا بنو۔ بے نیاز اور شکام۔ لیکن یہ کام آسان نہیں۔ جان جوکھم کا کام ہے۔ بہت کٹھن۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس راہ پر چلتے ہوئے کس قدم پر کس خطرہ و دُشواری کا مُنہ دیکھنا پڑے۔ اور اگر ہم ذہنی طور پر ان خطروں اور دُشواریوں کے لیئے تیار بھی ہو جائیں تو اس سے کیا ہوگا؟ ان کی وارفتگی اور شدّت کا مزا تو ان میں سے گزرنے پر ہی ہوگا۔ انگاروں کی طرح تپتے ہوئے ریگ زاروں کے خالی تصوّر سے آبلہ پائی کی لذتوں سے شناسا کیونکر ہوا جا سکتا ہے۔ صحنِ چمن کو ہی لے لو۔ باہر کھڑے ہو کر ہم اس کی وسعت کا اندازہ بھلے ہی لگا لیں۔ لیکن اس کی عطر بیز ہواؤں اور مہکتی فضاؤں کا لطف و سرور تو اندر جانے سے ہی نصیب خاطر ہوگا۔

ہمیں اس بات کا کیا رنج و غم کہ ہماری ہر کوشش ناکام گئی اور ہر سعی، سعی لاحاصل ثابت ہوئی

کیا ہوا جو ہمارے پاؤں میں چھالے پڑگئے اور ان چھالوں اور آبلوں سے خون بہنا شروع ہوگیا۔ معراجِ زندگی تو اس بات میں ہے کہ ہم ان آفتوں، کلفتوں، عذابوں اور مشکلوں میں بھی خندہ زن رہیں اور اپنے صدق وایما کا ثبوت دیں۔

نظامِ قدرت تو ہمیں ردِّ عمل' جوابی کارروائی کرنا سکھاتا ہے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ اور کفر وفریب کا جواب کفر وفریب سے دو۔ جعل سازی اور دھوکہ بازی کا جواب جعل سازی اور دھوکہ بازی سے دو یہی نہیں، دستور تو یہ ہے کہ جوابی حملہ پوری شدّت سے کرو۔ کیا پھر اس ردِّ عمل کو روکنا جوابی حملہ نہ کرنا کہیں زیادہ برتر، اعلیٰ اور خداداد طاقت کا تقاضا نہیں کرتا۔ اپنے آپ پر ضبط رکھنا اور بے نیاز ولاپروا رہنا، سچ مچ غیر معمولی اور خداداد وصفت اور وصف ہے۔

میں مشکلوں کو جانتا ہوں یہ ہیبت ناک اور دل ہلا دینے والی ہیں۔ ہم میں نوّے فی صدی انسان انہیں دیکھ کر ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور جی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اکثر اور بیشتر حالتوں میں نا سشا وا دی اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور خلوص ومحبت پر اور اعلیٰ اخلاقی قدروں پر اعتبار کرنا چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ کئی بار ہم نے ایسے انسان بھی دیکھے ہیں جو زندگی کی ابتدا میں رحم دل، سادہ لوح بے ریا اور مہر ومحبت کے پیکر ہوا کرتے تھے۔ لیکن عہد پیری میں صرف انسانی جامہ پہننے کے سزاوار بنکر رہ گئے۔ ان کے دلوں میں فساد اور ان کی نیتوں میں فتور بھر جاتا ہے۔ ان کی تمازت خون سرد پڑ جاتی ہے۔ اور حرارتِ زندگی ماند پڑ جاتی ہے۔ حتٰی کہ وہ بہت کم بول چال کرتے ہیں۔ لیکن اس خاموشی سے بولنا کہیں اچھا ہوتا ہے۔ لیکن وہ کیا کریں؟ ان کے دل ہی مردہ ہو جاتے ہیں۔ تب وہ بولیں بھی تو کیسے بولیں؟ نہ وہ کسی پر غصہ ہوتے ہیں اور نہ کسی کی لعنت و پھٹکار کرتے ہیں۔ مجھ سے پوچھیے تو میں کہوں گا۔ کہ وہ اگر غصہ کریں تو بہت بہتر ہے اس خاموشی سے۔ اُن کا غصّہ سے بولنا، دوسروں کو لعن طعن کرنا، ہزار ہا گنا اچھا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرسکتے۔ کیونکہ موت ان کے دلوں میں جا نگزیں ہو چکی ہے۔ قضا کے سرد ہاتھوں نے اُن کی رُوح کو دبوچ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ان میں حس وحرکت نہیں حتٰی کہ وہ نہ لعن طعن کرسکتے ہیں اور نہ زبان سے میٹھا تو کیا کڑوا لفظ بھی ادا نہیں کرسکتے۔

ہمیں اِن سب باتوں سے بچنا ہوگا، اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ہمیں برتر، اعلیٰ اور خداداد قوت کی ضرورت ہے۔ غیر معمولی انسانی طاقت کافی ووافی نہیں۔ اعلیٰ خدائی قوّت ہی درکار ہے اور صرف اسکے حصول میں راہِ نجات مضمر ہے۔ ہم اس قوت کے بل بوتے پر ہی ان بھول بھلیوں میں سے گزر سکیں گے یا آفتوں اور عذابوں کی بارش کا سامنا کرسکیں گے۔ اور ان سب شعلوں اور انگاروں سے بے رنج اور بے داغ نکل سکیں گے خواہ ہمیں پرزہ پرزہ کردیا جائے۔ خواہ ہمیں ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے۔ ہماری تکا بوٹی کردی

جائے لیکن ہمارے دل مسلسل اور پیہم نیک وپاک بنتے چلے جاتے چاہییں ایسا کرنا بہت دشوار ہے لیکن مسلسل مشق اور پیہم مہارت سے ہم اس دشواری اور مشکل کو آسان بنا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں یہ گُر سیکھنا ہوگا کہ کوئی بھی ہمارا اُس وقت تک کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا، تا وقتیکہ ہم زود حِس نہ ہوں۔ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ کوئی بیماری مجھے اس وقت تک نہیں لگ سکتی۔ جب تک میرا جسم اس کے لیئے تیار اور آمادہ نہ ہو۔ بیماری محض جراثیم کی وجہ سے ہی نہیں لگتی۔ اس کی ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ جسم میں پہلے سے ہی اس بیماری کو اثر قبول کرنے کی حالت پیدا ہو چکی ہو ہمیں وہی کچھ نصیب ہوتا ہے جس کے ہم اہل ہوتے ہیں۔ آیئے ہم گھمنڈ اور تکبر کو بالائے طاق رکھ کر اس حقیقت کو اپنے پلّے باندھ لیں کہ ہمیں کوئی رنج وعذاب بے سبب اور ناحق نہیں ملتا۔ کوئی مشکل اور دشواری ہمیں ایسی نہیں ملتی، جس کے لیئے ہم سزاوار نہ ہوں۔ کوئی کلفت ایسی آتی جس کے لیئے ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے راہیں استوار نہ کی ہوں۔ یہ راز ہمیں اچھی طرح سے جان لینا چاہیئے۔ اپنے آپ اور اپنے گرد وپیش کی چھان بین کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ جو صدمہ ہم کو سہنا پڑا، جو زخم ہم کو کھانا پڑا۔ ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لیئے راہیں استوار کی تھیں۔ آدھا کام ہم نے کیا، باقی کا آدھا دُنیا نے کر دیا۔ ہر دُکھ اس طرح بنا، ہر آفت نے اسی طرح جنم لیا، ہر عذاب اِسی طرح وجود میں آیا۔

اِس تجزیہ سے ہمیں سکون وقرار ملے گا۔ اُمید وحوصلہ کا پیغام ملے گا۔ مجھے باہر کی دُنیا پر کوئی اختیار نہیں لیکن جو کچھ میرے اندر ہے، میرے نزدیک ہے، میری دُنیا میں ہے۔ میری دُنیا میں بساط اور میری ہمت میں ہے اس پر تو مجھے اختیار حاصل ہے۔ چونکہ میری ہر ناکامی دونوں وجوہات سے وجود میں آتی ہے۔ اور ہر صدمہ کے پیچھے یہ دونوں پیغام فرما ہوتی ہیں۔ اِس لیئے میں ہر ناکامی پر آفت، اور ہر صدمہ کی پیش بندی کے لیئے اپنا حصہ نہیں ڈالوں گا۔ اگر میں نے سچے معنوں میں اپنے اوپر اختیار حاصل کر لیا تو مجھے کوئی تکلیف نہیں ستا سکتی۔ کوئی مشکل میرا راستہ روک نہیں سکتی، کوئی صدمہ مجھے غمناک اور سوگوار نہیں بنا سکتا۔

لیکن بچپن سے ہی ایک بات ہماری جزوِ فطرت سی بن چکی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم دوسروں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ ہر وقت ہم دوسروں کی اصلاح کے لیئے تیار رہتے ہیں۔ اپنی اصلاح کی ہوش ہی نہیں۔ اگر ہم کسی رنج وغم میں گھرے ہوئے ہوں تو ہم فوراً کہہ اٹھتے ہیں۔ یہ دُنیا دکھوں کی کان ہے مصیبتوں کا گھر ہے۔ لیکن یہ بات ہمارے ذہن میں ایک بار بھی نہیں آتی۔ کہ اگر فی الواقع ہی دُنیا ایسی نہیں تو پھر ہم اس دُنیا میں کیوں آئے۔ اگر یہ دُنیا بے ایمانوں اور بُرے اور بد انسانوں کے لیئے ہی ہے تو یقینی طور پر ہم خود بھی ایسا اور بُرے اور بد ہوں گے۔ ورنہ ہم یہاں کیوں آتے۔ ہم کہتے ہیں کہ دُنیا خود غرضوں کی آماجگاہ ہے، درست

www.taemeernews.com

51

اور بیجا، لیکن ہم اگر اچھے ہوتے تو ان کے دوش بدوش اور ہم رکاب کیوں ہوتے ؟ ذرا سوچئے تو سہی ؟

حق تو یہ ہے کہ جو کچھ بوتے ہیں وہی کچھ کاٹتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دُنیا بُری ہے اور ہم اچھے ہیں تو سفید جھوٹ بولتے ہیں۔ ناممکن سی بات ہے۔ اس سے زیادہ لرزہ خیز دروغ بیانی ہم کیا کر سکتے ہیں ؟

سب سے پہلا سبق جو ہمیں سیکھنا ہے یہی ہے کہ تہیہ کرلو کہ دوسروں کو الزام مت دو۔ دوسروں پر تہمتیں نہ جوڑو۔ دوسروں کو لعن طعن نہ کرو۔ مرد بنکر کھڑے ہو جایئے اور سب قصور اپنے اوپر لو۔ اور یہ بات ہے بھی دُرست، اس میں رَتّی بھی شک و شُبہ نہیں رہنا چاہیئے۔ کمر ہمت باندھ، مرد میدان بنو۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سر دست دوسروں کی اصلاح و بہبود کا خیال دل سے ترک کرکے اپنا دھیان کریں۔ اپنی فلاح و بہبود کی سوچیں۔ اسباب کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں تو مقصد خود اپنی سُدھ لے لیگا۔ یہ دُنیا اچھی بھی بن سکتی ہے۔ اور نیک بھی، بشرطیکہ ہماری اپنی زندگیاں اچھی اور نیک بن جائیں۔ ہم اگر علت بن جائیں تو یہ معلول ہو جائے گی۔ اس لیے آیئے ہم اپنے کو نیکوکار بنائیں اور اپنے آپ کو کامل انسان بنائیں۔

www.taemeernews.com

تعلیمِ نسواں

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ملک میں مرد اور عورت کے درمیان اس قدر فرق و امتیاز کیوں روا رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ ویدانت یہ کہتا ہے کہ سب صورتوں میں وہی ایک ابدی اور ازلی نورِ جلوہ افروز ہے۔ مردوں نے سمرتیاں لکھ کر اور سخت قاعدے قانون بنا کر عورتوں کو بچے جننے والی مشین بنا کر رکھ دیا ہے۔ زمانۂ زوال میں جب پنڈتوں اور پجاریوں نے دوسری سب جاتیوں کو وید پڑھنے کی ممانعت کر دی تب انہوں نے عورتوں کو بھی اُن کے حقوق سے محروم کر دیا۔ ویدوں اور اپنشدوں کے دور میں ہم میتری اور گارگی اور دوسری کتنی ہی دیویوں کو رشیوں کی جگہ سنبھالے دیکھتے ہیں۔ ہزاروں برہمنوں کی سبھائیں جہاں سب ویدوں کے عالم فاضل رونق افروز تھے یہ گارگی تھی جس نے جرأت کے ساتھ یاگیولکیہ کو برہم کے بارے میں بحث مناظرہ کرنے کے لئے للکارا تھا۔

جن ملکوں نے بھی ترقی کی ہے انہوں نے عورتوں کو خاطر خواہ عزت و توقیر دے کر کی۔ وہ ملک اور صرف وہ ملک جس نے عورت کی عزت و توقیر نہ کی نہ ترقی کر سکتا ہے اور نہ مستقبل میں کبھی ترقی کر سکے گا یا بامِ عروج پر پہنچ سکے گا۔ شکتی کا سچا پجاری وہی ہے جو اس بھید اور راز سے بخوبی واقف ہے کہ ایشور کی ستّا اور شکتی ہی کل کائنات میں جلوہ گر ہے اور جو عورت کو اس شکتی اور اس طاقت کا اظہارِ کمال تصور کرتا ہے۔ امریکہ اور مغرب کے دوسرے ملکوں میں مرد عورتوں کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے اور ان کی خاطر خواہ عزت و توقیر کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ترقی یافتہ ہیں، خوش حال ہیں، آزاد ہیں، صاحبِ عمل اور سرگرمِ کار ہیں۔ ہمارے زوال اور ہماری ذلّت و پستی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم نے شکتی کی ان جیتی جاگتی مورتوں اور صورتوں کی عزت و توقیر کرنا چھوڑ دیا۔ منو مہاراج کہتے ہیں کہ "جہاں عورتوں کی عزت و توقیر کی جاتی ہے۔ ان کی پوجا کی جاتی ہے۔ وہاں دیوتا اور

www.taemeernews.com

فرشتے بستے ہیں اور جہاں ایسا نہیں ہوتا وہاں سب عرق ریزی اور محنت و مشقت کے باوجود بدبختی اور شامت اعمال کی وجہ سے کچھ بھی نہیں بنتا۔ اس گھرانے اور ملک کی حالت کبھی نہیں سُدھر سکتی جہاں عورتیں رنج و غم میں ڈوبی رہتی ہوں۔

عورتوں کے مسائل بے شمار اور بہت سنجیدہ ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی مسئلہ ایسا نہیں جسے جادوئی لفظ "تعلیم" سے حل نہ کیا جا سکے۔ ہمارے مشہور آئین دان منو مہاراج کہتے ہیں کہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر اتنی قدر توجہ دی جانی چاہئے جس قدر لڑکوں کو دی جاتی ہے۔ جس طرح لڑکوں کو تیس برس تک برہمچریہ پالن کرنے کے بعد شادی کرنی چاہیئے اسی طرح لڑکیوں کو بھی ماں باپ کی طرف سے ایسی ہی تعلیم دی جانی چاہیئے اور انہیں برہمچریہ پالن کرنے کی ہدایت دی جانی چاہیئے لیکن ہمارا طرز عمل کیا ہے؟ ہم انہیں بے چارگی، بے ہمتی اور دوسروں کی غلامی اور دُوسروں کے ہاتھوں کی طرف دیکھنے کی ہی تعلیم دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہلکی سی مصیبت یا ذرا سی مشکل کی آہٹ پا کر وہ اشک ریزی اور گریہ وزاری شروع کر دیتی ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم عورتوں کو اس قابل بنا دیں کہ وہ اپنے مسائل کو خود اپنی مرضی کے مطابق حل کر سکیں۔ ہماری ہندوستانی عورتیں کسی بھی اعتبار سے بھی دنیا کی عورتیں سے کم نہیں ان کی طرح یہ بھی ہر کام کر سکتی ہیں۔

عورتوں میں ایسی تعلیم کو فروغ دینا چاہیئے جس کی بنیاد دین و مذہب ہو۔ دُوسری قسم کی تعلیم مذہب و دھرم کی تعلیم کے بعد ثانوی حیثیت رکھنے والی ہونی چاہیئے۔ مذہبی تعلیم، تعمیر اخلاق، اور برہمچریہ پالن، ان باتوں پر زیادہ زور دینا چاہیئے۔ ہماری ہندو عورتیں بخوبی جانتی ہیں کہ پاکیزگی اور پاک دامنی کسے کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ خوبیاں انہیں ورثہ میں ملتی ہیں سب سے پہلے انہیں پاکیزگی اور پاک دامنی کی ہی تعلیم دیجئے، تاکہ وہ ایسی سیرت اور اخلاق تعمیر کر سکیں جس کے بل بوتے پر وہ اپنی زندگی کے ہر دور میں، خواہ شادی شدہ ہوں یا خواہ اپنی مرضی سے کنواری رہیں۔ پاکدامنی اور پاکیزگی کی راہ سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہونے کی بجائے اپنی جان پر کھیل جائیں اور ضرورت پڑے تو اپنی زندگی کی آہُوتی دیدیں۔

ہندوستان کی عورتوں کو سیتا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی ترقی و تعمیر کرنی چاہیئے۔ سیتا آدرش عورت تھی جس کی سیرت بے نظیر، جس کا اخلاق بے مثال اور جس کی زندگی مثالی زندگی تھی وہ سچے معنوں میں ایک ہندوستانی عورت تھی، کیونکہ ہندوستان کی باکمال آدرش عورتوں میں جتنی خوبیاں ہوتی ہیں۔ اکیلی سیتا کی زندگی ان سب کا مجموعہ اور پیکر تھی اپنی ان خوبیوں اور صفتوں کی وجہ سے ان کے لئے، ہزاروں، لاکھوں برسوں سے آریہ ورت کے طول و عرض کے ایک ایک آدمی، ایک ایک عورت اور ایک ایک بچے کیلئے تعظیم و احترام، شردھا اور پُوجا کا مرکز بنی ہوئی ہے اور ہمیشہ بنی رہے گی وہ مہان اور عظیم المرتبہ، سیتا جو روحانی حسن و جمال کا شاہکار تھی، پاکیزگی

سے بھی زیادہ پاک، پاک دامنی بھی پاؤ پاک دامن۔ صبر و استقلال کی پیکر۔ تپ کی مورتی تھی جس نے شکوہ شکایت ایک لفظ منہ سے نکالے ہوئے بنا زندگی بھر تپ کیا، دکھ اور درد کو سہا، ایک نیک بیوی اور رفیقۂ حیات بنی جو ہمارے لوگوں کے لئے آدرش ہے جو ہماری قوم و ملک کے لئے بے مثال قابلِ پرستش دیوی ہے۔ ایسی سیتا ہماری نئی ہمیشہ ہمیشہ ہمارے آدرشوں میں جگمگاتی رہنی چاہیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی یاد اور اُن کے لئے شردھا ہماری نسل کی رگ دپے میں سرائت کر چکی ہے۔ ہماری عورتوں کو عصرِ نو کے جدید سانچوں میں ڈھالنے کی ہر کوشش جس کا مقصد ہماری عورتوں کو سیتا کے آدرش سے پرے ہٹا دینا ہے لازمی اور فوری طور پر ناکام ہو کر رہیگی ہر روز کے مشاہدے نہیں یہی کچھ بتاتے ہیں ؛

اس زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ بعض دیویاں، بعض عورتیں ترک دنیا اور نفس کشی، تپ اور ویراگیہ کے آدرشوں کے سانچے میں ڈھلی زندگی گذاریں۔ وہ اس بات کا قول و عہد کر لیں کہ وہ زندگی بھر کنواری رہیں گی اور اس پیتے اور نورِ ایمان سے جو انہیں تاریخ کے دھندلکو میں لپٹے ہوئے پرانے زمانوں سے ورثہ میں ملی دولت پاکدامنی پاکیزگی سے حاصل ہوا ہے ایک جگمگاتی شمعِ ہدایت بن جائیں۔ ہماری مادرِ وطن کی عظمت و تقدیس اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کے کچھ بچے اور بچیاں برہمچاری اور برہم چارنیں بن کر گذاریں۔ اگر ان عورتوں میں سے ایک بھی برہم دتیا بن گئی، واصلِ خدا ہو گئی تب وہ اپنی جگمگاتی اور نور افشاں زندگی کے پُرزور اثر سے ہزاروں دوسری عورتوں کو تلاشِ حق کی راہ پر ڈال سکیں گی اور انہیں متاثر کر سکیں گی اور اس سے لازمی طور پر سماج اور ملک کو فلاح و بہبود حاصل ہو گی ؛

سیرت و اخلاق کی دولت سے مالا مال ایسی برہمچارنیوں کو تعلیم و تدریس کا کام کرنا چاہیئے۔ انہیں تعلیم نسواں کی توسیع و ترقی کے لئے گاؤں گاؤں اور شہر شہر مرکز کھولنے چاہئیں۔ سیرت و اخلاق سکھانے والی ان صادق و مخلص ہدایت کی شمعوں کی بدولت سارے ملک میں تعلیم نسواں کا حقیقی فروغ ہو گا۔ عورتوں کو تاریخ کے علاوہ پورانوں کی گھر گرہستی کے فرائض کو حُسنِ خلوص سے ادا کرنے کی تعلیم بھی دی جانی چاہیئے۔ انہیں بتانا چاہیئے کہ کن اصولوں کی بدولت سیرت و اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے۔ گھر کو سلیقہ سے کس طرح رکھا جانا چاہیئے اور خرچ اخراجات کو کس طریقہ سے ٹھیک چلایا جا سکتا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہیں فنونِ لطیفہ کی تعلیم دی جانی چاہیئے۔ اس کے علاوہ انہیں سینے پرونے، گھر کا کام کاج کرنے کا فن اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے کا سلیقہ اور علم بھی سکھایا جانا چاہیئے ؛

لیکن اس تعلیم کا ناگزیر اور لازمی حصہ جپ (ورد) پوجا (پرستش) سادھنا (عبادت) کا ہونا چاہیئے۔ عورتوں کو دوسری باتوں کے علاوہ شیر دلی اور شجاعت بھی حاصل کرنی چاہیئے۔ آج کے زمانے

www.taemeernews.com

میں انہیں یہ سکھنا چاہیئے کہ وہ اپنی حفاظت کر سکیں اور وہ اپنی عزت و آبرو اور وطن و قوم کی آزادی کی نگہداشت کر سکیں۔ جھانسی کی رانی کتنی عظیم المرتبہ اور پُرشکوہ تھی۔ آج ہمارے وطن و ملک کو ایسی ہی نڈر، بے خوف عورتوں کی جو سنگمترا، لیلا، اہلیہ بائی اور میراں بائی کی روایات کو جاری ساری رکھ سکیں۔ ایسی عورتوں کی جو غازی مرد و با برگزیدہ انسانوں، فرشتہ سیرت آدمیوں اور سُورماؤں کی مائیں بننے کے قابل ہوں، ایسی عورتوں کی جن میں وہ طاقت اور قوت موجزن ہو جو طاقت ایشور کے پاؤں چھو لینے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں ایسی تعلیم و تربیت دیدیں کہ وقت پڑنے پر وہ اپنے گھربار کی ساری ذمہ داری سنبھال سکیں اور اُس کی حفاظت کر سکیں۔ حقیقت ایسی ماؤں کے بچے ہی ان خوبیوں اور صفتوں میں اور بھی ترقی کر سکتے ہیں اور اپنی خداداد ذہانت اور صلاحیت کی وجہ سے ساری دنیا میں امتیازی شان پیدا کر سکیں گے صرف پڑھی لکھی، نیکوکار، پارسا اور پاک دامن ماؤں کے گھروں میں ہی بڑے انسان پیدا ہوتے ہیں۔

اگر عورتوں کی حوصلہ افزائی کی جائے، انہیں ترقی کرنے دیں تو ان کے بچے اپنے شاندار اور رفیع الشان کارناموں کی بدولت ملک و وطن کی عزت کو چار چاند لگا دیں گے اور دیش کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں تہذیب تمدن، علم و فہم، طاقت اور ہمت، یکجہتی اور وفاداری سب مل کر ایک نئی بیداری پیدا کر دیں گے اور ملک و قوم کو نئی رفعتوں اور نئی عظمتیں عطا کر دیں گے۔

www.taemeernews.com

عوام کی تعلیم

جب کبھی میں ہندوستان کے غریبوں اور پسماندہ لوگوں کی حالتِ زار کے متعلق سوچتا ہوں تو میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے اور دل وجگر دردوکرب سے کراہنے لگتا ہے۔ آئے دن یہ اور بھی گہری پستی میں گرتے جاتے ہیں۔ بے رحم اور سنگدل معاشرہ نے ان پر جو کاری ضرب لگائی ہے، وہ اُسے محسوس تو کرتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ یہ ضرب ان پر کب پڑتی ہے۔ شدتِ غم اور وحشتِ روزگار کی وجہ سے انہیں یہ بھی یاد نہیں کہ وہ بھی انسان ہیں میرا دل درد سے اس قدر معمور ہے کہ میں اپنے غم واندوہ کو بیان بھی نہیں کرسکتا۔ جب تک لاکھوں لوگ بھوک اور غربت اور جہالت کی تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں میں ہر اس شخص کو غدار اور ننگِ وطن سمجھتا ہوں جو ان کے خرچ پر پڑھ لکھ جانے کے باوجود ان کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ ہمارا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ ہم عوام کی سُدھ بُدھ نہیں لیتے، انہیں بالکل فراموش کردیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں ذلت وخواری تباہی وبربادی، زوال وملال کا منہ دیکھنا پڑا۔ سیاست سے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، جب تک ہندوستان کے عوام الناس ایک دفعہ پھر پڑھے لکھے، کھاتے پیتے اور آسودہ حال نہیں بن جاتے۔

جوں جوں عوام میں علم وہنر فروغ پاتا جائے گا۔ گری سے گری قوم راہِ ترقی پر آگے بڑھتی چلی جائے گی قوم کی فلاح وبہبود اس بات سے ہی آشکار ہوتی ہے کہ عوام نے تعلیمی شعبہ میں کس قدر ترقی کی ہے۔ ہندوستان کی تباہی وبربادی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں علم وہنر تعلیم وتدریس کو چند مٹھی بھر انسانوں نے اپنی اجارہ داری میں لے لیا۔ اگر ہمیں موجودہ ذلت وپستی سے اوپر اُٹھنا ہے تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم عوام میں تعلیم وحکمت کو فروغ دیں۔ ہم اپنے پسماندہ طبقوں کے گھر کی ایک ہی خدمت کرسکتے ہیں اور یہ کہ

انہیں ایسی تعلیم و تربیت دیں کہ وہ انفرادی طور پر ترقی و بہبودی کی منزلیں سر کریں اور بامِ عروج تک پہنچ سکیں اس کے لئے انہیں نئے نئے خیالات سے سرفراز کرنا ہوگا انہیں تیجہ خیز ولولوں اور امنگوں سے مالا مال کرنا ہوگا ان کی آنکھیں کھولنی ہونگی تاکہ وہ دیکھ سکیں کہ ان کے گرد و پیش کی دنیا میں کیسے تغیرات اور انقلابات رُونما ہو رہے ہیں تاکہ وہ دوسروں کی دیکھا دیکھی وہ اپنی نجات اور سربلندی کے لئے کوشاں ہو سکیں۔ ہر ملک و قوم کو، ہر فرد و بشر کو، ہر مرد و زن کو اپنی بہتری و بہبودی، فارغ البالی اور آسودہ حالی کے لئے خود محنت و مشقت کرنی ہوگی ان کے دلوں اور دماغوں کو حیات بخش خیالوں اور ترقی بخش ولولوں سے معمور کر دیجئے" آپ سے وہ صرف یہی امداد مانگتے ہیں باقی سب کچھ تو معلول کی صورت میں ظہور پذیر ہو کر رہے گا۔ ہم یہی کچھ کر سکتے ہیں کہ چند کیمیائی اجزا کو باہم ملا دیں، اکٹھا کر دیں، باقی سب عمل تو قانونِ قدرت کے مطابق خود بخود ہوتا چلا جائیگا۔

میرا ارادہ یہ ہے کہ میں سب سے پہلے رُوحانیت کے ان جواہر پاروں کو جو ہماری کتابوں میں دبے پڑے ہیں یا جنہیں چند افراد نے اپنی قید حبس میں لے رکھا ہے۔ یا جو جنگلوں، مندروں اور مٹھوں سے چھپے پڑے ہیں۔ ان سب جواہر پاروں کو باہر لا کر رکھ دوں، یہی نہیں میں نہ صرف ان تمام ہاتھوں سے جو انہیں چھپائے ہوئے ہیں، حکمت و دانش کے تمام موتیوں اور جواہر ریزوں کو چھین لینا چاہتا ہوں، بلکہ ثقیل سنسکرت الفاظ کے ناقابل عبور سیلوں میں دبے ہوئے چند دشوار منزل نکال بھی کر عوام تک پہنچاؤں اور انہیں اس چشمۂ فیض و کرم سے سیراب کردوں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ میں انہیں مقبولِ عام اور ہر دل عزیز بنانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ حکمت و دانش، ایمان و اخلاق کے ان اعلیٰ و ارفع اصولوں کو سب میں تقسیم کر دوں یہ اثاثہ جو سب کا ساجھا ہے سب میں تقسیم کر دوں، مالک بنا دوں تاکہ ہندوستان کا ایک ایک انسان، خواہ وہ سنسکرت سے بے بہرہ ہو یا شناسا، ان سے فیض یاب ہو سکے۔ اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سنسکرت زبان ہے۔ میں اس کی عظمت و رفعت سے انکار نہیں کرتا۔ میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اکثریت اس سے نابلد ہے۔ اس مشکل کو بھی دُور کیا جا سکتا ہے اگر ساری قوم سنسکرت کے عالموں کی ہو جائے۔ یہ زبان کس قدر مشکل ہے اس کا صحیح اندازہ اس بات سے کر لیجئے کہ میں نے اپنی ساری زندگی اس زبان کے مطالعہ میں صرف کر دی ہے لیکن حالت یہ ہے کہ اب بھی سنسکرت کی کوئی نئی کتاب دیکھوں تو میرے لیے وہ غیر مانوس اور اجنبی سی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے لئے یہ کس قدر مشکل اور دقیق ہوگی جنہوں نے کبھی اُسے اچھی طرح نہیں پڑھا۔

اس لئے ضرورتِ وقت یہ ہے کہ لوگوں کو نئے خیالات ایسی زبان اور بولی میں دیئے جائیں جنہیں وہ سمجھ لیں جو اُن کی زبان ہو۔ عوام کو ان کی زبانوں اور بولیوں میں تعلیم و تربیت دیں۔ انہیں نئے نئے خیالات دو جہاں تک معلومات کا تعلق ہے۔ وہ انہیں خود بخود فراہم کر لیں گے۔ بنیادی ضرورت تو اس بات کی ہے کہ

www.taemeernews.com

ان کے دلوں میں علم وحکمت کی روشنی سے منور کر دیا ہے لیکن صرف اس سے کام نہیں بنے گا۔ انہیں کچھ اور دینا ہوگا۔ انہیں تہذیب وتمدن سے مالامال اور نہال کیجئے۔ جب تک آپ ان تقاضوں پر پورا نہیں اترتے، اپنے ان فرائض سے سبکدوش نہیں ہوتے تب تک عوام کی حالت سُدھر نہیں سکتی۔

اس کے ساتھ ساتھ سنسکرت کی تعلیم دینے کا مسئلہ بھی جاری رہنا چاہیئے۔ سنسکرت الفاظ کی آواز ہی فخر و افتخار پیدا کر دیتی ہے۔ یہ بھگوان بدھ کی غلطی تھی کہ انہوں نے عوام کو سنسکرت کی تعلیم دینے سے منع کر دیا۔ وہ فوری اور تیز رفتار نتائج چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے لوگوں کی زبان حال کو اپنایا۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ بھگوان بدھ عوام کی زبان اور بولی بولتے تھے۔ اس لئے عوام ان کا مطلب ومفہوم اچھی طرح سمجھ جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی ان کے خیالات وافکار تیزی سے دُور دراز تک پھیلتے چلے گئے لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کے ساتھ سنسکرت کی پڑھائی جاری رہتی۔ بھگوان بدھ کے طریقہ کار سے بلاشبہ لوگوں کو علم ضرور ملا لیکن فخر واعزاز نہ مل سکا۔ جب تک آپ سنسکرت کی تعلیم نہیں دیں گے تب تک آپ ایک نئی ذات اور فرق پیدا کرتے چلے جائیں گے۔ ایک ایسی ذات جو سنسکرت زبان کے علم کے بل بوتے پر دُوسروں پر فوقیت لے جائے گی۔

یاد رکھیئے کہ ہندوستانی قوم جھونپڑیاں میں رہتی ہے — وقت کا فرض پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ آپ ملک کے گوشہ گوشہ، کونہ کونہ میں گھوم جائیے گاؤں گاؤں جائیے، شہر شہر کا چکر لگایئے اور لوگوں کو خواب غفلت سے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیجئے اور انہیں سمجھائیے کہ محض ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں بنے گا انہیں سمجھائیے کہ ان کی اصل حالت کیا ہے اور زبوں حالی میں کیوں کر پھنسے ہوئے ہیں اے میرے بھائیو سب بیدار ہو جاؤ، اُٹھ کھڑے ہو جاؤ، جاگ پڑو، نیند کے ماتو کتنی دیر تک سوتے رہوگے؟ ان کے پاس جائیے اور بتایئے کہ وہ اپنی حالتِ زار کو کس طرح سنوار سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہیں مقبول عام طریقے سے سیدھے سادہ الفاظ میں بتائیے کہ ہمارے شاستروں میں کیسے کیسے پسند سُود مند لکھے ہوئے ہیں ان پر عمل کرو یہ بات ان کے دلوں میں جاگزیں کر دا دیجئے کہ آپ بھی دھرم اور مذہب وایمان پر اتنا ہی حق رکھتے ہیں جس قدر برہمن رکھتے ہیں۔ ان شعلہ ریز، حیات بخش منتروں سے چنڈالوں تک کو راہ حق وصداقت پر ڈال دیجئے۔ اور انہیں سہل الفاظ میں بتائیے کہ زندگی تجارت، بیوپار اور کھیتی باڑی وغیرہ کے لئے انہیں کیا کیا کام کرنے ہیں اور کس طرح کرنے ہیں۔

نہ معلوم کتنی صدیوں، کتنے ہزار برسوں سے مختلف قومیں اور ذاتیں، فرمانروا اور غیر ملکی حکمران ان پر جو ہلاکت آفرین کمر توڑ جبر وستم ڈھاتے چلے آئے ہیں، اس سے ان کی ساری قوت اور طاقت سلب ہو چکی ہے۔ ہمت وطاقت حاصل کرنے کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ اپنشدوں کو مشعلِ ہدایت بنائیے اور اس حقیقت پر یقین کیجئے کہ "میں آتما ہوں" تلوار مجھے کاٹ نہیں سکتی۔ کوئی ہتھیار مجھے چیر نہیں سکتا۔ آگ مجھے جلا نہیں سکتی۔ ہوا مجھے تباہ نہیں کر سکتی۔ میں قادر مطلق

(سروشکتی مان) اور ہر جگہ حاضر و ناظر (سرو ویاپک) ہوں۔"

ویدانت کے یہ نظریات اور خیالات و افکار اب جنگلوں اور غاروں سے باہر نکلنے چاہئیے تاکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی جلوہ طرازیاں اور معرکہ خیزیاں معمول ہو سکیں۔ کیا وکیل، کیا ڈاکٹر، کیا سائنسدان، کیا حساب دان، سب کے سب انہی نظریات اور خیالات و افکار کو مشعلِ راہ بنالیں مسجدوں اور مندروں میں ہی نہیں غریبوں کی جھونپڑیوں میں اور دہقان کے کھیتوں میں ہر جگہ یہی نظریات اور آدرش کارفرما ہو جائیں مچھلیاں پکڑنے والے ماہی گیر اور کتابوں کے کیڑے طالبعلموں کی زندگی کا نور انہی خیالات و افکار کا مرہونِ منت ہو۔ یہ عقیدے، نظریات اور تصورات ہر مرد، عورت اور بچے کو بلند بانگ دعوتِ عمل دے رہے ہیں، بلا لحاظ اس بات کے کہ ان کا رتبہ کیا ہے اور وہ کیا کام دھندہ کرتے ہیں یا کسی بھی ذات اور قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ ماہی گیر اور کسان، محنت کش اور طالب علم، سب لوگ اُپنشدوں کے ان نظریات، عقیدوں اور تصورات کو کس طرح عملی زندگی میں لاسکتے ہیں؟ اس کا طریقہ بتایا جاچکا ہے۔ اگر ماہی گیر یہ بات ذہن نشین کرلے کہ میں آتما ہوں تو وہ بہتر ماہی گیر بن جائے گا۔ اگر طالب علم یہ سوچ لے کہ میں آتما ہوں تو روشن ضمیر طالب علم بن جائے گا۔

ہندوستان کی بیشتر بدبختیوں، مصیبتوں اور تکلیفوں کی بنیادی وجہ غریبوں کی حالت کس مپرسی ہے۔ جب تک ان دبے ہوئے، سہمے ہوئے، کچلے ہوئے، ٹھکرائے ہوئے غریبوں کی حالتِ زار بہتر نہیں ہوتی، نہ ہندوستان کا حال شاندار ہو سکتا ہے اور نہ مستقبل کی نوک پلک سنور سکتی ہے۔ فرض کیا کہ آپ ہر ایک گاؤں میں ایک خیراتی سکول کھول دیتے ہیں۔ کیا اس سے صورتِ حالات بہتر ہو جائے گی؟ نہیں! کیونکہ غریبی اور مفلسی ہماری رگ و پے میں اس قدر دھنس چکی ہے کہ غریب بچے سکول جاکر تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی بجائے اپنے غریب اور مفلس ماں باپ کا ہاتھ بٹانے میں جُٹ جائیں گے اگر یہ لڑکے سکول نہیں آسکتے تو ہمیں اس بات کا اہتمام کرنا چاہئیے کہ تعلیم اُن تک پہنچ جائے علم و حکمت کا دریائے فیض رواں دواں آگے بڑھ کر ان طلباء تک پہنچ جائے

ہمارے ملک میں ہزاروں سنیاسی ایسے ہیں جو سب کچھ راہِ مولا میں لٹا کر سرمست اور سرشار گاؤں گاؤں گھومتے رہتے ہیں اور لوگوں کو دھرم اور دین و ایمان سکھاتے رہتے ہیں۔ اگر ان میں سے بعض سنیاسیوں کو اس قسم کے علم و ہنر کے مدرسوں اور مسیحروں کی طرح منظم کیا جاسکے تو وہ جگہ جگہ جاکر گھر گھر الکھ جگا کر نہ صرف لوگوں کو اُپدیش دے سکتے ہیں بلکہ انہیں علم و ہنر کی دولت سے بھی سرفراز کرسکتے ہیں۔ ان میں اگر کچھ سنیاسی شام کو ایک کیمرہ، ایک گلوب اور کچھ چارٹ اور چند نقشے وغیرہ لیکر کسی گاؤں میں جائیں تو جاہل اور انجان لوگوں کو بہت سا جغرافیہ اور علم ہیئت سکھا سکتے ہیں۔ دُوسرے ملکوں اور دُوسری قوموں کی کہانیاں سُنا سُنا کر ان غریبوں اور مفلسوں کو اس علم و ہنر سے کہیں زیادہ حکمت و آگاہی دے سکتے ہیں جو وہ ساری عمر کتابوں کے مطالعہ کرنے کے بھی حاصل نہیں کرسکتے۔ ان کے دلوں

www.taemeernews.com

اور دماغوں میں جدید سائنس کی مدد سے علم و ہنر کے چراغ روشن کرو۔ انہیں تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ادب، فنونِ لطیفہ سکھاؤ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں مذہب اور قوم کی عظیم سچائیوں کا دلدادہ اور پرستار بھی بناتے چلو۔

جان لیوا عرق ریز جدوجہدِ حیات میں سرتاپا مصروف ہونے کی وجہ سے انہیں اس بات کی فرصت ہی کہاں نصیب ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوصافِ حمیدہ کو، اپنی صلاحیتوں کو، اپنے خوابیدہ علم کو بیدار کر سکیں۔ نہ جانے کب سے وہ بے جان مشینوں کی طرح کشمکشِ حیات کی خاطر کام کرتے چلے آ رہے ہیں اور اب حالت یہ ہو چکی ہے کہ وہ خود بے جان مشین بن کر رہ گئے ہیں۔ اور پھر پڑھا لکھا، چالاک اور شاطر طبقہ ان کی عرق ریزی کے بیشتر پھل اور ثمر ہڑپ کرتا چلا آیا ہے لیکن اب وقت بدل گیا ہے ادنیٰ فرقوں کے لوگ اب رفتہ رفتہ اس حقیقت سے رُوشناس ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس لوٹ کھسوٹ کے خلاف متحدہ محاذ بناتے رہے ہیں۔ اب اونچا طبقہ لاکھ حیلے وسیلے کرلے، ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو نہ دبا سکے گا نہ کچل سکے گا۔ اب اعلیٰ طبقوں کا اپنا مفاد اور فائدہ اس بات میں پنہاں ہے کہ وہ ادنیٰ طبقوں کی مدد کریں تاکہ وہ اپنے حقوق اور معقول مفادات حاصل کرلیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں پکار پکار کر کہہ رہا ہوں کہ عوام میں تعلیم پھیلانے کے کام میں جٹ جاؤ۔ انہیں محسوس کراؤ اور بتاؤ کہ "آپ لوگ ہمارے بھائی بند ہو۔ ہمارے جسموں کا عضو اور انگ ہیں" آپ سے یہ پیار اور ہمدردی پاکر ان کے کام کرنے کی ہمت اور سرگرمی جوش و خروش میں کئی سو گنا اضافہ ہوتا جائے گا۔

ہر کارِ نمایاں سرانجام دینے کے لئے تین باتوں کی ضرورت ہے۔ پہلی یہ کہ جو کچھ محسوس کریں، تہِ دل سے کریں قیل و قال، حجت اور دلیل میں کیا رکھا ہے؟ عقل اور دلیل تو چند قدم بڑھ کر رُک جاتی ہے۔ اس کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اس کوچے میں تو صرف پیش قدمی کرنے کی جرأت و ہمت کی ضرورت ہے۔ محبت قوموں کو آگے بڑھنے کی تحریک و ترغیب دیتی ہے۔ محبت مسدود راہوں اور مقفل دروازوں کو کھول دیتی ہے جو لوگ بحث و تکرار، عقل و دلیل کے چکر میں اُلجھ جاتے ہیں انہیں کوئی کارنامہ انجام دینے کی سعادت نصیب ہوتی ہے؟ پروانہ کون سی دلیل سے متاثر ہو کر جان دیتا ہے؟ اس کے نزدیک سب سے بڑی دلیل شمع کا جلنا ہے۔ دلیل پر جان کون دیتا ہے؟ دلیل کی کاٹ دلیل ہو سکتی ہے لیکن محبت کی زنجیر کو دلیل کی ضربوں سے نہیں توڑا جا سکتا۔ دلیل کا طلسم حیاتِ انسانی میں اضطراب و انتشار تو پیدا کر سکتا ہے لیکن حیات کو خوش گوار نہیں بنا سکتا کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ حیاتِ انسانی کی یہ بے قراریاں اور جان کاہیاں عقل و دلیل کے فقدان کے باعث ہیں؟ یہ بات ہوتی تو ان قوموں کا دامن سکون کی دولت سے لبریز ہوتا جن کے پاس سرمایۂ عقل و دلیل ہے۔ حالانکہ وہ عذابِ رُوح میں مبتلا ہیں۔ سرمایۂ بلند ہمتی تو صرف محبت عطا کرتی ہے۔ اس لئے میرے وطنِ عزیز کے بسنے والو جاں نثارو اور حب الوطنو میں تم سے کہتا ہوں کہ "اپنے دلوں کے خلوص کو جگاؤ اور اپنے وطن کے غریبوں اور پسماندہ لوگوں کے لئے صدقِ دل سے سوچو"۔ کیا آپ اسی طرح سوچتے ہو؟ کیا تم محسوس کرتے ہو کہ میں اس ملک کے لاکھوں اور کروڑوں انسان جو فرشتوں اور رشیوں

www.taemeernews.com

کی سنتان ہیں اب پسماندگی اور کسمپرسی کے اس تنگ و تاریک عالم میں پھنس چکے ہیں جو عالم جانوروں اور حیوانوں کا عالم ہے کیا آپ محسوس کرتے ہو لاکھوں اور کروڑوں ہندوستانی اس وقت کس ذلت، خواری، تاریکی اور پستی میں پڑے ہوئے ہیں؟ جانے کتنے برسوں سے یہ لاکھوں اور کروڑوں اہل وطن فاقوں مر رہے ہیں؟ کیا آپ محسوس کرتے ہو کہ جہالت کی تاریک و سیاہ گھٹاؤں نے اس ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے؟ کیا یہ رنجیدہ صورتِ حالات آپ کو بے چین کرتی ہے؟ آپکے دنوں کا آرام اور آپ کی راتوں کی نیند کو حرام کیا ہے؟ کیا یہ درد و کرب آپ کے خون میں گھل گیا ہے؟ آپ کی رگ و پے میں اُتر چکا ہے؟ آپ کے دل کی دھڑکنوں کا آہنگ بنا ہے؟ کیا اس درد و کرب نے آپ کو دیوانہ بنا دیا ہے؟ اپنے ہم وطنوں کی تباہی و بربادی کسمپرسی اور زبون حالی سے آپ کے اس قدر وارفتہ خاطر اور پریشان ہوئے ہیں کہ آپ اپنی شہرت، اپنی عزت و ناموس، اپنے بال بچوں کو، اپنی دولت و امارت تک کو بھول جائیں۔ یہی نہیں کیا اس وفورِ غم اور شدتِ درد میں آپ کو اپنے جسم و جان کا بھی دھیان بھول گیا ہے؟ کیا ایسا تصور آپ کے دلوں میں جاگزیں ہوا ہے؟ ایسا سوچنا اور سمجھنا ہی وہ پہلا قدم ہے جو آپ ان کی خدمت کے لئے اٹھا سکتے ہیں۔

ممکن ہے کہ آپ کا اندازِ فکر یہی ہو لیکن کیا آپ نے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بیہودہ باتوں میں گنوانے کی بجائے اس مشکل و عذاب سے نجات پانے کے لیے کوئی عملی حل بھی تلاش کیا ہے؟ تاکہ ان زندہ درگور ہم وطنوں کی قیمتی خدمت کی جاسکے۔ صرف ایسا کرنا ہی کافی نہیں۔ کیا آپ نے پربتوں کی طرح ناقابل عبور مشکلوں پر قابو پانے کے لئے ناقابل تسخیر عزم وارادہ بھی باندھا ہے؟ اگر ساری دنیا شمشیر بکف تمہارے خلاف صف بند ہوجائے، ڈٹ جائے تو کیا تم پھر بھی اس عزم واستقلال سے منہ نہیں موڑو گے اور جو کچھ آپ درست اور برحق تصور کرتے ہیں اسے اپنی جان پر کھیل کر بھی عملی جامہ پہنانے کی سعی کریں گے؟ کیا ان مشکلوں اور دشواریوں کو دیکھنے کے باوجود آپ ہمت و استقلال کے ساتھ اپنی منزل اور اپنے نشانہ کی طرف رواں دواں قدم بڑھاتے چلو گے؟ کیا راجہ بھرتری ہری کا حسبِ ذیل مقولہ آپ کے لئے مشعلِ راہ اور شمع ہدایت بنا ہوا ہے:۔ دانا اور عاقل چاہے تعریف کریں، چاہے مذمت کریں، قسمت کی دیوی لکشمی آتی ہے تو آئے اور جانا چاہتی ہے تو جہاں جی چاہے جائے، موت آج آجائے یا سینکڑوں برسوں بعد آئے مستقل مزاج اور ثابت قدم وہی انسان ہے جو ان سب باتوں سے بے نیاز اور لاپروا رہتا ہوا راہِ حق سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتا" کیا آپ نے بھی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی حاصل کر لی ہے۔ اگر آپ اپنے دامن کو ان تینوں خوبیوں سے معمور کرلیں تو پھر یقین کیجئے کہ ان میں سے ہر خوبی اور ہر صفت معجزے دکھاتی چلی جائے گی۔

آئیے سجدوں میں گر کر اس مالک سے دعا کریں کہ "ہمیں ہدایت اور روشنی دو" آپ دیکھیں گے کہ گھٹاٹوپ

www.taemeernews.com

اندھیروں میں روشنی کی شعاع جگمگا جائے گی اور ایک دست و بازو آگے بڑھ کر ہماری رہنمائی کرنے لگ جائیگا۔ آئیے ہم میں سے ہر ایک فرد و بشر ہندوستان کے ان کروڑوں دکھیوں اور کچلے ہوؤں کے لئے شام و سحر دُعائیں مانگے جنہیں غربت، جبر و استبداد اور گورو ڈم نے اسیر و غلام بنا رکھا ہے۔ آئیے ہم رات دن ان کے لئے ہی دُعائیں مانگیں!

امیروں اور اونچے طبقے کے لوگوں کی نسبت میں انہیں اُپدیش دینے کو مقدم سمجھتا ہوں۔ میں نہ علم طبعی کا ماہر ہوں۔ نہ فلسفی، اور نہ ہی سنت یا رشی مُنی بلکہ میں غریب اور فقیر ہوں، میں غریبوں سے پیار کرتا ہوں۔ کوئی ہے جو غربت اور جہالت کی پستیوں میں غرق ہو چکے کروڑوں مردوں اور عورتوں کے لئے اشک ریزی کرے؟ میں تو اسے مہاتما، مہاپُرش کہوں گا جو غریبوں کی سُدھ لے۔ کون ہے جو ان کی سُدھ لیتا ہے؟ جو نہ تعلیم و تربیت حاصل کر پاتے ہیں نہ روشنی اور اُجالے کی صُورت دیکھ سکتے ہیں۔ کون ہے جو ان تک روشنی لے جائے! انہیں اُجالے کی صورت دکھائے قرب و جوار، گھر گھر پر جا کر انہیں تعلیم دے؟ ان انسانوں کو اپنا معبُود خدا بنا لو۔ سوچو تو ہمیشہ ان کے لئے کوئی کام کرو تو ان کے لئے۔ بلاناغہ دُعا کرو تو ان کے لیے۔ پروردگار آپ کو ہدایت و جزا دے گا۔

www.taemeernews.com

فرض کیا ہے؟

یہ جاننا اشد ضروری ہے کہ فرض کیا ہے؟ اگر مجھے کچھ کرنا ہی ہے تو سب سے پہلے مجھے اس بات کا علم ہونا چاہیئے کہ فلاں کام میرے ذمہ ہے۔ میرا فرض کیا ہے تب میں اُسے بخوبی انجام دے سکوں گا لیکن مشکل یہ ہے کہ مختلف قوموں میں فرض کے متعلق مختلف نظریات پائے ہیں جتنی قومیں اتنے عقیدے مسلمان کہتا ہے کہ جو کچھ اس کی کتاب مقدس کا قرآنِ حکیم میں لکھا ہے وہی اس کا فرض ہے۔ ہندو کہتا ہے کہ جو کچھ ویدوں میں درج ہے وہی اس کا فرض ہے عیسائی کہتا ہے جو کچھ بائبل میں تحریر ہے وہی اس کا فرض ہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی کی مختلف حالتوں مختلف تواریخی ادوار اور وقتوں اور مختلف قوموں میں فرض کے متعلق مختلف اور متضاد سے نظریات اور عقیدے موجود ہیں۔ ایسی صورت میں فرض کی تصریح و توضیح کرنا بہت کٹھن ہے۔ ہم عملی تدبیروں نتیجوں کو جان کر فرض کے متعلق محض ایک موہوم سا تصور اخذ کرتے ہیں۔ جب بعض باتیں ہماری آنکھوں کے سامنے عالم ظہور میں آتی ہیں تو ہمارے من کی لہریں بے ساختہ طور پر یا سلیقہ یافتہ ترنگوں کی طرح ایک مخصوص انداز میں ردِ عمل پیدا کرتی ہیں۔ دل و دماغ خود بخود صورتِ حالات کے متعلق جائزہ لینا شروع کر دیتا ہے کئی مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل و دماغ گرد و پیش کے حالات کو ملحوظ خاطر رکھتا ہوا ایک خاص انداز میں عمل پذیر ہونے کو زیادہ سُودمند تصور کرتا ہے اور کئی مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ویسے ہی حالات میں اس خاص انداز میں اس عمل کرنے کو غیر مفید اور مضر سمجھتا ہے۔ عام لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فرض کے متعلق عالم گیر تصور یہی ہے کہ ہر اچھا آدمی ضمیر و ایمان کی ہدایت اور اشارہ پر عمل کرتا ہے۔

لیکن وہ کیا شے ہے جو ایک فعل کو امتیازی پہلو سے سرفراز کرتی ہے اور اسے فرض کا درجہ دے دیتی ہے۔
اگر ایک عیسائی راستے میں گائے کے گوشت کا ٹکڑا پڑا دیکھتا ہے اور اُسے خود نہیں کھاتا یا کسی دوسرے کو بھی

نہیں دیتا تو وہ محسوس کرنے لگے کہ اُس نے ادائیگی فرض میں کوتاہی اور غفلت کی لیکن اگر ایک ہندو گائے کے گوشت کے اُس ٹکڑے کو کھا لیتا ہے یا کسی دُوسرے کو دیدیتا ہے تو وہ یہ محسوس کرے گا کہ اُس نے اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی اور غفلت کی کیونکہ ہندو کی نشوونما ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ اسی زاویۂ نگاہ سے سوچے گا۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی فعل کے متعلق مختلف تاثرات پیدا ہونے کی وجہ انسان کا مخصوص گردوپیش ہے۔ ایک اور مثال لے لیجئے۔

عام حالات میں اگر ایک شخص گلی کوچے میں جا کر ایک دُوسرے آدمی کو گولی کا نشانہ بنادے تو اُسے نہ صرف احساس گناہ ہوگا بلکہ اپنے کیئے پر پچھتاوا بھی ہوگا لیکن اگر یہی شخص فوج کی ایک رجمنٹ میں بھرتی ہو کر محاذ جنگ پر ایک چھوڑ بیس افراد کو گولی کا نشانہ بنادے تو وہ نہ صرف احساس فرض اور احساسِ اعزاز سے پھولا نہیں سمائے گا۔ اور یہ سمجھے گا کہ اُس نے یہ قتل تکمیل فرض کی خاطر کیئے۔ ارتکاب قتل ایک ایسا ہے لیکن گردوپیش کے حالات نے انہیں کی ماہیئت میں زمین و آسمان کا امتیاز پیدا کر کے رکھ دیا۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں فرض کی تصریح و توضیح کرنا بہت مشکل ہے۔ اور کسی فرض کو حقیقی اور مخصوص تشریح و تعریف دینا ناممکن ہے لیکن اگر داخلی طور پر فرض کا ایک امتیازی درجہ ہے۔ ہر وہ کام جو ہمیں حق و ایمان کی طرف لے جائے، اچھائی اور نیکی ہے، اس لیئے فرض ہے۔ اور وہ ہر فعل جو بدی اور بُرائی کی طرف لے جائے پستی و ذلالت کو خوش آمدید کہے، فرض نہیں کہلا سکتا۔ داخلی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بعض افعال اور اعمال ہی ایسے ہیں جنکے ارتکاب سے انسان میں نیکی اور اچھائی آتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو اونچا اور سربلند تصور کرنے لگتا ہے برخلاف اس کے بعض افعال اور اعمال ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ارتکاب سے انسان حیوان و وحشی بن جاتا ہے لیکن طرح طرح کے رجحانات اور مختلف قسم کے گردوپیش رکھنے والے لاتعداد انسانوں کے لیئے کونسا فعل کیسا ردِعمل پیدا کرے گا، اِس بات کی تصریح و توضیح نہیں کی جاسکتی۔ اس مسئلے پر کوئی ہمہ گیر قاعدہ و قانون نہیں ٹھونسا جاسکتا لیکن اُس کے باوجود فرض کے متعلق ایک نظریہ جسے ساری دنیا کُل بنی نوع انسان تمام عالموں اور فاضلوں سب فرقوں قوموں اور ملکوں نے یکساں طور پر تسلیم کیا ہے سنسکرت کے اس مقولہ میں بیان کر دیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے۔ "من بچن اور کرم سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤ۔ کسی کو نقصان نہ پہنچانا نیکی ہے اور کسی کو نقصان اور ضرر پہنچانا گناہ ہے۔"

بھگوت گیتا میں بار بار اشاروں اور کنایوں میں ان فرائض کا ذکر آتا ہے جو ایک انسان پر پیدائش یا زندگی میں مخصوص نام و مرتبہ کی وجہ سے انسان کے ضروری ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی انسان کے نظریۂ حیات کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اُس نے کہاں جنم لیا ہے۔ زندگی میں اس کا کیا درجہ ہے اور سوسائٹی میں اس کو کیا مقام حاصل ہے اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری اور لازمی امر ہے کہ ہم ایسے کرم کریں جن سے اس سماج اور سوسائٹی کا نام روشن ہو، جس میں ہم نے جنم لیا ہو لیکن یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے والی ہے کہ سب سماجوں سوسائٹیوں اور سب ملکوں اور

قوموں میں نہ تو حالات ایک طرح ہوتے ہیں اور نہ ہی نصب العین ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو تعصب اور عناد ہے اس کی بڑی وجہ ہماری یہی لاعلمی اور جہالت ہے۔ ایک امریکی باشندہ سوچتا ہے کہ میں نے اپنے ملک کے رسم و رواج کے مطابق جو کچھ کیا ہے بہترین کیا ہے۔ اور جو شخص ایسا نہیں کرتا، اس کی تقلید نہیں کرتا غیر معقول اور بدکار شخص ہے۔ ایک ہندو سمجھتا ہے کہ صرف اس کے رسم و رواج نہ صرف درست ہیں بلکہ ساری دنیا میں اعلیٰ ترین ہیں۔ اور جو ان پر عمل پیرا نہیں ہوتا وہ شخص بدکار اور خبیث ہے۔ یہ ایک ایسی شدید غلطی ہے جس کا ہم میں ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن یہ غلط رجحان بہت نقصان دہ ہے اور دنیا میں اس وقت جو شر و فساد پایا جاتا ہے اس کا پچاس فی صدی حصہ اس غلط رجحان اور تعصب کی پیداوار ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ دوسروں کے فرائض کا جائزہ ہم اُن کے مخصوص زاویۂ نگاہ یا نظریۂ حیات سے ہی لیں اور کبھی دوسرے لوگوں کے رسم و رواج کا فیصلہ اپنے رسم و رواج سے نہ کریں۔ کسی کے رسم و رواج یا نظریات کے بارے میں عدل کرنے والا میں کون ہوتا ہوں؟ مجھے اپنے آپ کو دنیا کے موافق ڈھالنا ہے نہ کہ دنیا کو اپنے سانچے میں ڈھالنا اور اپنے مطابق وموافق بنانا ہے اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حالات اور گردوپیش ہمارے فرائض کو ادلتے بدلتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس دُنیا میں سب سے اعلیٰ و ارفع کام جو کر سکتے ہیں۔ صرف یہ ہے کہ ہم خاص وقت کے مخصوص فرض کو بہترین طور پر انجام دیں۔ آئیے سب سے پہلے ہم وہ فرض ادا کریں جو پیدائش کی وجہ سے ہم پر لازم ہوتا ہے اور جب ادھر سے فارغ ہو جائیں تو ان فرائض کو پورا کرنے کی سعی کریں جو زندگی سوسائٹی اور سماج میں ہمارے مخصوص مقام نے ہم پر لازمی قرار دیے ہیں۔

لیکن ہم اپنی فطرت کے ایک عیب اور نقص کو اپنی نظروں سے اوجھل رکھتے ہیں۔ ہماری فطرت اور سرشت کا سب سے بڑا خطرناک عیب یہ ہے کہ ہم خود اپنا مطالعہ نہیں کرتے۔ ہمیں دوسروں کو دیکھنے سے ہی اتنی فرصت نہیں ملتی کہ ہم اپنے آپ کو دیکھیں اپنا مطالعہ کریں۔ اپنا تجزیہ کریں۔ جسے دیکھئے اپنے آپ کو تیس مار خاں سمجھا بیٹھا ہے۔ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ تخت سلطانی پر بیٹھنے کا اُسے حق حاصل ہے۔ مگر ایسا سوچنے سے پہلے اُسے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جو فرائض موجودہ حالات نے اُس پر لازم کیے ہیں، انہیں پورا کیا ہے یا نہیں بعد ازاں دوسرے اعلیٰ فرائض کا دھیان آنا چاہیئے۔ جب ہم دنیا میں کوئی کام کرنا شروع کرتے ہیں تو دُنیا دائیں بائیں سے ہم پر ضربیں لگاتی ہے۔ بہت جلد ہمیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ ہم اس بات کا صحیح احساس کر لیں کہ ہم کیا ہیں؟ سماج اور معاشرہ میں ہمارا مقام کیا ہے؟ کوئی آدمی اس منصب اور عہدہ پر بہت دیر تک فائز نہیں رہ سکتا۔ جس کے لئے وہ مستحق اور ضروری نہ ہو۔ نظامِ قدرت کے خلاف گریہ زاری اور شکوہ و شکایت کرنے سے کیا حاصل ہوگا؟ ہلکا اور ادنیٰ کام کرنے سے کوئی شخص

ہلکا اور ادنیٰ نہیں ہوجاتا اور نہ ہی کبھی انسان کے متعلق فیصلہ اس بات سے کیا جانا چاہئیے کہ اس کے فرائض کیسے ہیں۔ سب کا حساب اور فیصلہ تو اس بات سے کیا جائے گا کہ انہوں نے ان فرائض کو کس خوش اسلوبی اور کس ڈھنگ سے انجام دیا ہے

آگے چل کر ہم اس فیصلہ پر پہنچیں گے کہ فرض کے متعلق بھی نظریہ اور تصور تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کریں گے کہ سب سے اعلیٰ و ارفع کام اُسی وقت ہوتا ہے جب اس کام کے پیچھے کوئی خودغرضانہ جذبہ کارفرما نہ ہو جائے لطف تو یہ ہے کہ یہ کام بھی ایک خواہش تکمیل فرض ہوتی ہے جس کی تحریک اور ترغیب پر ہم بے لوث کام کرتے ہیں۔ جب نظریۂ حیات اس سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ تب کام عبادت اور بندگی بن جاتا ہے نہیں بلکہ ایسا کام بندگی اور عبادت سے بھی کہیں زیادہ سربلند اور ممتاز ہوتا ہے اور ایسا کام خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے۔

ذرا غور سے دیکھئے تو آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ فلسفہ فرض، خواہ ضابطہ اخلاق کی صورت میں عیاں ہو یا رشتۂ محبت کا لبادہ اوڑھے ہو۔ ایک ہی ہے شکل و صورت عمل الگ الگ ہیں لیکن روحِ عمل تو ایک ہی ہے۔ اور یہ فلسفہ فرض وہی ہے جو دوسرے ہر روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے اور یہ فلسفہ فرض ہے اپنے آپ کو لطیف و رقیق بنا۔ اپنے نفس کی تمام کثافتوں اور آلائشوں سے کنارہ کش ہونا تاکہ ہمارا حقیقی اپنا آپ رُخِ جمال دکھا سکے ہماری جو قوتیں اور طاقتیں ادنیٰ اور حقیر باتوں میں ضائع ہوتی چلی جا رہی ہیں اور اس چند روزہ حیات کی کشمکشوں کی نذر ہوتی جا رہی ہیں انہیں بچایا جا سکے، اعلیٰ و ارفع مقاصد کے حصول کی طرف مامور کیا جا سکے۔ تاکہ ہماری آتما اعلیٰ سطح تک پہنچ سکے نور ازلی سے ہمکنار ہو سکے اور نغمۂ توحید سے بہرہ ور ہو سکے لیکن ایسا ہونا تبھی ممکن ہے اگر ہم مسلسل اور پیہم اپنی ادنیٰ خواہشوں کو مارتے چلے جائیں۔ اپنے نفس کی شرارتوں اور سرکشیوں کا خاتمہ کرتے چلے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فرض اور کام محنت شاقہ کا سزاوار ہے۔ ہماری سوسائٹی اور ہمارے معاشرے کا تانا بانا دیدہ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر عمل و تجربہ کی بنیادوں پر اس طرح استوار کیا گیا ہے کہ جوں جوں ہم خودغرضی اور نفس پرستی کو کم کرتے چلے جائیں گے انسان کی حقیقی فطرت اپنی تمام رعنائیوں اور دلکشیوں کے ساتھ بحد حساب وسعت اور فروغ پکڑتی چلی جائے گی۔

ادائیگی فرض شاید ہی کبھی خوش گوار ہوتی ہو۔ یہ تو جوہرِ محبت ہے جو اس کی ناگواریوں کو خوشگواریوں کا جامہ پہناتا ہے اور اس کی تلخیوں کو خوشیوں میں ڈھال دیتا ہے محبت کے بغیر ادائیگی فرض کشیدگی۔ ناچاقی اور تلخی پیدا کرتی ہے ورنہ والدین اپنے بال بچوں کے لئے فرائض کیسے انجام دیں۔ خاوند اپنی بیویوں کے لیے اور بیویاں اپنے شوہروں کے لئے کیوں کر تکمیل فرض کی طرف راغب اور محو ہو سکتی ہیں کیا ہم اپنی زندگیوں میں آئے دن اس ناچاقی اور تلخی سے دوچار نہیں ہوتے ؟ لیکن جب اس فعل میں جوہر محبت ملا دیا جائے۔ جذبہ محبت تکمیل فرض

www.taemeernews.com

کے جذبہ کے ہمرکاب ہو جائے تب ہی فرض اور فعل جگمگا اُٹھتا ہے۔ لیکن یاد رکھیے کہ محبت صرف آزادی کی فضاؤں میں ہی پروان چڑھتی ہے۔ اور صرف آزاد فضاؤں میں ہی اپنے رُخِ جمال کو بے نقاب کرتی ہے۔

مقامِ افسوس ہے کہ ہم نے اس آزادی کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ اپنے نفس کے غلام بن جائیں کبھی غصہ کے کبھی حسد کے کبھی انتقام کے کبھی کینہ کے۔ انسانی زندگی میں آئے دن ہمارے دلوں میں شر و فساد، کفر و کذب کی جو جو صورتیں اُبھرتی رہتی ہیں ہم ان میں سے ہر صورت نفس کے غلام بننے کو ہی آزادی سمجھ بیٹھے ہیں۔ حالانکہ اعلیٰ ترین مقدم ترین آزادی کا مطلب و مفہوم یہ ہے کہ زندگی کی تمام چھوٹی موٹی تلخیوں، پریشانیوں، مشکلوں اور آفتوں میں قوتِ برداشت اور صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیں۔ لیکن اس بُردباری، اس تحمل مزاجی اور اس رضا و تسلیم، اس صبر و شکر کی خُو کو کیا ہو گیا ہے؟ عورتوں کو دیکھیے تو وہ تنک مزاجی، زود رنجی اور حسد و کینہ اور فطرت کی وجہ سے شوہروں کو جلی کٹی سناتی چلی جاتی ہیں۔ اپنی آزادی کی دھونس جماتی ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ ایسا کرتی ہوئی وہ محض اپنے آپ کو غلام ثابت کرتی ہیں یہی کیفیت شوہروں کی ہے جو ہمیشہ بیویوں کو ہی غلط کار سمجھتے رہتے ہیں۔

ترقی اور عروج کا راز صرف یہ ہے کہ ہم اپنے فرض کو ادا کرنے میں جُٹ جائیں اور اس طرح طاقت و قوت حاصل کرتے ہوئے قدم قدم رواں دواں آگے بڑھتے چلے جائیں حتیٰ کہ ہم سب سے بلند اور اونچی کیفیت کو حاصل کرلیں۔

ایک جواں سال سنیاسی اور درویش (حضرت فرید) ایک مرتبہ جنگل میں گئے وہاں انہوں نے کڑی عبادت کی اور کافی عرصہ تک خُدا کی یاد میں محو ہو کے یوگ کماتے رہے۔ برسوں کے جپ، تپ، ریاضت و عبادت کے بعد ایک دن وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے سر پر چند گھاس پھوس کے تنکے آکر گرنے شروع ہو گئے۔ گردن اُوپر اٹھا کر دیکھا تو چند چڑیوں کو آپس میں لڑتے پایا۔ یہ برہم ہو گئے۔ بولے "تم میں اتنی جرأت کہ میرے سر پر گھاس پھوس کے ڈالتی ہو؟" یہ کہہ کر انہوں نے غصہ سے ان چڑیوں کی طرف دیکھا۔ ایک شعلہ سا ان کی آنکھوں سے نکلا جس نے چڑیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اپنی آنکھ اور زبان میں اس قدر کراماتی طاقت دیکھ کر انہیں بعید خوشی اور گھمنڈ ہوا۔ کچھ وقت پا کر وہ خیرات مانگنے شہر میں گئے۔ ایک گھر کے باہر کھڑے ہو کر انہوں نے الکھ جگائی۔ بوڑھی ماں نے اندر سے جواب دیا "بیٹا ٹھہر و ابھی آتی ہوں"۔ انتظار کرنے کو توہین تصور کرتے ہوئے اس درویش کو صاحبہ خانہ پر سخت طیش آیا۔ دل میں کہنے لگے اے حقیر عورت تجھ میں اتنی جرأت اور تیری اتنی گستاخی کہ مجھ جیسے خدا رسیدہ اور کراماتی طاقتیں رکھنے والے درویش کو بھکشا کے لئے انتظار کراؤ شاید تمہیں پتہ نہیں کہ مجھ میں کتنی طاقت ہے، اندر سے ماں بولی "بیٹا یہاں چڑیاں تھوڑے ہیں جو تمہارے کہنے مرجائیں گی اپنے

اُدھر اس قدر گھمنڈ نہ کرو" درویش یہ جواب سُن کر ہکّا بکّا رہ گئے، بولے ماں! غیب کا علم تم نے کہاں سے سیکھا کو منسا یوگ کہلانے سے تم انتریامی بن گئیں؟" ماں بولی "بیٹا! میں یوگ وغیرہ کچھ نہیں جانتی اور تمہاری طرح کرم دھرم بھی نہیں کرتی۔ میں تو ایک معمولی عورت ہوں۔ میرا خاوند بیمار ہے اس کی خدمت میں مصروف ہونے کی وجہ سے میں جلدی نہ آسکی اور تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ زندگی بھر میں نے ادائیگی فرض کی خاطر جدوجہد کی ہے۔ جب میں کنواری تھی، میں اپنے ماں باپ کی خدمت میں مصروف رہتی تھی۔ شادی ہونے کے بعد میں نے خاوند کی خدمت کو اپنا دستورِ حیات بنالیا۔ دن رات اسی کی خدمت میں گذر جاتے ہیں۔ یہی ہے وہ یوگ جس کی میں نے کمائی کی ہے فرض شناسی کی بدولت میری چشمِ باطن کھل گئی ہے مجھے روشن ضمیری مل گئی اسی آنکھ سے میں نے تمہارے دل کی خلوتوں میں موجزن خیالات پڑھ لیے تھے اور یہ دیکھ لیا تھا کہ تم جنگل سے کیا کچھ کر کے آرہے ہو....' یہ کہانی اس بات پہ مہر تصدیق ثبت کرتی ہے کہ معراجِ عبادت ادائیگی فرض ہے۔

فرض و خدمت کے متعلق گلا اور شکوہ تو اس کی زبان پر رہتا ہے جس کے دل کی نگاہیں انجام و نتیجہ پر لگی رہتی ہیں۔ جو حق الخدمت اور ثمرہ انجام کے بارے میں بے نیاز ہو اس کی زبان حرفِ شکایت سے غیر آشنا رہتی ہے۔ اس کے لیے تو ہر خدمت اور ہر فرض اچھا ہے۔ وہ اس کام کو اس قدر انہماک سے انجام دیتا ہے کہ اس کی خودغرضی اور نفس پرستی مٹ جاتی ہے۔ اور روح کی آزادی اور سرشاری سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

ہم فطری طور پر اپنے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا شکار رہتے ہیں۔ لیکن جہاں کام کرنے کا وقت آتا ہے، ہم جھنجھلا جاتے ہیں اور واہی تباہی بولنے لگ جاتے ہیں اور دوسروں کو دیکھ دیکھ کر سیخ پا ہوتے جاتے ہیں حالانکہ یہ مقابلہ اور موازنہ ہمیشہ رقابت و حسد و بغض و کینہ پیدا کرتا ہے اور شاخِ دل سے رحم و کرم کی تمام کلیوں کو نوچ دیتا ہے اور مسل ڈالتا ہے۔ گلہ و شکایت کی وجہ سے بڑبڑانے والے کے لیے ہر فرض بدمزگی پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندر ایک ایسی تشنہ لبی اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے جسے دنیا کی کوئی شے نہیں مٹا سکتی۔ اس کا دل ہمیشہ سکون سے غیر آشنا رہتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی ساری زندگی اجیرن بن کر رہ جاتی ہے۔ تمام زندگی محرومیوں اور پریشانیوں کی تصویر بن جاتی ہے۔

زندگی کا بہترین مصرف یہی ہے کہ ہم کام کرتے رہیں اور جو جو فرائض ہمارے سامنے آئیں انہیں پوری سرگرمی مستعدی اور ہمت کے ساتھ ادا کرتے جائیں۔ ایسا کرنے سے ہی ہم نورِ ازلی اور رحمتِ الٰہی سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔

---

www.taemeernews.com

69

مالک کی طرح کام کرو

بھگوت گیتا میں ہم بار بار پڑھتے ہیں کہ ہمیں مسلسل اور لگاتار کام کرتے رہنا چاہیئے۔ لیکن کیا کبھی ہم نے اس قول کی گہرائی پر بھی غور کیا ہے۔ قدرتی طور پر ہر کام کا اچھا اور برا پہلو ہوتا ہے۔ کوئی بھی کام کیجئے، اس سے کسی نہ کسی کو کوئی فیض و فائدہ پہنچے گا اور کسی نہ کسی کو کوئی نقصان ضرور ہوگا۔ لازمی طور پر ہر کام میں اچھائی اور برائی ملی جلی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ہمیں یہی ہدایت و تعلیم دی جاتی ہے کہ ہم رُکے بغیر مسلسل اور متواتر کام کرتے چلے جائیں۔ اُس کے بُرے اور اچھے پہلو خود بخود اپنے اثرات پیدا کرتے چلے جائینگے یہ ایک کرم چکر ہے۔ جو چلتا آیا ہے۔ چل رہا ہے اور یونہی چلتا جائے گا۔ اچھے اور نیک کام سے اچھائی اور نیکی ملے گی۔ اچھا اور نیک اثر پیدا ہوگا۔ بُرے کام سے بُرائی آئے گی اور بُرا اثر پیدا ہوگا۔ لیکن یہ اچھائی اور بُرائی، یہ نیکی اور بدی بھی کیا ہے؟ رُوح کی قید، آتما کا بندھن! گیتا نے اس پاپ اور پُنیہ، نیکی اور بدی سے چھٹکارہ پانے کے لیے لاجواب ہدایت دی ہے۔ گیتا کہتی ہے کہ اگر آپ نِشکام اور بے لوث ہوکر، نتائج سے بے نیاز ہوکر، بے تعلقی کو شعار زندگی بناکر کام کرینگے تو اس کام کے اچھے یا بُرے اثرات آپ کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکیں گے تو آیئے یہ جاننے کی کوشش کریں کہ کرم میں نشکامتا کہاں سے آتی ہے اور کام کرتے ہوئے اس سے بے نیاز رہنے کا راز کیا ہے!

آپ نے کچھوا دیکھا ہوگا۔ جب یہ اپنی گردن اور پاؤں کھوپڑی کے اندر سمیٹ لیتا ہے، تب چاہے آپ اس کو مار ڈالیں یا ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ وہ اس سے باہر نہیں نکلے گا، کچھ ایسی کیفیت ہوتی ہے۔ اس انسان کی جس نے اپنے نفس پر کلیتاً قابو پالیا ہو جس نے اپنے دلوں کے محرکات کو اپنے بس میں

209 www.taemeernews.com

کرلیا ہو۔ اُسے اپنی اندرونی قوتوں اور طاقتوں پر اس قدر قابو اور غلبہ حاصل ہوتا ہے کہ پھر کوئی لاکھ چاہے اُسے اس کی رضا و رغبت کے بنا باہر نہیں نکال سکتا۔ لگاتار ان اچھے اور نیک خیالات اور تصورات کو جو بار بار سطحِ ذہن پر رقص کرتے رہتے ہیں، اپنے دل و دماغ کی پنہائیوں میں اُتارتے رہیے۔ اُن کے عکسِ جمیل کو اپنی رُوح میں دیکھنے کے فعلِ اضطراری کی بدولت اچھائی اور نیکی کرنے کا رُجحان مضبوط و مستحکم بن جاتا ہے۔ اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی پانچوں گیان اندریوں اور پانچوں کرم اندریوں کو اپنے بس میں کر لیتا ہے۔ اُن پر پوری طرح قابو پالیتا ہے۔ صرف ایسا کرنے سے انسان کی سیرت بنتی ہے۔ اخلاق تعمیر ہوتا ہے اور انسان حق تک پہنچ سکتا ہے۔ ایسا انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مُکت ہو جاتا ہے۔ وہ کبھی کوئی بدی یا برائی کر ہی نہیں سکتا۔ ایسے انسان کو کسی بھی ماحول اور فضا میں رکھ دیجئے، کسی بھی سوسائٹی اور محفل میں بٹھا دیجئے، کسی بھی جگہ کوئی خطرہ یا نقصان پہنچنے کا احتمال پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن ایک درجہ اس سے بھی پرے ہے۔ جو نیک اور راستباز، حق شناس اور پارسا بننے سے بھی اونچا ہے اور یہ ہے مُکتی کی آرزو، نجات کی تمنا، رہائی کی خواہش، مخلصی کی طلب۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ یہی مُکتی، نجات، رہائی اور مخلصی سب یوگ سادھنوں کے نصب العین کی طرف لے جاتا ہے۔ صرف کام کرنے سے انسان اس مقام تک رسائی اور پہنچ حاصل کر سکتا ہے جس مقام کو بھگوان بُدھ نے ریاضت اور عبادت سے حاصل کیا یا جس مقام کو حضرت عیسٰے نے دُعا اور بندگی سے پایا۔ بھگوان بُدھ کرم گیانی تھے تو عیسٰے بھگت، لیکن ان دونوں نے ایک ہی مرتبہ اور مقام پایا۔ راستے الگ الگ تھے، منزل ایک ہی تھی۔

وہ کام جس کی بدولت آپ بھی اس مرتبہ و منزل تک پہنچ پائیں۔ یہی ہے کہ اپنے بُرے رجحانات اور اور خیالات کی مخالفت اور مزاحمت اچھے رجحانات اور خیالات سے کریں۔ اور ہم میں جو خراب، پراگندہ یا بُرے تاثرات پیدا ہو چکے ہیں، اُن کی جگہ اچھے اور نیک تاثرات کو دل میں بٹھائیں۔ جتنے کہ دل کے ہر گوشے میں دبے چھپے ہوئے خیال اور تاثر کی سرکوبی یا بیخ کُنی کرلیں۔ اس کے بعد اچھے رجحانات اور تاثرات کو بھی قابو کرنا ہوگا۔ ایسا کرنے سے ہی جڑے ہوئے دل کو توڑا جا سکتا ہے۔ تعلقداری کو بے تعلق کیا جا سکتا ہے غلام کو آقا بنایا جا سکتا ہے۔ حُسنِ عمل یہی ہے کہ کام کرو لیکن اُسے اپنی رُوح پر گہرا اثر پیدا نہ کرنے دو۔ سطحِ آب پر اُٹھنے والے بُلبلوں اور فنا ہو جانے والی لہروں کی طرح ان تاثرات اور محسوسات کو آغوشِ فنا میں مٹ جانے دو۔ آپ کے دست و بازو رگ و ریشے، یا فہم و فکر بھلے ہی کے لیے اور بھلائی کا موہ کو کرتے رہیں لیکن آپ کی رُوح اُن کے تاثرات سے بے نیاز اور بے داغ رہنی چاہیے۔

 www.taemeernews.com

یہ قوت وقدرت کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے؟ اس سوال کا جواب لینے سے پہلے سوچیے کہ جو کام بھی آپ دل ودماغ کی تمام رغبتوں اور اُلفتوں کو اس سے وابستہ کرکے سرانجام دینگے، وہ ایک گہرا اثر چھوڑ جائے گا۔ میں دن بھر میں سینکڑوں لوگوں سے ملتا ہوں۔ اُن کی سُنتا ہوں اور اپنی سُناتا ہوں اس ہجوم میں ایسے شخص سے بھی مُلاقات ہو جاتی ہے جسے میں پیار کرتا ہوں۔ رات کو سوتے وقت جب دل میں اُن تمام چہروں کے نقوش کا پرتو دیکھنے کی سعی کرتا ہوں تو رہ رہ کر اُسی شخص کی صُورت اُبھرتی چلی جاتی ہے۔ اُسی کے خدوخال آئینۂ دل پر اجاگر ہو جاتے ہیں۔ جس سے میں محبت کرتا ہوں اور جسے شائد ایک منٹ سے زیادہ دیکھ بھی نہیں پایا تھا۔ باقی سب چہرے مٹ جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس شخص کے ساتھ مجھے جو اُنس وپیار ہے اُس نے میرے دل ودماغ میں گہرا اثر پیدا کر رکھا ہے دوسروں کے ساتھ رغبت واُلفت نہ تھی۔ اِس لیئے اُن کی صُورتیں خانۂ ذہن میں محفوظ نہ رہ سکیں۔ علم ترکیب اجسام حیوانات کے مطابق دیکھا جائے تو سب ملنے والوں کی صورتوں کے عکس آئینۂ دل پر اُترے ہیں۔ میری آنکھ کی پتلی ہر اُس مُورت وصُورت کی تصویر اُتارتی چلی گئی۔ جسے میں نے دیکھا، لیکن اس کے باوجود سب تصویریں کے عکس ایک جیسے نہیں ہوتے۔ بہت سی تصویریں پھیکی پھیکی سی تھیں۔ اُتریں اور مٹ گئیں، بعض چہرے تو بالکل غیر مانوس اور اجنبی سے تھے۔ اکثر وبیشتر پہلی بار دیکھے تھے۔ اُن کے بارے میں دل میں کبھی کوئی سوچ بھی نہ آئی تھی۔ لیکن جس سے محبت تھی اس کے چہرے کا ہلکا سا عکس بھی دل پر گہرے نقوش پیدا کر گیا۔ شائد اس لیئے کہ دل وذہن میں اس سے پہلے ہی کتنے خاکے اور نقوش موجود ومحفوظ تھے۔ اِن نقوش کو میں برسوں سے اُتارتا چلا آرہا تھا۔ اس لیئے جونہی اس سے آنکھیں چار ہوئیں۔ کتنے ہی خوابیدہ نقوش بیدار ہو گئے۔

اس ساری تعلیم وتلقین کا لُب لباب یہی ہے کہ مالک کی طرح کام کرو۔ نوکر کی طرح نہیں۔ مُسلسل اور پیہم کام کرو لیکن کام کے غلام بن کر نہیں۔ آپ دیکھتے نہیں کہ ہر شخص کیسے کام کرتا ہے۔؟ جسے دیکھیے مصروف کار ہے۔ اس جہان میں مکمل آرام کسے نصیب ہے؟ سب کام میں جُتے ہوئے ہیں لیکن نوے فی صدی لوگ غلاموں کی طرح کام کرتے ہیں۔ اور نتیجہ نکلتا ہے ذلت وخواری، رنج وغم، دردوکرب۔ وجہ یہ ہے کہ یہ سب کام خود غرضی سے کیا جاتا ہے۔ ہمارے دلوں کی خود غرضی ہی یہ رنگ لاتی ہے۔ اِس لیئے میں پکار پکار کر تمہیں تلقین کرتا ہوں کہ کام آزادی کے ساتھ کرو۔ بے تعلقی کے ساتھ کرو۔ محبت کے ساتھ کرو۔

یہ لفظ عشق ومحبت کتنا مشکل اور مہمل سا لفظ ہے جس کے پُورے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ جذبہ

www.taemeernews.com

عشق و محبت اس وقت تک بیدار ہی نہیں ہوتا، جب تک آزادی حاصل نہ ہو۔ آزادی ہی سچے جذبہ محبت کو جنم دیتی ہے۔ اور اسے پروان چڑھاتی ہے۔ غلام کے دل میں سچی محبت ہو ہی نہیں سکتی۔ چند کھنکھتے سکّے دے کر آپ غلام خرید لائیں۔ اُسے زنجیریں پہنا دیں۔ اور محنت و مشقت پر مامور کر دیں۔ وہ ایک بے نوا حیوان کی طرح خلافِ طبع سب محنت و مشقت کرتا چلا جائے گا۔ لیکن یہ کام پیار و محبت سے خالی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب ہم بھی دُنیادی چیزوں کے لیے غلاموں کی طرح کام کریں گے، تو ہمارے کاموں میں نہ محنت ہوگی اور نہ برکت۔ اور ہم جتنا کام بھی کریں گے؛ غیر حقیقی سا کام ہوگا۔ خواہ یہ کام ہم عزیز و اقارب کے لیے کریں۔ یا اقربا واحباب کے لیے یا پھر اپنے آپ کے لیے۔ جذبہ خود غرضی کے تحت کیا گیا سب کام، غلاموں ایسا کام ہوگا۔ جس میں نہ برکت کی چمک دمک ہوگی اور نہ محبت کی خوشبو؛

اور پھر اس کی ایک پرکھ بھی ہے۔ محبت کا ہر کام مسرتوں اور خوشیوں کو دینے والا ہوتا ہے۔ ایک بھی ایسا کارِ الفت نہیں جو اپنے دامن میں سکون و قرار، رحمت و برکت نہیں لاتا۔ محبت و مسرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حقیقی زندگی حقیقی علم اور حقیقی محبت یہ تینوں روزِ اوّل سے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں ایک ہوگی، وہاں دوسری دونوں موجود ہونگیں۔ یہ تینوں ایک ہی جمال و کمال کے تین پرتو ہیں۔ دوسرے دو کا خیال کیے بغیر ایک کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے ہم تینوں کو اکٹھا پکارتے ہیں ست (ہستی) چت (علم) آنند (مسرت)، جب ہستی اضافی و اعتباری بن جاتی ہے تو کائنات کی صورت میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اسی نسبت اور اعتبار سے علم کائناتی چیزوں کا علم بن جاتا ہے۔ اور رحمت و برکت انسانی دلوں سے شناسا محبت کی بنیاد بن جاتی ہے۔

وہ محبت سچی محبت نہیں ہوتی جو عاشق یا معشوق دونوں میں سے کسی ایک کو رنج و عذاب دے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص ایک عورت سے محبت کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ پری جمال اس کی اور صرف اس کی ہو رہے۔ اس لئے وہ عورت کی ہر حرکت کو نگاہِ حسد سے دیکھتا ہے وہ چاہتا ہے کہ وہ بیٹھے تو اس کے پہلو میں اُٹھے تو اسی کے ساتھ، چلے تو اسی کے ہمرکاب اور ہم دوش۔ کھائے تو ہم نوالا اور ہم پیالہ بن کر۔ اس کی ہر حرکت اُسکے اشاروں کی مرہونِ منّت ہو۔ لیکن کیا یہ محبت ہے؟ نہیں! وہ خود اس پیکرِ حُسن کی زُلفِ گرہ گیر کا غلام ہے۔ اور اُسے اپنا غلام بنانا چاہتا ہے۔ اُس کا نام عشق و محبت تو نہیں۔ یہ تو ایک غلام کی دل لگی ہے۔ جس نے عیاری سے عشق و محبت کا جامہ اوڑھ رکھا ہے۔ یہ دلبسری، آشنائی

www.taemeernews.com

دل لگی تو حقیقی عشق و محبت نہیں کہلا سکتی کیونکہ اس کا انجام رنج و عذاب ہے، درد و کرب ہے عشق کو درد و کرب سے کیا واسطہ؟ عشق تو راحت و تسکین ہے، سکون و قرار ہے۔ رحمت و برکت ہے۔ جو محبت دل کو سکون، جان کو راحت اور ہمارے دامنِ احساس کو رحمت و برکت سے نہ بھر دے وہ محبت حقیقی محبت نہیں ہو سکتی ایسی محبت کے جامہ عیاری کو تار تار کر کے دیکھ لیجیے کوئی اور جذبہ ہی کارفرما ملے گا اس جذبہ کو عشق حقیقی کیسے کہا جا سکتا ہے؟ آپ اگر اپنے خاوند، بیوی، بال بچے ساری دنیا کل کائنات سے ایسی ہی حقیقی محبت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ آپ کو نہ اندیشہ درد و کرب ہے نہ خطرہ حسد و رقابت آپ حقیقتاً اس کیفیت سے بہرہ ور ہو چکے ہیں جسے کیفیتِ بے نیازی کہا جا سکتا ہے۔

جو محبت حق و صلہ مانگتی ہے۔ وہ محبت کیسی؟ محبت دیتی ہے کچھ لینے کی آرزو مند نہیں ہوتی۔ کیا آپ اپنے بال بچوں کو جو کچھ دیتے ہیں ان سے اس کا حق و صلہ طلب کرتے ہیں؟ نہیں! کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ ان کی خدمت کرنا ان کے لیے محنت و مشقت کرنا آپ کا فرض تھا، آپ اس فرض سے سبکدوش ہونے کے عوضانہ اور قیمت وصول کرنے کے لئے دستِ سوال دراز نہیں کرتے۔ وسیع القلبی سے کام لیجیے، آپ خواہ کسی بھی فرد و قوم کسی بھی شہر و ملک کے لئے کوئی بھی کام کریں۔ اسی طرح کریں جس طرح اپنے بال بچوں کے لئے کرتے ہیں۔ حق خدمت یا صلہ و قیمت کی امید و آرزو نہ رکھو اگر آپ اٹل طور پر ایسا دینے والا عنایت کرنے والا داتا بن جائیں گے کہ جو کچھ بھی دنیا کو لٹائیں بلا صلہ و قیمت لٹائیں اور جو کچھ بھی دنیا کو دیں بلا معاوضہ دیں۔ آپ کا کوئی بھی کام آپ کے لئے کوئی بندھن گرفت، قید یا کرب پیدا کرنے والا نہیں رہے گا آپ آزاد اور بے نیاز رہیں گے، گرفت تو شرک کی پیداوار ہے۔ دل لگی اور پکڑ تو وہاں نمودار ہوتی ہے، جہاں صلہ و معاوضہ کی آرزو ہوتی ہے۔ یہ آرزو ہی نہ رہی تو پھر گرفت کیسی؟

اگر غلاموں کی طرح کام کرنے سے خود غرضی، دل لگی اور گرفت پیدا ہوتی ہے تو اپنے دلوں کے مالک و آقا بن کر کام کرنے سے رحمت و برکت اور بے نیازی ملتی ہے۔ ہم اکثر حق و انصاف کی باتیں کرتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں حق و انصاف کی باتیں طفلانہ گفتگو سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ ایک ہے قوت اور دوسری ہے رحم و کرم۔ اکثر صورتوں میں قوت اور تشدد کا استعمال خود غرضی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر مرد اور عورتیں اپنے حق و اختیار کے بل بوتے پر دنیا کا سب کچھ سمیٹ لینا چاہتے ہیں لیکن دوسری طرف رحم و کرم ایک خدائی جذبہ ہے۔ رحم و کرم گویا کلیدِ بہشت ہے لیکن رحم و کرم کرنے سے ہمیں رحیم و کریم بننا ہوگا۔ حق و انصاف کی بنیاد بھی رحم و کرم پر ہونی چاہیے۔ کسی کام کا صلہ و معاوضہ حاصل کرنے کی آرزو ہماری روحانی ترقی روک دیتی ہے بلکہ بالآخر رنج و الم لاتی ہے۔ رحم و کرم اور بے لوث سخاوت کے خیال و فکر کو عملی صورت پہنانے کا ایک اور ذریعہ

بھی ہے اور وہ ہے سرگن ایشور میں یقین واعتقاد رکھتے ہوئے کام کو عبادت اور بندگی تصور کرنے لگیں۔ اس صورت میں ہم اپنے تمام کاموں کا ثمر حوالۂ خدا کر دیں۔ ایشور ارپن کر دیں۔ اور اس طرح ایشور کی عبادت کرتے ہوئے بنی نوعِ انسان کی خدمت کریں اور اپنی اس خدمت کا کوئی صلہ و معاوضہ طلب نہ کریں۔ وُہ پروردگار خود مسلسل اور پیہم کام کرتا ہے اور ہمیشہ بے تعلق اور سب سے نیارہ رہتا ہے۔ جیسے پانی کنول کی پتیوں کو نمناک نہیں کر سکتا، اسی طرح کوئی کام کسی بے غرض اور بے لوث انسان کو پابند و اسیر نہیں بنا سکتا۔ ایسا کوئی گُناہ اس کی طرف آنکھ اُٹھانے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔

قربانیِ نفس جاں نثاری اور ایثار کی بہترین مثال حسبِ ذیل داستان سے مل سکتی ہے:۔ کورو کھیشتر کی جنگ کے بعد پانچوں پانڈو بھائیوں نے بہت بڑا یگیہ کیا اور غریبوں محتاجوں کو بہت کچھ دیا۔ تمام لوگ اس قدر بڑے یگیہ سے بہت حیران ہوئے اور پانڈووں کی بے نظیر سخاوت اور دریا دلی دیکھ کر کہنے لگے کہ ایسا یگیہ دُنیا میں پہلے کبھی نہیں ہوا۔ جب سب تقریبات ختم ہو گئیں تو وہاں ایک نیولا نمودار ہُوا جس کا آدھا جسم مٹیالے رنگ کا تھا اور آدھا سُنہری۔ اس نے یگیہ شالہ میں ناچنا کودنا شروع کر دیا اور زور زور سے کہنے لگا کہ "تم سب جھوٹ بولتے ہو۔ یہ یگیہ یگیہ نہیں۔" لوگ حیران ہو کر بولے "تم کیا کہتے ہو؟ کیا تمہیں پتہ ہے کہ اس یگیہ پر کس قدر دولت بہائی گئی ہے اور اس قدر دولت خیرات میں دی گئی ہے کہ ہر شخص امیر و مسرور بن کر جائے۔ ایسا یگیہ تو ہم نے نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ دیکھیں گے۔" لیکن یہ نیولا بولا "ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک غریب برہمن اپنی بیوی، اپنے بیٹے اور بیٹے کی بہو کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ بہت مفلس تھے اور بچوں کو پڑھا کر جو تھوڑا بہت ملتا اُس میں گزارہ کرتے تھے۔ تب اس علاقہ میں تین سال کے لئے قحط پڑ گیا جس سے اس غریب برہمن کی حالت اور بھی خستہ ہو گئی کئی دنوں کے فاقے کے بعد برہمن کو کہیں خوش قسمتی سے تھوڑا سا جَو کا آٹا مل گیا۔ اس کے انہوں نے چار حصّے کیے تاکہ ایک حصّہ ہر ایک کو مل جائے۔ جب وُہ اسے پکا کر کھانا کھانے لگے اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ خدمتِ مہمان اتھتی پوجا کو ایشور پُوجا سمجھنے والے برہمن نے باہر آکر کہا "آئیے مہاراج پدھاریئے، ہم آپ کا سواگت کرتے ہیں یہ کہہ کر اس نے مہمان کے آگے اپنا حصّہ پیش کر دیا۔ جو وُہ برہمن جھٹ سے چٹ کر گیا اور بولا "مہاراج، تم نے تو مجھے مار دیا۔ میں تو دس دن سے بھوکا تھا۔ فاقوں مر رہا تھا۔ یہ تھوڑا سا کھانا کھا کر میری بھوک تو اور چمک اٹھی ہے۔" تب برہمن کی بیوی اپنے شوہر سے بولی "انہیں میرا حصّہ بھی دیدیجئے۔" برہمن بولا "نہیں! یہ تم کھالو" لیکن وہ بولی یہ غریب ہمارا مہمان ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ صاحبِ خانہ ہوتے ہوئے اسے پیٹ بھر کر کھانا کھلائیں اب میرا فرض ہے کہ میں اپنا حصّہ پیش خدمت کر دوں۔" مہمان نے یہ حصہ بھی کھالیا اور بولا "میری بھوک ابھی نہیں مٹی۔ کچھ اور کھانے کو

214 www.taemeernews.com

دو۔ پسر کر بیٹے نے اپنا حصہ پیش کر دیا۔ مہمان نے یہ حصہ بھی کھا لیا۔ لیکن اس کی بھوک پھر بھی نہ مٹی۔ اور پھر بیٹے کی بہو نے بھی اپنا حصہ دے دیا۔ جب مہمان نے کھا لیا اور دعائیں دیتا ہوا چل دیا۔ اس رات یہ چاروں بھوک اور فاقہ سے لقمۂ اجل بن گئے۔ وہاں فرش پر کھانے کے چند دانے بکھرے ہوئے تھے۔ جب میں ان دانوں پر لوٹ پوٹ لیٹا، میرے جسم کا آدھا حصہ سنہری بن گیا۔ اور باقی کا آدھا جوں کا توں رہ گیا۔ تب سے میں ایسے کسی دوسرے یگیہ کو دیکھنے کے لیے دنیا بھر کی خاک چھان رہا ہوں تاکہ کہیں ایسے ہی اناج کے چند اور ٹکڑے مل جائیں اور جسم کا باقی آدھا حصہ بھی سنہری بن جائے لیکن مجھے کہیں ایسا دوسرا یگیہ نہیں ملا۔ اسی وجہ سے میں یہ کہتا ہوں کہ یہ یگیہ کوئی یگیہ نہیں۔"

جذبۂ ایثار نفسی اور رحم و کرم کا خیال اب ہندوستان میں مرتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مخلص بے نفس اور نیک آدمی روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔

آپ یہ بات اب بخوبی سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ کرم یوگ کے معنی کیا ہیں؟ آخری سانس تک بلا حیل و حجت غیر مشروط طور پر رحم و کرم کرتے چلے جانا۔ اور اس کے صلہ اور عوضانہ کی آرزو تک نہ کرنا۔ لاکھوں بار ٹھگے جانے کے باوجود حرفِ شکایت منہ پر نہ لاؤ۔ ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سوچو کہ تم کیا کر رہے ہو۔ تم نے کبھی کسی محتاج اور غریب کو کچھ راہِ خدا میں دے دیا تو اس پر شیخیاں مت بگھارو۔ کسی بھی شکریہ یا صلہ کی امید و آرزو نہ رکھو۔ بلکہ دوسروں کا شکریہ ادا کرو کہ انہوں نے تمہیں سخاوت کرنے اور ایثار و قربانی کرنے کا نادر موقع بہم پہنچایا۔

---

www.taemeernews.com

ہندوستان اور اس کے مسائل

صفحہ نمبر

- ہماری مادرِ وطن 217
- موجودہ زوال 231
- حیاتِ نو کے تقاضے 247
- معاشرتی برائیوں کی بے خطا دوا 256
- عوام الناس کی اصلاح و ترقی 264
- ذات پات کا مسئلہ 275
- عورتوں کی فلاح و بہبود 284
- تمدنی زندگی کی نشو و نما 291

216 www.taemeernews.com

ہندوستان اور اس کے مسائل

INDIA AND HER PROBLEMS

www.taemeernews.com

ہماری مادرِ وطن

اگر کرۂ ارض پر کوئی ایسی سرزمین موجود ہے جو اپنے آپ کو مقدس و مبارک کہلا سکتی ہے اور خیرِ مجموعی کہلانے کا افتخار و اعزاز رکھتی ہے تو وہ ہے سرزمینِ ہند۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں سب روحوں کو راہِ خدا کی یاد دہانیاں کرتے ہوئے اور نیک و بد اعمال کی سزا اور جزا بھگتتے ہوئے واصلِ حق ہونے کے لئے آنا پڑتا ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں نوعِ انسانی نے عجز و انکساری کی، شرافت و دیانت کی، پرہیزگاری اور پاک دامنی کی، نفس کشی اور فراخدلی کی سب سے بلند و بالا چوٹیوں کو سر کیا۔ یہی وہ سرزمین ہے جو ریاضت و عبادت کی، یہیں مجاہدہ و مشاہدہ کی سرزمین ہے۔ یہ فخر و امتیاز صرف سرزمینِ ہند کے ہی نصیب و مقدر میں آیا ہے۔

یہی وہ قدیم سرزمین ہے جسے حکمت و دانش اور فہم و فراست نے کہیں اور جانے سے پہلے اپنا مسکن بنایا۔ یہی ہے وہ سرزمینِ ہندوستان جس کے سرچشمۂ روحانیت کے فیض و کرم کی آئینہ داری مادی سطح پر یا وہ دریا کرتے ہیں جن کی وسعتیں سمندروں جیسی ہیں اور دیوانہ وار رواں دواں ہیں یا پھر کشورِ ہندوستان ہمالیہ کرتا ہے جس کی برف پوش چوٹیوں اور گھاٹیوں کا سلسلہ در سلسلہ حدِ نگاہ تک بلند سے بلند تر اٹھتا ہوا خلاؤں اور فضاؤں کے اسرارِ مخفی میں کھو جاتا ہے۔ یہی ہے وہ سرزمینِ ہندوستان جسے دنیا کی سب سے بڑی برگزیدہ ہستیوں، عارفوں اور سالکوں، رشیوں و منیوں نے اپنی مقدس خاکِ پا سے قابلِ احترام بنایا۔ یہی ہے وہ مقدس سرزمین جہاں انسان کی فطرت و سیرت اور دنیائے باطن کے متعلق سب سے پہلے تحقیق و جستجو کی گئی۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں روح کی ابدیت، آتما کے انادی ہونے اور قادرِ مطلق، خدا کی ہستی کا اقرار و دعویٰ کیا گیا۔ اسی خدا کا جو قدرت کے سب نظاروں اور انسان کے سب شاہکاروں پر جلوہ آرا ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں مذہب و فلسفہ کے متعلق اعلیٰ ترین نظریے اور عقیدے بامِ عروج اور نقطۂ عروج پر پہنچے تھے۔

www.taemeernews.com

ہماری مقدس مادرِ وطن ہے یہی سرزمین مذہب و فلسفہ جس کی خاکِ پاک سے دنیا کے سب سے بڑے روحانی رہنما پیدا ہوئے۔ وہ سرزمین جو ایثارِ نفسی، تیاگ اور ویراگیہ کی دھرتی ہے۔ وہ مبارک ملک جہاں روزِ اول سے اب تک زندگی کے متعلق اعلیٰ ترین تصور و ایمان کے دروازے ہر انسان کے لیے کھلے ہوتے ہیں۔ حقیقی معنوں میں ہندوستان فلسفہ، روحانیت، اخلاق و ایمان، شرافت و نفاست، عشق و محبت، پاک دامنی اور پرہیزگاری کو جنم دینے والی سرزمین ہے۔ یہ خوبیاں آج بھی اس سرزمین پہ پائی جاتی ہیں۔ اور دنیا کے مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج بھی ہندوستان ان خوبیوں کے اعتبار سے دنیا کی تمام دوسری قوموں سے برتر اور پیش پیش ہے۔

یہ ہندوستان کی ہی سرزمین ہے جس نے صدیوں سے صدمے پہ صدمے برداشت کیے ہیں۔ سینکڑوں برسوں کی غلامی کی صعوبتیں جھیلی ہیں۔ راجوں اور مہاراجوں کے سینکڑوں انقلابات اور زلزلے دیکھے ہیں۔ ہزاروں غیر ملکی حملوں کے جور و ستم، ظلم و استبداد سہے ہیں۔ یہ ہندوستان کی ہی مقدس سرزمین ہے جو ان طوفانوں اور طغیانیوں کے باوجود چٹان کی طرح مضبوط و مستحکم کھڑی ہے۔ اسی لازوال دم خم کے ساتھ، اسی لافنا حیات و بقا کے ساتھ، ہمیشہ دائم و قائم رہنے والی اسی تابندگی اور سربلندی کے ساتھ۔

ہندوستان کی زیست و زندگی کی وہی کیفیت ہے جو روحِ انسان کی ہے۔ بے آغاز۔ بے انجام، غیر فانی، زندۂ جاوید۔ انادی۔ اجر اور امر۔ ہم اسی مقدس سرزمینِ ہند کے خمیر سے پیدا ہونے والے اس کے بچے ہیں۔

اس مقدس سرزمین پہ زندگی کی حرارتیں اور رعنائیاں اس وقت بھی مصروفِ ہنگامہ تھیں جب یونان علم وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ روم کا خیال و گمان تک کسی کے دل و دماغ میں بھی موجود نہیں تھا۔ جب جدید اور نئے یورپیوں کے آبا و اجداد ابھی جنگلوں اور بیابانوں میں وحشیوں جیسی زندگی بسر کرتے تھے اور بلکہ وہ شکل و صورت اختیار کیے حیوانوں کی طرح رہا کرتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے اس دور میں جب صحیح تاریخ نمودار نہیں ہوئی تھی اس دور میں جس تک ہمارا علم و قیاس بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس دور میں جس دور کی ہر بات گھٹا ٹوپ اندھیرے میں لپٹی ہوئی ہے۔ اس زمانۂ آفرینش میں بھی یہی مقدس سرزمین حق و ایمان کے متعلق نئے نئے خیال، نت نئے نظریے اور نت نئے عقیدہ کو جنم دیتی چلی آئی ہے۔ اور پھر جو بھی لفظ اس ملک کی خاکِ مقدس سے بلند ہوا اپنے آگے پیچھے رحمتیں اور برکتیں لے کر بلند ہوا۔ تاریخِ عالم کی ورق گردانی کر دیکھئے۔ آپ اسی نتیجہ پہ پہنچیں گے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی اچھا نظریہ اور عقیدہ ملے گا، ہندوستان سے مستعار لیا ہوا ملے گا۔ کیونکہ نیکی اور پارسائی کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا۔ زمانۂ قدیم سے ہندوستان کی سرزمین بنی آدم کے معاشرے کو بیش بہا نظریوں اور عقیدوں سے مالا مال کرتی چلی آئی ہے۔ اعلیٰ ترین اخلاقی قدریں اسی سرزمین سے پیدا ہوئیں اور یہیں پہ وان چڑھیں۔ ہندوستان نے ان قدروں پہ اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی بجائے ان نظریوں اور عقیدوں کو فراخدلی کے ساتھ ساری دنیا

www.taemeernews.com

میں تقسیم کیا۔ مذہبی عقائد کی تحقیق و جستجو سے یہ بات غیر مبہم طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ملک ایسا نہیں جس نے اعلیٰ اخلاقی قدروں کو ہندوستان سے حاصل نہ کیا ہو۔ دنیا کا کوئی بھی دین و مذہب ایسا نہیں جس کا روح کی بقائے دوام کے متعلق نظریہ اور عقیدہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ہندوستان سے اخذ نہ کیا گیا ہو۔ یہی وہ مقدس سرزمین ہے جس سے توحید و معرفت کے فلسفہ نے طوفانی لہروں کی طرح دیوانہ وار بلند ہو کر ہندوستان کے کناروں سے باہر نکل کر ساری دنیا کو سیراب کیا۔ اگر بنی نوع انسان کی دم توڑتی قوموں کو نئی زندگی اور توانائی حاصل کرنی ہے تو روحانیت اور فلسفۂ حیات کی بھرپور موجوں کو ایک بار پھر ہندوستان کی سرزمین پر موجزن اور رقصاں ہونا ہوگا۔

"وہ قرضہ جو اس دنیا کو ہماری مادرِ وطن کا ادا کرنا ہے بے حساب ہے۔ ایک ایک ملک کو لے لیجئے آپ اس کرۂ ارض پر ایک بھی ایسی نسل و قوم نہیں پائیں گے جس نے بنی نوع آدم پر رحمت و برکت کی اس قدر گرانقدر بارش کی ہو جس قدر امن پسند نرم دل ہندوؤں کے سوز و گداز نے کی ہے جس طرح شبنم کے جھلملاتے موتی ان دیکھے اور ان سنے دبے پاؤں خراماں خراماں گلاب، موتیا، نرگس اور چمبیلی کی ایک ایک پنکھڑی کے دامنوں کو ہوش و حواس لوٹ لینے والی مہک اور خوشبو سے بھر دینے کے لئے اترتے ہیں ہاں اسی طرح ہندوستان نے شور مچائے بغیر، خاموشی اور انہماک سے ساری دنیا کے اندازِ فکر اور زاویۂ حیات میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر کے رکھ دیا۔ ساری دنیا کی نظر و فکر میں ہندوستان نے اس قدر نمایاں اور گراں بہا حصہ ڈالا ہے کہ کوئی دوسرا ملک دعویٰ ہمسری نہیں کر سکتا۔ ہندوستان نے دنیا بھر میں ایسا اپنا رنگِ اثر دکھایا ہے جو خاموش اور بے نوا تو ہے لیکن جسے ہر جگہ واضح اور عیاں شکل میں جلوہ گر دیکھا جا سکتا ہے۔"

قدیم زمانہ سے لیکر عصرِ حاضر تک عظیم اور قوی قومیں زبردست عقیدوں اور نظریوں کو جنم دیتی آئی ہیں۔ جب سے تاریخ کی آنکھیں کھلی ہیں اور زمانہ نے ہوش سنبھالا ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک دنیا کی نسلیں اور قومیں اپنے افکار و عقائد سے دوسری نسلوں اور قوموں کو متاثر کرتی چلی آئی ہیں۔ زمانہ قدیم سے لے کر اب تک قومی زندگی کی بے پناہ موجوں نے حق و قوت کا بیج دور دراز تک بویا ہے۔ لیکن قابلِ غور امر یہ ہے کہ یہ عمل ہمیشہ طبلِ جنگ کے ساتھ انجام دیا گیا۔ تخم ریزی کا یہ کام ہمیشہ جنگ و جدل کے ذریعہ سر سے چڑھایا گیا۔ خوں ریزی اور غارت گری کا سہارا لے کر کیا گیا۔ ہر نیا نظریہ اور عقیدہ خون کی ندیاں بہا کر دوسروں کے دلوں میں پیوست کیا گیا۔ ہر نئے اندازِ فکر و نظر کو ہزاروں اور لاکھوں معصوم انسانوں کے خون سے بھرے دریاؤں میں سے گذرنا پڑا۔ ہر نقطہ کے ردِعمل کے طور پر ہزاروں آہیں اٹھتی تھیں۔ لاکھوں چیخیں لب پر آتی تھیں۔ ہر خیال اور ہر تصور کے پیچھے یتیم بچوں کی اتنی دلسوز آہ و زاریاں ہوتی تھیں کہ آسمان کا بھی کلیجہ دہل جائے۔ بیوہ عورتوں کی گریہ و زاریاں بلند ہوتی تھیں جنہیں سن کر پہاڑوں کے دل موم ہو جائیں، چٹانوں کے سینے پگھل جائیں۔ دنیا کی

صفحہ 5

www.taemeernews.com

اکثر و بیشتر قوموں نے دنیا کو جو کچھ سکھایا پڑھایا۔ اسی جور و جبر کے ساتھ۔ اسی تشدد اور استبداد کے ساتھ۔ اسی بے رحمی اور سنگدلی کے ساتھ۔ دوسرے ملکوں کو چند مخصوص تصورات اور نظریات سے بہرہ ور کرنے کی داستان ان چیرہ دستیوں، انسانی خون آشام جنگوں، لرزہ خیز ہلاکتوں اور رونگٹے کھڑے کرنے والی غارت گریوں کی داستان ہے لیکن ہندوستان کا دامن اس جارحیت اور جنگ و جدل سے قطعی طور پر غیر آشنا رہا ہے۔ اور یہ ملک ہمیشہ ہمیشہ امن و آشتی کا علمبردار بنا رہا ہے۔

اہل مغرب کے نزدیک حیات و بقا کا راز قوت حرب و جنگی طاقت میں ہے۔ ان کا عقیدہ ہے جو سب سے زیادہ مضبوط اور توانا ہوگا۔ صرف وہی زندہ رہ سکے گا۔ اور صرف اسے ہی زندہ رہنے کا حق حاصل ہوگا۔ ایسی تھیوریاں اہل مغرب پیش کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ نظر و فکر برحق ہوتی۔ تو عہد ماضی کی جنگجو، جارحیت پسند اور قوت رکھنے والی قومیں آج بھی کامرانی اور مسرتوں سے مالا مال زندگی بسر کرتی نظر آتیں۔ اور ہم ہندو جنہوں نے ایک بھی فرد یا قوم کو فتح و تسخیر نہ کیا، کب کے مٹ گئے ہوتے۔ اور ہمارا نام و نشان ڈھونڈنے سے بھی کہیں نہ ملتا۔ لیکن دیکھ لیجئے کہ ہم ہندو زندہ و سلامت ہیں، وہ بھی کروڑوں کی تعداد میں۔ یہ طرۂ امتیاز صرف سرزمین ہند کے ہی نصیب میں آیا ہے۔ کہ یہ کبھی جنگ باز، جارحیت پسند، غارت گر اور حملہ آور نہیں رہی۔ یہی جبلی صفت اس کے سر پہ رحمت کا ہاتھ رکھے ہوئے ہے۔ اور اسی وجہ سے ہم آج بھی قائم و دائم ہیں۔

یونانیوں کی اس قدیم سلطنت کا نام و نشان تختۂ ارض سے مٹ چکا ہے جس کا طوطی کبھی ہر سو بولتا تھا۔ یہ سلطنت کچھ اس طرح نیست و نابود ہوئی کہ آج اس کی داستان یاد کر کے سرد آہ بھرنے والا ایک بھی غمگسار نہیں ملتا۔ ایک وقت تھا جب دنیا بھر میں سلطنت روم کے عقاب و شہباز کا ہی پرچم و علم لہراتا تھا ہر جگہ سلطنت روم کا دبدبہ تھا ساری نسل آدم اس کے پاؤں کی جنبش سے لرزہ براندام رہتی تھی۔ لیکن آج اس سلطنت کے دارالخلافہ کیپیٹولائن ہل محض کھنڈروں کا ڈھیر بنا اپنے زوال پہ رنج و ملال میں ڈوبا ہوا ہے جہاں کبھی سیزر جیسا حکمران تخت شاہی پہ جلوہ افروز رہتا تھا۔ وہاں اب کھنڈروں میں مکڑیاں اپنا جال بنتی نظر آتی ہیں۔ الو دن بھر یاس کی بولیاں بولتے نظر آتے ہیں۔ اور چمگادڑ ڈیرہ ڈالے ہوتے ہیں۔ ایسی کتنی ہی جلیل القدر قومیں اس دار فانی میں ہو چکی ہیں جو بگولے کی طرح اٹھیں آندھی کی طرح چھائیں اور پھر چار دن کی چاندنی دکھا کر ظلمات میں گم ہو کر رہ گئیں اور صفحۂ ہستی سے یوں ناپید ہو گئیں۔ جیسے پانی کے بلبلے مٹ جاتے ہیں یہ ہے ان قوموں اور نسلوں کی کہانی جن کی ہیبت قوت و طاقت سے لوگ تھر تھر کانپنے لگ جاتے تھے۔ لیکن آج جن کا نام لینے اور ماتم کرنے والا بھی موجود نہیں۔ لیکن ایک ہم ہیں کہ بدستور سابق، زندہ و سلامت ہیں۔ اگر آج منو مہرشی واپس آ جائیں تو اپنے آپ کو کسی غیر مانوس، غیر شناسا، اجنبی سے ملک میں نہیں پائیں گے۔ کیونکہ آج بھی ہمارے قانون و دستور

www.taemeernews.com

وہی ہیں جو ہزاروں برس پہلے ایجاد و مرتب کیے گئے تھے۔ آج بھی ہمارے رسم و رواج وہی ہیں جو ہمارے صدیوں کے تجربہ و مشاہدہ کا نچوڑ ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہم غیر فانی اور جاوداں ہیں۔ اور زمانہ کے تحت نئے انقلابات اور ان گنت لیل و نہار دیکھنے کے باوجود قائم اور دائم ہیں۔ جیسے ہر حادثہ، ہر بدنصیبی، ہر رنج و الم ہمارے لیے ایک نئی زندگی، نئی بہار اور نئی تر و تازگی کا پیغام بن کر آیا۔ تاکہ ہم اور بھی مضبوط اور ثابت قدم بن سکیں۔

کیا کبھی آپ نے ایسے ملک کا نام سنا ہے جہاں کے شہنشاہوں اور فرماں رواؤں نے بھی اپنے آپ کو ترک شاہی محلات میں عیش و نشاط کی رنگین و خوش ادا زندگی بسر کرنے والے ایسے تاجداروں کی اولاد نہیں کہا جو غریب راہگیروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ بلکہ اپنے آپ کو ہمیشہ جنگلوں اور ویرانوں میں دھونی رمانے والے فقیروں اور درویشوں کی اولاد کہلانے میں فخر محسوس کیا۔ یہ ملک صرف ہندوستان ہے جس کا اثاثۂ حیات تھے اس کے تارک الدنیا، خدا رسیدہ بزرگان دین والیان جو دنیا بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ میں دنیا کا سب سے زیادہ خوش نصیب انسان ہوں لیکن یہ فخر و اعزاز مجھے اپنی وجہ سے نہیں ملا۔ بلکہ ورثہ میں ملا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس کی وجہ میرے آبا و اجداد ہیں جنہوں نے ماضی کے کنوؤں میں جس قدر جھانکا ہے۔ اور عہد سلف کا جس قدر مطالعہ کیا ہے اسی قدر میرے دل و دماغ میں اور بھی فخر و افتخار پیدا ہوا ہے۔ اسی قدر زیادہ امید، ہمت اور اعتماد کی دولت میرے آنچلوں میں سمٹ آتی ہے۔ محسوس ہوا کہ مجھے فرش سے اٹھا کر عرش بریں تک پہنچا دیا گیا ہے اور مجھے تلقین کی گئی ہے کہ میں اپنے آبا و اجداد کے نقوش پا کو دیکھتے ہوئے ان کی بتائی ہوئی راہوں پہ گامزن ہو جاؤں۔ اور ان کے دستور حیات کو اپنا دستور حیات بناؤں۔ اے قدیم آریوں کی اولاد! ایشور کرے تم کو بھی امید، ہمت اور اعتماد کی دولت ملے۔ اپنے بزرگوں اور آبا و اجداد پر اعتماد آپ کے خون میں گھل مل جائے۔ یہ اعتقاد اور اعتماد آپ کی زندگی کا جزو و جان بن جائے۔ اور تم بھی ساری دنیا کی نجات و مسرت کے لیے مصروف کار ہو جاؤ۔

یہی ہے وہ نئی زندگی بخشنے والا آب حیات جس کے ساتھ ہمیں مادہ پرستی اور نفس پروری کی اس آگ کو ٹھنڈا کرنا ہے جس آگ نے دوسرے ملکوں کے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں فتنہ و فساد کے شعلے بھڑکا رکھے ہیں۔

جیسے ہر ملک و قوم کو اپنا اپنا مخصوص فرض ادا کرنا ہے۔ اور اپنا اپنا مخصوص کردار انجام دینا ہے۔ اسی طرح یہ بھی قدرتی امر ہے کہ ہر ملک و قوم کی ایک مخصوص انفرادیت اور خصوصیت ہوتی ہے جس سے اس کا آغاز حیات ہوا تھا۔ ہر نسل و قوم کا ایک مخصوص رنگ جمال ہے۔ جو اس دنیائے رنگ و بو کی زندگی اور خوبصورتی کے لیے اشد ضروری ہے۔ یہ مخصوص رنگ جمال ہی اس کی جان و حیات، اس کی روح رواں ہے۔ یہی اس کی بنیاد زندگی

www.taemeernews.com

ہے۔ یہی اس کی قومی زندگی کا مخزن ہے، سرچشمۂ حیات ہے۔ بعض ملکوں کی جان اس کی سیاسی طاقت و اقتدار میں ہوتی ہے جیسا کہ برطانیہ کی ہے۔ بعض ملکوں کی جان اس کے آرٹ اور ادب میں ہوتی ہے۔ کہنے سے مراد صرف یہ ہے کہ ہر ملک کا ایک مخصوص جوہر حیات ہوتا ہے۔ میں نے تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے کہ میں امریکنوں کو اس مذہب ایمان کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں پڑھا سکتا تھا جب تک انہیں یہ بات ذہن نشین نہ کرا دیتا تھا کہ اس مذہب ایمان کا ان کی معاشرتی زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ میں انگلستان میں اس وقت تک مذہب ایمانی کی تعلیم و تربیت نہ دے سکتا تھا۔ جب تک میں انہیں یہ نہیں بتا دیتا تھا کہ ویدانت پر عمل کرنے سے انہیں کیا کیا فائدے حاصل ہوں گے۔

لیکن یہ مقدس و مبارک سرزمین ہند ہے جس کی ریڑھ کی ہڈی، جس کی روح رواں، جس کی بنیاد زندگی اور جس کی حیات و بقا مذہب ہے اور صرف مذہب ہے۔ ہندوستان میں مذہبی زندگی ہی کل قومی زندگی کی کلید و کنجی ہے۔ ساری قومی زندگی کا تانا بانا مذہبی زندگی کے ارد گرد مستور ہے۔ دوسرے ممالک سیاست و حکمت عملی کی باتیں کرتے ہیں تو کرنے دیجئے۔ دوسرے تجارت کے ذریعہ دولت و سرمایہ جمع کرنے کے ذکر و فکر میں مستغرق ہیں تو رہنے دیجئے۔ دوسرے نفس پروری اور تن آسانی کا پرچار کرتے ہیں تو کرنے دیجئے۔ کیونکہ یہ سب کے سب ایسے موضوعات ہیں جنہیں ہندوؤں کا دل و دماغ نہیں سمجھ سکتا۔ اور نہ ہی انہیں سمجھنے کی کوئی تمنا اور آرزو رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ روحانیت۔ توحید و معرفت۔ روح و خدا۔ ابدی رحمت و مسرت کے تذکرے کر دیکھئے۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ ہندوستان کے ادنیٰ ترین کسان کو دوسرے ملکوں کے بہترین عالموں۔ فاضلوں اور دانشوروں سے کہیں زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا ہوا پائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں سماج سدھار کی تعلیم دینے کے لیے لوگوں کو یہ بتانا پڑتا ہے کہ نیا معاشرہ روحانیت کا کس قدر حامل ہوگا۔ اگر یہاں سیاسی تعلیم دی جاتی ہے تو لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرانی ہوگی۔ کہ اس کی بدولت ملک کس قدر روحانیت سے فیضیاب ہو سکے گا۔

جس طرح ہر ایک فرد و بشر کی الگ الگ پسند ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر ملک کی اپنی اپنی پسند، اپنا اپنا رجحان، اپنا اپنا میلان، اپنا اپنا نظریۂ حیات ہوتا ہے۔

جہاں تک ہماری پسند و انتخاب کا تعلق ہے، ہم نے اس کا فیصلہ برسوں پہلے کر دیا تھا۔ اور ہم اسی پر کاربند رہیں گے۔ پھر یہی انتخاب اتنا خراب نہیں کہ اسے یونہی ترک کر دیا جائے۔ کیا اس دنیا میں نفس و مادہ کی بجائے روح اور آتما، موجودات اور مخلوقات کی بجائے خالق کا ذکر و فکر کرنا اتنا ہی معیوب ہو گیا ہے کہ اسے اب خیرباد کہہ دیا جائے؟ اس دنیا سے اس قدر گہری محبت اور اس دنیا سے اس قدر نفرت، ایثار نفسی اور زہد و تقویٰ سے اس قدر عقیدت اور وابستگی، رب العالمین اور ایشور پر اس قدر ایمان و اعتقاد اور لافانی روح پر اس قدر اعتماد، یہ سب خوبیاں اور صفتیں آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ میں آپ کو چیلنج کرتا ہوں کہ آپ میں سے کوئی ان خوبیوں و صفتوں کو

www.taemeernews.com

چھوڑ کر دکھائے یقینی طور پر آپ نہیں چھوڑ سکتے چھوڑنے اور چھوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ ادراک ذہنیت نظریات آپ کے خون میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ آپ مادہ پرست ہونے کا دعوے کر کے جھگڑا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس سوانگ کو پوری طرح نبھانے کی خاطر آپ چار چھ مہینے مادہ پرستی کا ہی ذکر و فکر کرتے رہیں لیکن میں یہ امر بخوبی طور جانتا ہوں کہ آپ کی اصل قدر و قیمت کیا ہے۔ میرے ایک ہی جھٹکے، میری ایک ہی تحریک سے آپ پھر ایک بار ویسے ہی خدا پرست اور دین و ایمان کے دلدادہ بن جائیں گے جس طرح پہلے تھے۔ آپ اپنی فطرت و سیرت کو کیسے تبدیل کر سکتے ہیں؟ آپ کی سیاست، معاشرتی تنظیم نو، روپیہ بنانے، سرمایہ جوڑنے کے متعلق یہ سب لمبی چوڑی باتیں آپ کے دامن سے اس طرح جھڑ جائیں گی جس طرح پانی کے قطرے کنول کی پنکھڑیوں سے بکھر جاتے ہیں۔ انہیں نم کیے بنا بہہ جاتے ہیں۔

اگر کوئی قوم اپنی قومی روحِ حیات کو ترک کر دینا چاہے اور اپنی صدیوں پرانی بنیادِ زندگی کو تبدیل کر دینا چاہے تو اول تو یہ قوم اس کام میں کامیاب نہیں ہوگی۔ اور اگر بالفرضِ محال کامیاب ہو بھی جائے تو اس کی موت ہو جائے گی۔ آپ نے اگر اپنے مذہب، دھرم، اخلاق و ایمان کو ترک کر کے دوسروں کی سیاست گری اور دوسروں کے طرزِ حیات کو اپنانا چاہا، اپنی روحِ حیات کو ذبح کر کے دوسروں سے زندگی مستعار لینے کی کوشش کی تو آپ کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ اس بنیادِ زندگی، اس کلیۂ حیات کو ترک کر کے دیکھ لو، آپ کی موت واقع ہو جائے گی۔ اس فعل کا انجام ہی موت و قضا ہے۔ تباہی اور بربادی ہے۔ ہندوستان کی زندگی مذہب ہے اور صرف مذہب۔ اگر آپ نے یہ زندگی اس سے نوچ لی۔ اس سے چھین لی۔ تو ہندوستان کیسے زندہ و سلامت رہ سکتا ہے۔ لاکھ سیاستوں سے، لاکھ معاشرتی اصلاحوں سے، لاکھ دولتوں سے، اس ہندوستان کو زندہ و سلامت نہیں رکھا جا سکے گا۔

میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی میری مراد یہ ہے کہ ہمیں سیاسی اور معاشرتی اصلاحات کی ضرورت نہیں میرا مطلب و مدعا صرف اتنا ہے کہ آپ یہ بات اچھی طرح سے اپنے پلے باندھ لیں کہ یہ سب چیزیں ثانوی اہمیت رکھتی ہیں۔ اولین ضرورت دین و مذہب کی ہے، اخلاق و ایمان کی ہے توحید و خدا پرستی کی ہے۔ جو اہمیت اس جسم کے لئے خون کی ہے۔ وہی اہمیت مذہب، دھرم کی ہندوستان کے لئے ہے۔ اگر خون صاف اور اچھا ہو اور رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے تو یہ جسم و جان سلامت رہتے ہیں۔ لیکن اگر اسے نکال دو۔ تو جسم بے جان ہو جائے گا۔ یہی کیفیت روحانیت کی ہے۔ اسے ہندوستان سے چھین لو تو اس کی روح پرواز کر جائے گی۔ اور پھر! اگر خون صاف اور اچھا ہو تو کوئی مرض نہیں لاحق ہوگا۔ اسی طرح اگر روحانیت کی بنیاد درست اور مستحکم ہوگی تو سیاسی اور معاشرتی نظام بھی بے نقص رہے گا۔ اگر خون خراب اور گندہ ہوگا۔ تو ہر بیماری حملہ کر دے گی۔ اور ہر مرض دھاوا بول دے گا۔ ہندوستان کی بیماریوں اور روگوں کا

www.taemeernews.com

علاج کرنا چاہتے ہوں تو اس کے رُوحانیت اور مذہبی خونِ حیات کو صاف وشفاف بنا دیں۔

آپ نے اگر اتنی صدیوں سے پے در پے صدمے اور دُکھ برداشت کئے ہیں تو اس لئے کہ آپ کا یہ خونِ حیات صاف وشفاف تھا۔ آپ نے اسے صاف وشفاف رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ آپ نے سب کچھ گنوا کر بھی سب کچھ لُٹا کر بھی خون کو صاف رکھنے پر زور دیا۔ آپ کے آباؤ اجداد نے ہر اذیت کو ہنس ہنس کر برداشت کر لیا۔ ہر ظلم وستم کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ حتیٰ کہ وہ مسکراتے ہوئے تختۂ دار پہ لٹک گئے اور جامِ شہادت نوش کر گئے لیکن انہوں نے اپنے دین وایمان، مذہب، دھرم پہ آنچ نہ آنے دی۔ غیر ملکی حملہ آور یکے بعد دیگرے ہندوستان پہ حملہ کرتے رہے۔

انہوں نے مندر کے بعد مندر توڑ ڈالے شوالوں اور دھرم ستھانوں کی ناگفتہ بہ بے حرمتی کی۔ انہیں زمیں بوس کر دیا۔ ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی لیکن جونہی حملے اور جارحیت کی یہ آندھی ختم ہوئی مندر پھر بن گئے۔ شوالے پھر سے کھڑے ہو گئے۔ اور عبادت گاہیں پھر سے آباد ہو گئیں۔ گجرات کے سومناتھ مندر کی طرح شمالی، وسطی اور جنوبی ہند کے یہ مندر اور دھرم ستھان آپ کو بہت سی عقل ودانش سکھا سکتے ہیں۔ کتابوں سے کہیں زیادہ یہ مندر آپ کو ہندوستان کی تاریخ کے سبق پڑھا سکتے ہیں۔ ذرا غور وخوض سے دیکھئے کہ ان مندروں پہ اگر سینکڑوں حملہ آوروں کی جارحیت کے نشانات ہیں تو یہ سب مندر آپ کو ہزاروں نئی زندگیوں کی عکاسی کرتے نظر آئیں گے۔ وہ زندگیاں جو حملہ آوروں کے بعد خاک وراکھ سے اُٹھیں۔ نہ جانے کتنی بار یہ مندر اور شوالے اُجڑے اور کتنی بار آباد ہوئے۔

نہ جانے کتنی بار دشمن کے بے رحم ہاتھوں نے انہیں تہ تیغ کیا۔ لیکن یہ کٹے کہ پھر زندہ ہو گئے اور بار شفق ہو گئے۔ کیوں؟ مذہب، دھرم کی حرارت کی وجہ سے۔ یہی ہندوستان کی روحِ رواں، روحِ حیات ہے۔ اس کی حفاظت کرو۔ یہ آپ کی حفاظت کرے گی۔ اس کی پاسبانی اور نگہبانی کرنے سے ہی آپ عظیم وسربلند بن سکتے ہیں۔

ہندوستان کی روح اوّلین طور پر مذہبی اور روحانی ہے۔ بعد میں کچھ اور ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ تم پوری ہمت سے اس کی روح اور اس کے اس فہم وادراک کی حفاظت ونشوونما کرو۔ تم جو کچھ کرو اسی حرارتِ مذہب اور گرمیٔ ایمان سے کرو۔ تمہاری رگ وپے کی ایک ایک حرکت وجنبش میں یہی جذبۂ دین وایمان۔ مذہب، دھرم موجزن ہو جانا چاہئے۔ ہندوستان کے قومی نصب العین دو ہی تو رہے ہیں۔ ایک ہے تقوے، تیاگ، بے نفسی اور ویراگ کا۔ دوسرا ہے خدمت اور سیوا کا۔ ساری قومی زندگی کو ان دونوں سانچوں میں ڈھال لو۔ اور اپنی قومی زندگی کا رُخ ان دونوں قدرتی بہاؤ کی طرف موڑ دو۔ اس ملک میں مذہب، ایمان کا جھنڈا کبھی سرنگوں نہیں ہونا چاہئے۔ اسی میں اس کی زندگی اور نجات پنہاں ہے۔

بھلائی کے لئے سمجھئے یا بُرائی کے لئے ہماری قومی زندگی کا روحِ رواں مذہب، اخلاق ہے پھر بھلا آپ اپنے اس خمیر وضمیر کو کیسے تبدیل کر سکتے ہیں؟ آپ چاہیں بھی تو اسے تلف وتباہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس کی جگہ

www.taemeernews.com

کسی اور کو دے سکتے ہیں۔ ایسا کرنا اسی طرح مشکل اور دشوار ہے جیسے آپ ایک پھلتے پھولتے درخت کو ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگا کر سرسبز و شاداب نہیں رکھ سکتے اور نہ ہی اس گڑھے میں کوئی دوسرا پھلا پھولا پودا لگا کر زندہ رکھ سکتے ہیں۔ بھلائی کے لئے کیا برائی کے لیے، مذہب، ایمان کا آدرش، نصب العین سینکڑوں ہزاروں برسوں سے ہمارے خون میں سرایت کر چکا ہے۔ صدیوں سے ہم دین و ایمان کو ہی اپنی زندگی کا ماحصل اپنا منتہائے مقصود بنائے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری رگ و پے میں رس بس چکا ہے۔ یہ ہماری زندگیوں کی زندگی اور ہمارے دلوں کی دھڑکن اور آئین و دستور کی روح حیات بنا چلا آتا ہے۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ایسے مذہب، دھرم کو ترک کر سکیں۔ یا اسے خیر باد کہہ سکیں۔ کیا آپ ایسے دھرم اور دین کو اس مہیب اور تیز و تند ردِعمل کا مقابلہ کئے بنا ترک کر سکتے ہیں جو قومی زندگی کے اس قدر قدیم اور اس قدر تیز رو عظیم دریا کا رخ بدلنے سے پیدا ہوگا؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ گنگا اپنے برفانی منبع کو ترک کر کے اب کسی دوسرے منبع سے بہنا شروع کر دے اور کسی دوسرے رخ کو اختیار کر لے؟ ایسا ہونا ناممکن اور محال ہے لیکن اگر بالفرض محال ایسا ممکن ہو بھی جائے۔ اور سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکلنا شروع کر دے پھر بھی یہ سراسر ناممکن اور بعید از قیاس ہے کہ یہ ملک اپنی روایتی مذہبی اور روحانی زندگی ترک کر دے یا ایمان و اخلاق کی دیرینہ اور قدیم روایتوں کو خیر باد کہہ دے۔ اور اس کی بجائے سیاست یا کسی اور دستور و اصول کو اپنی روحِ رواں یا اپنی حیات ملی کی بنیاد بنا لے ناممکن ہے کہ آپ اس ملک و قوم کے صدیوں پرانے خطوطِ حیات کو تبدیل کر ڈالیں۔ دین و ایمان ہی اس کی زندگی اور اس کی روح ہے۔ یہ خطِ زندگی ہے۔ یہ خطِ ترقی ہے۔ یہ خطِ بہبودی ہے۔ اسی خطِ مذہب کو پھر بھلا کیسے خیر باد کہا جا سکتا ہے؟

یاد رکھو، ہندوستانی قوم کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لافانی اور زندۂ جاوید ہے۔ اور یہ اس وقت تک ہمیشہ لافانی اور زندۂ جاوید رہے گی جب تک اس کی روحِ حیات "مذہب" سلامت ہے جب تک اس کا روحانی پس منظر خیر و عافیت سے ہے جب تک اس کے باشندے روحانیت کو ترک نہیں کرتے۔ یہ بھک منگے اور گداگر ہو جاتے ہیں تو ہو جانے دو غربت اور مفلسی کا شکار ہوتے ہیں تو ہونے دو لیکن انہیں اپنے پربھو وشواس، اپنے صدق و ایمان کو تلانجلی مت دینے دو۔ انہیں یہ بات مت فراموش ہونے دو کہ وہ سالکوں، عارفوں، درویشوں، سنتوں اور مہا پرشوں کی اولاد اور سنتان ہیں۔

کیا وجہ ہے کہ ہزاروں برسوں کے خونیں انقلابات اور تغیر و تبدل دیکھنے اور اس قدر خون آشامی اور تباہی و ذلت دیکھنے کے باوجود ہندو نسل مر کھپ کیوں نہیں گئی؟ کیا وجہ ہے کہ اس کا نام و نشان نہیں مٹایا جا سکا۔ اگر ہمارے یہ رسم و رواج اتنے ہی غیر پسندیدہ اور قباحت و خباثت سے پُر ہیں تو ہندو قوم کب کی صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہوتی۔ کونسے حملہ آور نے ہندو قوم کو ملیا میٹ کر دینے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا؟ لیکن اپنی بے پناہ طاقت اور سخت گیری اور دہشت انگیزی کے باوجود وہ ہندو قوم کو نیست و نابود کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کوئی اور ملک ہوتا تو اس قدر سختیاں اور

www.taemeernews.com

بربادیاں دیکھنے کے بعد کب کا ویران و سنسان ہو گیا ہوتا۔ لیکن ہندوستان ان رسموں اور رواجوں کے دم قدم سے آباد رہا ہے۔ ہندوستان کی اس ناقابل تسخیر، ناقابل فتح، عرفانی قوت کا یہ راز سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھ لو۔ اور یہ بھی جان لو کہ وہ کونسی وجہ ہے کہ ہندوستان ان سب خون آشام جنگوں اور تباہ کن آندھیوں کے باوجود قائم و دائم ہے۔ اور آج بھی دنیا کی تہذیب کو نیا شباب دینے کے کام میں اپنا قابل قدر حصہ ڈالنے کیلئے بے تاب و بے قرار ہے۔

ہر انسان کے باطن میں ایک خاص نظریہ حیات جاگزیں ہوتا ہے۔ بیرونی انسان تو محض اس نظریہ حیات کا لباس و لبادہ ہے محض اس جذبہ کو قوتِ اظہار دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی طرح ہر ملک و قوم کے باطن میں ایک قومی نظریہ حیات جاگزیں ہوتا ہے۔ یہ جذبہ اظہار و عمل کے لئے ہمیشہ ہمیشہ بیتاب رہتا ہے۔ اسی جذبہ کی نگہداشت کی جانی چاہیئے۔ جب تک یہ جذبہ زندہ و سلامت ہے دنیا زندہ اور سلامت ہے لیکن جس منحوس دن یہ جذبہ مر گیا۔ اسی دن قوم و ملک کی موت واقع ہو جائے گی۔ ہندوستان اگر سالہا سال سے اپنوں اور بیگانوں کے اس قدر جور و ستم اور ظلم و جبر، تباہی، پامالی اور تشدد و استبداد سہنے کے باوجود دائم و قائم ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان نے اپنے اس باطنی جذبہ سے اس باطنی میلان روح کو زندہ و سلامت رکھا ہے جس کی دنیا کی سلامتی اور بہبودی کے لئے اشد ضرورت ہے۔

امر واقع یہ ہے کہ ہر قوم کا ایک مخصوص رجحانِ طبع ہوتا ہے۔ ایک خاص نظریہ حیات ہوتا ہے۔ ایک نیا اسلوبِ زندگی ہوتا ہے۔ اور ہر نسل و قوم کو اس دنیا میں ایک خاص مقصد پورا کرنا ہوتا ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے۔ فوجی اور عسکری قوت و طاقت کبھی اس کا نصب العین نہیں بنی۔ اور نہ ہی ہندوستان نے سیاسی برتائی یا سیاسی بڑے پن کی خواہش و تمنا کی ہے۔ یہ نہ ماضی میں کبھی بڑا سیاسی ملک بنا ہے نہ عظیم فوجی قوت کہلایا ہے۔ اور میرے الفاظ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ مستقبل میں کبھی ایسا نہیں بن سکے گا کیونکہ اس کا ایک دوسرا مخصوص نظریہ حیات ہے۔ ایک خاص مقصدِ زندگی ہے جسے پورا کرنے کی اس نے پوری پوری کوشش کی ہے۔ اور وہ ہے دنیا بھر کی روحانی طاقت کو حاصل کیا جائے، جمع کیا جائے۔ اور جب بھی حالات تقاضا کریں وہ اسی روحانی طاقت سے ساری دنیا میں ایک سیلاب سا پیدا کر دے۔

عصائے شاہی ٹوٹ چکے ہیں تختِ سلطانی روندے جا چکے ہیں۔ اور عنانِ حکومت ہاتھوں ہاتھ کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ لیکن ہندوستان میں چونکہ سرکار اور دربار کا تعلق معدودے چند افراد تک ہی ہوتا تھا۔ اور راج پاٹ کی یہ تبدیلیاں مخصوص طبقے کے اندر اندر محدود رہتی تھیں بیشتر عوام جن میں امیر و کبیر بھی شامل ہوتے تھے اور فقیر و درویش ان سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ اور انہیں اپنی مخصوص روش و

www.taemeernews.com

پر چلنے کی کامل آزادی نصیب رہتی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ اس قومی زندگی کی ندی کبھی خراماں خراماں آہستہ آہستہ رک رک کر چلی اور کبھی نوخیز و الھڑ دوشیزہ کی طرح سبک قدم اور سرعت رفتاری سے بہی۔ لیکن تصور کی آنکھ سے جب میں سال وماہ کی ان گزشتہ گردشوں کو دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ کوئی لمحہ حیات اگر روشن و چمکدار ہے تو کوئی بجھا بجھا سا، لیکن وقت کی کڑیوں کا یہ سلسلہ لامتناہی طور پر رواں دواں رہا ہے۔ اور مختلف زمانوں کے نشیب اور بلند بہاریں بھی جب میں اپنی مادر وطن بھارت ماتا کو پرشباب اور پرشکوہ شاہی وقار کے ساتھ آگے بڑھکر دنیا کو عظیم ترین روحانی اور اخلاقی تعلیم دیتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرا سر عقیدت و احترام سے جھک جاتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی طاقت ہندوستان کو اس تعلیم دینے سے نہ منع کر سکی ہے۔ نہ روک سکی ہے۔ یہ تعلیم ہمیشہ اعلےٰ ترین تعلیم تھی۔ ایسی تعلیم جو انسان کو اعلےٰ اور ارفع بناتی ہے۔ ایک وحشی اور درندہ انسان کو فرشتہ اور دیوتا بننا ہی نہیں سکھاتی۔ بلکہ انسان کو خدا بنا دیتی ہے۔

میرے بھائیو! یہ فخر و افتخار، یہ اعزاز و اعجاز صرف سرزمین ہند کو ہی نصیب رہا ہے۔ کہ اس نے آج سے ہزاروں برس پہلے اپنشدوں کے زمانہ میں دنیا کو چیلنج دیتے ہوئے للکار کر یہ تعلیم دی تھی کہ :۔

Na dhanena na prajaya tyāgenaike amritatwamanashuh

"نہ دولت و امارت سے۔ نہ حق وراثت سے۔ بلکہ صرف بےنفسی
تقوے، تیاگ اور ویراگیہ سے حیات جاودانی، بقائے دوام اور امرپد
کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

لیکن اس کے برعکس دنیا نے کیا تعلیم دی؟ نسل در نسل حکومت در حکومت مختلف ملکوں اور قوموں نے اپنی ساری قوت و طاقت سے زمانہ کی گتھیوں کو خواہشات نفس کی تکمیل کے ذریعہ حل کرنا چاہا، اور مادہ پرستی سے روح سکون کو پانا چاہا لیکن انہیں ناکامی و نامرادی دیکھنی پڑی۔ اور نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ایسی تمام قومیں اور نسلیں اپنی ان بدکاریوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے ہی تباہ و برباد ہو گئیں۔ اور مٹ گئیں۔ جو جسم و زر اور جاہ و حشمت، طمع اور لالچ کو اپنے ہمرکاب لائیں۔ وہ قومیں اور نسلیں ختم ہو گئیں۔ وہ بے نام و نشان قبروں میں پڑی گل سڑ چکی ہیں۔ ان کا ماتم کرنے والا بھی نہیں ملتا۔ ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ جو نئی قومیں اور نسلیں ان گتھیوں کو اس زمانہ میں تن پروری اور نفس پرستی سے حل کرنے کی تگ و دو کر رہی ہیں وہ اب زوال پذیر ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ اور سکون روح کیسے ملے گا۔ یہ مسئلہ بند پڑا رہا ہے۔ ابھی تک یہ مسئلہ حل طلب ہے کہ دنیا میں امن امان، صلح و آشتی رہے گی یا جنگ و خون ریزی۔ صبر و تحمل زندہ و سلامت رہے گا یا بے صبری، تنگ دلی۔ اور بے رحمی۔ بھلائی۔ اچھائی اور نیکی کا پلڑا بھاری رہے گا یا بدی، بداعمالی اور بدچلنی کا نفس پرستی

www.taemeernews.com

فتح مند رہے گی یا توحید، خدا پرستی اور روحانیت۔ دنیا کی دوسری قومیں ابھی اس مسئلہ کو ہی حل کرنے کی کوشش میں غلطاں ہیں لیکن صدیوں پہلے ہندوؤں نے اس مسئلہ کو حل کر لیا تھا اور ہم اچھے اور برے وقتوں میں ہمیشہ اسی حل پر کاربند اور عمل پیرا رہے ہیں۔ اور رہتی دنیا تک اسی فیصلہ اور اسی حل کے ساتھ وابستہ رہنا چاہتے ہیں۔ ہمارا فیصلہ تھا بے نفسی کا۔ تقوے و ترک کا۔ تیاگ اور ویراگ کا۔

ہندوؤں کا کارِ حیات اسی روحانیت اور اسی بے نفسی سے عبارت ہے۔ نفس کشی ہی اس کے ابدی اور لافانی نغموں کی صدا اور رجحان رہی ہے۔ یہی اس کی زندگی کی بنیاد ہے۔ یہی اس کی حیات و بقا کا مدار ہے۔ روحانیت ہی اس کی روحِ حیات ہے۔ اپنی زندگی کے تمام تر مرحلوں میں یہ اپنے اس آدرش اس نصب العین اس منتہائے مقصود اس روحِ حیات سے ادھر اُدھر نہیں ہوا۔ اس کے قدموں میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ تاریخ کے ہر دور میں ثابت قدم رہا۔ خواہ اس پر تاتاریوں نے حکومت کی۔ خواہ ترک اس پر فرماں روائی کرتے رہے۔ خواہ مغل آئے۔ اور خواہ انگریزوں نے عنانِ حکومت سنبھالی ہر دور میں یہ اپنے اسی نشانِ راہ پر جما اور ڈٹا رہا ہے۔

جامع اور بے داغ تہذیب و تمدن کے لئے دنیا نے ہمیشہ بے قراری اور بیتابی سے ہندوستان کی طرف اس امید سے دیکھا ہے کہ اس سرچشمہ روحانیت سے اخلاقی اور روحانی قدروں کے خزانے باہر نکلیں تاکہ دنیا اس کے ان عظیم اور نادر المثال روحانی خزانوں سے فیض یاب ہو سکے جن خزانوں کو ہندوستان نے ذلت و محکومی رسوائی اور تنگ دستی، بدحالی اور غلامی کے تاریک ترین دور میں بھی اپنے سینے سے لپٹائے رکھا ہے سنبھالے رکھا ہے۔ آج کی دنیا بھی آپ کے انہی خزانوں کا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن واہ رے ہندوستانیو! تمہیں اس بات کا اندازہ تک نہیں کہ دنیا میں ہندوستان کے عارفوں، سالکوں، ولیوں اور پیغمبروں، رشیوں اور مہاپرشوں کے ان گراں قدر خزانوں کے لئے کس قدر بھوک اور طلب ہے۔ ایک ہم ہیں کہ یہاں ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے ہیں۔ اور ہر مذہبی، دھارمک اور روحانی بات پر ایک دوسرے کا تمسخر اڑاتے ہیں یا ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بات کبھی ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آئی کہ ہندوستان کی سرحدوں کے باہر کس طرح لاکھوں کروڑوں انسان بے پناہ بے صبری اور ناقابلِ بیان تشنہ لبی کے ساتھ ہاتھ پھیلائے اس آبِ حیات، اس امرت کی ایک ایک بوند کے لئے ترس رہے ہیں، جس امرت اور آبِ حیات کو ہمارے آبا و اجداد نے سرزمینِ ہند میں سنبھال کر محفوظ و سلامت رکھ دیا تھا۔

آپ خواہ معرفت و توحید پر اعتقاد رکھیں یا نہیں۔ لیکن قومی حیات و بقا کے لئے آپ کو روحانی اور اخلاقی قدروں سے روشناس اور ان پر کاربند ہونا ہی ہوگا۔ اپنے ایک ہاتھ میں اس تحفۂ توحید کو تھام لو اور پھر دوسرا ہاتھ آگے بڑھا کر دنیا کی دوسری قوموں سے جو کچھ لے سکتے ہو لے لو۔ اپنے ایک دامن سے

www.taemeernews.com

متاعِ ایمان و اخلاق مضبوطی سے باندھ لو۔ پھر دوسرا دامن پھیلاکر دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں سے جو کچھ لینا چاہتے ہو لے لو۔ لیکن مت بھولو! آپ کی ہر بات ہندوستان کے روحانی نصب العین کے ماتحت اور زیر نگیں ہونی چاہیئے۔ جب ہم بھی اسی منزل پر پہنچ گئے تب ایک لاجواب درخشندہ اور روشن ترین مستقبل الا ہندوستان طلوع ہوگا۔ مجھے یقینِ واثق ہے کہ ایسا ہندوستان تیزی کے ساتھ ابھر رہا ہے اور طلوع ہو رہا ہے جس کی نظیر و مثال نہیں مل سکتی۔ ایک دفعہ پھر اس سرزمینِ ہند سے ایسے سالک، عارف، برہم رشی اور مہاپرش پیدا ہوں گے۔ جو ماضی کے تمام سالکوں، عارفوں، برہم رشیوں اور مہاپرشوں سے کہیں زیادہ عظیم اور کہیں زیادہ قابلِ احترام ہوں گے۔ انہیں دیکھ کر نہ صرف آپ کے آبا و اجداد اپنے اس قدر پرشکوہ اور عظیم المرتبہ جانشینوں اور نام لیواؤں سے مطمئن و مسرور ہوں گے بلکہ ان پر بجا طور پر ناز و فخر بھی کریں گے۔ آؤ میرے بھائیو! آؤ! ہم ایسے ہندوستان کی تعمیر و ترقی کے لئے دن رات محنتِ شاقہ سے کام لیں۔ یہ سونے کا وقت نہیں ہماری اس محنتِ شاقہ پر ہی کل کے ہندوستان کا دار و مدار ہے ہماری مادرِ وطن بے قراری اور بے تابی سے ہماری اس محنتِ شاقہ اور ہماری ان مساعی کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ اس وقت صرف محوِ خواب ہے اٹھو۔ جاگو۔ اور اپنی مادرِ وطن کو اس کا ابدی تخت لوٹا دو۔ اور اسے اس تخت پر جلوہ افروز کر دو۔ اپنی مادرِ وطن کو پہلے سے کہیں زیادہ پرشکوہ، پرشباب اور درخشندہ و تابندہ بنا دو۔

آپ نے کئی بار دیکھا ہوگا کہ جلیل القدر درخت کو خوبصورت پکا ہوا پھل لگتا ہے۔ جو زمین پر گر کر گل سڑ جاتا ہے۔ تب اس گلے سڑے پھل سے ایک نئے درخت کی جڑیں پھوٹتی ہیں جو بعد ازاں پہلے درخت سے بھی کہیں زیادہ رفیع الشان اور کہیں زیادہ تناور ہوتا ہے۔ حال ہی میں ہندوستان جس دورِ ابتری سے گذرا تھا وہ گویا اس کی نئی قومی حیات کے لئے ضروری تھا۔ اس دورِ ابتری سے اب مستقبل کا حسین و جمیل ہندوستان بیدار ہو رہا ہے۔ اس کی کونپلیں پھوٹ پڑی ہیں۔ اس کے برگ و بار صاف نظر آ رہے ہیں۔ اور دیکھتے دیکھتے یہ شاندار، عظیم الشان درخت پھلتا پھولتا جا رہا ہے۔

غلامی، بربادی اور کسمپرسی کی لمبی اور تاریک رات اب ختم ہو چلی ہے۔ دیکھو! سحر پھوٹ چکی ہے اور نسیمِ سحری کے جانفزا جھونکے چلنے شروع ہو چکے ہیں۔ قدرت خوابیدہ کلیوں کی پنکھڑیوں کو اپنے نرم نرم ہاتھوں سے عطر بیز، شفاف قطروں سے دھو دھو کر نکھار و نکہت بخش رہی ہے۔ ہندوستان کی شدید ترین تکلیف و اذیت اب رفع ہوتی جاتی ہے۔ اور بظاہر مردہ و بے جان نظر آنے والا ملک ایک بار زندگی کی انگڑائیاں لینے لگا ہے۔ وہ دیکھو، اس کے لب ہلنے لگے ہیں۔ اس کی قوتِ گویائی بحال ہو گئی ہے۔ اس کے اعضا میں نئی روح موجزن ہو گئی ہے۔ اس کے ہونٹوں سے ایک سحر انگیز آواز سی نکلنی شروع ہو گئی ہے۔ وہ آواز جو اس

www.taemeernews.com

قدیم زمانہ کی نقیب و خطیب ہے جس زمانہ تک تاریخ کی پہنچ ہے نہ ہمارے رسم و رواج جس کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ جو زمانہ ہماری تہذیب و تمدن کی نادر المثال روایات کے آنچلوں میں لپٹا ہوا ہے۔ اس بے مثال زمانہ کی یہ آواز ہمالیہ کی سر بفلک برف پوش چوٹیوں سے گونج گونج کر ہمیں محبت۔ خلوص۔ خدمت و محنت کا پیغام دے رہی ہے اور کہہ رہی ہے: "ہندوستان ہماری مادرِ وطن ہے۔ اس کی خدمت ہمارا ایمان ہے۔ اس کے بسنے والوں سے محبت ہمارا دین ہے۔" یہ آواز مدھم لیکن بھرپور ہے۔ اور روز بروز شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ یہ آواز بلند سے بلند ہوتی جا رہی ہے۔ اس آواز کو سن کر نیند میں سونے والے بھی جاگ اٹھے ہیں اور بیدار ہو گئے ہیں۔ ہمالیہ کے دامنوں سے آنے والی نسیم سحر کی طرح یہ آواز ہمارے لئے نئی زندگی کا پیغام لا رہی ہے۔ اس آواز کی بدولت مردہ ہڈیوں اور بے جان شریانوں میں نئی روح سرایت کر رہی ہے۔ غفلت و سستی۔ خواب آلودگی اور بے دلی کا طلسم ٹوٹتا جا رہا ہے۔ اور ہماری مادرِ وطن خوابِ خرگوش سے بیدار ہو کر نئی منزلوں پر کمندیں ڈال رہی ہے۔ صرف اندھی آنکھیں اس بیدار ہوتے ہندوستان کو نہیں دیکھ سکتیں۔ اور صرف مخرب اور برگشتہ مزاج نئے ابھرتے ہوئے ہندوستان کا صحیح جائزہ اور اندازہ نہیں کر سکتے۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ اس کی ترقی و تعمیر میں حائل ہو سکیں کس میں جرأت ہے کہ اس کو بامِ عروج، بامِ شہرت تک پہنچنے سے روک سکے۔ خواہ کچھ ہو جائے یہ ملک پھر اس خوابِ خرگوش کا شکار نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہمہ گیر صفات رکھنے والا یہ ملک اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا جا رہا ہے۔

اٹھو! اٹھو! دیکھو! شبِ ہجر کی طرح لمبی رات اب ختم ہو چکی ہے۔ دن کی روشنی تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے۔ سوئے ہوئے پرسکون پانی کی سطح پر ہلچل شروع ہو چکی ہے۔ لہریں اٹھنی شروع ہو گئی ہیں۔ اب اس کی طغیانی اور بہاؤ کو کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ یقین جانو میرے ہم وطنو! اعتماد سے یہ بات ذہن نشین کر لو کہ الہام نازل ہو گیا ہے۔ پروردگار کا اشارہ ہو گیا ہے کہ ہندوستان کو ایک بار پھر سے برتر و بالا اٹھنا ہوگا۔ اور اس کے عوام کو، اس کے غریب باشندوں کو مسرور و شادکام بننا ہوگا۔ میں ہندوستان کو اب تیزی کے ساتھ اونچا ابھرتا دیکھ رہا ہوں۔ اب یہ رک نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ بے پناہ طاقت کے ساتھ مائل بہ پرواز ہے۔ ہر انسان کو اس کی تعمیر و ترقی کے کام میں کندھے سے کندھا ملا کر محنت کرنی ہوگی۔ ہر نیکی اور بھلائی کی قوت کو اس کی قوتِ ترقی اور طاقتِ پرواز کو چار چاند لگانے ہوں گے۔ ہر دشت و پا کو اس کا راستہ صاف و ہموار بنانا ہوگا۔ پھر دیکھئے کہ مالک کی رحمت و برکت سے ہندوستان کہاں سے کہاں پہنچنے والا ہے۔ یہ سب اس مالک کے لطف و کرم کا صدقہ ہے۔

---

www.taemeernews.com

موجودہ زوال

قصور وار ہم ہیں، خطا ہماری ہے کیونکہ ہم ویدانت کے حامی اور داعی یقینی طور پر جانتے ہیں کہ اس کائنات کی کوئی شے ہمیں اس وقت تک کوئی نقصان وگزند نہیں پہنچا سکتی جب تک ہم خود پہلے اپنے آپ نقصان وگزند نہ پہنچا لیں کسی دوسرے کو موردِ الزام مت ٹھہرائیے۔ اپنے کرموں کے لئے دوسروں کو سزاوار کیوں بناتے ہو؟ جب تک کسی عیب، ناقص خوراک، تنگ دستی، درماندگی یا گرمی و سردی کی وجہ سے ہمارے جسمانی قالب میں کوئی نقص یا خرابی پیدا نہ ہو جائے تب تک ہوا میں موجود جراثیم ہمارا کچھ بھی نقصان نہیں کر سکتے جس کا جسم تندرست ہو۔ وہ جراثیم بھرے ہوا کے جھونکوں میں بھی سکون و راحت کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ اگر مرض یہاں ہے۔ تو وجہ مرض بھی یہاں ہی ہوگی۔ اس کے لئے ہم سزاوار ہیں۔ کمرِ ہمت باندھو۔ جرأت اور دلیری سے کام لو۔ اور اپنی اس دردشا اور درماندگی کی تمام تر ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھالو۔ دوسروں پر کیچڑ اچھالنا بند کر دو۔ کیونکہ ان تمام غلطیوں اور خرابیوں کے لئے جن کی ہم سزا بھگت رہے ہیں، ذمہ دار ہم ہیں۔ اور صرف ہم۔

ان دنوں ہر شخص ان افراد کو برا بھلا کہتا رہتا ہے۔ جو مڑ مڑ کر ماضی کی طرف دیکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ درماندگی اور خستہ حالی کی وجہ شدت کے ساتھ ماضی کو یاد رکھنا اور بار بار اس پر نگاہیں جمائے رکھنا ہے۔ میرے نزدیک یہ بات نہ صرف غلط ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ جو بات اس خیال کے الٹ ہے، وہی میرے نزدیک برحق ہے۔ جب تک ہندوؤں نے ماضی کو فراموش کئے رکھا، وہ زوال وانتشار کا شکار ہوتے چلے گئے۔ لیکن جونہی انہوں نے ماضی کو ملحوظِ خاطر رکھنا

شروع کر دیا۔ ہر سو نوید بہار آ گئی۔ ہر سو نئی زندگی انگڑائیاں لینے لگی۔ خزاں خوردہ چمن میں نئی بہار ڈال ڈال پات پات پہ رقص کرنے لگی۔

تاریخ کا ہر ایک بین طالب علم اس حقیقت سے کماحقہ واقف ہے کہ ہندوستان کے معاشرتی قانون و قاعدے وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ آغاز و ابتدا میں یہ قانون و قاعدے اس عظیم الشان منصوبہ کے جسم و جان تھے جس منصوبہ کو وقت کے ساتھ ساتھ بے نقاب و بے حجاب ہونا تھا۔ قدیم ہندوستان کے ان قابل احترام درویشوں، رشیوں، سالکوں اور عارفوں نے کمال کی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے بھانپ لیا تھا کہ دنیا کو ان کی حکمت و دانش کی قدر افزائی کرنے یا اس کی اہمیت و قیمت جاننے میں کئی صدیاں لگ جائیں گی۔ ہماری یہ کوتاہ بینی، بے قدری اور بے سمجھی ہی ہمارے زوال کی وجہ بن گئی۔ ہم جو اپنے آپ کو ان رشیوں کا نام لیوا اور جانشین کہلاتے ہیں، چونکہ ان کی حکمت و دانش کی قدر و قیمت نہ جان سکے اس لئے ہمیں یہ زوال و تنزل دیکھنا پڑا۔ ہم چونکہ ان کے اس عظیم منصوبہ کی صحیح اہمیت اور فضیلت سے شناسا نہ تھے اس لئے ہمیں یہ پامالیاں اور تباہ حالیاں دیکھنی پڑیں۔ میرے نزدیک ہندوستان کے زوال اور اس کی گراوٹ کی وجہ یہی تھی کہ ہم اپنے رشیوں کی حکمت و دانش سے بیگانہ سے بن گئے تھے۔ یہ کوتاہ بینی ہی ہماری ترقی کی راہ میں پہاڑ بن کر کھڑی ہو گئی۔ نہ صرف ہماری نظر و فکر میں بلکہ ہمارے کردار و اعمال میں بھی تنگی آ گئی۔ ہماری سوچ اور کام کے دائرے محدود سے ہو کر رہ گئے۔ ہم نے باہر جھانکنا اور نکلنا بند کر دیا۔ اور اس طرح دوسری قوموں سے اپنا مقابلہ یا موازنہ کرنا بھول بیٹھے۔ ہمارے آس پاس کی دنیا بدل گئی۔ لیکن ہم آنکھیں بند کیے ان حیرت انگیز انقلابات اور تغیرات کو دیکھ بھی نہ پائے جو ہمارے گرد و پیش رونما ہو رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی دل ہی دل میں ذلت و پستی میں دھنستی چلی گئی۔

ہندوستان کی درماندگی اور زبوں حالی کی بڑی وجوہات میں ایک وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے آپ کو تنگ نظر، تنگ دل اور تنگ عمل بنا لیا۔ بجائے اس کے کہ ہم صدف کی طرح اپنا منہ کھول کر اپنے آبدار موتیوں کو زمانہ میں لٹاتے۔ اور دنیا کو ان آب دار موتیوں سے مالا مال کرتے۔ ہم نے ان موتیوں کو اپنے ہی دامن میں سمیٹ کر رکھ لیا اور انہیں دنیا میں لٹانے سے انکار کر دیا۔ دنیا کی بھوکی اور پیاسی قومیں ہماری حیات افروز سچائیوں اور قدروں کو جاننے کے لئے بیتاب و بے قرار ہوئی جا رہی تھیں۔ لیکن ہم نے ان رازوں اور ان قدروں کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا اور آریہ نسل کے باہر کے لوگوں کو ان سے فیضیاب نہ ہونے دیا۔ میرا یہ پختہ ایمان ہے

www.taemeernews.com

کہ کوئی فرد یا کوئی قوم اپنے آپ کو سب سے بے تعلق اور نیارہ رکھ کر دوسروں سے بیگانہ بن کر اور دور رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور جب کبھی عظمت وحشمت، حکمت و دانش، حق وایمان کے متعلق غلط غرور اور خواہ مخواہ کے تکبر کی وجہ سے کسی نے اپنے آپ کو دوسروں سے الگ تھلگ بے تعلق اور بیگانہ رکھنے کی کوشش کی اسے ہمیشہ تباہی و ذلت کا منہ دیکھنا پڑا۔ میرے نزدیک ہند کی ذلت وپستی، تباہی وپامالی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں رسم ورواج کی ایسی دیواریں کھڑی کر دی گئیں جن کی بنیاد ہی اس بات پر تھی۔ کہ دوسروں سے نفرت وحقارت کرو۔ قوم کے اردگرد ایسی دیواریں چن دینے کا مقصد اس زمانۂ قدیم میں یہ تھا کہ ہندو آس پاس کی پڑوسی بدھ دھرم کو ماننے والی قوموں سے کوئی تعلق، واسطہ نہ رکھیں۔ اس غلط روی پر عقل و دلیل سے کوئی بھی نئی یا پرانی حجت پیش کریں تجزیہ کرنے سے بالآخر ایک ہی نتیجہ نکلے گا اور ہمیشہ اس اخلاقی اصول کا بول بالا رہے گا کہ کوئی فرد یا قوم اپنے آپ کو ذلیل وخوار کیے بنا دوسروں سے نفرت نہیں کر سکتی جس کسی نے دوسروں سے حقارت کی، دوسروں کو ٹھکرایا۔ دنیا نے اس سے حقارت کی اور اسے ٹھکرا دیا۔ یہ اسی غلط کاری کا انجام تو ہے کہ وہ نسل و قوم جو کبھی دنیا کی قدیم نسلوں اور قوموں میں پیش پیش تھی آج اس کی داستان تک بھی داستانوں میں نہیں۔ اور ہم اسے ذلت وحقارت کے گڑھے میں گرا دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے بزرگوں اور آبا واجداد نے جس آئینِ قدرت کو کھوج نکالا اور جس کی انہوں نے جی بھر کر تبلیغ واشاعت کی، ہم نے اس اصول کی خلاف ورزی کی اور اپنے ہی ہاتھوں اپنی تباہی اور پامالی کا سامان پیدا کیا۔

ایسا ملک جس کے بڑے بڑے رہنما پچھلے دو ہزار برسوں سے اس بحث مباحثہ میں الجھے ہوئے ہیں کہ روٹی دائیں ہاتھ سے کھائی جائے یا بائیں ہاتھ سے۔ پانی دائیں ہاتھ سے پیا جائے یا بائیں ہاتھ سے۔ اگر ایسا ملک ذلیل وخوار نہ بنے تو کیا بنے؟ تباہی وپامالی نہ دیکھے تو کیا دیکھے؟ ذرا تصور کی آنکھوں سے اس زوال وگراوٹ کے پچھلے چھ سو، سات سو برسوں کے حالات و واقعات کو دیکھئے۔ جب سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں بڑے بوڑھے برسوں تک اس مناظرہ و مباحثہ میں الجھے رہتے تھے کہ پانی کا گلاس کس ہاتھ سے پیا جائے، دائیں سے یا بائیں سے۔ ہاتھ کو تین مرتبہ دھویا جائے یا چار مرتبہ۔ کلی چار مرتبہ کی جائے یا پانچ مرتبہ۔ بھلا ان لوگوں سے جن کی عمریں اور زندگیاں ایسے وقتی اور فروعی سوالوں پہ بحث مباحثہ کرنے اور ان معاملات کے متعلق فلسفہ کی ضخیم ضخیم کتابیں لکھنے میں صرف ہو گئیں۔ ان سے آپ کس بات

www.taemeernews.com

کی توقع رکھ سکتے ہیں۔

خطرہ اس بات کا ہے کہ کہیں ہمارا مذہب و ایمان رسوئی میں بند ہو کر نہ رہ جائے ہم نہ ویدانتی ہیں نہ پورانوں کو ماننے والے نہ تانترک و دیا۔ کالے علم کو جاننے والے۔ ہم تو صرف دوسروں سے الگ تھلگ ہو چکے رہنے والے لوگ ہیں جن کی زبان پر ہر وقت یہی لفظ ہے کہ "مجھے ہاتھ نہ لگاؤ"۔ ہمارا مذہب و دھرم رسوئی میں بند ہو کر رہ گیا ہے۔ ہمارا ایشور اور خدا ہانڈی میں ہے۔ گویا ہمارا ایمان و مذہب صرف یہ ہے کہ "میں پاک و صاف ہوں مجھے مت چھوؤ"۔ یہ چھوا چھوت اگر ایک صدی اور رائج رہی تو ہم سب پاگل خانہ پہنچ جائیں گے۔ یہ ذہن و فکر کی کمزوری اور پستی نہیں تو کیا ہے کہ ہم زندگی کے اعلیٰ مقاصد و ضوابط کے متعلق تو سوچتے ہی نہیں۔ ان معاملات کی سوجھ بوجھ کی ہم میں قابلیت و علمیت ہی نہیں رہی۔ جیسے ہر قسم کی جدت پسندی اور قوت تخلیق مٹ گئی ہو۔ جیسے دل و دماغ سب صلاحیتوں سے محروم ہو چکے ہوں نہ خیال میں قوت پرواز ہو نہ جوش میں حرارت اور دماغ ذرا ذرا سی بات پر الجھ الجھ کر رہ جائے۔ بات بات پر تکرار شروع کر دے

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا سب سے بڑا قومی گناہ یہ ہے کہ ہم نے عوام کو، جنتا کو نظر انداز کر دیا میرے نزدیک ہمارے زوال کی ایک وجہ یہ بے رخی اور بے توجہی ہے۔ سیاست کی کتنی ہی گرمی اور شدت کیوں نہ ہو اگر ہندوستان کے عوام کو زیورِ علم نہیں پہنایا جاتا ان کے رہن سہن کو اچھا نہیں بنایا جاتا ان کو خوشحال و آسودہ حال نہیں بنایا جاتا تو یہ سب سیاست گری کس کام کی؟ ہماری تعلیم و تربیت کا خرچ ان کی جیبوں سے نکلتا ہے۔ ہمارے مندر اور ہماری عبادت گاہیں ان کے خون پسینہ کی کمائی سے تعمیر ہوتی ہیں۔ لیکن جواب میں انہیں کیا ملتا ہے۔ ٹھوکریں، عملی طور پر وہ ہمارے غلام ہیں! اگر ہندوستان کو پھر سے ترقی کرنی ہے، خوشحال اور فارغ البال ہونا ہے، عظمت و رفعت دیکھنی ہے، جاہ و حشمت حاصل کرنی ہے تو ہمیں ان کے لیے عوام کے لیے کام کرنا ہوگا۔

ہماری پامالی اور پستی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ہم نے عورتوں کو نظر انداز کر دیا۔ منو مہاراج تو کہہ گئے ہیں کہ جہاں عورتوں کی عزت و ناز برداری ہوتی ہے وہاں دیوتے بھی خوش رہتے ہیں۔ لیکن ہماری بیت ناک گناہ دیکھئے کہ ہم نے عورتوں کو کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ ذلیل و خوار کہنا شروع کر دیا۔ انہیں "جہنم کا دروازہ" کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ اور اسی طرح کی دوسری تہمتیں لگا دیں۔ اور حقارت آمیز آوازے کسنے شروع کر دیئے۔ لیکن ایشور کہتا ہے کہ تم

www.taemeernews.com

ہی عورت ہو، تم ہی مرد ہو، تم ہی لڑکے ہو، تم ہی لڑکی ہو، ہر روپ و صورت میں تمہارا ہی حسن و جلوہ نور افشاں ہے۔" لیکن ہماری کج فکری دیکھئے کہ ہم نے الٹا یہ شور شرابہ کھڑا کر دیا کہ "اس فسوں ساز، سحر طراز عورت کو کس نے پیدا کیا؟"

سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس ملک میں عورت اور مرد کے درمیان اس قدر امتیاز کیوں روا رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ ویدانت کی تعلیم یہ کہتی ہے کہ سب عورتوں میں ایک ہی پاک ذات جلوہ افروز ہے۔ جب دیکھو تم عورتوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہو۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ تم نے عورتوں کی فلاح و بہبود کے لئے کیا کچھ کیا ہے؟ سمرتیاں لکھ ڈالیں، انہیں کڑے اور سخت گیرانہ قاعدے قانونوں میں جکڑ کر رکھ دیا! اور انہیں محض بچے پیدا کرنے والی مشینیں بنا کر رکھ دیا؟ اگر تم نے ان عورتوں کے لئے جو دیوی ماں، خالق دو جہان کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں، کچھ نہ کیا تو سمجھ لو کہ تم کبھی ترقی نہیں کر سکو گے۔ ترقی اور عظمت کا ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عورتوں کو اونچا اٹھاؤ۔ انہیں پستیوں سے نکالو، انہیں عظمت و رفعت کی جگہ پر بٹھاؤ۔

آیئے ہم خطرات و حوادث کا جائزہ لیں جن سے ہم دوچار ہیں۔ یہ خطرات کہیں باہر سے نہیں ہندوستان میں ہیں اور ہماری آنکھوں کو صاف نظر آ رہے ہیں۔ ان میں دو خطرات جو زیادہ مہیب ہیں ہمیں دور کرنے ہوں گے۔ ان میں ایک ہے پرلے درجہ کی مادہ پرستی۔ اور دوسرا خطرہ ہے پرلے درجہ کی اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی ہمیں ان سے بچنا ہوگا۔ اور ان کا تدارک و انسداد کرنا ہوگا۔

لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مغرب کی اندھی تقلید کی جائے۔ کئی ایسے بھی ہیں جو ذرا سی مغربیت، اہل مغرب کی ذرا فہم و فراست حاصل کر کے اس تکبر اور گھمنڈ میں پھنس جاتے ہیں جیسے سب کچھ جانتے ہیں، ایسا انسان ہمارے قدیم رشیوں، سالکوں اور عارفوں کا تمسخر اڑاتا پھرتا ہے۔ ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ اس کے لئے تمام ہندو فلسفہ محض باطل پرستی ہے، ہندوؤں کی ساری حکمت و دانش محض طفلانہ قیاس آرائی ہے، مذہب و ایمان محض جہالت اور بے وقوفوں کی مخبوط الحواسی اور کج فہمی ہے۔

اندھی تقلید اور اندھی نقل میں تہذیب و تمدن کی شائستگی اور جوہر افشانی کہاں؟ میں اگر راجہ یا بادشاہ جیسا لباس پہن لوں تو کیا اس سے میں راجہ یا بادشاہ بن جاؤں گا؟ گدھا شیر کی کھال اوڑھ کر شیر نہیں بن سکتا، وہ گدھا ہی رہتا ہے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ بزدلانہ اور جاہلانہ نقل و تقلید سے کوئی تعمیر و ترقی نہیں ہوگی۔ بلکہ ایسی نقل و تقلید تو اس بات کی علامت و نشانی ہے کہ اس شخص میں دہشتناک کمزوری اور گراوٹ آ گئی ہے۔ یہ پستی کی انتہا ہی تو ہے کہ انسان اپنے آپ سے نفرت

www.taemeernews.com

شروع کر دیتا ہے۔ جب کوئی انسان اپنے آبا و اجداد پہ شرم و ندامت محسوس کرنے لگے تو سمجھو کہ اس کی موت و قضا آپہنچی۔ اس کا خاتمہ قریب آگیا۔ اس لئے میری تعلیم آپ کو یہی ہے کہ آپ اپنے آپ کو ان ہندوستانی زندگی سے کنارہ کش، بے تعلق یا دور نہ کیجئے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال دل میں نہ لائیے کہ اگر سب ہندوستانی کسی دوسری نسل و قوم کی طرح کھانا، پہننا شروع کردیں تو یہ ملک بہشت بن جائے گا یہ خیال خام ہے اسے دل سے نکال دیجئے۔

جس طرح مغرب کی اندھی تقلید مفید نہیں، اسی طرح دقیانوسیت اچھی نہیں۔ جو آدمی پڑھا لکھا ہے لیکن خبطی اور سودائی ہے، پرلے درجہ کا دقیانوسی ہے ہر بات پہ کوئی نہ کوئی حجت پیش کرتا ہے۔ یا دلیل دیتا ہے۔ ایسا آدمی ہر وہم، ہر جہالت اور اپنے معبود گاؤں اور نسل کے ہر رواج کی ایک یا دوسری طبیعی، مابعد الطبیعاتی حجت و دلیل اور خدا جانے کیسی کیسی طفلانہ منطق پیش کرے گا اس کے نزدیک گاؤں میں مروج و مشہور ہر وہم اور ہر جہالت بھی وید کا فرمان ہے جس پہ عمل کرنے پہ ہی قومی زندگی کا دار و مدار ہے میں کہتا ہوں کہ ایسے خبطی اور دقیانوس سے ہوشیار رہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم میں کتنے ہی وہم پھیلے ہوئے ہیں۔ کتنی ہی جہالتیں گھر کر چکی ہیں۔ کتنی ہی ضعیف الاعتقادیوں کے داغ اور بدنما پھوڑے ہمارے جسم مذہب پہ نکلے ہوئے ہیں۔ جن کا ہمیں انسداد و تدارک کرنا ہوگا۔ جن کو ہمیں کاٹ دینا ہوگا۔ اور خاتمہ اور ازالہ کرنا ہوگا۔ لیکن اس کا مطلب اور مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہمارے مذہب و ایمان میں کوئی خرابی یا عیب ہے نہیں۔ ہمارے دین و ایمان، ہماری قومی زندگی اور ہماری توحید اور روحانیت کو مت تباہ کیجئے۔ کیونکہ جہاں تک مذہب کے بنیادی اصولوں کا تعلق ہے۔ ہر اصول برحق، درست اور محفوظ ہے۔ لیکن جتنی جلدی ضعیف الاعتقادی کے سیاہ دھبے مٹا دیئے جائیں اتنی جلدی ہمارے یہ اصول جگمگانے لگیں گے پہلے سے کہیں زیادہ آب و تاب کے ساتھ۔ اس لئے ان اصولوں کو خیر باد مت کہیئے۔ بلکہ مضبوطی اور ثابت قدمی کے ساتھ ان کے پابند بنے رہیئے۔

لیکن کس قدر رنج و الم کی بات ہے کہ اپنشدوں کی تقدیس و عظمت کے وارث اور عارفوں اور سالکوں کا دوسری سب قوموں سے زیادہ پیارا اور قابل فخر حسب نسب رکھنے کے باوجود ہم کمزور و لاغر، نحیف و ناتواں ہیں۔ بے حد شکستہ ہمت ہماری کمزوریوں میں سب سے بڑی ہماری جسمانی کمزوری ہے جسے ہمیں دور کرنا ہے میں تو کہوں گا کہ ہماری ایک تہائی تلخیوں، دشواریوں، نامرادیوں اور مشکلوں کی وجہ ہماری یہ جسمانی کمزوری ہے۔

ہمارے نوجوانوں کو مضبوط اور طاقتور بننا ہے۔ دین و مذہب کی ضرورت ثانوی ہے اس کے بعد

www.taemeernews.com

میں دیکھ لیں گے میرے جواں سال دوستو! میرا آپ کے نام یہی پیغام اور یہی اپدیش ہے کہ مضبوط۔ توانا اور قوی ہمت بنو۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی رگ رگ اور نس نس فولاد کی بن جائے۔ آپ کی بلند ہمتی شہزوری اور توانائی میں ہی ملک کی آزادی و آبرو کا راز چھپا ہوا ہے۔

کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ہماری یہ درد دشا کیوں ہوئی؟ ہمیں یہ ذلت و پامالی کیوں دیکھنی پڑی؟ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ ہم خود اعتمادی کی دولت لٹا بیٹھے۔ ہمارے دل و دماغ خود اعتمادی سے محروم ہو گئے۔ ہم میں اعتقاد اور یقین ایمان اور وشواس ختم ہو گیا۔ میں اگر کہوں کہ ہم سے کہیں زیادہ اعتقاد و ایمان انگریز مردوں اور عورتوں میں ہے۔ تو بے جا نہیں ہوگا۔ ہم اس دولت سے محروم ہو کر ذلیل و رسوا ہوئے اور اس وجہ سے ہم غلام بنے۔ ورنہ کیا کسی کی مجال تھی کہ ہمارے اوپر حکومت کرتا! لیکن ہماری کمزوری اور بزدلی دیکھیئے کہ گذشتہ ایک ہزار برسوں میں کتنی ہی بار مٹھی بھر حملہ آور ہماری سر زمین کو روندتے ہوئے آگے بڑھے۔ اور انہوں نے ہم تیس کروڑ ہندوستانیوں کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ اور ہمیں غلامی اور ذلت کی عمیق ترین پستیوں میں پھینک دیا۔ جانتے ہو اس کی وجہ کیا تھی؟ وہ جذبۂ خود اعتمادی سے معمور تھے۔ اور ہم اس جذبے سے محروم۔ انہیں اپنے زور بازو پر بھروسہ تھا۔ لیکن ہم بے ہمت اور لاغر تھے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہندوستان کی سربلندی اور عظمت کے لئے پھر سے جذبۂ خود اعتمادی۔ شردھا اور وشواس اپنے اندر پیدا کریں۔ بے ہمت ناتواں اور لاغروں کی زندگی سے تو موت بدرجہا بہتر ہے۔ کمزوری قضا ہے۔ بہادری ہمت اور طاقت زندگی ہے۔

غلام اور مفتوح قوم کے ناطے ہماری ہمت و خود اعتمادی کے رہے سہے سوتے بھی سوکھ گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم یہ سوچنے لگ گئے ہیں کہ ہم کمزور اور بے ہمت ہیں۔ ہم کسی بھی بات میں آزادانہ روش اختیار نہیں کرتے۔ یہ درماندگی، جذبۂ خود اعتمادی۔ وشواس اور شردھا کے فقدان کا مظہر ہے ہمیں پھر سے اپنے دلوں میں اسی جذبہ کو بیدار کرنا ہے۔ اور اپنے دماغوں کو، اپنی روحوں کو شردھا اور وشواس سے معمور کرنا ہے۔ جب تک یہ جذبہ بیدار نہیں ہوگا، ہم نہ آزاد ہو سکیں گے نہ ترقی و سربلندی کا منہ دیکھ سکیں گے۔ کمر ہمت باندھئے اور جذبۂ خود اعتمادی پیدا کرتے ہی ہمارے ملک اور ہماری قوم کے جملہ مسائل حل ہونے شروع ہو جائیں گے۔ اس ایک مشکل کو آسان کر لیجئے۔ باقی مشکلیں خود بخود آسان ہونی شروع ہو جائیں گی۔ اپنے اوپر بھروسہ اور اعتماد رکھو۔ مضبوط اور شہ زور بنو۔ یہ وشواس تمہارے دل میں جاگزیں ہو جانا چاہیئے کہ ہم آتما ہیں۔ امر لافنا، آزاد، پاک و صاف، پھر بھلا ہم سے کوئی گناہ کیسے سرزد ہو سکتا ہے۔ پھر بھلا ہم غلام اور کمزور کیوں کر رہ سکتے ہیں۔ یہی جذبہ کلید کامیابی ہے۔ یہی فکر و نظر ہمیں انسان بنائے گی۔

www.taemeernews.com

بلکہ ہمیں فرشتوں کا ہم نشین بنادے گی۔ کمزوری، پژمُردگی، بے ہمتی اور یاؤسی کے برسائے کو دور بھگا دو۔ اپنے دلوں میں یہ بات اچھی طرح بٹھالو کہ ہم سب یہاں مخصوص کام کرنے کے لئے آئے ہیں۔ یہ کام ہمیں کرنا ہی ہوگا۔ ہم بہت سا کام پہلے کر چکے ہیں۔ جو باقی رہتا ہے وہ کام ہمیں اب انجام دینا ہوگا۔ یہ ذمہ داری ہماری ہے جس سے ہم بھاگ نہیں سکتے۔ ہمیں یہ فرض ادا کرنا ہوگا۔ اور پوری ہمت و جانفشانی سے ادا کرنا ہوگا۔ کاہلی اور سستی، مایوسی اور بے بسی اور لاچاری کے جو ہلاکت آفریں جراثیم ہمارے قومی خون میں سرایت کرتے چلے ہیں انہیں ختم کردو۔ اور ملک و قوم کو رفعت و عظمت کی بلندیوں پر پہنچاؤ۔ اپنے آپ پر طعن و تشنیع بھیجنا اور اپنے بزرگوں کا تمسخر اڑانا ترک کردو۔ شردھا اور وشواس کے ساتھ ہمت باندھ کر تعمیر و ترقی کی راہ اختیار کرو۔ دیکھو کامرانی اور کامیابی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔

حیف افسوس ہے کہ ہمارا سارا قومی کردار طفلانہ ثابت ہو گیا۔ جیسے بچے ہر بات کے لئے دوسروں کا منہ تکتے رہتے ہیں، دوسروں پر تکیہ کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم دوسروں کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ ہم تو یہاں تک کاہل، بے ہمت اور دوسروں پر تکیہ کرنے والے بن گئے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ پکا پکایا کھانا ہمارے سامنے لاکر رکھ دیا جائے ہمیں اس کے لئے کوئی محنت و مشقت نہ کرنی پڑے۔ بلکہ کئی لوگ تو یہاں تک گئے گزرے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ انہیں لقمہ منہ میں ڈالنے کی بھی زحمت نہ اٹھانی پڑے اور کوئی ان کے منہ میں نوالہ ڈالتا جائے۔ یہ زندگی میرے نزدیک موت سے بدتر ہے۔ جو اپنی مدد آپ نہیں کرتے انہیں زندہ رہنے کا کیا حق ہے؟ یاد رکھیئے کہ وہی قوم زندہ رہتی ہے جو زندہ رہنے کے لئے محنت و مشقت کرتی ہے۔ یہی کیفیت ہر ایک انسان کی ہے۔ اس لئے امداد کے لئے دوسروں کی طرف دیکھنا بند کردو۔ بیرونی امداد پر کب تک زندہ رہ سکو گے؟ افراد کی طرح قوموں کو بھی اپنی حیات و بقا کے لئے محنت کرنا ہوگی۔ یہی حقیقی اور اصلی حب الوطنی ہے۔ دیش بھگتی ہے۔ اگر کوئی قوم اس راز حیات سے محروم ہے تو سمجھ لیجئے کہ ابھی اس کے دن نہیں پھرے۔ ترقی و خوشحالی سے ہمکنار ہونے کے لئے اسے ابھی انتظار کرنا ہوگا۔

یہ کاہلی، سستی اور فرض سے فرار کے مترادف ہی تو ہے کہ ہم میں سے ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ اسے کوئی کام نہ کرنا پڑے صرف دوسروں پر حکم چلانا پڑے جسے دیکھو سب حکمرانی چاہتے ہیں۔ اطاعت اور تابعداری کوئی نہیں چاہتا۔ سب فرماں روائی کے دلدادہ ہیں۔ کوئی بھی فرماں برداری کا طلبگار اور حاجتمند نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی کے ابتدائی دنوں میں لوگوں کو ہر بچہ کو یہ تعلیم نہیں دی جاتی۔ ہر بچہ یہ میں سب سے پہلے فرماں برداری، اطاعت اور تابعداری سکھائی جاتی ہے۔ یہ پہلے خدمت

www.taemeernews.com

کرنا سیکھو۔ وقت آئے گا کہ آپ خود بخود مخدوم بن جائیں گے۔ فرماں برداری سے فرماں روائی مل جائیگی اچھا مخدوم وہی ہوتا ہے جو اچھا خادم ہو۔ فرماں برداری بھی غیر مشروط ہونی چاہیئے۔ کسی قسم کی چون وچرا حیل و حجت دلیل و بحث نہیں ہونی چاہیئے۔ کوئی بزرگ اور بڑا اگر آپ کو کہے کہ طوفانی دریا کی بپھری ہوئی متلاطم موجوں میں کود کر مجھ کو پکڑ لاؤ۔ تو اس حکم پر لبیک کہتے ہوئے دریا میں کود جاؤ۔ دلیل و حجت چون وچرا بعد از اں کرنا۔ خواہ یہ حکم غلط ہی کیوں نہ ہو، بے جھجک بلا شرط، بلا حیل و حجت اسے عملی جامہ پہنا و بحث بعد ازاں کرنا کہ یہ غلط تھا۔ خدمت گزاری فرماں برداری کی خوبی و صفت اپنے اندر پیدا کر لو۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تم اپنا آپ تک مٹا دو۔ یا قربان کر دو۔ نہیں! اپنی انفرادیت قائم رکھ کر بڑوں کے حکم کی تعمیل کرنا سیکھو جب تک بڑوں کی خدمت گزاری کو مسلکِ حیات نہ بنایا جائے گا۔ تنظیم و کام میں مرکزیت کہاں سے آئے گی؟ کوئی بڑا کام اس وقت تک انجام بھی نہیں دیا جا سکتا جب تک سب قوتیں مرتکز ہو کر مل کر اس کام کو نہیں کرتیں۔

باتیں کم کرو۔ زبانی جمع خرچ کرنے اور ہوائی قلعے بنانے سے تقدیریں نہیں بدل سکتیں۔ لیکن اس وقت جدھر دیکھیئے بڑھ چڑھ کر باتیں کی جا رہی ہیں۔ زبان سے زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں ہم بڑے ہیں۔ ہم عظیم المرتبہ ہیں۔ یہ سب باتیں میرے نزدیک بیہودہ اور محض بکواس ہیں۔ ہم نامرد اور ہیجڑے ہیں۔ ہم بزدل اور تن آسان ہیں۔ زبان سے تو ہم زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں لیکن کرتے کراتے کچھ نہیں محض طوطے کی طرح کچھ باتیں رٹ لینے سے کچھ نہیں بنتا۔ زبانی جمع خرچ کرنا اور ہاتھوں سے کچھ نہ کرنا، یہی ہماری خو اور یہی عادت بن کے رہ گئی ہے۔ ایسی ضعیف العقلی سے ہمارا کچھ بھی نہیں بنے گا۔ ہمیں کردار کا غازی، مردِ میدان بننا ہوگا۔

اپنی کس کس بات کا رونا رویا جائے۔ ہم پرلے درجے کے کاہل، سست اور تن آسان ہیں۔ ہم کام نہیں کر سکتے۔ اکٹھے مل کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ایک دوسرے سے رشتۂ محبت نہیں جوڑ سکتے۔ ہم میں نہ اتحاد ہے نہ رفاقت۔ ہم انتہائی طور پر خود غرض اور حسد و رشک کی آگ میں جلنے والے ہیں۔ ہم تین اکٹھے ہو جائیں تو لازمی طور پر ایک دوسرے کے خلاف جلتے کڑھتے رہیں گے۔ تین اکٹھے مل بیٹھیں تو ایک دوسرے کے خلاف بد گمانی اور رقابت کرنے لگ جائیں گے۔ ہماری موجودہ دردناک کیفیت یہ ہے۔ کہ ہم بری طرح سے غیر منظم ہجوم سا بن کر رہ گئے ہیں۔ انتہائی طور پر خود غرض، مطلبی اور نفس پرست ہیں۔ اور رسالدماہ کی انتہا کہ دشمنوں سے کتنی ہی صدیوں سے ہم ایک دوسرے سے اس سوال پر دست و گریباں ہوتے چلے آ رہے ہیں کہ ماتھے پہ تلک کس طرح لگایا جائے ہم نے

www.taemeernews.com

اپنی ساری قوتوں اور طاقتوں کو رسم و رواج کے متعلق حقیر ترین انتہائی فروعی سوالات پر فضیم سے ضخیم کتابیں تحریر کرنے پر صرف کر دیا۔

اور پھر ہم جذبۂ اتحاد بھرو محبت تنظیمی قوت اور جماعت بندی کے جوہر سے قطعی طور پر ناآشنا ہیں۔ جیسے گروہ بندی۔ جماعتی تنظیم ہماری فطرت میں ہی شامل نہ ہو ہمیں پھر سے اتحاد و رفاقت کا رشتہ پیدا کرنا ہے۔ جماعتی تنظیم پیدا کرنا ہے۔ اپنے آپ کو شیرازہ بند کرنا ہے۔ اور ایسا کرنے کا اہل ترین طریقہ، اس کا راز یہ ہے کہ حسد و رقابت کو بالکل دور کر دیا جائے خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے بھائیوں کے نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ کو سننے کے بعد اسے قبول کرنے کے لئے تیار رہو اور ہمیشہ صلح جو بنو فراخ دلی سے مخالف نظریوں کو تسلیم کرنے کے لئے مستعد رہو۔ جب تک یہ جماعتی اتحاد پیدا نہیں ہوگا تم طاقتور نہیں بن سکو گے۔

کبھی سوچا آپ نے کہ تنظیمیں اور جماعتیں اس قدر طاقتور اور ذی اثر کیوں ہوتی ہیں؟ مثال کے طور پر کیا آپ جانتے ہیں کہ چار کروڑ انگریز تیس کروڑ ہندوستانیوں پر کیسے حکومت کر رہے ہیں؟ انگریز کی اس حکومت اور ہماری اس غلامی کی نفسیاتی وجہ کیا ہے؟ انگریز ہم سے تعداد میں کہیں کم ہوتے ہوئے بھی متحد اور منظم ہیں۔ اور ہم ان سے کہیں زیادہ تعداد میں ہونے کے باوجود منتشر اور ایک دوسرے سے جدا اور بگڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے مستقبل کو آباد بنانے کے لئے، اسے خوشنمائی اور رعنائی سے مزین کرنے کے لئے ہمیں اتحاد اور اتفاق کا گر سیکھنا چاہیئے۔ دلوں میں رفاقت اور محبت پیدا کر کے ہی ہم طاقت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور شہ زور بن سکتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں اتھر وید سنگھتا کا ایک منتر ابھر رہا ہے میرا دھیان بار بار اس کے جگمگاتے اپدیش کی طرف مبذول ہوتا جا رہا ہے۔

اس وید منتر میں کہا گیا ہے: ”بھگوان کرے تم سب کے دل ایک جیسے ہوں۔ تمہارے دلوں میں رفاقت اور یگانگت ہو۔ تم سب کے جذبات اور احساسات ایک جیسے ہوں۔ تمہارے خیالوں اور فکروں میں یکسانیت اور اخوت ہو“۔ دلوں اور خیالوں کی اس یگانگت اور رفاقت کی بدولت ہی دیوتاؤں اور فرشتوں پر خدا کی رحمتیں نازل کی گئی تھیں۔ فرشتوں اور دیوتاؤں کی پرستش و تعظیم کا راز اسی بات میں ہے۔ کہ ان میں اتفاق اور اتحاد ہے۔ ان کے دل ملے ہوئے ہیں۔ ان کے قدم ملے ہوئے ہیں ان کے ذہن و فکر ملے ہوئے ہیں۔ ترقی معاشرت کا راز اسی یک دلی میں پنہاں ہے۔ اور جب تک آپ دراوڑستان یا آریہ کے سوال پر برہمن اور غیر برہمن کے سوال پر ایک دوسرے سے لڑتے مرتے رہو گے، تب تک آپ اس قوت اور طاقت سے محروم رہو گے جس قوت اور

طاقت سے مستقبل کا ہندوستان تعمیر کرنا ہے۔ اس امر حقیقت کو اپنے دلوں میں پیوست کر لو کہ ہندوستان کے مستقبل کا انحصار آپ کی اسی طاقت اور قوت پر ہے۔ اور اس طاقت اور قوت کو حاصل کرنے، جمع کرنے کا راز صرف اتحاد و محبت، رواداری اور بردباری، یگانگت و رفاقت میں پنہاں ہے۔ اپنے دلوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیجئے، اپنی بکھری ہوئی منتشر قوتوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیجئے۔ اور قدم سے قدم ملا کر، کندھے سے کندھا ملا کر، بانہوں میں بانہیں ڈال کر، دلوں اور روحوں، خیالوں سے خیال ملا کر، ولولوں سے ولولے ملا کر حسین و جمیل مستقبل کی طرف رواں دواں آگے بڑھیئے۔

ہندوستان کے باشندوں، ہندوؤں میں تاجرانہ امور کے متعلق ایک ایسا مخصوص جوہر بن سا پایا جاتا ہے جیسے انہیں تاجرانہ دیانت و کمال حاصل نہ ہو۔ نہ یہ حساب کے پکے ہیں اور نہ ان میں سلیقہ و ضابطہ موجود ہے۔ ان کی اقتصادی اور معاشی زندگی میں جتنا بھی جھانک کر دیکھئے، اتنا ہی آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ انہیں ابھی کاروبار اور لین دین کے اعلیٰ ترین اصولوں کو سمجھنا ہے، اپنانا ہے۔ تجارت، تجارت ہے، بیوپار بیوپار ہے۔ اور اس میں کسی طرح کی رو رعایت، دوستی یا آنکھ کی شرم نہیں ہونی چاہیئے۔ جو رقم بھی کسی کی تحویل میں ہو اس کی پائی پائی کا حساب صاف صاف رکھنا چاہیئے۔ اور ایک مخصوص کام کے لئے وقف کیا گیا روپیہ پیسہ کسی دوسرے کام میں خرچ اور صرف نہیں کیا جانا چاہیئے، خواہ ہمیں فاقوں ہی کیوں نہ مرنا پڑے۔ تاجرانہ کسب و کمال تو یہی ہے۔ اگر آپ میں یہ جوہر تجارت آ جائے۔ اور اس کے ساتھ آپ اپنے اندر کبھی نہ دھوکا دینے والی قوت بیدار کر لیں۔ تو پھر کسی چیز کی کمی نہیں رہے گی۔ جو کچھ بھی تم کرو، اسی حسن عمل سے کرو۔ کہ یہ کام بندگی اور عبادت سا بن جائے۔

لیکن جب تک آپ اپنے کام سے پیار و محبت نہیں کریں گے نہ یہ کسب و کمال ملے گا، نہ طاقت و ہمت نصیب ہوگی اور نہ ہی آپ کا کام بندگی بن سکے گا۔ محبت کام سے ہو یا ایک دوسرے کے ساتھ، اس کے بغیر نکھار اور چمک کہاں سے آئے گی؟ کوئی انسان بھی اپنے کام سے نفرت کر کے اس کام میں کمال و جمال پیدا نہیں کر سکتا۔ بالکل اسی طرح کوئی انسان یا کوئی نسل و قوم دوسروں سے نفرت و حقارت کر کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی تاریخ کا تاریک ترین دن وہ تھا جب لفظ "ملیچھ" ایجاد کیا گیا۔ اور ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی، محبت، خلوص و الفت سے پیش آنا بند کر دیا تھا۔ اور محبت کی جگہ نفرت و حقارت کو بنیاد زندگی بنا لیا تھا۔ محبت کبھی ناکام اور نامراد نہیں ہوتی۔ اس کا ثمر آج ملے یا کل یا برسوں بعد، کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اپنا رنگ اثر پیدا کر کے رہے گی۔ بالآخر سچائی اور محبت ہی کامران و فاتح رہی ہے۔ محبت و عشق نے زندگی کے معرکے سر کئے ہیں اور سب کامیابیوں اور نصرتوں کو قدم بوسی پر مجبور کیا ہے۔ اس لئے اپنے

www.taemeernews.com

ہم وطنوں سے خلوص و پیار سے پیش آؤ۔ ایک دوسرے سے بھرپور محبت سے برتاؤ کرو۔ آپ کی زندگی کے تاریک گوشے بھی جگمگا اٹھیں تو کہنا۔

آپ پوچھتے ہو کہ ہم خدا اور ایشور کی جستجو میں کہاں جائیں۔ میں کہتا ہوں کہ کیا سب غریب، مفلس، نادار، درماندہ، لاغر و نحیف انسان خدا اور ایشور نہیں ہیں؟ کیوں نہ پہلے ان کی عبادت و بندگی کی جائے؟ گنگا کے کنارے کنواں کھودنے کی کیا ضرورت ہے۔ خدا اور محبت کے قادر مطلق ہونے پر یقین و ایمان لاؤ لیکن کیا آپ محبت و عشق سے شناسا بھی ہیں؟ اگر میں تو یقین کرو کہ تم قادر مطلق ہو کیا آپ مطلقاً بے نفس اور بے لوث ہیں؟ اگر ہیں تو یقین کرو کہ کسی غیر میں اتنی تاب و طاقت کہاں کہ آپ کا راستہ روک سکے یا آپ کی مزاحمت کر سکے۔ آپ کی بے نفسی کے سامنے ٹھہرنے کی کس میں مجال ہے؟ یہ اخلاق و کردار کی بلندی اور عظمت ہے جس کو ہر جگہ فتح و نصرت ملتی ہے۔ اپنے اندر بھی بلندیٔ کردار اور پاکیزگیٔ اخلاق پیدا کر لو۔ پہاڑ تمہارے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے۔ بحر بیکراں کی پہنائیاں آپ کے لئے اپنا سینہ کھول دیں گی۔ سر بفلک چوٹیوں پہ اور عمیق ترین گہرائیوں میں ہر جگہ خدا آپ کی حفاظت و نگہداشت کرے گا۔ اس کا رحم و کرم قدم قدم پہ آپ کے ساتھ رہے گا۔ شرط یہ ہے کہ آپ ملک و قوم کے لئے ہیرو بن جائیے۔ جرأت و ایثار کے پیکر بن جائیے۔

اپنے صدقِ دل کے احساسات کو جگاؤ۔ جذبات و خیالات میں سوز و گداز پیدا کرو۔ عقل و دلیل میں کیا رکھا ہے؟ یہ چند قدم جا کر دم توڑ دے گی لیکن سوزِ عشق، سوزِ محبت آپ کا ساتھ چھوڑے گا۔ یہ آپ کو بلند سے بلند تر لیتا جائے گا۔ آپ کو ان بلند ترین مرتبوں اور مقامات تک لے جائے گا جن کا خیال تک عقل و دلیل کی سرشت میں نہیں رکھا گیا۔ معاملہ عقل و دلیل تک رہے گا۔ تو چند قدم چل کر آپ اپنے قدموں کو آگے چلنے سے معذور پائیں گے۔ لیکن اگر معاملہ دل سے ہو گا۔ تو جوش و ولولہ آپ کو کہاں سے کہاں لے جائے گا۔ نہ آپ کے پاؤں رکیں گے نہ آپ کی راہیں مسدود ہوں گی۔ عقل و دلیل پہ جو دروازے بند ہوتے ہیں وہ سوزِ عشق پہ کھل جاتے ہیں۔ اس کائنات کے سربستہ راز دل کی کنجی عشق و محبت کے ہاتھ میں ہے۔ سوزِ محبت جگاؤ، دیکھو کائنات اپنی سب اسرار مخفی آپ پہ آشکار کر دینے کے لئے دیوانی ہو جاتی ہے یا نہیں؟ مزا تو جب ہے کہ آپ کے دلوں میں وطن و قوم کے لئے ہی سوزِ محبت بیدار ہو جائے۔ آپ ہی بتائیے کہ کیا آپ کا دل اس عشق و محبت سے معمور ہے؟ آپ اب بے لوث جذبۂ حبِ وطنی سے سرشار ہیں؟ کیا آپ دیوتاؤں اور فرشتوں کے ان نام لیواؤں اور جانشینوں کی حالت زار دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں یا نہیں جو زمانہ کی ٹھوکریں کھا کھا کر وحشی اور درندے بن چکے ہیں؟ کیا آپ فی الحقیقت محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے لاکھوں ہم وطن فاقوں مر رہے ہیں۔ اور نہ جانے کتنی صدیوں سے اسی فاقہ مستی اور مفلسی کی پستیوں اور

www.taemeernews.com

تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں ؟ کیا آپ کا دل یہ دیکھ کر سچ مچ بلک اٹھتا ہے کہ جہالت کی گھنگھور گھٹا نے آپ کے وطن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے ؟ کیا ملک و قوم کی یہ ابتری کس مپرسی اور واماندگی دیکھ کر بے چین اور بے قرار ہو جاتے ہیں ؟ کیا اپنے وطن کی غربت و جہالت آپ کی راتوں کی نیند اور دن کے چین کو حرام کر دیتی ہے ؟ کیا مادرِ وطن کی یہ زبوں حالی دیکھ کر آپ کا دل گریہ زاری کرنے لگ جاتا ہے ؟ حقیقی حب الوطنی اور یک دلی بھگتی تو یہی ہے کہ یہ صورتِ حالات آپ کو مضطرب و مغموم بنا دے ۔ اور آپ اپنے آپ کو، اپنے بیوی بچوں کو، اپنی جائداد اور اپنی امارت و شہرت سب کا خیال چھوڑ کر وطن کی اس درد شا کو دور کرنے کے لئے کود پڑیں ۔

تنگ دیواروں سے باہر نکلو ۔ اور اس وسیع و عریض دنیا کو دیکھو ! دیکھو دنیا کی قومیں کس طرح ترقی کرتی جا رہی ہیں ۔ تم بھی کوشش کرو کہ تمہاری مادرِ وطن ہند بھی ترقی کرے ۔ کیا تم انسان سے پیار کرتے ہو ؟ کیا تم اپنے ملک سے پیار کرتے ہو ؟ تو آؤ ہم مل کر ملک کی سربلندی اور خوشحالی کے لئے جدوجہد کریں تاکہ ہمارا ملک بھی اونچا اٹھ سکے ۔ خدمتِ وطن کی راہ پر سرفروشوں اور جاں نثاروں کی طرح آگے بڑھو ۔ اور پھر کوئی پکارتا رہ جائے کوئی آوازیں دیتا رہ جائے ۔ تم ملک کی عظمت و رفعت کے لئے برابر آگے قدم بڑھاتے چلے جاؤ ۔ آپ کے عزیز و اقارب بھی آپ کی راہ نہ روک سکیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے آگے دیکھئے آگے بڑھیئے اور جب تک آپ اپنے عزم و ارادہ کو عملی جامہ نہیں پہنا لیتے ۔ آرام و سکون کے ساتھ مت بیٹھو ۔

خدمتِ وطن کے عظیم کام کے لئے انسانوں کی ضرورت ہے ۔ دوسری ہر چیز تیار ملے گی ۔ اولین ضرورت انسانوں کی ہے مضبوط، جفاکش، جذبۂ خود اعتمادی سے معمور، دیانت دار، بے لوث، ایماندار، سرفروش انسانوں کی ضرورت ہے ۔ ایسے ایک سو سرفروش مجاہد اور غازی مل جائیں تو ساری دنیا میں تہلکہ مچا دیں ۔ انقلاب سا برپا کر دیں ۔

اصلی اور لازمی چیز بےنفسی، بےتعلقی، بےلوثی ہے ۔ کیونکہ جب تک آپ بےنفس، بےتعلق، بےلوث نہیں ہوں گے آپ دوسروں کی خدمت میں دل و جان سے نہیں جٹ سکیں گے ۔ صرف بےلوث اور بےنفس انسان ہی ہر پہلو اور ہر زاویہ سے اچھی طرح سے دیکھ سکتا ہے اور صورتِ حالات کا درست اور حقیقت پسندانہ جائزہ لے سکتا ہے ۔ اور سراپا خدمت بن جاتا ہے ۔ اپنے آپ کو دوسروں کی خدمت کے لئے وقف کر دیتا ہے ۔ ایسا سرفروش اور بےنفس انسان جدھر نگاہ اٹھاتا ہے سب مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں ۔ کیونکہ یہ کسی مشکل اور دقت کو خاطر میں کب لاتا ہے ۔ کس میں جرأت و ہمت ہے کہ حق و صداقت اور محبت و خلوص کی مزاحمت و مخالفت کر سکے ۔ اس لئے صادق و راسخ بن جاؤ ۔ دم واپسیں تک حق و صداقت کا دامن نہ چھوڑیئے ۔ راہِ حق پر گامزن رہیئے اور خواہ موت سے ہمکنار کیوں نہ ہونا پڑے ۔ صداقت و بےخوفی کو ہاتھ سے مت چھوڑیئے ۔ خوف و خطر کو دل سے نکال کر

244 www.taemeernews.com

دوسروں کی خدمت کرتے چلے جائیے۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنے دامنِ علم کو کشادہ سے کشادہ تر کرتے چلے جائیے کام کرو۔ مصروفِ عمل ہو جاؤ۔ کام میں جٹ جاؤ میرے بہادر اور نیک دوستو! خدمتِ وطن کے لئے خون پسینہ ایک کر دو۔ اور ترقیٔ وطن کے پہیئے کو آگے حرکت دو۔ اپنا کندھا آگے کر دو۔ اور اس پہیئے کو آگے بڑھاؤ۔ اور ایسا کرتے ہوئے اپنے نام و نمود، شہرت و دولت، عظمت و رفعت کے سب خیالوں کو دل سے نکال دو۔ یہ سب خیال خام ہیں محنت کرو۔ اور بساطِ حیات پلٹ کر رکھ دو۔ اسے مقدس اور پاک و صاف رکھو! کام کرو۔ یہی میرا پیغام ہے۔

قوم و وطن کی خدمت کے لئے سب تن آسانیاں سب بھی انکار یاں سب سستیاں اور سب کاہلیاں ترک کر دو۔ سب مسرتیں، سب عیش پرستیاں قربان گاہِ وطن پر قربان کر دو۔ اور اس آتشِ خدمت میں کود پڑو۔ اور لوگوں کو جوق در جوق اس مالک کے دربار میں لے جاؤ۔ دل و جان سے اپنے آپ کو اس خدمت میں لگا دو آپ اپنے اندر اس قدر بے پناہ قوت و ہمت کے سرچشمے پھوٹتے دیکھیں گے کہ آپ اس قدر قوت و ہمت کی تاب بھی نہ لا سکیں اسے برداشت نہ کر سکیں۔ دوسروں کی سیوا کے لئے کیا گیا ادنے سے ادنے کام انسان کے دل و دماغ میں اتھاہ طاقت پیدا کرتا ہے۔ دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے سوچا گیا ہر خیال آپ کے دل میں شیرِ ببر کی سی قوت کو جگا دے گا۔ میں آپ کو صدقِ دل سے محبت و پیار کرتا ہوں لیکن میں زیادہ پسند کروں گا کہ آپ دوسروں کی خاطر اپنی جان پر کھیل جائیں۔ اپنی زندگی کو دوسروں کی فلاح و بہبود کی خاطر قربان کر دیں ایسی موت موجودہ زندگی سے بدرجہا بہتر ہوگی۔

دنیا میں ہمیشہ سچائی کا بول بالا ہوتا ہے۔ دورِ اوّل سے سچ جھوٹ کے مقابلہ میں سچ کا پلڑا بھاری رہا ہے یہی کیفیت نیکی، اچھائی، بھلائی اور نفس کشی کی ہے۔ آپ میں یہ خوبیاں ہوں تو ناپاک سے ناپاک دنیاوی قوتیں بھی آپ کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ آپ ہر میدان میں فتح و نصرت حاصل کریں گے اور ہر جگہ اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑتے چلے جائیں گے۔ کونسا کام ہے جسے پایہ کامیابی تک پہنچنے سے پہلے آپ کو دشواریوں اور پریشانیوں میں سے نہیں گذرنا پڑتا۔ لیکن وہ پست ہمت اور نامراد ہوتے ہیں۔ جو ان دشواریوں اور پریشانیوں سے گھبرا کر کوشش و کاوش ترک کر دیتے ہیں اور ہمت ہار بیٹھتے ہیں ثابت قدم آج نہیں تو کل، لازمی طور پر تنویر کامیابی دیکھیں گے۔ اچھے کام میں تو مشکلیں اور زیادہ ہوتی ہیں۔ اس راہ پر چلنے والوں کو بے پایاں صبر و ہمت اور بے پایاں ایثار نفسی سے کام لینا ہوگا۔ جن کے پاس یہ رختِ سفر ہوگا۔ وہ جلد یا بدیر منزلِ مراد پالیں گے۔ صدق و ایمان کے ساتھ اس راہ پر چلتے رہو۔ اس نشانِ منزل کی طرف بڑھتے چلو۔ صادق بنو۔ ایماندار بنو۔ نیکوکار بنو۔ بے نفس اور حق پرست بنو۔ دوسرے

www.taemeernews.com

دھیرے قدم بڑھاؤ تیزی یا بے قراری سے لمبے لمبے ڈگ نہ بھرو۔ اس سے گرنے کا خدشہ و خطرہ لاحق ہوگا۔ شروع شروع میں بڑے بڑے منصوبے نہ بناؤ۔ لمبے چوڑے خاکے تیار نہ کرو۔ بلکہ آہستہ آہستہ اپنا راستہ صاف کرکے آگے بڑھو۔ اور ثابت قدمی سے اس وقت تک رواں دواں آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ جب تک کہ منزل نہیں مل جاتی۔

دو باتوں کو پلّے باندھ لو۔ ان کے متعلق ہمیشہ چوکس اور ہوشیار رہو۔ ایک ہے قوتِ محبت دوسری ہے حسد و رقابت کی تباہ کاری۔ قوتِ محبت تمہارے ساتھ رہنی چاہیئے۔ حسد و رقابت کی آگ کو اپنے دل میں ذرا سی بھی جگہ نہ دو۔ لیڈر رہبر بن کر تم نے قدم اٹھایا۔ تو راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ آپ کا راستہ کانٹوں سے بھر جائے گا۔ اور ان کانٹوں کو کوئی دور کرنے نہیں آئے گا۔ لیکن یہ کانٹے آپ کی نفس پرستی، جاہ پرستی، شہرت پرستی نے ہی آپ کے راستوں میں بکھیرے ہیں۔ اس لیئے کامیابی کا گر یہ ہے۔ کہ آپ پہلے اپنا آپ ختم کردو۔ کامیابی چاہتے ہو تو پندار، خودی، احساسِ فخر و افتخار، احساسِ حسد و رقابت اپنے دل سے نکال دو۔ اپنے بھائیوں کی رہنمائی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ انہیں رہنمائی کی نہیں خدمت کی حاجت ہے۔ دوسروں کی رہنمائی اور رہبری کرنے کے وحشیانہ جنون نے نہ جانے کتنوں کے بیڑے بیچ منجدھار غرقاب کیئے ہیں۔ اس لیئے اس جنون و سودا سے ہمیشہ بچ کر رہو۔ رہنما اور رہبر نہ بنو۔ خادم بنو۔ سب کی خدمت آپ کا مسلک بن جائے سب کی خدمت آپ کا دستورِ حیات بن جائے۔ حکمرانی کا ارمان آپ کو ذلت و رسوائی دکھائے گا لیکن اگر آپ خدمتِ خلق شروع کردیں گے۔ تو آپ لوگوں کے دلوں پہ حکومت کریں گے خدمت گذاری آپ کو مخدومِ قوم بنا دے گی۔

ہر ایک کے ساتھ صبر و تحمل کے ساتھ پیش آؤ۔ بردباری اور روا داری سے چلو۔ بحث مباحثوں میں کیوں الجھتے ہو۔ دوسروں کے خیالات اور نظریات کو خندہ پیشانی اور فراخدلی سے سنو۔ دوسروں کی تردید نہ کرو۔ یقین جانو۔ کہ تحمل مزاجی، راست بازی، ایثار نفسی اور بردباری ہی غالب آئے گی اور اسی کا بول بالا ہوگا۔ ہر ایک فرد و بشر کو خوش کرنے کی کوشش کرو۔ دوسروں کے دلوں کو گدگداؤ۔ انہیں محبت و مسکراہٹ دو۔ پھر دیکھو آپ کے دامن میں کتنی محبت سمٹ آتی ہے۔ کتنی مسکراہٹیں آپ کے دل میں سما جاتی ہیں۔ نہ دوسروں کے ساتھ مکر و فریب کرو۔ نہ ریاکاری اور مکاری کو اپنا شیوہ بناؤ۔ نہ بزدلی یا کم حوصلگی سے کام لو۔ اپنے اچھے، نیک، برحق خیالات کو ہمت و صداقت کے ساتھ پکڑے رکھو۔ آپ کی راہ میں کتنی ہی مشکلیں کیوں نہ آئیں دل ہمت چھوڑو۔ وقت آئے گا کہ ساری دنیا کو آپ کی آواز سننی پڑے گی۔ آپ کے الفاظ کی قدر و منزلت کرنی ہوگی۔ آپ کے الفاظ کی اہمیت و فوقیت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اپنے رویہ کو مثبت

www.taemeernews.com

رکھو۔ مستقل مزاجی کو ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ دوسروں پر نکتہ چینی نہ کرو۔ بلکہ محبت و پیار کے ساتھ اپنا پیغام دیتے جاؤ۔ آپ کے پاس دنیا کو سکھانے کے لئے کوئی شے ہے تو دنیا کو سکھاؤ۔ اور اس کے بعد آپ کا کام ختم ہوا۔ آگے کی مالک جانے۔ آپ کا کام سمجھانا ہے جبر و تشدد کے ساتھ دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانا نہیں۔

اپنے دل کو اس کائنات کی طرح وسیع و عریض بنالو۔ کشادہ دلی اور فراخ دلی کو فطرت بنالو۔ مادرِ وطن کو ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جو دیوانوں اور سودائیوں جیسی شدتِ جذبات اور مادہ پرستوں جیسی وسعتِ قلب رکھتے ہوں۔ دل ہو تو بحرِ بیکراں کی طرح گہرا نیلگوں آسمانوں کی طرح بے انداز ہمیں ایسے ہی قلب و جگر رکھنے والے انسانوں کی ضرورت ہے۔

مانا کہ ہم غریب و مسکین ہیں۔ مانا کہ ہم کچھ بھی نہیں تسلیم کہ ہم بے کس و بے جان ہیں لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ خدا اور ایشور نے ایسے ہی مسکین و غریب۔ بے کس اور بے حیثیت انسانوں کو اپنی مخصوص رحمت و برکتوں کے لئے منتخب کیا تھا۔ ایسے ہی مسکین و غریب اور عاجز و منکسر بندوں کو اس مالک نے اپنا ولی۔ پیغمبر اور رسول بنایا تھا۔ اور ان کو برہم رشیوں کا درجہ دیا تھا۔ خدا اور بھالے کے لئے دوسروں کے منہ کی طرف مت دیکھو۔ کیا اس مالک کی امداد تمام انسانی امداد سے افضل نہیں؟

نیک نفس اور خدا دوست بنو۔ مالکِ دوجہاں پر ایمان و اعتقاد رکھو۔ اور ہمیشہ اس پر بھروسہ اور اعتماد رکھو یہی راہِ خدا ہے یہی راہِ حق ہے۔ اس راہ پر چلتے ہوئے آپ کے خلاف کوئی کفر و کذب باطل و الزام نہیں ٹھہر سکتا۔ ہمیشہ پروردگار سے یہی دعا مانگو کہ "اے میرے رب! اے میرے مولا! اے نورِ ازلی میرے دل کی تاریکیوں کو دور کر۔ اندھیرے کو مٹا کر اجالا کر۔ تاریکی مٹا کر روشنی کر۔" اعتماد اور اعتقادِ صدق و ایمان سے مانگی گئی یہ دعا قبولِ بارگاہ ہوگی۔ اور آپ دیکھیں گے کہ تاریکیوں کو چیرتی ہوئی روشنی کی شعاع آپ کی راہوں کو اجاگر کرنے کے لئے دیوانہ وار آپ کی طرف دوڑتی چلی آرہی ہے۔ ایک دستِ رحمت آپ کی امداد کے لئے غیب سے بڑھتا آرہا ہے۔ ایشور کا نام لے کر اس کی رحمتوں کو پکارتے ہوئے آگے بڑھتے چلو۔ اسے اپنا سپہ سالار اور اپنا جرنیل بنالو۔ اور قدم آگے بڑھاتے چلے جاؤ پیچھے مڑ کر نہ دیکھو کہ کون ساتھ آرہا ہے۔ اور کون راستے ہی میں گر رہا ہے بلکہ ہمت اور مضبوطی سے آگے بڑھو میرے بھائیو! اس راہ پر ہمیں اسی طرح چلنا ہے۔ ایک گر جائے تو دوسرا اس کا کام سنبھال لے۔ کام نہیں رکنا چاہیئے۔ اس لئے اے بہادرو! اے شیر دلو! افکار و اضطراب کا یہاں کیا کام، کام کرو۔ ایشور ہماری پشت پناہ ہے۔ وہ مہان شکتی آپ کے ساتھ ہے۔

www.taemeernews.com

حیاتِ نو کے تقاضے

معاشرتی ہو یا سیاسی سب نظاموں کا دار و مدار انسانوں کی نیکی و خوبی پر ہے۔ کوئی ملک اور قوم محض اس لئے عظیم اور بڑی نہیں بن جاتی کہ اس کی پارلیمنٹ نے فلاں فلاں قانون و آئین مرتب کیا ہے۔ بلکہ اس کی عظمت و سربلندی اس بات میں مضمر ہے کہ اس کے انسان نیک اور اچھے ہیں۔ دنیا بھر کی دولت ایک طرف انسان ایک طرف دنیا کی دولت کے انباروں اور خزانوں سے انسان کہیں بیش قیمت ہے۔

برطانیہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ وہ ہندوستان کو نجات حاصل کرنے میں امداد دے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ ترقی جو اس حاکم کے اشارے پر رقص کرتے ہوئے کی جائے گی جس حاکم نے اپنے محکوم ملک کا گلا گھونٹ رکھا ہو بے قیمت اور غیر حقیقی ہو گی۔ کیا غلاموں کی طرح کام کرنے والے مزدوروں کی طرف سے جو کام کیا جائے گا' اعلیٰ ترین پائے کا ہو گا؟ ہرگز نہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ یہ کام آپ کا ہو گا یا آپ کے حاکموں کا؟ اگر یہ کام آپ کا ہے تو اس سے آپ کی ضرورتیں پوری ہونی چاہئیں۔ اگر یہ آپ کے حاکموں کا کام ہے تو اس سے حاکموں کو فیض پہنچے گا۔ آپ کو نہیں۔ لیکن کیا کبھی گداگروں کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ اور پھر اگر حکومت آپ کو کچھ کرنے کے لئے کچھ سہولتیں دے بھی دیتی ہے تو اس کام کو انجام دینے کے لئے مطلوبہ ہنرمند انسان کہاں سے آئیں گے اس لئے پہلے ایسے انسان پیدا کرو۔

جب ایسے انسان جو ملک و قوم کی خاطر بہت کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔ جو تہہ دل سے محب وطن اور مخلص و صادق ہوں۔ مادرِ وطن کی خدمت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ تب ہندوستان سچے معنوں میں ہر پہلو سے عظیم اور بڑا ملک بن جائے گا۔ مادرِ وطن کی نبض اس وقت کھلے گی جب ہزاروں سرفروش' جانثار'

www.taemeernews.com

محبِ وطن اپنی تمام خوشیاں، اپنی تمام مسرتیں، اپنی تمام راحتیں، وطن کی آزادی و آبرو کی خاطر قربان کرنے کے لیے میدان میں کود پڑیں گے۔ ہندوستان کے دن تبھی پھریں گے۔ جب کفن بردوش دیش بھگت اپنے ان لاکھوں ہم وطنوں کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے۔ جو روز بروز جہالت و تہی دستی، محرومی و بے نصیبی کی عمیق گہرائیوں میں گرتے جا رہے ہیں۔

ان نوجوانوں میں کام کرو، ان نوجوانوں کو اکساؤ۔ اور انہیں اس بات کی تلقین کرو۔ کہ وہ دل و جان سے اس مقدس فرض کو پورا کرنے میں جٹ جائیں۔ اور یہ واحد فرض ہے ہندوستان کے عوام کو اونچا اٹھانا، ان کی حالت کو سدھارنا۔ ان نوجوانوں کو جگاؤ۔ انہیں ایک تنظیم میں متحد و متفق بنا دو۔ اور انہیں خلوصِ دل کے ساتھ بے نفس و بے لوث رہتے ہوئے ملک و وطن کے لیے سب کچھ لٹا دینے کی تعلیم و تربیت دو۔ ہندوستان کے مستقبل کا دار و مدار صرف نوجوانوں پر ہے۔ ملک اوپر اٹھے گا تو ان کے دم قدم سے۔ بڑا بنے گا تو ان کی ہمت سے سربلند و خوشحال بنے گا تو ان کی محنت و قربانی کے صدقے جب آزادیٔ وطن کے ایسے ہزاروں پروانے جان ہتھیلی پہ رکھ کر، پروانہ وار بے پناہ اعتقاد و ایمان رکھ کر اپنے ہم وطنوں کو آزادی و خوشحالی کی تعلیم دیں گے۔ انہیں غلامی و جہالت کی ایک ایک زنجیر کاٹ دینے کے لیے اکسائیں گے۔ تب یہ گرا ہوا، پامال شدہ، روندا گیا ملک جاگ کر عظمتوں اور سربلندیوں کی طرف بڑھے گا۔ اور ملک بھر میں ایک نئی صبح نئی زندگی انگڑائیاں لے گی۔ قدرت اس امر کی ہے کہ اس جذبۂ سوزِ وطن سے سرشار نوجوان ملک کے طول و عرض میں پامال اور پسماندہ و بے سہارا لوگوں کو مقدس عقیدۂ آزادی، دین، خدمت، پیغامِ مساوات کی تعلیم دیں گے تبھی سارا دیش جاگ اٹھے گا، سارا ملک بیدار ہو جائے گا۔

اس وقت مجھے ایسے ہی کفن بردوش، حرارتِ ایمان سے شعلوں کی طرح دہکنے والے مبلغوں اور مشنریوں کی دستی کی ضرورت ہے میرا منصوبہ ہندوستان میں جگہ جگہ ایسے ادارے قائم کرنے کا ہے۔ جو ہمارے نوجوانوں کو ہماری مقدس کتابوں کی عظیم سچائیوں بے مثل قدروں کی ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر دوسرے ملکوں میں تبلیغ و تلقین کر سکیں۔

اس وقت ہندوستان میں ہم جن سیاسی نظاموں کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ صدیوں یورپ میں آزمائے گئے ہیں۔ کئی صدیوں سے آزمائے جا رہے ہیں لیکن انہیں اکثر ناکام اور ادھورا، ناقص اور غیر مکمل بتایا گیا ہے۔

ایک کے بعد دوسرے ہر ایسے نظام ادارے اور دستور کو، جس کا تعلق سیاسی حکومت یا سیاسی نظم و نسق کے ساتھ تھا، نکما اور بے سود قرار دے کر مسترد اور متروک کیا جا چکا ہے۔ یورپ اس وقت سخت بے چینی اور پریشانی میں گرفتار ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں کہ کدھر جائے سامنے اگلی منزل تک معلوم نہیں۔ توپ و تفنگ کے ساتھ نہ کوئی ساری دنیا پہ حکومت کر سکا ہے اور نہ آئندہ کر سکے گا۔ گولی اور لاٹھی کے ساتھ ساری

www.taemeernews.com

دنیا کو فتح کرنا، اور اس پر حکومت کرنے کا خواب یقیناً سراسر حماقت، بے عقلی، نادانی اور جہالت ہے۔ تاریخ عالم کی ورق گردانی کر کے دیکھ لو۔ تم دیکھو گے کہ وہی مرکز اور وہی ملک جہاں جبر و تشدد کے ساتھ فتح عالم کا جنون خیال پیدا ہوا تھا، سب سے پہلے زوال پذیر ہو ۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، یہ ممالک اور یہ مراکز قعر گمنامی و ذلت میں گر پڑے۔ جو یورپ آج مادی ترقی پر اس قدر اترا رہا ہے پچاس برس کے اندر اندر خاک کا ڈھیر بن کر رہ جائے گا۔ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اس صورت حالات سے بچنے کی ایک ہی صورت باقی ہے۔ اور وہ یہ کہ یورپ ایسا نظریۂ حیات تبدیل کر لے۔ اور مادہ پرستی کی بجائے روحانیت کو بنیاد زندگی بنا لے۔

آثار و قرائن اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ ہر جگہ سوشلزم یا عوام کی حکومت، اسے آپ خواہ کسی بھی نام سے کیوں نہ پکاریں، اور کسی اصطلاح سے یاد کریں برسر اقتدار آ رہی ہے۔ لازمی امر ہے کہ لوگ اس بات کی کوشش کریں کہ ان کی مادی ضروریات بہم پہنچائی جائیں۔ انہیں کم کام کرنا پڑے۔ ان پر کوئی سختی یا تشدد وغیرہ نہ ہو۔ انہیں جنگ و جدل کا کوئی کھٹکا نہ رہے۔ اور انہیں بھر پیٹ کھانے کو ملے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے۔ کہ موجودہ یا کوئی آنے والی تہذیب اتنی دیر تک بقید حیات رہے گی۔ جب اس کا دستور، آئین، مذہب، دا ایمان۔ نیکی اور بھلائی پر انحصار رکھے گا، اور انسان کے اعلیٰ اخلاق اور اس کے جوہر انسانیت کو نکھارے گا۔ موٹی بات تو یہ ہے کہ دین و دھرم پر بھروسہ کرو۔ کیونکہ یہ حق و ایمان ہی ہے جو ہر بات کی تہ تک جاتا ہے۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو سب کچھ ٹھیک ہے ہمیں یہ بات تسلیم کرنی ہو گی کہ قانون، حکومت، اختیار و سیاست، یہ سب راستے ہیں راستے کی منزلیں ہیں۔ یہ خود منزل مقصود نہیں۔ یہ سب تشنہ کام اور ادھورے خاکے ہیں۔ ہماری منزل ان سے کہیں اونچی، ان سے کہیں دور پرے ہے۔ اور وہ منزل مقصود بھی ایسی ہے کہ وہاں کسی قانون و قاعدہ، اختیار، حکومت، سیاست اور حکمت عملی کی کوئی حاجت نہیں حضرت عیسیٰ نے بھی یہی پند سود مند دنیا کے سامنے رکھا تھا کہ قانون و آئین بنیاد زندگی نہیں۔ اخلاق و ایمان۔ ایثار نفسی اور نیک باطنی ہی حقیقی قوت ہے۔ اور پھر آپ نے یہ ضرب المثل بھی تو سن رکھی ہو گی کہ پارلیمنٹ کے آئین و قانون سے ہم انسان نہیں بنا سکتے۔ انسان گری قانون سے نہیں، حق و ایمان سے کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ حق و ایمان۔ مذہب و دھرم کی قدر و قیمت سیاسی شعبدہ گری سے کہیں زیادہ ہے۔ قاعدے اور قانون۔ آئین و حکومت یہ سب چیزیں تغیر پذیر ہیں۔ بدل جاتی ہیں آئے دن ان میں انقلابات آتے رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک حق و ایمان۔ مذہب و دھرم کا تعلق ہے۔ یہ ایسی غیر فانی، اٹل سچائیوں پر دارومدار رکھتا ہے جو انسان کے دل و دماغ پر گہرا، کبھی نہ مٹنے والا اثر چھوڑتا ہے۔ انسان کے اخلاق و کردار میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرتا ہے۔

www.taemeernews.com

III

ہندوستان کی حالت زار سدھارنے کے لئے کسی مذہبی عقیدہ واعتقاد کو تلف و برباد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میرا نظریہ تو یہ ہے کہ موجودہ زبوں حالی اور درماندگی کی وجہ مذہب دھرم نہیں ۔ بلکہ اس دردناکی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں مذہبی اور روحانی قدروں کو ان معنوں میں اپنایا ہی نہیں گیا جن کی یہ مستحق تھیں ہم نے کہنے کے لئے مذہب قبول کر لیا لیکن روح مذہب سے بے خبر نا آشنا رہے ۔ اور حقیقی مذہب کو اپنی زندگیوں میں لانے میں ناکام رہے قصور مذہب ایمان کا نہیں ہماری کوتاہی غفلت اور غلط روی کا ہے ۔ حقیقت میں اپنی قدیم مذہبی کتابوں سے ثابت کر سکتا ہوں ۔ ان کا حرف حرف درست ہے میری تعلیم یہی ہے ۔ کہ مذہب ایمان کو برا بھلا نہ کہو ۔ اپنے کردار و اخلاق ، عمل و فعل کو دیکھو ۔ اس انقلاب کو لانے کے لئے ہمیں اولین توجہ اپنشدوں پہ دینی ہوگی ۔ ان مقدس کتابوں میں جو لاجواب سچائیاں بھری پڑی ہیں وقت آگیا ہے کہ انہیں اب سارے ملک میں سب لوگوں میں بانٹ دیا جائے ۔ ہندوستان میں کوئی بھی ترقی ، کوئی بھی ترمیم و بہتری کرنی ہو اولین ضرورت اس بات کی ہے کہ مذہبی انقلاب برپا کیا جائے ۔ لوگوں کو حقیقت مذہب سے روشناس کرایا جائے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوستان میں سیاسی اور سوشلسٹ ، اشتراکی نظریات کی آبیاری کرنے سے پہلے ملک میں روحانی اور مذہبی خیالات و نظریات کا سیلاب سا لا دیا جائے ۔ سخاوت و خیرات کی اس سرزمین پہ آیئے ہم سب سے پہلے مذہب و روحانیت کی خیرات بانٹیں اور سخاوت کا بازار گرم کریں اور اخلاقی و روحانی قدروں کی حتی المقدور اشاعت و تبلیغ کریں ۔ اور یہ اشاعت و تبلیغ کا کام صرف ہندوستان کے اندر ہی نہیں کیا جانا چاہیئے ۔ بلکہ انہیں چار دانگ عالم میں پھیلانا ہوگا ۔ لوگوں کو روحانی اور اخلاقی قدروں کی تعلیم عام دینے کے ساتھ ساتھ انہیں مادی دنیا کی تعلیم اور دوسری ہر تعلیم کو عام کرنا ہوگا جس کی ملک و وطن کو ضرورت ہے ۔ لیکن اگر آپ مذہب ، معرفت ، توحید و ایمان کو نظرانداز کرکے دوسری سب تعلیمیں پھیلائیں گے ، تو میری بات ذہن نشین کر لیجئے آپ کی سب کوششیں اکارت جائیں گی نہ آپ کبھی لوگوں کو اپنے قابو میں رکھ سکیں گے ۔

ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر کے لئے پہلا زینہ جو ہمیں چڑھنا ہے ۔ پہلا قدم جو ہمیں اٹھانا ہے پہلا کام جو ہمیں ہاتھ میں لینا ہے ۔ وہ یہی ہے کہ روحانیت و مذہب کے اس قدیم ترین چٹان کو توڑ کر اس کے لعل و جواہرات کو گھر گھر میں بانٹنا ہوگا ۔ اور مذہب میں یکدلی اور یگانگت ، اتحاد و اتصال پیدا کرنا ہوگا ہم سب کو اس بات کی تعلیم دی جانی ہے ۔ اور یہ بات ہمیں دلوں میں پیوست کرنی ہوگی کہ ہم ہندوستانیوں کی پشت پہ بعض مشترکہ ، سانجھے اصول کارفرما ہیں ۔ اور اب وقت آگیا ہے ۔ کہ ہم اپنی حیات و بقا کے لئے اپنی نسل کی بہتری و بہبودی کے لئے اپنے ملک و وطن کی سربلندی اور عظمت کے لئے اپنی چھوٹی موٹی سب

لڑائیاں اور چپقلشیں ختم کر دیں۔ اور متحد و منظم ہو جائیں۔ ایک اور یک رنگ ہو جائیں۔ ہندوستان میں ایک ایسی نسل بیدار ہو جانی چاہیئے جس کے افراد کے دل ایک ہوں سب کی دھڑکنیں ایک ہوں۔ ایک ہی روحانی جذبہ ہر دل میں موجزن ہو۔ ایک ہی روحانی اور اخلاقی نغمہ ہر لب پر رقصاں ہو۔

مادرِ وطن کو ضرورت اس وقت فولادی پٹھوں اور آہنی عزم و ارادہ والے ایسے جانبازوں کی ہے جو زمین و آسمان کے اسرارِ مخفی کو نوچ ڈالیں اور اس کائنات کے ہر چھپے خزانے کو لوٹ سکیں جو خلاؤں اور فضاؤں کو چیر ڈالیں۔ دریاؤں اور سمندروں کی گہرائیوں کو سر کر لیں جو پہاڑوں کو چیر ڈالیں صحراؤں اور میدانوں کو احاطۂ قلب میں لے لیں سرزمینِ ہند میں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔ اور ہم ایسے انسان ایسے ہم وطن ادویت اور وحدت کو سمجھنے اور سوچنے اسے اپنی زندگی میں اتارنے سے ہی پیدا کر سکتے ہیں، قائم اور بحال کر سکتے ہیں اور انہیں مضبوط و توانا بنا سکتے ہیں۔ اس اصولِ وحدت اس جذبۂ توحید کو عملی زندگی میں لائے بنا کسی بھی دوسرے طریقہ سے ملک میں حیات نو نہیں لائی جا سکتی۔ اپنشدوں کی سچائیاں آپ کے سامنے ہیں انہیں اپناؤ۔ انہیں اپنی زندگی میں اتارو۔ اپنی زندگی ان تعلیمات کے سانچے میں ڈھالو۔ ہندوستان آزاد و سرخرو ہو جائے گا۔ ملک کا بیڑا پار ہو جائے گا۔

ملک کا مستقبل آپ کو للکار للکار کر کہہ رہا ہے کہ جواں ہمت بنو۔ طاقتور بنو۔ شہ زور بنو۔ ہمت و قوت، طاقت اور توانائی کے بغیر کچھ نہیں بنے گا۔ اپنشد کیا ہیں؟ اسی تعلیم کا سرچشمہ، اسی قوت اور طاقت کا مخزن اپنشدوں کے اقوالِ زریں میں اس قوت اور طاقت کا راز پنہاں ہے، جن پر عمل پیرا ہونے سے ساری دنیا میں انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے کل عالم میں تہلکہ مچایا جا سکتا ہے۔ اس دنیا کو مضبوط و مستحکم بنایا جا سکتا ہے اس میں نئے عزم و عمل کی روح پھونکی جا سکتی ہے اپنشدوں کی تعلیم کسی کی اجارہ داری نہیں۔ یہ سب انسانوں کے لیئے، سب ملکوں اور قوموں اور نسلوں کے لیئے ہے۔ سب فرقوں، سب مذہبوں اور سب عقیدوں کے لیئے ہے۔ یہ سب کو پکار پکار کر کہتی ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ۔ آزاد بنو۔ طاقتور بنو۔ جسمانی اور فطری آزادی حاصل کرو۔ ذہنی اور قلبی آزادی حاصل کرو۔ روحانی اور مذہبی آزادی حاصل کر یہی اپنشدوں کی تعلیم کا لبِ لباب اور ماحصل ہے۔ اسے پلے باندھ لو۔ دیکھتے ہی دیکھتے رنگِ زمانہ بدل جائے گا۔ اپنے دل و دماغ سے یہ بات کلیتاً نکال دو۔ کہ ہم کمزور، ناتواں ہیں، حقیر و ناچیز ہیں بے خوف اور نڈر بنو ہیں تو کہوں گا کہ اس وقت ایک ہی مذہب و ایمان سکھانے کی ضرورت ہے۔ اور وہ مذہب و ایمان ہے بیخوفی کا۔ نڈرتا کا، جرات کا، بیباکی کا۔ دلیری کا، جسارت کا، نیڈر کے ماتی؛ خوف ڈر اور دہشت دل سے نکال دو۔ جاگو۔ بیدار ہو جاؤ۔ اور کمزوری و نحوست کو خیر باد کہہ دو۔ کوئی بھی کمزور نہیں کوئی بھی حقیر و

www.taemeernews.com

ناچیز نہیں۔ آپ کی روح آپ کی آتما ایشور کی انش ہے۔ خدا کی تخلیقِ خاص اشرف المخلوقات۔ بے پایاں بے حد و کنار قادرِ مطلق۔ پھر یہ بے ہمتی، یہ پژمردگی، یہ مایوسی، یہ لاچاری کیوں؟ ہمت باندھو۔ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو جاؤ۔ اپنا حق جتاؤ۔ اپنے دعوے سے دستبردار کیوں ہوتے ہو؟ تمہارے اندر جو خدا ہے جو بے پایاں قوت رکھنے والی روح ہے اسے آشکار کرو۔ اپنے خدا اور اپنی روح کی قوت و طاقت سے انحراف کیوں کرتے ہو؟ اس سے منکر کیوں ہوتے ہو؟ کفر کا کلمہ کیوں کہتے ہو؟ کذب سے کیوں کام لیتے ہو؟ اس نامردی سے دستکش ہو جاؤ۔ اس نامرادی کو دور ہٹا دو۔ اس طلسم کو چور چور کر دو کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس وہم و گمان نے نہ جانے کتنی نسلوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ خدارا اب تو اسے دور ہٹا دو۔

اے نئے ہندوستان کے باشندو! اے ہندوستانیو! اس بے عملی، کاہلی، سستی اور نامرادی کی نیند کو توڑ دو۔ اس خوابِ خرگوش کو اب ختم کر دو۔ اپنی حقیقت کو پہچانو۔ اپنی طاقت کا صحیح اندازہ لگاؤ۔ اپنی فطرت کا حقیقت پسندانہ احساس کرو۔ اپنے آپ کو بیدار کرو۔ اور دوسروں کو بیدار کرو۔ خود جاگو، دوسروں کو جگاؤ۔ خود یہ بات ذہن نشین کر لو اور دوسروں کے دلوں میں یہ بات بٹھا دو کہ میں بے خوف آزاد بے پایاں طاقت کا مخزن ہوں۔ انتھاہ طاقت کا سرچشمہ۔ ہر خوابیدہ روح کو جگا دو۔ اور اسے احساسِ حقیقت کراؤ۔ اسے جگا دو۔ تم دیکھو گے کہ قوتوں کے لاکھوں چشمے پھوٹ پڑیں گے۔ ہمت کا ایک بے پایاں خزانہ مل جائے گا۔ قسمت و دولت آپ کے قدموں کے بوسے لے گی۔ عظمت و سربلندی آپ پہ نثار ہو گی۔ جونہی سوتی روح جاگ پڑی، پھر خوشی، رحمت و برکت، پاکیزگی، ایثارِ نفسی، سب کچھ آپ پہ قربان ہو گا۔ ہر رحمت آپ پہ جان دے گی۔ ہر برکت آپ کی لونڈی بن جائے گی۔

ہمیشہ ہمیشہ اپنے آپ کو یہی بتاؤ کہ "میں وہی ہوں۔ میں خدا کی ذات ہوں۔ میں خود خدا ہوں۔ میں خدا ہوں۔ مجھ میں اور اس میں کوئی فرق نہیں"۔ یہ جادوئی الفاظ آپ کے دل و دماغ میں چھپی ہوئی کاہلی اور کاہلی، مایوسی و نامردی، احساسِ کمتری اور احساسِ شکستہ دلی کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ یہ جادوئی الفاظ آپ کے اندر سوئی ہوئی محوِ خواب قوتوں اور طاقتوں کو بیدار کر دیں گے۔ اور آپ کے دل میں جو بے پایاں طاقت نیند سے خراٹے بھر رہی ہے جاگ اٹھے گی۔

اصلاحِ معاشرہ کرنے کے جتنے داعی اور حامی ہیں وہ سب کے سب اس غور و فکر میں غلطاں ہیں کہ اپنی اشتراکیت، کمیونزم اور مساوات و برابری کی سب تھیوریوں کو روحانی بنیادوں پہ استوار کیا جائے لیکن یہ روحانی بنیاد صرف ویدانت ہے۔ کتنی بھی سختی اور تشدد سے کیوں نہ کام لیا جاتے حکومت کتنا ہی زور کیوں نہ لگا لے۔ قانون ساز اسمبلیاں کتنے ہی آئین و قوانین کیوں نہ مرتب کر لیں، ملک و قوم کے حالات اس وقت تک تبدیل نہیں ہو

www.taemeernews.com

سکتے۔ جب تک روحانیت اور حقانیت، اخلاق و ایمان کی قدریں غلط نسلی رجحانات اور تصورات کی اصلاح نہیں کردیتیں تب تک کچھ نہیں ہوگا۔ آج کی طلسماتی اور پُرفریب بنیادوں پہ نہ جاؤ۔ بلکہ اس عہدِ سلف اس پیارے زمانہ کو تروتازہ کرو۔ جب لوگوں میں حق ایمان کی قوت اور ہمت تھی۔ ایک بار پھر جواں ہمت اور شہ زوری کر دکھاؤ۔ یہی یقینی زندگی ہے۔ قابلِ رشک گراں قدر زندگی !!

ہندوؤں کے عقیدہ و اعتقاد، ان کی تہذیب تمدن کی مذمت و مخالفت میں پلیٹ فارم سے ہزاروں دھواں دھار شعلہ باریاں کی جاچکی ہیں۔ اور ایک کے بعد دوسری ضخیم کتاب لکھی جاچکی ہے۔ لیکن اس کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلا۔ جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ مذمت و ملامت، دشنام طرازی اور گالیوں کی بوچھار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اور آج تک مذمت و ملامت سے نہ کبھی کوئی سدھار ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔ بہتری و بہبودی کے لئے جب اپنایئے کوئی دوسرا راستہ اپنایئے۔ اس طور طریقہ سے اصلاح نہیں ہوسکتی۔ کوئی ادارہ، کوئی رسم، کوئی تنظیم خواہ کتنی ہی دقیانوس کتنی ہی اوہام پرست، کتنی ہی گئی گذری کیوں نہ دکھائی دے۔ اس کے خلاف حرفِ ملامت، حرفِ مذمت منہ پہ مت لایئے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس نے ماضی میں کوئی مفید کام، اچھا کام انجام دیا ہو۔ اور پھر یہ بات بھی ہمیشہ یاد رکھیئے کہ دنیا میں کوئی اور ملک نہیں جس کے ادارے جس کی تنظیمیں جس کے مقاصد اور جس کے اصول ہندوستان کے اداروں، تنظیموں، مقصدوں و اصولوں سے بہتر ہوں۔ ایسے رسم و رواج بھی جو آج سراسر برے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ایک لعنت سے بن گئے ہیں۔ ایک وقت تھا جب انہوں نے حیات بخش اصلاحی کام کیا تھا۔ ہم اگر ان کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ ہم ان کے خلاف دشنام طرازی، مذمت و ملامت کی شعلہ باری شروع کردیں۔ بلکہ اس عظیم کام کے لئے جو انہوں نے ماضی میں ہماری قوم و نسل کی حفاظت و سلامتی کے لئے کی ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ اور انہیں خیرباد کہنا ہے کہئے کہ ماضی میں ان رسموں یا رواجوں نے ضرورت وقت کو پورا کرتے ہوئے گراں بہا کام کیا تھا لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔ اب حالات کے نئے تقاضے ہیں۔ اب ہمیں ان کی بجائے دوسری باتوں کو اپنانا ہے۔

میں اصلاح و تادیب میں یقین نہیں رکھتا۔ میں نشوونما، ترقی، بالیدگی اور روئیدگی پر اعتماد رکھتا ہوں کیا حق ہے مجھے کہ میں خدا بن کر سماج و جماعت کو یہ حکم و فرمان دوں کہ "تمہارا یہ طور طریقہ غلط ہے یہ درست ہے" میں اس طریقہ کو منفی طریقہ سمجھتا ہوں۔ اور اس کی تعلیم و تلقین نہیں کرتا۔ میں تو قومی خطوط پہ جماعت سماج کی توسیع اشاعت۔ ترقی اور نشوونما کا حامی و طرفدار ہوں۔ ہر فردِ واحد کو اپنی نجات و مکتی کے لئے کوشاں ہونا چاہیئے۔ یہی کیفیت قوموں اور ملکوں کی ہے۔ ہر ملک و قوم کو اپنی نجات آزادی، سربلندی اور عظمت کے لئے محنت شاقہ کرنی ہوگی۔ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ جب تک اعلٰے اور افضل قاعدے اور ضابطے

www.taemeernews.com

نہیں بنا لیے جاتے۔ تب تک پرانی کو توڑنا، انہیں ختم کرنا، تباہ کن نتائج کا حامل ہوگا۔
نشو و نما بتدریج آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ جہاں کوئی انسان کھڑا ہے اسے وہاں سے آگے لیجائیے اس کی ترقی وہاں سے کیجئے جس مقام تک پہنچا ہوا ہے۔ یہ نہیں کہ اسے وہاں سے ہٹا کر واپس لاؤ۔ اور اسے کہو کہ اب یہاں اس نقطہ سے آگے بڑھو۔ یہ طریقہ نشو و نما اور ترقی کا نہیں، انتشار و تباہی پھیلانے والا ہے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے رنج و ملال ہوتا ہے کہ حال ہی میں جس قدر اصلاحی تحریکیں شروع کی گئیں وہ مغربی طور طریقوں کی اندھی تقلید و نقل کے سوا اور کچھ نہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان سے نہ ہندوستان کی فلاح و بہبود ہو سکتی تھی نہ ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی۔ ہندوستان میں جس قدر اصلاح کرنے والے ہوئے ہیں انہوں نے سب سے شدید غلطی یہ کی کہ انہوں نے ملک کی ابتری و بدحالی کی وجہ سنتوں اور پنڈتوں اور پروہتوں کی خرابیوں اور برائیوں کے لئے مذہب دھرم کی مذمت و ملامت شروع کردی۔ اور اس لا زوال اور لافانی ڈھانچے اور تنظیم کو مسمار و منہدم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ ناکامی پشیمانی۔
ہر بات کی گہرائی اور بنیاد تک جائیے۔ انقلابی اصلاح کا یہی دستور ہے۔ اصلاح و تادیب کی آگ بنیاد پر روشن کر دیجئے۔ تاکہ یہ وہاں سے اوپر کی طرف اٹھ سکے پھیل سکے۔ ایسا کرنے سے ہی نئی ہندوستانی قوم عالم وجود میں آئے گی میرا طریقہ علاج مرض کو جڑ سے کاٹ دینے کا ہے محض اوپر سے رفع دفع کرنے کا نہیں۔
تمام صحت مند معاشرتی تبدیلیاں اندر اندر کام کرنے والی روحانی قوتوں کا ہی اظہار و جمال ہیں۔ یہ روحانی قوتیں جتنی طاقتور اور مضبوط ہوں گی ہمارے معاشرہ میں اسی قدر تبدیلیاں آئیں گی سماج سدھار کا کام اس وقت تک کرنے کا نام نہ لو جب تک پہلے آپ روحانی اور اخلاقی اصلاح نہیں کر لیتے۔ اولین ضرورت اخلاق توحید کی ہے۔ اخلاق و سیرت میں اصلاح ہوگی تو معاشرہ میں خود بخود تبدیلیاں ہوتی چلی جائیں گی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں اصلاح معاشرت کی ضرورت نہیں۔ بلاشبہ ہمیں اس کی اشد ضرورت ہے۔ ماضی میں بھی اصلاح معاشرت ہوتی رہی ہے۔ وقتاً فوقتاً بزرگوں نے ترقی و اصلاح کے بارے میں نئے نئے خیالات و ادراک کو پیش کیا۔ اور حاکم وقت نے انہیں قانون و آئین کی صورت میں منظور کیا۔ ماضی میں معاشرتی اصلاحیں اسی طریقہ سے کی جاتی رہیں۔ لیکن اس عصر جدید میں ایسی معاشرتی تبدیلیاں لانے اور اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمیں ایسی حاکمانہ استعداد و قوت پیدا کرنی ہوگی۔ راجوں، مہاراجوں اور بادشاہوں کا دور ختم ہو چکا ہے۔ قوت و طاقت اب عوام کے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ اس لئے لازمی امر ہے کہ ہم پہلے عوام کو پڑھا لکھا لیں۔ انہیں تعلیم و علم سے بہرہ ور بنا دیں۔ تاکہ وہ اپنی ضرورتوں، حاجتوں اور مسائل کو اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔ اور اپنے مسائل کو حل کرنے کے قابل ہو جائیں۔ پہلے ہمیں ان کے اندر یہ

www.taemeernews.com

صلاحیتیں اور یہ قوتیں پیدا کرنی ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ اقلیت کے ظلم و تشدد۔ جور و ستم کو ختم کر کے عوام کو ان کی قسمتوں کا مالک بنایا جائے۔ اقلیت کا ظلم و تشدد اور جور و ستم بدترین قسم کا ہوتا ہے۔ اس لئے ایسی تصوراتی اور خیالی اصلاحات پر اپنی طاقتوں اور قوتوں کو ضائع کرنے کی بجائے، جو کبھی عملی صورت اختیار نہ کر سکیں ہمیں اپنی پوری توجہ اور پوری ہمت کے ساتھ عوام کو تعلیم دینی ہوگی ہمیں عوام کو اس قدر اہل اور قابل بنا دینا ہوگا کہ وہ آئین و قانون ساز بن جائیں۔ اور اپنے مسائل کو خود حل کر لیں۔ زندگی کے نظامِ نو کا تقاضا یہ ہے کہ عوام کی نجات، مکمل آزادی و خوشحالی صرف عوام ہی لا سکتے ہیں۔ عوام کو اس قابل بنانے میں کچھ دقت ضرور رہے گی خصوصاً ہندوستان میں جہاں اب تک راجے، مہاراجے اور بادشاہ ہی حکومت کیا کرتے تھے۔ لیکن بالآخر یہ مساعی کامیاب ہوں گی۔ اور عوام اپنی ذمہ داریوں اور صلاحیتوں سے روشناس ہو جائیں گے۔

اگر آپ سچے معنوں میں مصلح (اصلاح و سدھار کرنے والا) بننا چاہتے ہیں تو تین باتوں کی اشد ضرورت ہے۔ اولین ضرورت ہے دل و جگر میں حقیقی درد اور سوز کو پیدا کرنا۔ کیا آپ اپنے بھائیوں اور ہم وطنوں کی حالت زار دیکھ کر سچ مچ گریہ زاری کرتے ہیں؟ کیا فی الحقیقت آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ دنیا میں کس قدر تباہی پھیلی ہوئی ہے۔ کس قدر آفتیں اپنا بھیانک منہ کھولے دنیا کو کھائے جا رہی ہیں؟ کیا آپ سچے معنوں میں یہ محسوس کر کے دکھی ہو جاتے ہیں کہ دنیا میں کس قدر جہالت، ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی پھیلی ہوئی ہے؟ کیا فی الواقع آپ اس درد سے نڈھال ہوئے جاتے ہیں کہ دنیا کے یہ باشندے آپ کے بھائی بند ہیں؟ کیا یہ درد یا سوز آپ کے خون میں گردش کرنے لگا ہے؟ کیا آپ کی نس نس، رگ رگ اس احساس سے جل رہی ہے؟ کیا آپ کا سارا جسم اس درد اور احساس کی سراپا تصویر بن گیا ہے؟ کیا آپ ان کی خاطر سب کچھ قربان کرنے اور ان کے لئے سب کچھ کر گذرنے پر آمادہ ہو چکے ہیں؟ اس احساس کا آپ کے دل میں بیدار ہونا شرطِ اولین ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ اس صورتِ حالات کو کیسے بہتر بنا سکتے ہیں؟ یہ سوچئے پرانے خیالات بھلے ہی وہم و جہالت ہوں۔ لیکن مت بھولئے کہ یہ خیالات و افکار سونے اور ہیرے جواہرات سے تولے جانے کے قابل ہیں۔ کیا آپ نے ایسی صورت و سبیل سوچی ہے کہ آپ کے پاس سونا سونا رہ جائے اور سب کھوٹ نکل جائے تیسری شرط یہ ہے کہ اپنے مقصدِ کار کو دیکھئے۔ دیکھئے کہیں کوئی خود غرضی عزت و شہرت کی کوئی خواہش تو آپ کے دل میں چٹکیاں نہیں لے رہی۔

---

www.taemeernews.com

مُعاشرتی بُرائیوں کی بے خطا دوا

اس وقت جو تعلیم و تربیت آپ حاصل کر رہے ہیں اس میں بعض خوبیاں ضرور ہیں۔ لیکن اس میں ایک ایسی مہیب خرابی اور برائی بھی موجود ہے جو اس کی جملہ خوبیوں پر بھاری ہے۔ سب سے پہلے تو یہی بات لے لیں کہ یہ تعلیم انسان ساز تعلیم نہیں۔ یہ سراسر اور کلی طور پر منفی تعلیم ہے۔ اور ایسی منفی تعلیم پر انحصار رکھنے والی ہر بات موت سے بھی بدتر ہے۔ بچے کو سکول میں سب سے پہلا سبق یہ سکھایا جاتا ہے کہ اس کا باپ احمق اور بے وقوف ہے۔ دوسری بات جو اسے سمجھائی جاتی ہے۔ یہ ہے کہ اس کا دادا سودائی اور پاگل ہے۔ تیسری بات جو اس کے ذہن میں بٹھائی جاتی ہے یہ ہے کہ اس کے سب گرو وغیرہ ریاکار اور عیار و مکار ہیں۔ چوتھی بات جو اسے ذہن نشین کرائی جاتی ہے یہ ہے کہ سب دھارمک اور مقدس کتابیں جھوٹی اور غلط ہیں۔ ایسی منفی تعلیم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب بچہ سولہ برس کا ہوتا ہے وہ منفی باتوں کا پیکر بن کر رہ جاتا ہے۔ بے جان، بے روح۔ اس منفی تعلیم کی وجہ سے پچھلے پچاس برسوں سے ہمارے ملک میں تخلیقی قوتیں رکھنے والا کوئی جدت طراز اور لاجواب آدمی پیدا نہیں ہوا۔ اور اگر ایسا کوئی آدمی اس عرصے میں پیدا بھی ہوا ہے تو اس کی تعلیم و تربیت اس ملک میں نہیں کسی دوسری جگہ ہوئی ہوگی۔ یا پھر اس نے کسی نئی یونیورسٹی کی بجائے پرانی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں کی طرف رجوع کیا ہوگا۔ تاکہ اپنے آپ کو نئی تعلیم کی برائیوں اور بدعتوں سے دامن کش رکھ سکے۔

جائے افسوس ہے کہ ہمیں بچپن سے ہی منفی تعلیم دی جاتی ہے جس سے ہم صرف یہ بات سیکھ پاتے ہیں کہ ہم کچھ بھی نہیں حقیر و بے جان، لاغر انسان ہیں جو اس دنیا میں کچھ بھی نہیں کر سکتے ہمیں بتایا ہی نہیں جاتا کہ اس ملک کی خاک پاک نے اعلیٰ اور ارفع انسانوں کو پیدا کیا تھا۔ ہمیں کوئی مثبت تعلیم دی ہی نہیں جاتی نتیجہ نکلتا

www.taemeernews.com

ہے کہ ہمیں ہاتھ پاؤں مارنے آتے ہی نہیں۔ بس ایک نامرادی اور کاہلی سی ہماری رگ و پے میں بھر دی جاتی ہے ہم صرف کمزوری اور بد دلی سیکھتے ہیں اور کمزور و بد دل بنے زندگی کے دن پورا کر دیتے ہیں۔

موجودہ نظامِ تعلیم محض کلرک پیدا کرنے والی ایک مشین ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اگر اس نظامِ تعلیم کی خرابی و برائی یہیں تک محدود رہتی تو کوئی بات نہ ہوتی۔ رنج و افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ اس تعلیم کی وجہ سے لوگ نفرت کے ساتھ شردھا اور وشواس اعتماد و ایمان سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک گیتا مبالغہ گوئی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور وید بے زیب و زینت دیہاتی گیتوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ ہندوستان کے باہر کے سب ملکوں اور سب باتوں کا وہ کماحقہ علم حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے اپنے آبا و اجداد کے بارے میں کچھ پوچھو تو گونگے اور بہرے بن جاتے ہیں۔ کیونکہ ان بیچاروں کو اپنے حسب نسب کا ہی علم نہیں۔

ہمارے معلم اور مدرس ہمارے بچوں کو طوطے سمجھتے ہیں اور طوطا بناتے ہیں جنہیں چند رٹی رٹائی باتوں کے سوا اور کچھ بھی یاد نہیں۔ یا پھر ان بچوں کے دماغوں میں ادھر ادھر کی ہزاروں باتوں کا بھوسا بھرا جا رہا ہے۔ اخلاق و ایمان کا جنازہ نکل گیا ہے۔ اوصاف حمیدہ ان کے قریب تک نہیں پھٹکتے نیکی بھلائی کے جوہروں سے یہ غیر شناسا رہتے ہیں۔ دیکھئے کس کرّ و فر کے ساتھ یہ بی۔ اے کرتے ہیں اور گریجویٹ بنتے ہیں۔ لیکن چند دنوں کے بعد جب ڈگری و سند کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ اور دماغ ٹھکانے لگ جاتا ہے۔ ان بچاروں کو اول تو کچھ آتا جاتا نہیں۔ اور اگر بالفرض محال انہیں کچھ آتا ہے تو صرف یہ کہ ہمارا دین و مذہب۔ اخلاق و ایمان خراب ہے۔ ہمارے رسم و رواج واہیات ہیں۔ اور صرف اہلِ مغرب کے طور طریقے قابلِ ستائش اور قابلِ تقلید ہیں۔ اس علم سے یہ نہ اپنی بھوک و پیاس کا علاج کر سکتے ہیں نہ کوئی اور تعمیری کام انجام دے سکتے ہیں۔ بھلا ایسی تعلیم کا کیا فائدہ؟ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا کہ لوگوں کو تھوڑی بہت فنی تعلیم دے دی جاتی۔ تاکہ وہ نوکری کی خاطر در بدر کی خاک چھاننے کی بجائے وہ کہیں کام کر سکتے۔ اور روٹی اور روزی پیدا کر سکتے۔

کیا یہ تعلیم، تعلیم کہلانے کی مستحق ہے جس کے دباؤ کی وجہ سے روح اور سیرت پامال اور تنزل پذیر ہوتی جاتی ہے۔ حتٰی کہ یہ ایک دن مر مٹ جاتی ہے؟ کیا یہ تعلیم، تعلیم ہے جس کے زیر اثر نئے حیات افروز خیالات تو دل و دماغ میں کیا گھر کریں گے الٹا پرانے خیالات بھی ایک ایک کر کے فنا ہوتے جاتے ہیں؟ یہ کیسی تعلیم ہے جس کے سبب انسان رفتہ رفتہ مشین بنتا جا رہا ہے۔ میرے نزدیک تو ایک بے جان بے روح بے کیف مردہ دل مشین بننے سے کہیں بہتر ہوتا کہ انسان اپنی آزادانہ فہم و فراست اور مرضی سے برا بھلا، جیسا چاہے بن جائے۔

www.taemeernews.com

آپ اس انسان کو تعلیم یافتہ تصور کرتے ہیں جس نے چند امتحان پاس کر لیے ہوں اور جو بچے دار لکچر جھاڑ سکتا ہو۔ لیکن میں اسے تعلیم یافتہ کہنے کو تیار نہیں۔ وہ تعلیم جو عوام الناس کو کشمکش حیات سے گزرنے کی ہمت و قوت نہیں بخشتی، جو انسان کی باطنی خوبیوں اور جوہروں کو نہیں نکھارتی، جو اخلاق و سیرت کی تاب و طاقت کو بے حجاب اور بے نقاب نہیں کرتی۔ جو انسان کے اندر شیر دلی اور ناقابل تسخیر جرأت پیدا نہیں کرتی۔ وہ تعلیم، میرے نزدیک تعلیم کہلانے کی بھی حقدار نہیں۔ جو تعلیم آپ ان دنوں سکولوں اور کالجوں میں حاصل کرتے ہیں وہ تو آپ کو کمزوروں، ناتوانوں اور بزدلوں کی نسل بناتی جا رہی ہے۔ آپ مشین بن کر رہ گئے ہیں۔ اور بہت بے ثمری، بے لطفی سی زندگی کاٹ رہے ہیں۔ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر تعلیم کیا ہے؟ مطالعۂ کتب کا نام؟ نہیں، بہت سے علم اور فن سیکھنے کا نام؟ ہرگز نہیں۔ تعلیم اور وہ بھی سچی تعلیم، تو اسے کہتے ہیں جس کی بدولت آپ کی قوت حیات میں نظم و ضبط پیدا ہو جائے اور اس میں چمک دمک پیدا ہو جائے۔ اور آپ کی قوتیں ثمر دار اور مفید و معاون بن جائیں صحیح تعلیم تو وہی کہلانے کی حقدار ہے جو آپ کے جوہروں اور خوبیوں کی نشو و نما کرے۔ انہیں کمال و جمال سے روشناس کرائے۔ محض الفاظ کا ذخیرہ جمع کرنے کا نام تعلیم نہیں ہو سکتا۔ حقیقی تعلیم تو وہی ہوتی ہے جس کے طفیل افراد صحیح اور درست کام مستعدی و تن دہی اور جانفشانی سے کر سکیں۔

تمام تعلیم کا نصب العین اور تربیت کا منتہائے مقصود انسان سازی ہونا چاہیے۔ یہ کہاں کی تعلیم ہوتی کہ آپ کے ذہن و دماغ میں چند ایسے حقائق ٹھونس دیئے جائیں جو دلوں میں فتور برپا کر دیں اور فتنہ و فساد کو پیدا کرنے لگیں۔ اور ساری زندگی آپ کے اخلاق و سیرت پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ ایسے حقائق اور ایسی معلومات جو آپ زندگی بھر ہضم نہ کر سکیں۔ کیا انہیں تعلیم کہا جا سکتا ہے؟ تعلیم تو ایسی ہونی چاہیئے جس سے انسان سازی، اخلاق سازی، سیرت سازی ہو سکے جس کی بدولت آپ ایسے اصولوں اور حقائق کو اخذ کر سکیں جن کے سانچے میں زندگی ڈھالی جا سکے۔ ایک ایسے انسان کی نسبت جس نے کتب خانے کی سب کتابوں کو حفظ کر لیا ہو، وہ انسان لاکھ گنا قابل احترام اور قابل فخر ہے جس نے ساری کتابوں کے دفتر یاد کرنے کی بجائے گنتی کے صرف پانچ پند سود مند یاد کیے ہوں۔ اور اپنی زندگی ان کے سانچے میں ڈھالی ہو۔ ایسا علم حاصل کرنا تو گدھے کی پیٹھ پر صندل کی لکڑیاں لادنے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ گدھے کو صرف بوجھ کا ہی پتہ ہوتا ہے۔ صندل کی قیمت و قدر کا احساس نہیں ہوتا۔ اگر تعلیم کا مقصد و مطلب محض اطلاعات کے انبار جمع کرنے سے ہوتا۔ تو کتب خانے سب سے زیادہ عالم و فاضل ہوتے اور ضخیم کتابیں دانشور اور عارف کہلاتیں۔

www.taemeernews.com

تعلیم سے میری مراد موجودہ نظامِ تعلیم سے نہیں محض کتابوں کے دفتر یاد کرلینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ چند حقائق و واقعات یا معلومات سے شناسائی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تعلیم حاصل کرلی گئی ہے تعلیم تو ایسی ہونی چاہیئے جس سے انسان کے اخلاق اور سیرت کی تعمیر ہو۔ انسان کی قوتِ ارادی مضبوط و مستحکم بنے۔ انسان کی فہم و فراست کی ترقی ہو۔ انسان اپنے پاؤں پہ کھڑا ہوسکے۔ ضرورتِ وقت یہ ہے کہ مغربی سائنس اور ویدانت کو باہم ملا دیا جائے تاکہ انسان ان دونوں سے فیض و لطف اٹھائے۔ بہرحال یہ۔ ایثار نفسی انسان کا مقصدِ حیات بن جائے۔ اور انسان کا دل و دماغ تر دھا اور خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ہوجائے۔ اور انسان حقیقی معنوں میں ایک مثالی انسان بن جائے۔

اعلےٰ تعلیم سے عام طور پر یہ مطلب اخذ کیا جاتا ہے کہ انسان مادی سائنسوں کی واقفیت حاصل کرلے اور مشینوں کے ذریعہ روزمرہ کے استعمال میں آنے والی چیزیں تیار کرسکے۔ اسے اعلےٰ تعلیم نہیں مادی اور صنعتی تعلیم کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ کیونکہ اعلےٰ تعلیم تو صرف وہی کہلانے کی مستحق ہے جس کی بدولت انسان زندگی کے جملہ مسائل کو حل کرنا سیکھ لے جن ملکوں نے صنعتی اور مادی تعلیم میں ترقی کرلی ہے اور حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کی ہیں اور جن ملکوں کو تہذیبِ جدید کے اعتبار سے بہت ترقی یافتہ کہا جاتا ہے۔ وہاں ان دنوں اسی اعلےٰ تعلیم اور موزوں ترین دستورِ حیات کے مسئلہ کے لئے ہی سب غور و فکر و تفکر کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس مسئلہ کو ہزاروں برس پہلے ہمارے ملک میں حل کرلیا گیا تھا۔

میں اس تعلیم کو ہی تعلیم سمجھتا ہوں جو انسان کے باطنی جوہر کو ترقی اور نکھار دے کر اسے کمال و جمال تک پہنچا دے۔ میرے نزدیک تعلیم کا مرکزی نقطہ اور محور ایمان و مذہب ہونا چاہیئے۔ مذہب کے متعلق آپ کیا سوچتے ہیں یا میرا نظریہ کیا ہے؟ اس بارے میں مغز پچی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایمان و مذہب سے میری مراد اس عالمگیر ضابطۂ اخلاق سے ہے جس کے بنیادی اصولوں پہ کوئی اختلاف رائے ہی نہیں ہوسکتا۔ اس علم سے کیا فائدہ جس سے آپ کو بدہضمی کی شکایت ہوجائے اور آپ اخلاق و ایمان سے بیگانے ہوجائیں؟ ایسی تعلیم پر لعنت بھیجو۔ جو انسان کو انسان کی بجائے حیوان اور شیطان بنا دے۔

تحصیلِ علم کا ایک ہی قاعدہ اور طریقہ ہے۔ ادنےٰ ترین انسان سے سالک و عارف اور یوگی تک ہر ایک کو اسی قاعدہ و طریقہ کی پناہ لینی ہوتی ہے اسے بروئے کار لانا ہوتا ہے۔ اس قاعدہ و طریقہ کا نام ہے یکسوئیِ قلب۔ جس کسی نے کچھ پایا ہے، اسی یکسوئیِ قلب سے پایا ہے کیمسٹ اور سائنس دان کی معجزہ نمائیاں اسی یکسوئیِ قلب کی مرہونِ منت ہیں۔ ہیئت دانوں کو حیران کن معلومات اسی یکسوئیِ قلب کی بدولت نصیب ہوئیں ہر ایک کی ترقی کا راز یکسوئیِ قلب، من کی ایکاگرتا میں ہے۔

260 www.taemeernews.com

اس دنیا میں ہم کو محوِ حیرت کر دینے والی جس قدر چیزیں نظر آتی ہیں سب یکسوئی قلب کی پیداوار اور کرشمہ سازی ہیں۔ کائنات میں جس قدر علوم و فنون ہیں سب کے سب یکسوئی قلب کی بدولت معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ ہر فرد و بشر کے کام میں جو خوش نمائی نظر آتی ہے۔ اس کے فن میں جو کشش و چمک ہے۔ اس کی تخلیق و دریافت میں جو عنصرِ حیرت اور رنگِ حسن ہے وہ سب کی سب یکسوئی قلب کی شعبدہ گری اور کیمیاگری ہی تو ہے۔ یکسوئی قلب سے مانگو کائنات اپنے تمام راز آپ پر لٹا دے گی طلب میں جتنی وحشت و یکسوئی ہوگی، فیض و کرم اتنی جلدی میسر ہوگا۔ زمانہ بھر کے رموز اور اسرار کے دروازے یکسوئی قلب سے دستک دینے یا مناسب طاقت سے دروازہ کھٹکھٹانے سے کھلتے ہیں۔ دستک دینا کیا ہے؟ یکسوئی قلب سے ضرب لگانا۔ انسان اس خدا کی افضل ترین مخلوق ہے۔ انسان کے دل و دماغ کی قوتیں بے حد و حساب اور بے حد و کنار ہیں۔ اس میں جتنی یکسوئی ہوگی اتنی ہی خوشی کی بات ہے۔ اپنی قوت و طاقت کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ہی کلیدِ کامیابی ہے۔ کسی بھی کام کو لے لو، اس میں جب چمک دمک آئے گی تو صرف یکسوئی قلب کی بدولت۔ دنیاداری ہو یا خدا دوستی۔ کاروبار و بیوپار ہو یا عبادتِ حق۔ رب۔ دل و دماغ کی تمام قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کر لیجیے یکسوئی قلب کی جتنی طاقت زیادہ ہوگی، اتنی ہی جلدی کامیابی آپ کے قدموں کے بوسے لے گی۔ مقصد حصولِ زر ہو یا وصلِ خدا، فتح و کامیابی کا انحصار ہمیشہ ہمیشہ اس بات پر ہوتا ہے کہ آپ میں کس قدر یکسوئی قلب ہے۔ خزانۂ علم کی کنجی بھی یکسوئی قلب میں ہے۔

لیکن محض یکسوئی قلب کافی نہیں۔ اس کے ساتھ بے تعلقی اور بے نفسی کی قوت بھی آپ کو حاصل کرنی ہوگی۔ ہمیں اپنا دل کسی ایک چیز کا اسیر و غلام نہیں بنا دینا۔ بلکہ اس کا تعلق کسی شے سے ایسا ہونا چاہیے کہ آپ جب چاہیں اسے وہاں سے توڑ کر کسی دوسری شے سے جوڑ سکیں۔ حقیقی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ آپ جس قدر یکسوئی قلب حاصل کریں، اسی قدر قوتِ بے نفسی میں اضافہ کریں۔ خیر و عافیت کا تقاضا یہی ہے کہ ان دونوں قوتوں میں ایک سا اضافہ کیا جائے۔ ان دونوں کی ترقی و نشو و نما ہم رکاب رہنی چاہیے۔ قلب و جگر کی یہی ترقی باقاعدہ اور باسلیقہ ترقی ہے۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ میرے نزدیک تعلیم کا مفہوم و مطلب یکسوئی قلب ہے۔ چند معلومات کی فراہمی نہیں۔ آپ تحصیلِ علم کے خواہاں ہیں تو معلومات اور اطلاعات یا چند حقائق و حالات کے حاصل ہونے پر مطمئن و مسرور ہو کر مت بیٹھیے بلکہ اپنی قوتِ یکسوئی قلب اور قوتِ بے نفسی اور بے تعلقی میں ترقی و اضافہ کرتے جائیے۔ یہ قوتیں پنپ گئیں، طاقتور ہو گئیں تو معلومات اور حقائق جب چاہیں گے، فراہم کر سکتے ہیں۔ اور یہ رازِ حیات صرف آپ کی ذات تک محدود اور مخصوص نہیں رہنا چاہیے ہر بچہ کے اندر قوتِ یکسوئی قلب اور قوتِ بے تعلقی اور بے نفسی پیدا کیجیے۔ اور اس صلاحیت کی

www.taemeernews.com

نشوونما کیجئے۔ ہر بچّہ کو برہمچریہ کی تعلیم دو، نفس کُشی اور جذبۂ خود اعتمادی کی تلقین و تربیت دو۔ اس کے دل و دماغ میں جو زنگ لگا ہوا ہو اسے دور کر دو، میں کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا، ایسے حوصلہ شکن ہمت توڑ اور مُردہ بنانے والے خیالات کو دل و دماغ سے نکال باہر کرو۔ ان کے اخلاق و سیرت کی تعمیر کرو۔ انہیں کردار کا غازی بنا دو۔ انہیں کام کا دھنی بنا دو۔ ان کے خیالات و عقاید کو حرارتِ ایمان بخش دو۔ اُن کے ذہن و فکر میں مذہب و ایمان کی شمع جلا دو۔ انہیں قدرت سے پیار کرنے کی تعلیم دو۔

کیا آپ نے اُپنشدوں کی حکایتیں پڑھی ہیں؟ ایک حکایت میں سُناتا ہوں ستیہ کام برہمچاری کی سی زندگی بسر کرنے اپنے گورو کے ہاں پہنچا۔ گورو نے کچھ گائیں اس کی تحویل میں دے دیں اور کہا کہ انہیں جنگل میں لے جاؤ اور جب یہ دوگنی ہو جائیں تب واپس آنا۔ تعمیلِ ارشاد میں ستیہ کام بن میں ان گایوں کی دیکھ بھال کرتا یا پھر یادِ خدا میں محو ہو رہتا۔ اور قدرت کے مناظر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ بہت برسوں کے بعد ایک گائے نے اسے کہا ــ "ستیہ کام! اب ہمیں واپس لے چلو۔ آپ کے گورو نے جو قید و شرط لگائی تھی وہ پوری ہو گئی ہے۔ ہماری تعداد دوگنی ہو گئی ہے۔" ستیہ کام انہیں ہانک کے واپس گورو کے آشرم کی طرف لے چلا۔ راستہ میں کتنے ہی بے نوا چرندوں پرندوں نے اس سے گفتگو کی۔ سے کام آمد باتیں بتائیں۔

جب ستیہ کام واپس آشرم پہنچا۔ تو گورو نے اس کی پیشانی پہ نورِ بشارت دیکھ کر سمجھ لیا کہ ستیہ کام اب حق شناس ہو گیا ہے۔ ستیہ کام کی یہ کہانی بتاتی ہے کہ قدرت سے ہمکلام اور ہم زبان کیسے ہوا جا سکتا ہے اور کس طرح انسان قدرت کے راز و نیاز سے لطف و سرور حاصل کر سکتا ہے۔

تقاضائے وقت یہ ہے کہ ہم ہر قسم کے غیر ملکی دباؤ و مداخلت سے آزاد تعلیم حاصل کریں اور ہر علم و فن میں اپنے ذوق و شوق سے خوب ترقی کریں۔ اس کے ساتھ انگریزی اور مغربی سائینس کی از حد ضرورت ہے۔ وقت کی پکار یہ ہے کہ ہمارے سکول محض کلرک اور بابو پیدا کرنے کی بجائے بچوں کو فنی اور دستکاری کی تعلیم دیں تاکہ وہ نوکری کی بجائے ملک میں کارخانوں اور دستکاریوں کا جال بچھا سکیں۔ اپنی زندگی آسودگی سے گزار سکیں۔ اور ملک و قوم کو شاہراہِ ترقی و خوشحالی پہ ڈال سکیں۔

لیکن مشکل تو یہ ہے کہ چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف مناسب توجہ نہیں دی جاتی۔ ان بچوں کو پڑھانے کے لیئے ہمارے پاس ایک بھی اچھی کتاب نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ رامائن، مہابھارت اور اُپنشدوں کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی چند ایسی کتابیں مرتب کی جائیں۔ جن کی زبان سلیس ہو جن کا اسلوب بیان عام فہم ہو۔ اور جنہیں پڑھ کر چھوٹے بچے مستفید ہو سکیں۔

میری زندگی کی ایک ہی آرزو ہے اور بس ایک ہی آرزو میں چاہتا ہوں ایک ایسا نظام ایک

www.taemeernews.com

ایسی تحریک یا ایسی مشینری قائم کردیں جو گھر گھر، گاؤں گاؤں اور شہر شہر نئے خیالات، حیات بخش، قوم پرور، مذہب وایمان کے لئے عقیدت واحترام پیدا کرنے والے خیالات پہنچا سکے، تاکہ ملک کے سب مرد و زن، سب نر، ناری اپنی قسمت کے خود مالک بن سکیں۔ اور اپنا مستقبل اپنی مرضی کے مطابق بنا سکیں ضرورت ایسی مشینری قائم کرنے کی ہے جو ہمارے ہم وطنوں کو یہ بتا سکے کہ ان کے آبا و اجداد کیسے تھے اور ماضی میں انہوں نے کس معراجِ زندگی کو حاصل کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی بتانا چاہیئے کہ دنیا کی دوسری قومیں زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کچھ سوچ رہی ہیں اور کیا کچھ کر رہی ہیں۔ دنیا کی دوسری قوموں سے جو کچھ سیکھا جا سکتا ہے سیکھنا چاہیئے، انہیں سیکھ لینا ہوگا۔ تاکہ وہ بھی اپنی اس زبوں حالی اور کسمپرسی سے چھٹکارا حاصل کر سکیں ہمیں ایک کیمیاگر کی طرح عوام الناس کی بہتری وبہبودی، سربلندی اور خوشحالی کے لئے سب ضروری اجزا کو بہم پہنچانا ہوگا۔ اس عمل کے نتائج قانونِ قدرت کی طرح خود بخود نکلتے چلے آئیں گے۔ انقلاب کے اس نظام کی داغ بیل ڈال دو۔ پھر دیکھو، قوم کتنی جلدی اس خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنے مستقبل کو سنوار لیتی ہے۔

لیکن ایسا ہونا تبھی ممکن ہے اگر ہم اپنی قوم کی روحانی اور غیر روحانی تعلیم کے دونوں پہلوؤں۔ دونوں شعبوں پر مکمل اختیار و قابو رکھتے ہوں۔ آپ کے خیالوں، نیالوں، ارمانوں اور کاموں میں یہی لگن اور چینک کار فرما ہونی چاہیئے۔ خواب لو تو اس کے۔ باتیں کرو تو اس کی۔ سوچو تو اس کے متعلق کام کرو تو اس کا۔ جب تک آپ نظامِ تعلیم میں ایسی تبدیلی نہیں کر لیتے۔ تب تک نہ آزادی نصیب ہوگی نہ خوشحالی ہمیں لازمی طور پر تعلیم کا سارا نظام اپنے کنٹرول، قابو اور اختیار میں لانا ہوگا۔ اور اسے قومی خطوں پر آراستہ و استوار کرنا ہوگا۔ اور کام کے لئے جہاں تک بھی ممکن ہو قومی طریقوں کو ہی بروئے کار لانا ہوگا۔ بلاشبہ یہ بہت بڑا کام ہے۔ بہت عظیم منصوبہ ہے۔ یہ منصوبہ سر سے چڑھے گا یا نہیں۔ یہ تو مالک جانے۔ لیکن ہمیں اس کے لئے دن رات محنت کرنی ہوگی محنتِ شاقہ کے بغیر بھلا ہم اس قدر عظیم انقلاب تعلیم کیسے لا سکتے ہیں۔

ہم ہندوؤں اور ہندوستانیوں کے لئے مقدم ترین بات مذہب وایمان ہے۔ اس لئے ہمیں ایک نیا شوالہ اور مندر تعمیر کرنا ہوگا۔ لیکن یہ شوالہ اور یہ مندر کسی ایک فرقہ، کسی ایک قوم یا کسی ایک عقیدہ کے لوگوں کے لئے مخصوص نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ سب کا سانجھا، سب کا مشترکہ، غیر فرقہ وارانہ مندر ہونا چاہیئے۔ اور اس کا نشان صرف "اوم" ہونا چاہیئے۔ جو بہترین اور افضل ترین نشان ہے۔ اس کے دروازے سب کے لئے کھلے ہونے چاہئیں۔ اور یہاں سب مذہبوں، فرقوں اور دھرموں کے مشترکہ اصولوں کی تعلیم و تبلیغ دی جانی چاہیئے۔ اور مختلف عقیدوں اور اصولوں کو ماننے والے سب فرقوں اور مذہبوں کے لوگوں کو اس بات کی کامل آزادی حاصل ہونی چاہیئے کہ وہ جب چاہیں اس مندر میں آئیں جائیں۔ اور اپنے اصولوں عقیدوں

www.taemeernews.com

اور نظریوں کی اشاعت و تبلیغ کریں۔ ان پر کوئی روک ٹوک نہیں ہونی چاہیئے۔ سوائے اس پابندی کے کہ وہ دوسروں کے عقیدوں نظریوں یا فرقوں کے خلاف کچھ نہیں کہیں گے۔ نہ کسی کی مذمت کریں گے نہ کسی کی دلآزاری کریں گے۔ دوسری ضرورت اس امر کی ہے کہ اس عبادت گاہ اور مندر کے ساتھ ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیئے جہاں ایسے مدرسوں اور معلموں کو تعلیم و تربیت دی جائے گی جو گاؤں گاؤں قصبہ قصبہ شہر شہر گھوم کر ملک کے طول و عرض میں لوگوں کو مذہب ایمان کے اصولوں سے روشناس کرا سکیں اور غیر فرقہ دارانہ تعلیم دے سکیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جس طرح اب تک ہم گھر گھر جا کر مذہبی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ اس طرح اب ہم غیر فرقہ وارانہ غیر دینی دنیاداری کی تعلیم کی اشاعت کریں۔ ایسا کرنا دشوار اور مشکل نہیں۔ بمول جمل ایسے معلموں اور مدرسوں کا کام فروغ حاصل کرے گا۔ اور ملک کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں ایسی تعلیم کی تبلیغ ہونے لگے گی۔ توں توں آہستہ آہستہ ایسے اور مندر تعمیر ہوتے جائیں گے اور ایسی عبادت گاہیں بنتی جائیں گی اور اس طرح سارے ہندوستان میں ان کا جال سا بچھ جائے گا۔ یہی میرا منصوبہ ہے۔ یہی میری تمنا ہے۔ بلاشبہ یہ بہت بڑا عظیم سا منصوبہ لگتا ہے لیکن ملک و قوم کو اس کی اشد ضرورت ہے۔ اس لئے ہمیں اس منصوبہ کو ہاتھ میں لینا ہی ہوگا۔

www.taemeernews.com

عوام النّاس کی اصلاح و ترقّی

ہمارے عوام النّاس بلا شبہ غیر دینی اور دنیاداری کی باتوں سے بھی بیحد گریز کرتے ہیں لیکن وہ بے حد صاف باطن اور نیک دل ہیں کیونکہ غریبی اور مفلسی ہمارے ملک میں جرم و قصور نہیں۔ اور پھر ہمارے عوام النّاس نہ تشدد پسند ہیں نہ دہشت انگیز۔ ان کے مزاج اور ان کی سیرت و اخلاق میں نیکی و پارسائی شرافت و امن پسندی اور صلح جوئی کی جو صفات ہیں وہ انہیں مادرِ وطن کی طرف سے وراثت میں ملی ہیں۔ جب میں امریکہ اور برطانیہ گیا۔ تو کئی بار میرے لباس کی وجہ سے ہجوموں کے ہجوم مجھ پر ٹوٹ پڑے لیکن ہندوستان میں یہ بات نہ کبھی دیکھی ہے نہ کبھی سنی ہے کہ کسی شخص پر اس کے لباس کی وجہ سے ہجوم ٹوٹ پڑے۔ صرف اسی پہلو سے نہیں۔ بلکہ ہر لحاظ سے اور ہر اعتبار سے ہندوستان کے عوام النّاس یورپی عوام النّاس کی نسبت کہیں زیادہ مہذب اور شائستہ اخلاق ہیں۔ مجھے میرے تجربہ نے یہ بات بتا دی ہے کہ ہندوستان کے عوام النّاس نہ تنگ دل ہیں نہ کند ذہن۔ ان میں دنیا کی دوسری قوموں کی طرح نئی نئی باتیں سیکھنے زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے اور زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کی طلب و خواہش چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں دنیا کے حالات و مسائل کے متعلق زیادہ سے زیادہ علم و واقفیت حاصل ہو۔

لیکن کتنے رنج و ستم کی بات ہے کہ کسان اور محنت کش، مزدور اور نچلے طبقہ کے لوگ جنہیں حملہ آوروں نے اپنا غلام بنایا اور اپنے جور و ستم کا تختۂ مشق بنایا۔ ان عوام النّاس کو ان کے ہم وطن ہندوستانی بھی نفرت و حقارت سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ ہزاروں برسوں سے خاموشی کے ساتھ، حقِ خدمت یا معاوضہ لئے بغیر مسلسل اور پیہم محنت و مزدوری اور عرق ریزی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ حق کی بات تو یہ ہے کہ یہ کسان، یہ موچی، یہ بھنگی، یہ خاکروب، یہ مزدور اور جفاکش غرضیکہ نچلے طبقے کے دوسرے سب لوگ آپ کی نسبت کہیں زیادہ کام کرنے کی

www.taemeernews.com

صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور آپ سے کہیں زیادہ جذبۂ خود اعتمادی سے مالا مال ہیں۔ نہ جانے کتنی صدیوں سے یہ لوگ چپ چاپ، خاموشی کے ساتھ کام کرتے آ رہے ہیں۔ اور ملک کی خاطر دولت پیدا کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود کبھی ان کے لب پر حرفِ شکایت نہیں آیا۔ کبھی انہوں نے گلہ و شکوہ نہیں کیا۔ جیسے صلہ ملنے یا حق محنت لینے کی آرزو تک ان کے دلوں میں دم توڑ کر رہ گئی ہو۔

کیا مضائقہ اگر انہوں نے آپ کی طرح چند کتابیں نہیں پڑھ لیں یا جن کتابوں سے آپ محبت و لگن رکھتے ہیں ان کا مطالعہ نہیں کیا۔ یا آپ کی طرح دوسروں کی تہذیب و تمدن کے دلدادہ اور پرستار نہیں بنے۔ یہ سب باتیں فروعی نوعیت کی ہیں حقیقت یہ ہے کہ قوم کی ریڑھ کی ہڈی یہی عوام الناس تھے، ہیں اور آئندہ بھی بنے رہیں گے۔ آپ قوم کی ریڑھ کی ہڈی نہ کہلا سکے ہیں نہ کہلا سکتے ہیں اور نہ کہلا سکیں گے۔ زمانے کے ہر لیل و نہار میں یہی عوام الناس ریڑھ کی ہڈی بنے رہے ہیں۔ ذرا سوچئے تو سہی۔ اگر ادنیٰ طبقہ کے ان لوگوں نے محنت و مشقت ترک کر دی تو آپ کو اناج کہاں سے ملے گا، روٹی کہاں سے میسر ہو گی؟ کسی بھی شہر میں اگر بھنگی ایک آدھ دن کام چھوڑ دیں تو شہر میں ہاہاکار مچ جاتی ہے۔ اور اگر کہیں دو تین دن کے لئے کام ترک کر دیں شہر میں وبائی بیماریاں پھیل جائیں گی اور شہر کا شہر دیکھتے ہی دیکھتے شہرِ خموشاں کا نظارہ پیش کرنے لگے گا۔ اگر یہ مزدور اور محنت کش کام کاج چھوڑ بیٹھیں تو آپ کو نہ کھانے کو اناج مل سکے گا نہ تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا نصیب ہو سکے گا۔ لیکن کتنے ستم کی بات ہے کہ ان باتوں کے باوجود آپ ان لوگوں کو ادنیٰ طبقہ کے حقیر و ناچیز لوگ تصور کرتے ہیں اور اپنی تہذیب و تمدن پر بلا وجہ اتراتے پھرتے ہیں۔

اے ہندوستان کے جفاکشو، محنت کشو اور مزدورو! یہ تمہاری خاموش محنتوں اور مشقتوں کا پھل تھا کہ کبھی بابل میں خوشی کے نقارے بجائے گئے۔ کبھی ایران میں مسرتوں کی شہنائیاں گونجیں۔ کبھی اسکندریہ میں جشن کے شادیانے بجائے گئے۔ کبھی یونان و روم، وینس اور بغداد، دمشق اور سپین میں فتح و کامرانی کے نغمے گائے گئے۔ کبھی فرانس، ڈنمارک، ہالینڈ اور برطانیہ میں یکے بعد دیگرے سب ملکوں میں شہرت و عظمت کے چراغ جلائے گئے۔ یہ تمہاری خاموش محنتوں کی کمائی تھی جسے لوٹ کر متذکرہ بالا شہروں اور ملکوں کے حملہ آوروں نے اپنے خزانوں کو لبالب بھرا۔ اور شہرت و نام پیدا کیا۔ لیکن تم! تمہاری کس کو پروا تھی؟ کون تھا جو تم کو خاطر میں لاتا؟ تمہاری زبوں حالی اور کس مپرسی پہ آٹھ آٹھ آنسو بہاتا؟ یا تمہاری حالتِ زار پہ ٹھنڈی آہ بھرتا؟ جن کے خونِ جگر نے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں اور سلطنتوں کو سرخی و خوشحالی دی۔ یا شوخیٔ شہرت دی۔ ان کے لئے کسی نے اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ ان کی تعریف میں ایک لفظ بھی منہ سے نکال سکے لیکن ان فاتحوں نے جن کے ہاتھوں روحانیت، شعر و شاعری اور دوسری تخلیقی قوتوں کے باغ اجڑے اور پامال ہوئے۔ ہر سو تباہی و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ دنیا

www.taemeernews.com

سے ہمیشہ خراجِ تحسین و تعریف حاصل کیا۔ کسی کو اتنا بھی گوارا نہیں ہوا کہ ایک نگاہِ التفات تم پر ڈال سکے۔ اور تم پر لطف و کرم کی بارش کر سکے۔ کسی کو اتنی توفیق بھی نصیب نہ ہوئی۔ کہ تمہاری حوصلہ افزائی یا قدر و منزلت کر سکے۔ بلکہ اُلٹا دُنیا نے تم سے نفرت و حقارت کی۔ تمہیں ٹھکرایا۔ اور بُرا بھلا کہا۔ لیکن تم نے غضب کی فراخدلی اور اطمینانِ قلبی بے پایاں رواداری اور بے کنار صبر و سکون کے ساتھ بے حساب مہر و محبت کے ساتھ، تم نے اے میرے وطن کے محنت کشو اور مزدورو، غریبو اور سیدھے سادھے لوگو! تم نے ان سب باتوں کو برداشت و تسلیم کر لیا۔ تم نے نہ اپنی آنکھوں سے رنج و افسوس کا آنسو ٹپکنے دیا۔ نہ لبوں پہ حرفِ شکایت آنے دیا۔ کیا یہ مردانگی اور بہادری نہیں۔ یہ جرأت و ہمت نہیں شجاعت و مردانگی نہیں؟ موافق اور سازگار حالات میں کون ہیرو نہیں بن جاتا ہے۔ بزدل سے بزدل، اور کائر سے کائر بھی اپنی بزدلی اور کائرتا کو خیرباد کہہ دیتے ہیں، اور خود غرضی کے مجسمے بھی بے نیازی اور بے لوثی کا اظہار کرنا شروع کر دیتے ہیں، واہ واہ اور خراجِ تحسین پاکر کون ہے جو ایک نیا بہروپ دھارن نہ کر لے اور جو کچھ نہ ہو بن دکھلائے لیکن قربان جائیے ایسی نیک نفس مدوحوں کے جو اُدنے سے اُدنے کام میں بھی غضب کی فرض شناسی کا ثبوت دیتی ہیں۔ اور اس بات سے بے نیاز ہو کر دُنیا کیا کہتی ہے اور کیا سوچتی ہے اپنی اور لگن سے بے لوث خدمت کرتی چلی جاتی ہیں ستم تو یہ ہے کہ دُنیا نے جب بھی لتاڑا، انہیں لتاڑا، اور زمانہ نے جب بھی ستم ڈھایا، ان پہ ڈھایا، لیکن ان کی جبیں پہ ایک بھی شکن نہ پڑی ان کے لب پہ ایک بھی حرفِ شکایت نہ آیا۔ میں بصد عزت و احترام کے ساتھ ان محنت کشوں، مزدوروں اور غریبوں کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہوں اور بار بار ان کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

مُعاشرے کی قیادت خواہ ان کے ہاتھوں میں ہو جو علم و ہنر کو اپنی اجارہ داری میں رکھتے ہیں یا ان افراد کے ہاتھوں میں جو دولت و شجاعت سے مالا مال ہوں، مُلک کی قوت کا سرچشمہ ہمیشہ عوام الناس رہے ہیں۔ مُلک و قوم کی طاقت و عظمت کا مخزن و منبع ہمیشہ یہی رہے ہیں۔ برسرِ اقتدار طبقہ جتنا اس سرچشمۂ حیات سے کٹتا جائے گا، اسی قدر کمزور و ناتواں ہوتا جائے گا۔ کیونکہ اپنے منبعِ قوت سے کٹ کر کوئی بشر کیسے سرسبز و شاداب رہ سکتا ہے۔ لیکن زمانہ کی کج روی اور بے اعتنائی کی انتہا دیکھئے یا اسے مایا کی مادہ پرستی کی کارستانی، وہی عوام جن سے ایمانداری سے یا دھوکہ دہی سے فریب سے یا قوت سے رضاکارانہ طور پر یا مکر و فریب سے طاقت حاصل کی جاتی ہے۔ برسرِ اقتدار آنے کے بعد انہیں عوام کو فراموش کر دیا جاتا ہے ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ ہمارے اس مُلک میں جہاں دیانت اور توحید و معرفت نے جنم لیا مُدتوں سے عوام کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور ہم انہیں ٹھکراتے اور لتاڑتے چلے آئے ہیں۔ ہماری اس متکبر روی کی انتہا دیکھئے کہ اب ان عوام کو چھونا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے پاس بیٹھنا بھی جرم تصور کیا جاتا ہے۔ یہ عوام الناس نامرادی پیدا ہوتے

www.taemeernews.com

نامرادی مر مٹ گئے ہماری اس کج روی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کی حالت اَبتر سے اَبتر اور بد سے بدترین ہوتی چلی گئی ہے اور اب انسانی زندگی کی انتہائی پستی اور گراوٹ تک پہنچ گئے ہیں۔ دنیا کا کون سا دوسرا ملک ہے سوائے ہندوستان کے جہاں انسان وہیں سوتے اٹھتے ہیں جہاں ڈھور ڈنگر باندھے جاتے ہیں۔ اس خستہ حالی پامالی و ذلت کی زندگی کے لئے کسی دوسرے کو موردِ الزام مت ٹھہراؤ۔ ارتکابِ جرم کرنے کے بعد انکارِ جرم کا گناہ مت کرو۔ یہ دُردشا ہماری ہی پیدا کردہ ہے جرم و خطا ہماری ہے قصوروار ہم ہیں ہمت سے کام لو۔ کھڑے ہو جاؤ اور اس صورتِ حالات کا تمام جرم اور سب قصور اپنے اوپر لے لو۔ دوسروں پر کیچڑ اچھالنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ ان تمام خطاؤں اور خامیوں غلطیوں اور جرموں کی ذمہ داری جن کی وجہ سے آج ہمیں یہ ابتری اور ذلت دیکھنی پڑی ہمارے اوپر ہے۔ اس تمام صورتِ حالات کے لئے ہم اور صرف ہم ذمہ دار اور خطاوار ہیں۔

ہمارے امیر و کبیر، مغرور اور متکبر پیش رو ملک کے عوام الناس کو اپنے پاؤں تلے لتاڑتے کچلتے اور مسلتے رہے ہیں یہاں تک کہ عوام نڈھال اور بے جان ہو گئے۔ ٹھوکریں کھا کھا کر یہ بدنصیب اس حالتِ زار کو پہنچ گئے کہ انہیں یہ بھی بھول گیا کہ وہ انسان بھی ہیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی احساسات اور خیالات رکھتے ہیں۔ ان میں بھی جان و دل ہے۔ ہم نے معاشرہ ہی ایسا بنا دیا جس میں وہ لکڑہارے یا پانی ڈھونے والے بہشتی ہی بنے رہیں ہندوستان کے ان تقدیر کے ماروں، بدنصیبوں اور گنہگاروں کا اس دنیا میں کوئی والی و وارث اور پرسان حال نہیں رہا۔ یہ بے یار و مددگار رہ گئے ہیں۔ یہ نہ ترقی کر سکتے ہیں نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ لاکھ ہمت کریں۔ لاکھ سر پٹکیں۔ ہم انہیں اوپر اٹھنے اور آگے بڑھنے ہی نہیں دیتے۔ ان کی حالتِ زار روز بروز خراب و خستہ ہوتی جا رہی ہے۔ بے رحم معاشرے کی جوتوں پر جوتیں کھائے جا رہے ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ جور و ستم کون کر رہا ہے۔ یہ ظلم و تشدد کون ڈھا رہا ہے۔ انہیں تو اب اتنا بھی ہوش باقی نہیں رہا کہ وہ بھی ہم جیسے انسان ہیں۔ اس صورتِ حالات کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ ملک غیروں کی ذلت آمیز غلامی میں جکڑا گیا ہے پچھلے چند برسوں میں جتنے بھی اشخاص ہوئے ہیں انہوں نے اس وجہِ ذلت، اس وجہِ غلامی اور اس وجہِ پامالی کو دیکھا اور محسوس کیا۔ لیکن بدقسمتی سے انہوں نے اس صورتِ حالات کے لئے سزاوار اور خطاوار ہندو قوم کو گردانا۔ اور انہوں نے حالات کو سنوارنے کا طریقہ یہ تجویز کیا کہ دنیا کے اس عظیم الشان مذہب دھرم کو ہی کچل کر رکھ دیا جائے۔ اس کو ملیا میٹ کر دیا جائے۔

گوشِ ہوش سے سن لو۔ کہ میں نے اس راز کو پروردگار کے رحم و کرم کی بدولت پا لیا ہے۔ کہ قصور جرم مذہب کا نہیں بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ مذہب کے احسانات بے پایاں ہیں۔ یہ مذہب ہی ہے جو آپ کو شعورِ زندگی عطا کرتا ہے آپ کو خود بین، خود نما اور خود شناس بناتا ہے۔ اور آپ کی صفت پہلوئے شخصیت کو آپ کی نگاہوں کے سامنے اجاگر

www.taemeernews.com

کرتا ہے ہمارا قصور اور جرم اگر تھا تو یہ تھا کہ ہم نے روحِ مذہب کو عملی زندگی میں نہ اتارا۔ دلوں کے کذب و کفر کی وجہ سے ہم اس مذہب کے مطابق اپنی عملی زندگی نہ بنا سکے ہم مذہب کے اصولوں کو، اس کی عظیم سچائیوں کو جوہرِ کردار نہ بنا سکے۔

مالک ایک بار پھر بھگوان بدھ کی صورت میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوا۔ اور اس نے ہمیں تعلیم دی کہ ہم اپنے دلوں کو کس طرح دردآشنا اور خدا دوست بنا سکتے ہیں۔ ہمارے دلوں کو وہ متاعِ احساس کیسے مل سکتی ہے جس کی بدولت غریب، مفلس کو دیکھیں تو ہم بے قرار ہو جائیں۔ ہم اپاہج و بے نوا کو دیکھیں تو ایک ٹیس سی ہمارے دلوں میں جاگ پڑے۔ گنہگار کو دیکھیں تو رحم و محبت کا دریا ہمارے سینے میں موجزن ہو جائے بھگوان بدھ نے ہمیں یہی تعلیم دی تھی لیکن ہماری بدنصیبی کہ ہم نے ان کی آواز کو سنا اَن سنا کر دیا۔ اور ان کی تعلیم پر عمل نہ کیا اور جو رسوائی اور ذلت حضرت یسوع مسیح کو ٹھکرانے والے یہودیوں کی ہوئی اور جس طرح انہیں دربدر کی خاک چھاننی پڑی۔ جگہ بہ جگہ نامرادی اور بے اعتنائی کا شکار ہونا پڑا۔ یہی کیفیت ہماری ہوئی ہے۔ زمانہ بھر میں ہمیں غلاموں کی قوم تصور کیا جاتا ہے۔ اور غلام بھی ایسے، جن پر حکومت کرنا، ان کا حق وصیلہ ہو۔ لیکن اے ظالمو! سن لو! تمہیں شاید یہ بات بھول گئی ہو کہ ظلم و تشدد اور غلامی لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں تشدد و استبداد ہوگا، وہاں غلام ہوں گے اور جہاں غلام ہوں گے وہاں ان پہ جور و ظلم ڈھایا ہی جائے گا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا اور علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

"دنیا کا کوئی دوسرا مذہب انسانیت کی عظمت و رفعت کا اس قدر داعی اور علمبردار نہیں جس قدر ہندو دھرم ہے۔ لیکن ظلم و قہر دیکھو۔ کہ دنیا کا کوئی دوسرا مذہب غریبوں کی گردنوں پہ اس قدر سوار نہیں ہوتا، ان پہ اس قدر ظلم و تشدد نہیں کرتا، جس قدر ہندو دھرم کرتا ہے۔ ایشور نے انتہائی رحم و کرم کرتے ہوئے یہ بات میرے اوپر افشا کر دی ہے۔ کہ اس صورتِ حالات کے لیے مذہب کا کوئی قصور اور جرم نہیں ہے کوتاہ اندیش، غلط کار، وہم پرست جاہ پسند اور ریاکار پنڈت یا اسی قسم کے دوسرے لوگ تھے جنہوں نے اس امرت میں زہر ملایا۔ اور ہندو دھرم میں خرابیاں، برائیاں اور طرح طرح کی بدعتیں داخل کر دیں۔ اور ظلم و تشدد کے طرح طرح کے حیلے اور وسیلے ایجاد کر دیئے۔

یہ ان لوگوں کا قصور و جرم ہے کہ انہوں نے بھنگیوں اور دوسرے افراد کی اس قدر کو ذلت و پستی میں پھینک دیا۔ ستم خدا کا کہ منہ سے اپنے آپ کو اَدَیت مت کا پجاری، توحید و وحدت کا پرستار و علمبردار کہنے والوں نے اپنے سلوک و رویہ میں اس درجہ سنگدلی اور بے دردی کا مظاہرہ کیا کہ توبہ ہی بھلی۔ اس قدر غلط راہ پہ اس تندہی سے بڑھے جیسے ہمارے سینوں میں دل، حساس دل نہ ہوں بے جان اور بے حس پتھر کے سنگلاخ ٹکڑے ہوں یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ ہمیں دنیا کے بہترین، افضل ترین مذہب، ایمان سے مالا مال کیا گیا لیکن ہم نے عوام میں جہالت و برائی کی تاریکی پھیلائی! مالک نے ہمیں دین و مذہب، اخلاق و ایمان کے سدا بہار چشموں سے سرفراز کیا۔ لیکن ہم نے دنیا میں اس امرت کو بانٹنے اور سب میں لطف و کرم تقسیم کرنے کی بجائے گندگی اور

www.taemeernews.com

مزدوروں کو تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ یہ سنگدلی اور بے حیائی نہیں تو کیا ہے کہ ہمارا بی۔ اے پاس پڑھا لکھا نوجوان نیچی ذات کے کسی فرد کو چھونے کے لیے تو تیار نہیں ہوتا لیکن اپنی تعلیم و فن پروری کے لیے اس سے روپیہ پیسہ بٹورنے میں کوئی شرم و حیا محسوس نہیں کرتا۔

یہ غریب نادار نچلی ذات کے عوام اپنے آپ کو بقیدِ حیات رکھنے کی کشمکش میں اس بری طرح مصروف و محو رہے ہیں کہ انہیں علم و فضیلت حاصل کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں مل سکا۔ یہ بیچارے بے جان مشینوں کی طرح برسوں سے اسی طرح دن رات خون پسینہ ایک کرتے چلے گئے ہیں اور پڑھا لکھا طبقہ انہیں اس قدر بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرنے میں مگن رہا ہے کہ انہیں اپنی زندگی کو نکھارنے اور اونچے اٹھنے اور سربلند کرنے کی سوجھ بوجھ تک نہیں۔ محنت کرتے کرتے یہ مر گئے لیکن ان کی کمائی سے دوسرے فیضیاب ہوتے چلے گئے۔ چند پڑھے لکھے لوگوں کا طبقہ ان کی محنتِ شاقہ کی ساری کمائی کو لوٹتا چلا گیا لیکن اب وقت نے کروٹ بدلی ہے۔ حالات نے پانسہ پلٹا ہے اور غریب و مفلس عوام آہستہ آہستہ اس صورتِ حالات سے روشناس اور باخبر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کسمپرسی، تباہی، ذلت و خواری کے اسباب ان پہ کھلتے جا رہے ہیں اور وہ حالات کے خلاف ایک قسم کا متحدہ محاذ بنانے لگے ہیں۔ انہوں نے اب اس بات کا تہیہ کر لیا ہے کہ وہ اب اپنے جائز حقوق و مراعات حاصل کر کے دم لیں گے۔ یورپ اور امریکہ کے عوام اس صورتِ حالات کے متعلق سب سے پہلے بیدار ہوئے تھے۔ اور انہوں نے سب سے پہلے جدوجہد شروع کی تھی۔ اب ہندوستان میں بھی ایسی بیداری آنی شروع ہو گئی ہے۔ یہ اس بیداری کی ہی تو علامت ہے کہ ادنیٰ طبقہ کے لوگ اب آئے دن ہڑتال کر دیتے ہیں۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ اب لاکھ چاہیں ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو نہ دبا سکیں گے نہ کچل سکیں گے۔ اعلیٰ طبقہ کا اپنا مفاد اس بات میں پنہاں ہے کہ وہ ادنیٰ طبقہ کے ساتھ ان کے جائز حقوق حاصل کرنے میں اشتراکِ عمل کرے۔

آج امریکہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں ہر انسان کو ترقی کرنے کے لیے وسیع مواقع اور امکانات ملتے ہیں۔ جو شخص آج غریب ہے کل وہ امیر، صاحبِ علم، صاحبِ عزت اور صاحبِ ثروت بھی بن سکتا ہے۔ امریکہ میں ہر شخص غریب کی امداد کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ لیکن ہندوستان میں جدھر دیکھو یہی صدا گونجتی ہوئی ملے گی کہ ہم غریب ہیں زندگی سے بیزار بیٹھے ہیں۔ کتنے ہی خیراتی ادارے ہیں۔ جو ان غریبوں کی امداد کرنے کو تیار ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جن کی آنکھوں میں ہندوستان کے ان کروڑوں غریبوں اور مفلسوں کی حالتِ زار دیکھ کر آنسو چھلک پڑتے ہیں؟ کیا اس بے رخی اور بے اعتنائی کے باوجود جو ہم ان سے روا رکھتے ہیں۔ اور اس بے دردی کے باوجود جو ہم ان کے تئیں دکھاتے ہیں۔ ہم انسان کہلانے کے مستحق ہیں؟ کیا ہم انسان ہیں؟ اگر نہیں تو خود ہی کہیئے کہ ہم ان کی حالت سدھارنے کے لیے انہیں روزی کمانے کے قابل بنانے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ مدد کرنی تو کجا ہم تو

www.taemeernews.com

ان کے سایہ تک سے دور بھاگتے ہیں۔ ہم انہیں چھونا تک نہیں چاہتے۔ ان کی صحبت وہم نشینی گوارا کرنے کو تیار نہیں۔ کیا اس قدر سنگ دلی کے باوجود ہم اپنے آپ کو انسان کہہ سکتے ہیں؟

یورپ کے متعدد شہروں میں گھومتے پھرتے ہوئے میں نے جب غریب باشندوں کو بھی عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے دیکھا۔ انہیں تعلیم و دولت سے بہرہ ور پایا۔ تو میرے ذہن میں ہندوستانیوں کی غربت و ناداری کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی حالت ذرا گھوم گھوم گئی۔ اور میری آنکھیں فرطِ غم سے اشکبار ہو گئیں لیکن کیا محض آنسو بہانے سے ان کی حالت سدھر سکتی ہے؟ نہیں! ان کی حالت سدھارنے کے لئے اور انہیں پستیوں سے نکالنے کا حل کیا ہے؟ میری عقل و دانش میں تو صرف ایک حل ہے، تعلیم۔ اور صرف تعلیم۔ تعلیم و تربیت سے ہی ہم انسان کے اندر خوابیدہ جذبۂ خود اعتمادی کو بیدار کر کے ہی ہر انسان کے اندر محوِ خواب برہم کو جگا سکتے ہیں۔ اگر یورپ کے لوگ مسرور و شادماں خوشحال و آسودہ حال ہیں تو اس لئے کہ ان کے اندر برہم جاگا ہوا ہے۔ ہماری غریبی، پستیوں اور زبوں حالیوں کا سبب یہ ہے کہ ہمارا برہم خوابِ گراں میں بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔

میں نے نیویارک میں اپنی آنکھوں سے آئرش آباد کاروں کو ساحل امریکہ پہ اترتے دیکھا۔ پیلے رنگ، افسردہ خاطر، پھٹے پرانے، چیتھڑے پہنے ہوئے مرجھائے چہروں والے یہ لوگ پھٹے ٹاٹ کا ایک گندا اور گلا بستر کندھے پر ڈالے، ہاتھ میں گٹھڑی لئے جب یہ آباد کار آتے تو ان کے قدم قدم سے وحشت و غربت ٹپکتی تھی۔ ان کی آنکھیں بے نور۔ بے رونق تھیں جیسے غربت نے زندگی کی ساری چمک کو نوچ کر ان آنکھوں میں دہشت و خوف کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہو۔ لیکن چند مہینوں میں ہی دیکھتے دیکھتے، ان کی کایا پلٹ گئی جو لوگ مایوسی اور پژمردگی کی وجہ سے گردن نیچے ڈالے من من کا قدم اٹھاتے تھے۔ اب ان کے قدموں میں سبک رفتاری آ گئی۔ ان کی آنکھوں کو چمک ان کے ہونٹوں کو ہنسی۔ ان کے چہروں کو رونق مل گئی۔ گلے سڑے چیتھڑوں کی جگہ اب زرق برق لباس زیبِ تن تھا۔ اب نہ ان کی چال میں دہشت تھی نہ آنکھوں سے وحشت برستی تھی چھ مہینے میں انقلاب آ گیا۔ یہ آباد کار کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟

یہ آئرش باشندے جب تک اپنے ملک میں رہے۔ سارا ماحول ان کے لئے حوصلہ شکن اور شکست و ندامت کے ہلاکت آفریں جذبہ سے معمور تھا۔ یہ جب تک اپنے ملک میں تھے ہوا کا ہر جھونکا بار بار ان کے کانوں سے ٹکرا کر یہی کہتا تھا کہ "تم؟ تم تو گئے گذرے ہو! تم سے کچھ بھی نہ ہوگا! ترقی کی امیدیں ترک کر دو۔ تم غلام اور غریب پیدا ہوئے ہو غلام اور غریب مروگے"۔ دن رات بچپن کی لوریوں سے ہی ان کے کانوں میں یہی شکست خوردگی، یہی مایوسی، یہی بزدلی اور احساسِ غربت کوٹ کوٹ کر بھر دیا جاتا تھا۔ اور نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ایسا ہی تصور کرنے لگتے اور ہر وقت سہمے اور ڈرے رہتے تھے۔ اور خاموش ہو رہتے تھے۔ یہ بات ان کے دلوں میں گھر کر گئی تھی کہ

www.taemeernews.com

واقعی ہم حقیر و ناچیز ہیں، ہم سے کیا ہوگا؟ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ذلت و پستی سے گھری ایسے شخص کی روح رفتہ رفتہ زندگی اور نامرادی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گرد کھاتی چلی جاتی تھی۔ لیکن امریکہ پہنچنے کی دیر تھی۔ اس کے کانوں میں بار بار ایک آواز ٹکرائی۔ کہ "تم مایوس اور افسردہ خاطر کیوں ہو؟ تم بھی ہماری طرح انسان ہو۔ جو کچھ ہم نے کیا ہے تم بھی کر سکتے ہو۔ کمر ہمت باندھو، جرأت سے کام لو۔ اٹھو۔ جاگو۔ اور اپنی اس دنیا کے اندھیرے کو مٹا کر اپنے چاروں طرف اجالا اور روشنی کر لو۔" یہ نغمۂ حیات ان آباد کاروں کے کانوں میں گونجا۔ تو ان کے دلوں میں اپنی خوابیدہ قوتوں اور صلاحیتوں کے متعلق احساس جاگا۔ جذبۂ خود اعتمادی انگڑائیاں لینے لگا۔ خواب گراں میں مدہوش پڑا "برہمن" جاگ اٹھا۔ اور وہ ناقوسِ قدرت سے ہم آہنگ ہو کر پکارنے لگا۔ "اٹھو، جاگو اور جب تک منزل کو نہیں پا لیتے رکو نہیں"۔

جس دن سے تعلیم و تمدن کی روشنی اعلیٰ طبقہ سے ادنیٰ طبقہ میں پھیلنے لگی ہے اسی دن سے مغربی ممالک کی تہذیبِ نو اور ہندوستان، مصر اور روم کی تہذیبِ کہنہ میں امتیاز کی دیواریں کھڑی ہونی شروع ہوگئیں۔ اور ان دونوں تہذیبی قدروں میں زمین و آسمان کا فرق پڑ گیا۔ میری آنکھوں دیکھی بات ہے جس جس ملک و قوم میں تعلیم تہذیب عوام میں پھیلنی شروع ہوگئی۔ وہاں خوشحالی اور ترقی نے لوگوں کی قدمبوسی شروع کر دی۔ تعلیم کی روشنی پھیلی تو دولت کی فراوانی اور خوشحالی بھی آئی۔ ہندوستان کی تباہی و بربادی۔ ذلت و نامرادی کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ اس خطۂ ارض کی ساری عقل و دانش اور تعلیم و ہنر کو چند لوگوں نے اونچی ذات کے گھمنڈ یا طاقت کے تکبر و غرور کے نشہ میں اندھے ہو کر اپنی اجارہ داری میں لے لیا تھا۔ اور اسے محدود اور قید کر دیا تھا۔ اگر ہمیں پھر سے ترقی کرنی ہے، اونچا اٹھنا ہے تو ہمیں وہی کچھ کرنا ہوگا جو یورپ میں کیا گیا۔ ہمیں بھی تعلیم کو عوام الناس میں پھیلانا ہوگا۔ ہماری ترقی اور بہتری کا راز فروغِ تعلیم میں ہے۔ میرا خیال اور ارادہ اب یہ ہے کہ ہندوستان کے اندر اور باہر کے ملکوں میں نوعِ انسان نے جس قدر ترقی کی ہے اسے ہندوستان میں غریب سے غریب ترین، عاجز سے عاجز ترین انسان تک پہنچا دوں۔ انہیں اسی دولتِ علم و ہنر سے مالا مال کر دوں۔ ان کی سوچ و فکر کی صلاحیتوں کو بیدار کر دوں تاکہ وہ اپنے مستقبل اور اپنے مفاد کی فکر خود کر سکیں۔

انہیں کون روشنی اور اجالا دے گا؟ کون گھر گھر اور در در گھوم کر انہیں زیورِ تعلیم پہنائے گا؟ ان انسانوں کو ہی اپنا خدا اور معبود سمجھو۔ سوچو تو ان کے لئے، کام کرو تو ان کی خاطر، دعا کے لئے ہاتھ اٹھاؤ تو ان کے واسطے۔ ایسا کرو گے تو مالک اور ایشور خود آگے بڑھ کر آپ کی رہنمائی کرے گا۔ آپ کو بتائے گا کہ یہ کارِ گراں کیسے انجام دیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک مہاتما اور عابد و سالک وہی ہے جس کا دل ان غریبوں کی کسمپرسی دیکھ کر پگھل کر آنسو بن جائے جس کا دل لہو لہو ہو جائے۔ اگر اس کے دل میں یہ احساسِ ہمدردی اور احساسِ رحم دلی پیدا نہیں ہوتا تو میں اسے بدکار اور خبیث کہوں گا۔ آئیے ہم یک دل اور یک زبان ہو کر ان کی فلاح و بہبود کے لئے ترمن

www.taemeernews.com

I33

دھن ایک کردیں۔ ان کی خدمت کرتے ہوئے ان کا غم و فکر کرتے ہوئے ہم خواہ گمنامی کی موت مرجائیں۔ کوئی ہمارا نام لیوا اور جانشین تک نہ رہے۔ کوئی ہماری تربت پر آنسو تک نہ بہائے۔ کوئی ہمارا نام و نشان تک نہ جانے اس کا غم و اندوہ مت کیجئے یقین رکھئے۔ کہ آپ کا کوئی فعل رائیگاں نہیں جائے گا۔ آپ کا کوئی خیال بے ثمر نہیں رہے گا۔

ہر فعل و فکر جلد یا بدیر رنگ لائے گا میرا دل و فور جذبات سے اس قدر بھر گیا ہے کہ میں اپنے احساسات کو موزوں الفاظ کا لباس بھی نہیں پہنا سکتا۔ آپ میرے دل کی اس کیفیت کو جانتے ہیں اور محسوس کر سکتے ہیں میں اپنے منہ سے کیا کہوں؟ کیسے کہوں؟ میرا تو عقیدہ و ایمان یہ ہے کہ جب تک ہمارے کروڑوں ہم وطن بھوک و جہالت کے شکار بنے ہوئے ہیں۔ ہم میں سے ہر وہ شخص غدار اور ننگ وطن ہے۔ جس نے ان کے خرچ سے ان کے سرمایہ سے تعلیم تو حاصل کی ہو لیکن ان کی مطلقاً پرواہ تک نہیں کرتا میرے نزدیک وہ انسان انسان ہی کہلانے کا حقدار نہیں۔ جو ان کے بل بوتے پر عقل و دانش حاصل کر کے ان کی سوچ اور فکر سے بے بہرہ رہے ہیں تو ایسے تمام انسانوں کو جو اپنی نفاستوں کا سوانگ بھرتے نہیں تھکتے۔ جو اپنی بڑائی اور عظمت کی ڈینگیں مارتے نہیں رکتے، لیکن جن کے دل ان غریب بھوکے اور ان پڑھ ہم وطنوں کو دیکھ کر نہیں پسیجتے۔ بے شرم، ذلیل و بے حیا سمجھتا ہوں جس شخص کی آنکھ سے اپنے ان بھائیوں اور بہنوں کی جن کی حالت بھوکے جنگلیوں سے بھی زیادہ گئی گزری ہے ' ابتری' لاچاری اور درماندگی دیکھ کر آنسو نہیں ٹپکتا' میرے نزدیک وہ شخص پاجی اور عیار ہے۔

ہمیں ایسے لوگوں کو مذہبی عقائد سے آزاد دنیاداری کی اور فطری اخلاق کی تعلیم دینی چاہیئے۔ اور اس غرض کے لئے ہمیں طریقہ اور لائحہ عمل کو اپنانا ہوگا جس کی داغ بیل ہمارے آباؤ اجداد نے مرتب کی تھی۔ اور وہ طریقہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ بتدریج تمام اعلے مقاصد حیات' تمام آدرش عوام کے دلوں میں نقش کر دیئے جائیں۔ انہیں آہستہ آہستہ اوپر اٹھایا جائے ان میں دستورِ مساوات کو فروغ دیا جائے اور انہیں مساوی طور پر اونچا اٹھایا جائے لیکن دنیاداری اور ضابطۂ اخلاق کی یہ تعلیم بھی انہیں مذہب کے ذریعہ دیجئے

اس مرحلہ پر آپ کا فرض ہے کہ ملک کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک گھوم گھوم جائیے ایک ایک گاؤں اور ایک ایک گھر پہنچ کر لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرائیے کہ محض ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رکھنے سے کچھ نہیں بنے گا۔ کفِ افسوس ملنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ انہیں یہ بات اچھی طرح سمجھا دیجئے کہ ان کی زبوں حالی کس قدر ناگفتہ بہ ہے۔ ان کی دردشا کس قدر حسرتناک ہو چلی ہے۔ انہیں کہہ دیجئے کہ اے بھائیو! اب جاگو۔ اب اٹھو۔ اب بیدار ہو جاؤ۔ تم کب تک خوابِ خرگوش میں پڑے رہوگے۔" جائیے! اپنے ان ہم وطنوں کو یہ بتا دیجئے کہ وہ اپنی دردشا کو کس طرح دور کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی حالت کس طرح سنوار سکتے ہیں۔ ان کی اس عقلِ سلیم کو بیدار کر دیجئے جس کی بدولت وہ شاستروں کی انتہائی اعلےٰ سچائیوں اور اقدار کو سمجھ سکیں۔ اور یہ کام تبھی ممکن ہوگا۔ اگر آپ ان سچائیوں اور قدروں کو دل میں

www.taemeernews.com

اور دل میں کھب جانے والی فصاحت و بلاغت سے پیش کریں کہ بیان کے لوح دل پہ لکھی جائیں۔ اب تک ہمارے مذہب دھرم کے اجارہ دار پنڈت بنے بیٹھے ہیں لیکن اب وہ انقلاب زمانہ کے تقاضوں کی وجہ سے اس اجارہ داری کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے ایسے اقدام کیجئے جن کی بدولت اس ملک کا ہر فرد و بشر اس دین و مذہب سے آشنا اور بہرہ ور ہو سکے ان کے دلوں پہ یہ بات نقش کر دیجئے کہ وہ بھی مذہب اور دھرم کے متعلق اسی قدر حق دار ہیں جس قدر برہمن ہیں۔ مذہب دھرم کی سچائیاں کسی کی اجارہ داری میں نہیں۔ یہ سب کے لئے ہیں۔ سب کی ساجھی ہیں۔ ان حیات افروز شعلہ بار منتروں سے ان میں ہر ایک کو چنڈالوں تک کو اسی رو زندگی پہ ڈال دیجئے اور اس کے ساتھ ہی انہیں سادہ اور سیدھے سادے الفاظ میں زندگی کی ضروریات اور تجارت، بیوپار، کھیتی باڑی کی اہمیت اور ضرورت سے روشناس کرائیے

عوام الناس کو ایک مرکزی کالج کے ذریعہ اونچا اٹھانے کے طریقہ کو فروغ دیجئے اور پھر اس کالج میں تربیت پائے ہوئے مشنریوں اور مبلغوں کے ذریعہ علم و مذہب کی تعلیم ایک ایک غریب کی دہلیز اور چوکھٹ تک پہنچا دیجئے اگر چند تارک الدنیا بے لوث سنیاسی دوسروں کی فلاح و بہبود کی دھن اور لگن میں سرشار ہو کر گاؤں گاؤں جا کر تعلیم کو فروغ دیں اور چنڈال تک ہر شخص کا معیار زندگی اونچا اٹھانے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں لڑائیں اور نئے نئے طریقے بروئے کار لائیں۔ اور کیمروں، نقشوں، چارٹوں، خاکوں اور ایسی دوسری چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے دیہاتیوں اور عوام الناس میں بیداری لانے کی پوری پوری کوشش کریں تو کیا اس کے طفیل تھوڑے دنوں میں ہی ملک کی کایا نہیں پلٹ جائے گی؟ اگر موسیٰ چل کر کوہ طور پر نہیں جا سکتا۔ تو کوہ طور کو موسیٰ کے پاس چل کر جانا ہوگا۔ ہندوستان کے غریب باشندے اس قدر مفلس ہیں کہ یہ بچارے سکولوں اور مدرسوں یا پاٹھ شالاؤں تک بھی نہیں جا سکتے اس لئے ہمیں اب تعلیم کو ان تک پہنچانے کے لئے شبانہ روز کوشش کرنی ہوگی۔

یاد رکھیئے ہماری نسل و قوم جھونپڑیوں میں بسنے والی ہے۔ اگر عوام الناس کی حالت بہتر بنائی جاتی ہے اور ان کا معیار حیات بلند کیا جاتا ہے تو ہمیں تعلیم کو جھونپڑیوں تک لے جانا ہوگا لیکن کتنے افسوس اور رنج کا مقام ہے کہ کسی نے بھی ان بچاروں کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ رہی ہمارے عصر جدید کے ریفارمروں کی بات وہ تو صرف اوپر کی چکنی چپڑی اور سطحی نمائش و آرائش میں ہی کھوئے رہتے ہیں۔ اور اس طرح فروعی باتوں پہ اپنی ساری توانائیوں کو خرچ کرتے جاتے ہیں کہ بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت ہونی چاہئیے یا نہیں۔ میں ہر اصلاح سے ہمدردی رکھتا ہوں اور اس کی تائید کرتا ہوں۔ لیکن یاد رکھیئے کہ ملک کے مستقبل کا دار و مدار اس بات پہ نہیں کہ بیوہ کو کتنے خاوند ملتے ہیں بلکہ اس بات پہ ہے کہ اس کے عوام کی حالت کیسی ہے؟ ان کا معیار حیات کیسا ہے؟ کیا آپ اسے اونچا اٹھا سکتے ہیں؟ کیا آپ انہیں ان کی گم شدہ انفرادیت کو اس طریقہ واپس بحال کر سکتے ہیں کہ ان کے روحانی باطن میں کوئی خلل و فتور نہ پیدا ہو۔ جہاں تک حق مساوات، آزادی اور کام کرنے کی صلاحیتوں کا تعلق ہے، آپ اہل مغرب

www.taemeernews.com

کی طرح فراخدل اور کشادہ مزاج بن جائیں۔ لیکن جہاں تک مذہبی تہذیب اور اخلاقی قدروں کا سوال ہو آپ پکے ہندو ہوں ہمیں یہی کچھ کرنا ہے، ہم یہی کچھ کریں گے ہمیں یہی کچھ بننا ہے ہم یہی کچھ بنیں گے۔

سوامی وویکانند مذاہب کی پارلیمنٹ میں

www.taemeernews.com

ذات پات کا مسئلہ

اگرچہ بظاہر ہماری ذات پات کی تنگ نظریاں اور فرقہ بندیاں ہمارے مذہب اور دھرم سے وابستہ نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں مذہب، دھرم کا ان سے کوئی تعلق، واسطہ نہیں۔ ذات پات کی یہ تنگ نظریاں اور فرقہ بندیاں ماضی میں ہمیں بطور قوم محفوظ و سلامت رکھنے کے لیے ضروری تھیں۔ لیکن جونہی حفظ ماتقدم کی یہ ضرورت ختم ہو گئی۔ یہ بھی قائم نہیں رہ سکیں گی۔ یہ قدرتی موت مر جائیں گی۔ مذہب و ایمان میں کوئی ذات پات نہیں۔ ہندوستان میں اعلیٰ ترین ذات کا اور ادنیٰ ترین ذات کا شخص سادھو بن سکتا ہے۔ اور سالک و عارف بن سکتا ہے۔ اور اس طرح دونوں ذاتیں برابر اور ہم پایہ ہو جاتی ہیں۔ پھر ذات پات کا سوال کہاں رہتا ہے۔ ذات پات کی یہ تنگ نظریاں اور فرقہ بندیاں سراسر دیانت کے مذہب، دھرم کے منافی ہیں۔

یہ فرقہ بندی اور ذات پات کی تمیز سماجی رسم و دستور ہے جس کا دھرم کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اور ہمارے جتنے بڑے رہنما پیدا ہو چکے ہیں ان سب نے اسے توڑ دینے اور مسمار کر دینے کی زبردست کوشش کی ہے۔ بدھ مت کے بعد سب طبقوں نے اس تفریق و تمیز کے خلاف آواز بلند کی۔ لیکن جتنی کوشش اسے ختم کرنے کی گئی۔ یہ زنجیر اتنی ہی مضبوط اور مستحکم ہوتی چلی گئی۔ بھگوان بدھ سے راجہ رام موہن رائے تک سب نے ذات پات کو مذہبی دستور سمجھنے کی غلطی کی۔ اور ہمارے مذہب، دھرم کو ختم کر دینے کی کوشش کی۔ ذات پات کی تفریق و تمیز سے چھٹکارا پانے کی خاطر انہوں نے دھرم کو بھی نیست و نابود کر دینے کی سعی کی۔ مگر انہیں ناکامی دیکھنی پڑی۔

پنڈے اور پجاری خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہتے رہیں۔ ذات پات محض ایک سماجی فرق بندی ہے اپنا مفید کام سرانجام دینے کے بعد اب ہندوستان کی فضا میں یہ محض سڑاند اور عفونت پھیلا رہی ہے اسے

www.taemeernews.com

تبھی دور کیا جا سکتا ہے جب لوگوں کی گم شدہ سماجی انفرادیت پھر سے بحال کر دی جائے ۔ ذات پات کی یہ تنگ نظری اور فرقہ بندی فی الحقیقت ہندوستان کے سیاسی رجحانات اور سیاسی اداروں کی ہی بگڑی ہوئی صورت ہے یا یوں سمجھئے وراثت میں ملی ہوئی ایک تاجرانہ ذہنیت ہے۔ یورپ کے تاجرانہ مقابلہ نے جس کی جڑیں کھوکھلی کر کے رکھ دی ہیں شاید کسی تعلیم کا بھی اس قدر کاری اثر نہ ہوتا جس قدر اس تجارتی کشمکش نے پیدا کیا ہے۔

میں جوں جوں بوڑھا ہوتا جاتا ہوں توں توں میں ذات پات اور ہندوستان کے دوسرے قدیم رسموں رواجوں کی زیادہ قدر و قیمت سمجھنے لگا ہوں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ میں ان میں بیشتر رسموں اور رواجوں کو بیکار اور فضول تصور کرتا تھا۔ لیکن جوں جوں میں سن رسیدہ ہوا توں توں ان رسموں اور رواجوں کی مذمت و ملامت کرنی ترک کرنی پڑی اور میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ ان میں سے ہر رسم و رواج صدیوں کے تجربہ کا نچوڑ ہے۔

ان کے خلاف جو ہوا فروغ ہو رہی ہے اس کو میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ کل کو اگر دو دن کا بچہ جس کی زندگی کا دو روزہ ہے میرے پاس آکر کہے کہ تم اپنے منصوبوں اور ارادوں کو تبدیل کر دو۔ کیونکہ یہ ناقص اور فضول ہیں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟ اس بچہ کا کہنا مان کر ان منصوبوں اور ارادوں کو خیرباد کہہ دینا ہوگا یا اپنے گرد و پیش کو تبدیل کر دینا ہوگا؟ میں ایسا کروں گا تو یہ میری جہالت و حماقت ہوگی۔ بیچند ملکوں کی طرف سے ہمارے ان رسموں رواجوں کے خلاف جو صلاح مشورے ہمیں دیئے جا رہے ہیں۔ ان کی کیفیت ایسی ہی ہے۔ ان عقل کے اندھوں کو کہہ دیجئے کہ آپ اپنی عقل اپنے گھر سنبھال کر رکھیے۔ میں آپ کے الفاظ کو تبھی کوئی قدر و قیمت دوں گا، جب آپ کوئی مستحکم سماج اور معاشرہ بنا کر دکھائیں گے۔ انہیں کہہ دیجئے کہ تم میں مستقل مزاجی اور صحیح الدماغی کہاں سے آگئی؟ آپ تو کسی ایک بات پہ دو دن سے زیادہ نہیں ٹک سکتے۔ آپ آپس میں الجھتے رہتے ہیں اور ناکام و نامراد رہتے ہیں۔ آپ تو برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہوئے ہیں اور چار پانچ دن کے بعد فنا کی آغوش میں سو جائیں گے۔ آپ بلبلوں کی طرح پیدا ہوئے بلبلوں کی طرح مٹ جائیں گے۔ آپ لاف زنی نہ کریں۔ پہلے ہماری طرح مستحکم معاشرہ تو قائم کر کے دکھائیں پھر جانیں گے کہ آپ میں بھی کچھ ہمت و جان ہے۔ چند قوانین مرتب کر کے ان پر پوری شان و شوکت سے صدیوں تک کاربند رہ کر تو دکھائیں پھر میرے پاس آکر صلاح و مشورہ دینا۔ لیکن جب تک آپ ایسا نہیں کر لیتے ہم آپ کو وارفتہ مزاج اور کم ظرف بچہ ہی سمجھتے رہیں گے۔

ذات پات بہت اچھی ہے۔ یہ دینی دستور حیات اور منصوبہ زندگی ہے، جسے آپ اپنانا چاہتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ لاکھوں میں کوئی ایک ہی اس بات کا صحیح صحیح علم رکھتا ہے کہ ذات پات کا اصل مفہوم و مقصد کیا ہے۔

بادی النظر سے دیکھئے تو دنیا کا ایک بھی ملک ایسا نہیں ملے گا جہاں ذات پات نہیں۔ ہندوستان میں تو ہم ذات پات کے زینہ سے ہی اس مقام تک پہنچتے ہیں جہاں کوئی ذات پات نہیں۔ ذات پات کی بنیاد ہمیشہ ہمیشہ سے اسی

277 www.taemeernews.com

اصول پر استوار رہی ہے۔ اور وہ اصول یہ تھا ہر شخص کو برہمن بنایا جائے کیونکہ برہمن ہی اس دنیا کا آدرش انسان ہے۔ اگر آپ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہاں ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو اونچا اٹھانے کی مسلسل اور پیہم کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ کتنے ہی طبقوں کو اونچا اٹھایا گیا۔ اور جب تک سب برہمن نہیں بن جاتے دوسرے طبقوں اور دوسری ذاتوں کو اسی طرح سے اونچا اٹھانے کا عمل بدستور جاری رہے گا کیونکہ ذات پات کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما ہے۔ اور یہی جذبہ ہماری زندگی کا دستور بن چکا ہے۔ یہی ہمارا منصوبۂ حیات ہے۔

ہمارا منتہائے مقصود ہر ایک کو ایسا برہمن بنانا ہے۔ توحید و معرفت جس کی زندگی کی زیب و زینت ہو تقویٰ اور بے نفسی جس کی زندگی کی عبادت ہو۔

آدرش برہمن سے ہماری مراد کیا ہے؟ اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لیجئے۔ آدرش برہمن سے میری مراد ایک ایسی قلبی کیفیت سے ہے جس میں تن پروری، نفس پروری اور دنیاداری مطلقاً فنا ہو جائے۔ اور صرف علم معرفت، علم حق اور علم توحید ہی زندہ اور موجزن ہو۔ ہندو نسل و قوم کا آدرش تو ایسا انسان ہی بنتا ہے۔ کیا کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ جب ہماری مقدس کتابیں۔ دانشور اور سالک یہ اعلان کرتے ہیں کہ برہمن پر کسی قانون و آئین کی گرفت نہیں عائد ہوتی۔ کوئی قانون اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ کوئی حکمران اور بادشاہ اس پر حکومت و رعب نہیں بٹھا سکتا۔ اس کی روح ان سب گرفتوں اور پابندیوں سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے۔ کہ ان الفاظ کی گہرائی میں کونسی حقیقتیں پنہاں ہیں۔ یہ الفاظ یونہی نہیں کہے گئے۔ یہ سو فیصدی درست اور مبنی بر حقیقت ہیں۔ ان الفاظ کی قدر و قیمت چند خود غرض پسند یا احمقوں کی باتوں میں آکر ان کے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش نہ کیجئے بلکہ ان کی اصل حقیقت اور ماہیت کا اندازہ خالص ویدانتی نقطۂ نگاہ سے لگائیے۔ مگر برہمن سے مراد ایسے انسان سے ہے جس نے سب خود غرضیوں اور نفس پرستیوں کو فنا کر دیا ہو۔ اور جو ہر وقت حکمت و دانش، اور خلوص و محبت پھیلانے میں ہی محو و مصروف رہتا ہو۔ اور اگر سارے ملک میں ایسے ہی برہمن مرد اور ایسی ہی برہمن عورتیں آباد ہوں۔ جو اخلاقی اور روحانی طور پر نہایت بلند اخلاق و ایمان رکھنے والی ہوں۔ تو پھر آپ خود ہی کہیئے کہ کیا یہ کہنا غلط ہے کہ ایسا ملک ایسا بہشت ہر قانون اور ہر دستور کی گرفت سے بہت اونچا اور بلند ہے؟ بھلا ایسے ملک پر حکمرانی کرنے کے لئے پولیس اور فوج کی کیا ضرورت ہے؟ ایسے انسان بھلا کسی حکومت کے ماتحت اور زیر نگیں کیوں ہوں گے؟ ایسے انسان تو فرشتے اور دیوتا ہوں گے۔ ہمارے آدرش برہمن ایسے ہی انسان ہیں۔ کیا آپ نے نہیں جانا کہ کرت یگ میں ایک ہی ذات پات تھی اور وہ تھی برہمنوں کی۔ مہابھارت میں یہ بات واضح الفاظ میں کہی گئی ہے کہ آغاز میں اس ساری دنیا میں صرف برہمن ہی تھے لیکن جوں جوں ان میں زوال اور پستی آتی چلی گئی توں توں یہ مختلف ذات پات میں تقسیم ہوتے چلے گئے۔ زوال کے اس چکر کو الٹا چلائیے۔ سب لوگ ایک بار پھر برہمن بن جائیں گے اور آدرش انسان بن جائیں گے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ ہمارا نصب العین اور منتہائے مقصود ہر ایک فرد و بشر کو ایسا ہی

www.taemeernews.com

برہمن بنانا ہے۔

ضروری نہیں کہ برہمن کا لڑکا جگر بھی برہمن ہی ہو۔ اگرچہ اس بات کا امکان ضرور ہے کہ وہ برہمن بن سکے۔ برہمن ذات اور برہمن سیرت، دو مختلف چیزیں ہیں۔ میں جس برہمن کو آدرش کہتا ہوں۔ اس سے مراد برہمن سیرت ہے۔ برہمن ذات نہیں۔ میں اسے برہمن کہنے کو تیار نہیں جو جنم سے برہمن ہو۔ میں تو اسے برہمن کہتا ہوں اور سمجھتا ہوں جو سیرت و کردار میں برہمن ہو۔ ضروری ہے کہ اس فرق اور امتیاز کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا جائے۔ جیسے ہر ایک انسان کے اندر ستوگن، رجوگن اور تموگن، تینوں فطرتیں کم و بیش مقدار میں موجود ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر انسان میں برہمن، کشتری، ویش اور شودر بننے کی صلاحیت اور اہلیت پائی جاتی ہے۔ کسی میں یہ کم ہوتی ہے کسی میں زیادہ۔ کوئی فطرت کسی وقت غالب ہوتی ہے، کوئی فطرت کسی وقت۔ انسان ہر وقت ان تینوں میں سے ایک نہ ایک فطرت و سیرت و جذبہ کے غلبہ میں ہوتا ہے اور جس جذبہ اور جس فطرت کا غلبہ زیادہ ہوگا، حاوی ہوگا، اس کا کام و فعل بھی ویسا ہی ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک انسان کی عملی زندگی کا ہی تجزیہ کر دیکھئے۔ جب وہ اجرت و تنخواہ کے لیے کسی کی خدمت میں جٹا ہوتا ہے اس وقت وہ شودر ہوتا ہے جب وہ نفع اور فائدہ کی خاطر لین دین کرتا ہے۔ تو وہ ویش ہوتا ہے۔ جب وہ کسی بات کے حق و صداقت کی خاطر اڑتا ہے تو کشتری پن کی صفات اس پر غالب ہوتی ہیں۔ اور جب وہ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر یادِ خدا میں سر جھکا کر بیٹھتا ہے یا اپنا وقت اس مالک سے گفتگو کرنے میں صرف کرتا ہے اس وقت وہ برہمن ہوتا ہے۔ ایک ہی انسان کسی وقت کچھ ہوتا ہے کسی وقت کچھ۔ ظاہر ہے کہ ان ذاتوں کو تبدیل کرنا قدرتی عمل ہے۔ اور ایسا کرنا ممکن ہے۔ ذات پات تبدیل کی جا سکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو وشوامتر جو جنم سے کشتری تھے، برہمن کیسے بن گئے۔ اور پرشو رام جن کا جنم کشتری خاندان میں ہوا تھا، برہمن کیسے کہلائے؟

ارتقاء کی یہ منزلیں آریوں نے امن و سکون سے طے کیں۔ آریوں کی تہذیب ہی پُرامن تہذیب ہے۔ لیکن اس کے برعکس یورپینوں کی تہذیب و تمدن تلوار کے سہارے پھیلی اور پروان چڑھی۔ آریوں نے اپنی تہذیب کی بنیاد وہ فنون ان فرقوں پر رکھی جن میں عقل و دانش، اخلاق و کردار کے مطابق ہر شخص کی ذات پات مخصوص تھی۔ اور اس میں لگاتار تبدیلی رونما ہوتی رہتی تھی۔ جوں جوں اخلاق و کردار میں پاکیزگی اور تابندگی آتی جاتی ہے۔ توں توں ذات ادنیٰ سے اعلیٰ ہوتی جاتی ہے۔ لیکن ذرا یورپ کی زندگی پر نگاہ ڈالئے۔ وہاں صرف طاقتور زندہ رہتے ہیں۔ کمزور مٹ جاتے ہیں۔ وہاں فتح و نصرت صرف اس کی ہوتی ہے جو شہ زور اور جسمی ہمت ہوتا ہے۔ وہاں صرف شہ زوروں کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے کمزوروں کو نہیں۔ لیکن یہ فخر صرف سرزمین بھارت کو حاصل ہے کہ یہاں معاشرتی قانون و دستور کا مقصد ہی غریبوں کی، کمزوروں کی حفاظت کرنا ہے۔

ایسا ہے ذات پات کے متعلق ہمارا آدرش جس کا مقصد اور مدعا صرف یہ ہے کہ انسان کے جوہرِ انسانیت اور

www.taemeernews.com

حسنِ اخلاق کو آہستہ آہستہ اس قدر سنوارا جائے اس قدر نکھارا جائے کہ انسان بالآخر ایک ایسا آدرش روحانی انسان بن جائے جس پہ فرشتے بھی رشک کریں۔

ہمارا یقین ہے کہ ہندوستان میں ذات پات کا جو نظام ہے یہ انسان کے لئے ایشور کی سب سے بڑی دین سب سے بڑی رحمت ہے۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ اس نظام میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ناگزیر طور پر جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں غیر ملکی حملہ آوروں کے پیہم جور و ستم اور مسلسل ستم رانیوں کی وجہ سے یا بعض ایسے براہمنوں کی ضرب المثل جہالت اور تکبر کی وجہ سے جنہیں براہمن کہلانے کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ اس نظام میں جو بدعتیں، خرابیاں نظر آرہی ہیں ان سب بدعتوں اور خرابیوں کے ہوتے ہوئے بھی اور اس نظام کو جو ذلتیں اور رسوائیاں دیکھنی پڑی ہیں ان کے باوجود اس نظام نے بھارت کی سرزمین پہ کرامتیں اور معجزے کر دکھائے ہیں اور لازمی طور پر اس کی بدولت ہندوستانی قوم کو اس کی اعلےٰ اور ارفع منزلوں تک لے جایا جا سکتا ہے۔

یہ سلسلہ ذات پات ختم نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ وقتاً فوقتاً اس میں ترمیم و تنسیخ ہوتی رہنی چاہیئے۔ اس نظام کے پرانے ڈھانچے میں اس کہنہ سلسلہ کی چار دیواری کے اندر آج بھی ایک ایسی زندگی کو فروزاں دیکھا جا سکتا ہے جس زندگی کی بنیادوں پہ لاکھوں برس تک صحیح و سلامت رہنے والی عمارت ایستادہ کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلہ ذات پات کے مکمل خاتمہ کی خواہش اور مطلب سراسر حماقت ہے۔

فرقہ بندی تو معاشرہ کی بنی فطرت میں شامل ہے یہ عین تقاضائے فطرت ہے۔ اس لئے اس سلسلہ کے وجود کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے؟ ہاں جن باتوں سے ہمیں نجات حاصل کرنا ہے جن بدعتوں کو رفع دفع کر دینا چاہیئے وہ ہیں کسی خاص فرقہ یا کسی خاص طبقہ کی خصوصی مراعات یا خصوصی حقوق۔ دور تو انہیں کرنا ہے۔ ذات پات کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس معاشرہ میں ہر ایک کے ذمے ایک خاص کام ہے۔ ہر ایک کو مخصوص فرض ادا کرنا ہے۔ ایک کام آپ کے ذمے ہے ایک کام میرے ذمے ہو سکتا ہے کہ آپ ملک کی حکومت و نظم و نسق چلانے کا فرض ادا کریں اور میں پرانی جوتیاں گانٹھنے کا کام کروں لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ آپ مجھ سے افضل اور برتر ہیں یا آپ کو مجھ سے زیادہ مراعات اور حقوق حاصل ہیں اور۔ پھر کیا آپ میری طرح جوتیوں کی مرمت کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ پھر یہ احساس برتری کیوں؟ کیا میں عنانِ حکومت سنبھال سکتا ہوں؟ نہیں! میں جوتیوں کی مرمت کے کام میں بہت مہارت رکھتا ہوں اور آپ وید پڑھنے میں یکتائے روزگار ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ میرے سر چڑھ جائیں یا مجھے پاؤں تلے لتاڑنے کی کوشش کریں۔ ہر بے جا رد رعایت کا دستور ختم ہونا چاہیئے۔ اور کسی کو خاص مراعات دی جانی بند ہونی چاہیئے۔ اعلےٰ طبقہ کا ایک فرد اگر کسی کو قتل کر دے تو اسے معاف کر دیا جائے۔ اور اگر ادنےٰ طبقہ کا کوئی فرد سیب چرا لے تو اسے تختۂ دار پہ کھینچ دیا جائے! یہ سلسلہ اور طریقہ ہر حالت میں ختم ہونا ہی چاہیئے۔

www.taemeernews.com

سلسلۂ ذات پات اچھا ہے۔ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا یہ قدرتی طریقہ ہے۔ سب افراد اگر ایک ہی کام کرنے لگ جائیں تو معاشرہ درہم برہم ہو جائے گا۔ معاشرہ کا تقاضا تو یہ ہے کہ مختلف افراد مختلف کام کریں۔ آپ بھلا اس فطرتی تقاضا کو کیسے دور کر سکتے ہیں؟ آپ کہیں بھی چلے جائیے ذات پات کا یہ سلسلہ آپ کو ہر جگہ حاضر و موجود ملے گا لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ کسی خاص طبقہ کے لئے خاص مراعات و حقوق وابستہ کرنے کا رواج اور نظام بھی موجود ہو۔ ان خاص مراعات اور حقوق کا خاتمہ تو ہونا ہی چاہیئے۔ ویدانت کا مقصد اور مدعا یہی ہے کہ ان مراعات اور حقوق کو ختم کر دیا جائے۔ ویدانت سے بہرہ ور انسان اگر ماہی گیر بھی ہے تو وہ بھی برملا کہے گا "بطور انسان مجھ میں اور آپ میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ کیا ہوا کہ آپ فلسفی اور منطقی ہیں اور میں ماہی گیر ہوں لیکن میرے اندر بھی وہی ایشور جلوہ افروز ہے جو آپ کے اندر ہے۔ ہم دونوں ایک ہی طاقت و قوت کا ظہور و وجود ہیں۔ ہم دونوں میں ایک ہی نورِ ازلی ضوپاشیاں کر رہا ہے۔"

آج ہمیں اسی بات کی ضرورت ہے کہ کسی بھی خاص طبقہ یا فریق کے لئے خاص مراعات و حقوق مخصوص نہ کئے جائیں۔ سب کو ترقی و خوشحالی کے ایک جیسے مواقع ملیں۔ سب کو ایک جیسے حقوق و مراعات میسر ہوں۔ ہر ایک کو اس بات کی تعلیم حاصل کرنے کا پورا پورا حق و اختیار ہے کہ خدا میرے اندر رونق افروز ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کے اندر وہی ایشور رقصِ زندگی میں محو ہے۔ ہر ایک کو یہ حق و اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی نجات اور مکتی کے لئے جستجو کرے۔ خاص مراعات و حقوق کا زمانہ لد گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرزمینِ ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔

ایک وقت تھا جب پاکیزگیٔ اخلاق اور جوہرِ ایمان یہ تھا۔

- (tribhuvanamupakāra shrenibhih pri- yamānah)

شری بھو وانا میو کارا شر یہی نیا ئے

ہر ممکن طریقہ سے خدمت کرتے ہوئے تسلیم و رضا کے پابند رہنا۔ بے لوث خدمتِ خلق سے اپنی مسرتوں کی تخلیق کرنا۔ لیکن اب تو کیفیت بالکل الٹی ہے۔ اب اس بلند اصول کی بجائے یہ نعرہ لگایا جاتا ہے کہ صرف میں پاکباز اور نیک نفس ہوں۔ باقی سارا زمانہ غلط کار اور برا ہے۔ "مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ مجھے مت چھوؤ!" قربان جائیے ایسے دستورِ حیات اور اس نظریۂ زندگی کے۔ قربان جائیے ایسے برہم گیان کے۔ واہ رے میرے بھگوان! ایمان و اخلاق کہاں سے کہاں پہنچ گیا!! اتنی پست خیالی اور اس قدر تنگ نظری!!! اب ایشور نہ خانۂ دل میں نہاں ہے۔ نہ ساتویں آسمان پہ نور افروز ہے۔ نہ انسانوں میں جلوہ ریز ہے۔ بلکہ اب تو خدا کو رسوئی گھر اور ہنڈیا میں بند کر دیا گیا ہے۔

ہم بھی راسخ الاعتقاد ہندو ہیں۔ لیکن ہم ان ہندوؤں کے ہم خیال اور ہم نظریہ نہیں جو چھوا چھوت میں مبتلا ہیں اور "مجھے ہاتھ مت لگاؤ" کی پست نظری کا شکار ہیں۔ یہ ہندو دھرم نہیں۔ ہماری مقدس کتابوں میں یہ ہندو دھرم آپ کو کہیں بھی نہیں مل سکے گا۔ یہ تو سراسر غلط تقلید، وہم اور ضعیف الاعتقادی ہے۔ جس کا شرح مذہب اور شرح ایمان سے

www.taemeernews.com

دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ اب تو مذہب ایمان ہنڈیا کا مذہب ایمان بن کر رہ گیا ہے۔ ہندوؤں کا آج کا مذہب نہ دھرم نہ علم و دانش کا راستہ ہے نہ منطق و دلیل کا۔ یہ تو چھوا چھوت۔ نفرت و حقارت۔ کذب و کفر کا مذہب کو دھرم بنا دیا گیا ہے۔

یہ چھوا چھوت ایک قسم کی قلبی اور ذہنی بیماری ہے۔ اس کے مہلک اثرات سے اپنے دامن کو بچا کر رکھو۔ اس سے ہمیشہ خبردار رہو۔ فراخ دلی زندگی ہے تنگ دلی موت ہے۔ محبت فراخدلی ہے۔ خود غرضی تنگ نظری اور جہالت ہے۔ محبت ہی حقیقی دستورِ حیات ہے۔ محبت ہی ایمان ہے۔ دیکھنا کہ آپ اپنی قیمتی زندگیوں کو چھوا چھوت کے کفر و فریب کی وجہ سے کہیں ضائع نہ کر دینا۔ "آتما وات سرو بھوتیشو" "کل چیزوں میں اپنے آپ کو ہی دیکھنا" کیا یہ تعلیم اعلیٰ و ارفع تعلیم محض کتابوں کا زیور بن کر رہ جائے گی؟ بھلا وہ کس منہ سے نجات اور مکتی کا حق دار ہے جو بھوکے کے منہ میں روٹی کے چند لقمے نہیں ڈالتا اور کسی کی پیاس نہیں بجھاتا۔ جو کسی کی تشنگی لب نہیں بجھاتا۔ کسی کی غربت و افلاس پہ اشک بار نہیں ہوتا۔ وہ بھلا کس منہ سے نجات و مکتی مانگتے ہیں۔ جو محض دوسروں کے لمس اور سانس سے اپنے آپ کو ناپاک تصور کرنے لگ جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو بھرشٹ سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ کسی دوسرے کو پاکباز اور راست باز کیسے بنا سکتے ہیں؟ دوسروں کی بھلائی کیسے کر سکتے ہیں؟

ہمیں جور و ظلم بند کر دینا ہوگا۔ تشدد ریزی ختم کرنی ہوگی۔ اور ہم جن مضحکہ خیز اور ندامت آمیز صورتِ حالات کا شکار ہو گئے ہیں اس کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ کتنے ستم کی بات ہے کہ اگر کوئی بھنگی اور خاکروب بھنگی اور خاکروب کی صورت میں ہمارے پاس آئے۔ تو ہم اسے ٹھکرا دیتے ہیں۔ اسے اپنے پاس پھٹکنے تک نہیں دیتے۔ لیکن اگر وہ پانی کے چند لوٹے اپنے سر پہ ڈال لے اور پادری کے بتائے ہوئے چند منتر یا مناجات پڑھ لے اور کوٹ پتلون پہن کر کسی دقیانوسی اور کٹر ہندو کے گھر چلا جائے تو کوئی ہندو اسے کرسی پیش کرنے میں نہ عار سمجھتا ہے۔ نہ اس سے ہاتھ ملانے سے پرہیز کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر غلط اور ستم ظریفی کی حد اور کیا ہوگی؟

ہماری اس غلط روی۔ تنگ نظری۔ کوتاہ دامنی اور ستم رانی کی وجہ سے مدراس اور جنوبی ہند کے سینکڑوں ہندو عیسائیت کی گود میں پناہ لیتے جا رہے ہیں اور عیسائی بنتے جا رہے ہیں۔ مت سمجھئے کہ ان کی تبدیلی مذہب کی اصل وجہ بھکمری اور مفلسی ہے۔ نہیں اس کی اصل وجہ ہماری بے رخی۔ کوتاہ دامنی اور غیر ہمدردی ہے۔ کتنی گراوٹ اور پستی ہے کہ اب ہم رات دن چھوا چھوت کے بھرم میں ہی جکڑے رہتے ہیں اور محض حقارت و نفرت کے پیکر بن کر رہ گئے ہیں۔ مجھے تو اس تہی دستی کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آیا اس ملک میں ہمدردی اور محبت کا جذبہ اب کہیں زندہ و سلامت بھی ہے؟ یا یہاں صرف انسان سے نفرت کرنے والے ہی ایسے انسان بستے ہیں۔ "مجھے ہاتھ مت لگانا" جن کا ایمان بن کر رہ گیا ہے۔ ایسے غلط رواجوں کی مکمل طور پر بیخ کنی کر کے رکھ دیجئے۔ میرے دل کے اندر اس چھوا چھوت کو ختم کرنے

www.taemeernews.com

کی اُمنگ تھا انھیں مل رہی ہے جو چاہتا ہے کہ نفرت و حقارت کی اِن سب دیواروں کو نیست و نابود اور زمین بوس کر دوں اور ملک بھر میں جس قدر غریب مفلس پسماندہ ٹھکرائے ہوئے لوگ ہیں انہیں آوازیں دے دے کر منظم و متحد کر دوں کیونکہ جب تک یہ نہیں جاگتے مادرِ وطن کیسے جاگ سکتی ہے؟ جب تک اس قدر بڑے طبقہ میں بیداری نہیں آتی۔ مادرِ وطن کی نیند کا طلسم کیسے ٹوٹ سکتا ہے؟

ہر ہندو دوسرے ہندو کا بھائی ہے آپس میں ہمیں اسی جذبۂ محبت اور اسی جذبۂ اخوت کو مستحکم و مضبوط بنانا ہوگا لیکن ہماری بدبختی دیکھئے کہ ہم نے اپنے ہاتھوں چھوا چھوت کی یا دھوم مچا کر نفرت و حقارت سی پیدا کر دی ہے کہ ہم اپنے ہی بھائیوں کو حقیر و ادنیٰ سمجھنے کی حماقت کرنے لگے ہیں۔ اس طرح ہم نہ صرف اپنے بھائیوں کے ساتھ ہی برا سلوک کرنے کے مجرم و خطاوار بنے ہیں بلکہ ہم نے سارے ملک کو کمزوری، بزدلی اور جہالت کی پستیوں میں دھکیل کر رکھ دیا ہے۔ ہمیں ان انسانوں کو اوپر اٹھانا ہوگا۔ ان کے کانوں کو ڈھارس اور اُمید، محبت اور خوشی کا پیغام سنانا ہوگا انہیں بتانا ہوگا کہ آپ بھی ہماری طرح انسان ہیں۔ آپ کے بھی وہی حقوق و مراعات ہیں جو ہمیں حاصل ہیں۔ مایوسی، ابتری اور احساسِ کمتری ختم کر دو اور اٹھ کر کندھے سے کندھا ملا کر۔ قدم سے قدم ملا کر شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو جاؤ۔ یہ نغمۂ حیات ان کے دلوں میں جگانا ہوگا۔

سلسلۂ ذات پات سے جو مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ انہیں حل کرنے کے لئے ہمارا طریقہ یہ نہیں کہتا کہ جو اعلیٰ اور ارفع ہیں انہیں پستیوں اور ذلتوں میں گھسیٹا جائے۔ یہ طریقہ اس بات کا تقاضا بھی نہیں کرتا کہ ہم کھانے پینے کے معاملے میں پاگل اور سوداتی بن جائیں۔ اس طریقہ کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم زیادہ لطف و نشاط لینے کی خاطر خاص حدوں سے تجاوز کر جائیں۔ بلکہ ان جملہ مسائل کو حل کرنے کا ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک ویدانت دھرم کے تقاضوں اور فرائض کو پورا کرے۔ خوب شاہیان کی راہ پر چلے اور حق و صداقت کو دستورِ حیات بنا لے اور آدرش براہمن بن دکھلائے۔ آپ کی ذات پات کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ آپ آریہ ہوں یا غیر آریہ۔ رشی ہوں یا براہمن بھوسن جاتی کے ہوں یا شودر جاتی کے۔ ہم میں سے ہر ایک کے لئے ہمارے بزرگوں نے ایک خاص کام اور ایک خاص فرض لگا رکھا ہے۔ اور فرض یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک آدرش براہمن بننے کی کوشش و سعی کرے۔ ویدانت کا نصب العین صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں قابلِ عمل ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری دنیا اسی راہِ ویدانت کی جادہ پیما ہو جائے۔

ہندوستان کے لوگوں کے لئے کس قسم کا براہمن پن یعنی کس قسم کی طہارتِ باطنی، کس قسم کی نفس کُشی اور پاکیزگی روح نصب العین ہونی چاہئیے۔ اس کا حال شنکر آچاریہ نے غضب کے اسلوب بیان سے گیتا کی تفسیر کے آغاز میں دیا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ بھگوان کرشن نے کل بنی نوع انسان کو اسی براہمن پن کی تعلیم و تلقین دینے کی خاطر جنم لیا۔ معراجِ زندگی ہی براہمن پن کا نام ہے یہی وہ عظیم نصب العین ہے جس کا انہوں نے پرچار کیا۔ انہوں نے کہا ہے کہ ایسے براہمن، ایسے مردِ مومن، ایسے بندۂ خدا، جس نے برہم اور ایشور کو خلوت اور جلوت میں پا لیا ہو۔ بقائے دنیا کے لئے اس دنیا میں رہنا چاہئیے۔

www.taemeernews.com

اس کی ایسی بابرکت زندگی کا خاتمہ نہیں ہونا چاہیئے۔

ذات پات کے نظام میں خواہ کتنی ہی خرابیاں اور بدعتیں کیوں نہ سرایت کر گئی ہوں ہمیں یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ یہ فخر و اعزاز صرف برہمنوں کو ہی حاصل ہے کہ دوسرے طبقوں کی نسبت کہیں زیادہ ان کی صف سے سچے براہمن سچے مردِ مومن، سالک اور عارف پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس کو کوئی ٹھکرا نہیں سکتا۔ یہ طرۂ امتیاز صرف ان ہی کے حصہ آیا ہے۔ اور اس لحاظ سے ان کا مرتبہ دوسرے سب طبقوں اور فرقوں میں کہیں زیادہ برتر و بالا ہے۔ ہم میں اگر اتنی جرأت ہونی چاہیئے کہ ہم براہمنوں کی خرابیوں ان کی بدعنوانیوں کا اظہار بے جھجک کر سکیں۔ تو اس کے ساتھ ہی ہم میں یہ فراخ دلی بھی ہونی چاہیئے کہ ہم ان کی خوبیوں کے لئے ان کی تعریف کر سکیں اور ان کی صفتوں کا اعتراف کر سکیں۔

مختلف ذات پات کے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان نہیں ہونا چاہیئے۔ اس چپقلش سے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس سے ہم اور بھی بٹ جائیں گے اور کٹ جائیں گے نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اور کمزور ہو جائیں گے۔ اور اور اس طرح مزید ذلت و پستی کا شکار ہو جائیں گے۔ اس صورتِ حالات کا حل یہ نہیں کہ اعلیٰ طبقہ کو پستیوں میں گھسیٹا جائے۔ بلکہ یہ ہے کہ ادنیٰ طبقوں کو اونچا اٹھایا جائے۔ اور یہی اندازِ فکر اور یہی لائحہ عمل کی تلقین ہماری سب مقدس کتابیں کرتی ہیں۔

---

www.taemeernews.com

عورتوں کی فلاح وبہبود

سیتا بھی ہندوستانی عورت کا اعلیٰ ترین مثالی کردار ہے۔ کیوں کہ وہ تمام ہندوستانی معیار اور صفات جو کہ ایک مکمل عورت کے اندر ہونی چاہئے۔ سیتا جی کی زندگی کے اندر نشوونما پائی گئی تھیں۔ یہاں اسے ہزاروں برس سے بلند مرتبہ حاصل ہے اور سرزمین آریہ ورت کے طول و عرض میں ہر ایک مرد عورت اور بچہ اس کی پرستش کرتا ہے۔ یہ جلیل القدر سیتا جو پاکیزگی سے زیادہ پاکیزہ تمام تر صبر و رضا اور تمام تر ایثار کی پیکر ہے۔ وہاں ہمیشہ جلیل القدر رہے گی۔ وہ جس نے لب ہلائے بغیر مصائب و آرام کی زندگی برداشت کی وہ جو ہمیشہ پاک دامن اور پاک عفت بیوی رہی وہ جو عوام کا معیار ہے دیوتاؤں کا معیار ہے وہ ہماری قومی دیوی عظیم سیتا ہمیشہ جلیل القدر رہے گی۔ میرے الفاظ کو یاد رکھئے خواہ دیومالا مٹ جائے۔ یہاں تک کہ ہمارے وید رخصت ہو جائیں اور ہماری زبان سنسکرت ختم ہو جائے۔ جب تک چند ہندو بھی زندہ رہیں گے خواہ وہ انتہائی عامیانہ زبان بولنے والے ہوں ہماری سیتا کی کہانی موجود رہیگی سیتا ہماری قوم کے لئے ایک ناگزیر کردار ہے وہ ہر ایک ہندو مرد اور ہندو عورت کے رگ و پے میں رچ اور بس چکی ہے۔ ہم سب سیتا کے بچے ہیں۔

ہندوستانی معیار اور قومی معیار میں کس قدر فرق ہے! قومی معیار کہتا ہے "کام کرو۔ اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرو"۔ مغرب نے یہ مسئلہ حل کر لیا ہے کہ ایک آدمی کتنا رکھ سکتا ہے۔ ہندوستان نے یہ مسئلہ حل کر لیا ہے کہ ایک آدمی کس قدر کم سے کم رکھ سکتا ہے۔ آپ دونوں نظریات کی شدت کو دیکھئے سیتا ہندوستان کا ایک مثالی کردار ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ آیا وہ کبھی تھی یا اس کی کہانی تاریخی ہے یا نہیں۔ ہمارے سامنے ایک معیار موجود ہے اسے ہم جانتے ہیں۔ پرانوں کی کوئی بھی کہانی ایسی نہیں ہے جو اس طرح پوری قوم کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہو اسی طرح

صفحہ 70 ہندوستان اور اس کے مسائل

www.taemeernews.com

پوری قوم کی زندگی کے اندر رچ بس گئی ہو۔ اور قوم کے خون میں جس کی آمیزش اس طرح ہو گئی ہو جس طرح کہ سیتا کے اس مثالی کردار کی کہانی کی ۔

سیتا خود پاک دامن ہے۔ وہ اپنے شوہر کے جسم کے علاوہ کسی اور جسم کو کبھی ہاتھ نہیں لگاتی۔ ہندوستان میں سیتا ہر اچھی چیز کا نام ہے۔ پاکیزہ اور مقدس چیز کا نام ہے۔ وہ نام ہے عورت کی ان تمام خصوصیات کا جو کہ ہم ایک عورت کے اندر تلاش کرتے ہیں۔ اگر ایک پجاری ایک عورت کو آشیرواد دیتا ہے تو کہتا ہے سیتا ہو۔ اگر وہ ایک بچہ کو آشیرواد دیتا ہے تو کہتا ہے سیتا ہو۔ وہ سب سیتا کے بچے ہیں اور وہ سیتا بننے کی صابر اور تمام تر رنج میں ہمیشہ وفادار اور ہمیشہ پاکیزہ بیوی بننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان تمام تر مصائب و آلام کے دوران جو اس نے برداشت کئے اس نے رام کے خلاف ایک بھی سخت لفظ منہ سے نہیں نکالا اس کو اس نے خود اپنا فرض منصبی سمجھا اور مصائب و آلام کو گزارنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ جنگل کو اس کی اس غیر منصفانہ جلا وطنی کے بارے میں غور کیجئے! لیکن سیتا نے کوئی تلخی محسوس نہیں کی۔ یہ بھی ہندوستان کی خصوصیت ہے۔ فطرت کے اعتبار سے سیتا ایک سچی ہندوستانی عورت تھی۔ اس نے کبھی خواب میں کسی کو دکھ نہیں پہنچایا۔

میں جانتا ہوں کہ جس قوم نے سیتا کو جنم دیا اگر وہ صرف اس کا تصور کرے تو یہ عورت کا اس قدر احترام ہے کہ اس کی نظیر روئے زمین پر نہیں مل سکتی۔ مغربی عورتوں کے کاندھوں پر قانون کی بندش کی وجہ سے ایک بہت بڑا بوجھ ہے۔ ہماری عورتیں اس بوجھ سے قطعی طور پر ناواقف ہیں۔ یقینی طور پر ہم بے انصافیاں کرتے ہیں اعتراضات کرتے ہیں لیکن یہ وہ بھی کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ دنیا بھر میں عام کوشش محبت، ملائمیت اور راست بازی کے اظہار کے لئے کی جا رہی ہے۔ اور اس اظہار کا انتہائی موثر ذریعہ قومی رسومات ہوتے ہیں۔ جہاں تک گھریلو زندگی کا تعلق ہے مجھے یہ کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہے کہ ہندوستانی طریقوں کو کئی اعتبار سے تمام دوسرے طریقوں پر فوقیت حاصل ہے۔ ہندوستان کی پوتر دھرتی سیتا اور ساوتری کی اس سرزمین پر عورتوں کے اندر ایسے کردار مل سکتے ہیں۔ جن کے اندر قدرت کا ایسا جذبہ ہوتا ہے۔ ایسی محبت ایسی دردمندی اور ایسی قناعت ہوتی ہے جس میں دنیا میں کسی بھی جگہ کی عورتوں کے نہیں پا سکتا۔ مغرب میں عورتیں بظاہر مجھے عورتیں دکھائی نہیں دیتیں وہ مردوں کی ہوبہو نقل معلوم ہوتی ہیں۔ گاڑیاں چلاتی ہیں دفتروں میں کام کرتی ہیں۔ سکول جاتی ہیں اور پیشہ ورانہ فرائض انجام دیتی ہیں۔ ہندوستان ہی واحد ایک ایسا ملک ہے جہاں نسوانی حیا نظر آتی ہے ۔

ہماری عورتوں کو ماڈرن بنانے کی ہر ایک کوشش اگر اس کا مقصد انہیں اس سیتا کے معیار سے ہٹانا ہے قدرتی طور پر ناکام ہو گی جیسا کہ روزمرہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ ہندوستانی عورتوں کو سیتا کے نقش قدم پر

www.taemeernews.com

چل کر ہی ترقی کرنی چاہئے اور پھلنا پھولنا چاہئے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ ہر کام میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔ ہر جگہ غیر معمولی صفائی نظر آتی ہے اور وہاں تعلیم کا بہت زیادہ رواج ہے۔ جب میں خود اس علاقہ میں تھا تو میں بہت سی ایسی عورتوں سے ملا جو کہ اچھی طرح سنسکرت میں بات چیت کر لیتی تھیں۔ جبکہ باقی ہندوستانی میں سنسکرت میں بات چیت میں صلاحیت رکھنے والی اسی لاکھ میں بھی ایک عورت نہیں ملے گی۔ آقائیت سرافراز کرتی ہے۔ اور مکری ذلیل حقیر بناتی ہے۔ مالابار کو کبھی پرتگالیوں اور مسلمانوں نے فتح نہیں کیا۔ دراوڑ وسطی ایشیا میں غیر آریائی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ جو آریوں سے پہلے آئے۔ جنوبی ہند میں وہ لوگ انتہائی تہذیب یافتہ تھے۔ ان میں عورتوں کا درجہ مردوں سے بلند ہوتا تھا۔

عورتوں کے بارے میں آریائی اور سامی نظریات ہمیشہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہے ہیں۔ سامی نسل کے لوگوں میں عورتوں کی موجودگی کو بھگتی کے لئے خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ وہ مذہبی رسومات کو ادا نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ کھانے کے لئے ایک چڑیا کو بھی ہلاک نہیں کر سکتی۔ آریوں کے مطابق ایک آدمی کے بغیر مذہبی کام انجام نہیں دے سکتا۔

پار برہم کی اعلیٰ ترین سچائی ہے جنس کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ ہم صرف نسبتی سطح پر ہی اس کو برتتے ہیں۔ اور جس قدر زیادہ ہماری روح مشاہدہ نفس کی عادی ہوتی جاتی ہے اسی قدر تیزی کے ساتھ فرق ختم ہوتا جاتا ہے۔ آخر کار روح پوری طرح برہم کی یک رنگی و ہم رنگی میں جذب ہو جاتی ہے اور اس وقت اس قسم کا کوئی تصور باقی نہیں رہتا کہ فلاں مرد اور فلاں عورت۔ شری رام کرشن کی زندگی میں اس حقیقت کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس لئے میں کہوں گا کہ خواہ ظاہری طور پر مرد اور عورت میں فرق ہو ان کی حقیقی فطرت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر ایک آدمی برہم کا گیان حاصل کر سکتا ہے تو ایک عورت اسی گیان کو کیوں حاصل نہیں کر سکتی۔

وہ کون سی کتابیں ہیں جن میں آپ کو ایسی باتیں ملتی ہیں کہ عورتیں گیان اور بھگتی کی اہل نہیں ہیں؟ تنزل کے دور میں جب پجاریوں نے دوسری ذاتوں کو ویدوں کی تعلیم کا نااہل قرار دیا تو اس وقت انھوں نے عورتوں کو بھی ان کے حقوق سے محروم کر دیا۔ جدید ہندو مت کی بنیاد پرانوں پر ہے یعنی اس کا مخرج بودھ دور کے بعد کا ہے دیانند سرسوتی نے اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ ویدوں کی رسم کی ادائیگی گھریلو اگنی کی قربانی کے وقت بیوی کا موجود ہونا قطعی لازمی ہے لیکن وہ شالگرام شیلا کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ کیوں کہ اس کی ابتدا برائیوں کے بعد کے دور سے ہوتی ہے ورنہ آپ دیکھیں گے کہ ویدوں اور اپنشدوں کے زمانوں میں میتری اور گارگی جیسی قابل احترام دیویوں نے برہما کے ساتھ اپنی بھگتی کے نتیجہ میں رشیوں کی جگہ اور ان کا مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ ہزاروں پنڈتوں کے اجتماع میں جو ویدوں کے بہترین عالم اور فاضل تھے۔ گارگی نے برہما کے متعلق بحث میں بڑے حوصلہ کے ساتھ بڑا لگ لیا۔

www.taemeernews.com

کو چیلنج کیا تھا

جب ایسی مثالی عورتیں روحانی گیان حاصل کر سکتی تھیں تو اب عورتیں اسی قسم کی اعانت کو کیوں حاصل نہیں کر سکتیں۔ جو ایک بار ہو چکا ہے وہ پھر بھی ہو سکتا ہے۔ تاریخ خود کو دہراتی ہے۔

آپ ہمیشہ عورت پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن بتایئے آپ نے عورتوں کی ترقی کے لئے کیا کیا ہے؟ ہمیں پیچھے لکھ کر اور انہیں سخت ترین قوانین کی پابند بنا کر مردوں نے عورتوں کو محض بچے پیدا کرنے والی مشینوں میں ڈھال دیا ہے۔ ان کو ہمیشہ یہی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ مجبور رہیں۔ دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ذرا سی بھی مصیبت آتی ہے یا خطرہ نظر آتا ہے تو وہ آنکھوں سے آنسو بہانے لگتی ہیں۔ اور گریہ زاری کرنے لگتی ہیں۔

تمام قوموں نے عورتوں کا مناسب احترام اور عزت کرنے کے بعد ہی عظمت حاصل کی ہے۔ وہ ملک اور وہ قوم جو کہ عورتوں کا احترام نہیں کرتی کبھی عظیم نہیں بن سکتی۔ ہماری قوم کو اس قدر تنزل کیوں دیکھنا پڑا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان شکتی کی ان زندہ دیویوں کا احترام نہیں کیا۔ منو کہتا ہے: جہاں عورتوں کا احترام کیا جاتا ہے وہاں دیوتاؤں کی رحمت برستی ہے۔ اور جہاں عورتوں کا احترام نہیں ہوتا۔ وہ تمام کام اور تمام کوششیں ضائع جاتی ہیں۔ (منو سمہتا III ۵۶) اس خاندان اور کنبہ اور اس ملک کے عروج کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی جہاں عورتوں کا احترام نہیں کیا جاتا۔ اور جہاں عورتیں رنج و غم کی زندگی گذارتی ہیں۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ شکتی کا حقیقی پجاری کون ہے؟ شکتی کا حقیقی پجاری وہ ہے جو یہ جانتا ہے کہ کائنات میں ایشور کی طاقت ہر جگہ موجود ہے اور جو عورتوں کے اندر اس شکتی کا جلوہ دیکھتا ہے۔ کیا آپ اپنی عورتوں کے حالات کو بہتر بنا سکتے ہیں؟ اسی وقت آپ کی خوش حالی کی توقع پیدا ہوگی۔ ورنہ آپ ایسے ہی پسماندہ رہیں گے جیسے کہ اس وقت ہیں۔ سب سے پہلے عورتوں کی ترقی اور عوام کی بیداری ضروری ہے اسی وقت ملک کا اور ہندوستان کا کوئی بھلا ہو سکتا ہے۔ اگر عورتوں کا معیار بلند کیا جائے تو اسی صورت میں ان کے بچے اپنے کارہائے نمایاں سے ملک کے نام کو روشن کر سکتے ہیں۔ پھر اس کے بعد ملک کے اندر اس کے کلچر، علم طاقت اور بھگتی میں بیداری آجائے گی۔

اگر آپ یہ دعویٰ کریں کہ آپ اس عورت یا بچہ کو نجات دلائیں گے تو یہ بات غلط اور ہزار بار غلط ہے

مجھ سے بار بار پوچھا جاتا رہا ہے کہ دو دھواؤں کی دوسری شادی کے بارے میں میرا کیا خیال ہے اور عورت کے مسئلہ کے بارے میں کیا سوچتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ کے لئے جواب دینے دیجئے۔ کیا میں کوئی ودھوا ہوں کہ آپ مجھ سے یہ

www.taemeernews.com

بے وقوفی کی باتیں کرتے ہیں۔ کیا میں کوئی عورت ہوں جو آپ مجھ سے یہ سوال بار بار کرتے ہیں؟ آپ عورتوں کے مسائل کو حل کرنے والے کون ہیں؟ کب آپ کوئی اتھارٹی ہیں کہ ہر ایک ودھوا اور ہر ایک عورت پر آپ کو دسترس حاصل ہے۔ ایسی باتوں کو چھوڑ دیجئے۔ عورتیں اپنے مسائل آپ حل کر لیں گی۔

میری رائے میں ہر ملک کے اندر سماج خود بخود بنتا ہے۔ بس ہمیں کم عمری کی شادیوں کو ختم کرنے اور ودھواؤں کی دوسری شادی وغیرہ جیسے مسائل پر قبل از وقت سر نہیں کھپانا چاہئے۔ ہمارا کردار اس فرض کی ادائیگی میں پوشیدہ ہے کہ ہم تمام مردوں اور تمام عورتوں کو سچی تعلیم دیں۔ اس تعلیم کے نتیجہ میں وہ خود بخود سمجھنے لگیں گے کہ ان کے لئے کیا چیز اچھی ہے کیا چیز بری ہے۔ اور بری چیزوں کو خود بخود ختم کر دیں گے۔ تب جبر کے ساتھ سماج کے اندر سے کسی چیز کو ختم کرنے یا کسی چیز کو لانے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ مداخلت کا ہمارا حق صرف مناسب طور پر تعلیم دینے تک ہی محدود ہے۔ عورتوں کو اسی پوزیشن میں لے آنا چاہئے کہ وہ خود اپنے طور پر اپنے مسائل کو حل کر سکیں۔ نہ ہی کوئی ان کے مسائل کو حل کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو ایسی کوشش کرنی چاہئے۔ ہماری ہندوستانی عورتوں کے اندر اپنے مسائل کو حل کرنے کی اتنی ہی صلاحیت موجود ہے جتنی دنیا کی دوسری عورتوں میں۔

عورتوں کا معیار بلند کرنے کے اپنے بڑے بڑے دعووں کے باوجود افسوس کہ آپ ان کو ترقی دینے کے لئے کچھ نہیں کر سکے۔ آپ نے ان کے اندر تعلیم کے پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ اگر انہیں صحیح قسم کی تعلیم دی جائے تو وہ دنیا بھر میں خود کو مثالی عورتوں کی حیثیت میں پیش کر سکتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان کے مسائل بہت پیچیدہ ہیں لیکن وہ کون سا ایسا مسئلہ ہے جو تعلیم کے اس جادوئی لفظ سے حل نہیں ہو سکتا۔

عورتوں کے اندر تعلیم کا آغاز ان میں پاک دامنی کا احساس پیدا کرنے سے کیا جا سکتا ہے۔ ہماری عورتیں پاک دامنی کا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہیں کیوں کہ وہ اس کی وارث ہیں۔ اب آپ ان کے اندر اور تمام باتوں سے پہلے پاک دامنی کے نظریہ کو فروغ دیں جس سے ان کے اندر مضبوط کیرکٹر کی وہ طاقت پیدا ہو کہ زندگی کے ہر مرحلہ میں خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ یا کنوارا رہنا پسند کریں اس طاقت سے کام لیں۔ ذرہ برابر بھی خوف زدہ نہ ہوں اور اپنی عصمت و عفت کو ہاتھ سے جانے دینے کے بجائے اپنی جانوں کو قربان کرنے کو ترجیح دیں۔ ایک شخص کو اس قابل بنا دینا کہ وہ اپنے نظریہ کی خاطر، خواہ وہ نظریہ کچھ بھی کیوں نہ ہو اپنی جان قربان کرنے سے گریز نہ کرے کیا یہ کم بہادری ہے؟

تاریخ اور پرانی تہذیب، آرٹ، سائینس، گھر و بار کی تعلیم پکانا پینا اور صحت ان مضامین کی

www.taemeernews.com

عام فہم مگر خاص خاص باتیں ہماری عورتوں کو پڑھائی جانی چاہئیں۔ یہ بات اچھی نہ ہوگی کہ انہیں ناولوں اور قصہ کہانیوں کو پڑھنے کی آزادی ہو۔ لیکن صرف انہیں پوجا کی رسومات سے آگاہ کرنے ہی سے کام نہیں چلے گا ان کی تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ پھر اس کے بعد تمام معاملات کے بارے میں آگاہی حاصل ہو۔ ان کی آنکھیں کھل جائیں لڑکیوں کے سامنے ہمیشہ ایسے مثالی کردار پیش کئے جانے چاہئیں جن کا ان پر رنگ چڑھ جائے اور بے نفسی کے بلند پایہ اصولوں کی حامل بن جائیں۔ سیتا ساوتری دمینتی لیلاوتی اور میراں بائی کی مقدس مثالوں کو انکے دماغوں میں بٹھا دینا چاہیئے تاکہ وہ ان مثالی عورتوں کے کرداروں کی روشنی میں اپنے آپ کو ڈھال سکیں۔ دوسری باتوں کے علاوہ ان میں بہادری اور جرأت مندی کا جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ دور میں انکے لئے اپنی حفاظت آپ کرنا بھی جاننا ضروری ہے۔ غور کیجئے رانی جھانسی کسقدر عظیم تھی! اس قسم کی تعلیم کے بعد ہی ہماری عورتیں اپنے مسائل کو خود حل کر سکیں گی۔

ہمیں اس بات کا لحاظ کرنا چاہیئے کہ ان کی نشو و نما ایسی ہو کہ وہ ہر وقت مثالی گھریلو منتظم بن سکیں۔ ایسی ماؤں کے اندر اور زیادہ حسن و اخلاق پیدا ہوگا جو کہ ماؤں کو ممتاز کرے گا ایسی عظیم اور پرہیزگار روشن تقی اور تعلیم یافتہ عورتوں کے گھروں میں سے عظیم انسان پیدا ہوئے ہیں۔

اس دور کی موجودہ ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ بات ناگزیر معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے کچھ کو ترک علائق کے نظریات کی تربیت دی جائے تاکہ وہ حسن پاک دامنی کی طاقت سے جو کہ قابل احترام بزرگوں سے انکے خون کی فطری طور پر ہے زندگی بھر باعصمت رہنے کا پیمان باندھ سکیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہیں سائنس اور دوسرے علوم کی تعلیم دی جانی چاہیئے جس سے نہ صرف انہیں ہی فائدہ حاصل ہو بلکہ دوسروں کو بھی فائدہ حاصل ہو۔ اس کو حاصل کر کے وہ ان باتوں کو جان جائیں گی۔ اور ان کی انجام دہی میں مسرت محسوس کریں گی۔ ہماری مادر بھومی کو اس کی ترقی اور خوش حالی کے لئے ایسے بچوں کی ضرورت ہے جو کہ ایسے خالص برہمچاری بن چکے ہوں۔

ان کی مثالوں اور دنیا کے سامنے قومی نظریات پر کاربند ہونے کی ان کی کوششوں کے نتیجہ میں خیالات اور جذبات میں ایک انقلاب آجائے گا۔ ہمارے یہاں اس وقت ہوتا کیا ہے؟ کسی نہ کسی طرح ماں باپ لڑکی سے شادی کر کے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں۔ خواہ اس کی عمر نو سال کی ہو یا دس سال کی! اور کس قدر خوشی منائی جاتی ہے اگر تیرہ سال کی عمر میں بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس قسم کے خیالات کے رجحان کو بدل دیا جائے تو پرانی شردھا کے لوٹ آنے کی امید ہو سکتی ہے اور ان کی تو بات ہی کیا ہے کہ جو برہمچریہ نہیں۔ غور کیجئے ان کے اندر ان کی کس قدر شردھا اور اعتماد ہوگا! اور ان کے اندر بھلائی کا کام کرنے کے لئے کتنی شکتی ہوگی۔

www.taemeernews.com

پس کیا ہم ہندوستان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے عظیم بے خوف عورتیں پیدا کر سکتے ہیں۔ ایسی عورتیں جن کے اندر سنگ مترا لیلا اہلیا بائی اور میراں بائی کی روایات کو زندہ رکھنے کی شکتی ہو۔ ایسی عورتیں جو پاک دامنی بے غرضی اور شکتی کی وجہ سے جو کہ ایشور کے چرن چھونے سے حاصل ہوتی ہے بہادروں کی ماں بننے کے لائق ہوں۔ عورتیں دیوی ماں کا انسانی شکل میں اظہار ہیں جن کے ظاہری حسن و جمال مردوں کو دیوانہ بنا دیتا ہے لیکن یہی حسن جمال باطن گیان بھگتی ایثار اور ہمدردی ہے۔ "وہ جب خوش ہوتی ہے تو موافق بن جاتی ہے اور انسان کی نجات کا ذریعہ بن جاتی ہے۔" (چنڈی) پوجا کے ذریعہ ماں کو موافق بنائے بغیر رسم بندگی ادا کئے بغیر برہما اور وشنو تک بھی کوئی طاقت نہیں ہے کہ وہ اس سے گریز کرتے ہوئے آزادی حاصل کریں۔ اسلئے ان گھریلو دیویوں کی پرستش کیلئے انکے اندر برہم کو ظاہر کرنے کے لئے میں عورتوں کا ایک مٹھ قائم کروں گا۔

اس مٹھ سے متعلق ایک لڑکیوں کا سکول ہوگا جس کے اندر مذہبی کتابیں، ادب، سنسکرت، قواعد اور یہاں تک کہ کسی قدر انگریزی بھی پڑھائی جانی چاہئے۔ اور دوسری چیزیں مثلاً سلائی گھریلو کام کاج بچوں کی دیکھ بھال وغیرہ کے کام بھی سکھائے جانے چاہئیں۔ اگرچہ جاپ اور بھگتی وغیرہ تعلیم کے لازمی جزو ہوں گے ۔۔۔ سکول میں تعلیم دینے کی ذمہ داری ہر طرح کی تعلیم یافتہ ودھواؤں اور برہم چارنیوں کے سپرد ہونی چاہئے۔ اس ملک کے اندر عورتوں کے اسکولوں کے ساتھ مردوں کے تعلق سے بچانا ضروری ہے۔ بوڑھی برہم چارنیوں کو رہبر میں لڑکیوں کو ٹریننگ کا چارج دیا جائے گا۔

اس مٹھ میں پانچ یا چھ برس کی ٹریننگ کے بعد ان لڑکیوں کے ماں باپ ان کی شادیاں کر سکتے ہیں اگر وہ یوگ اور مذہبی زندگی کے لئے مناسب معلوم ہوں تو ان کے ماں باپ کی اجازت سے ان کو مٹھ میں رہنے دیا جائے گا۔ یہ غیر شادی شدہ برہم چارنیاں وقت آنے پر مٹھ کی استانیاں اور پرچارک بنیں گی۔ وہ دیہات اور شہروں میں مرکز کھولیں گی اور عورتوں کے اندر تعلیم کو پھیلانے کی جدوجہد کریں گی۔ کیریکٹر کی ایسی دیندار پرچارکوں کے ذریعہ اس ملک کے اندر عورتوں میں حقیقی تعلیم پھیلے گی۔

جب تک طالبات کا تعلق اس مٹھ سے رہے گا وہ اس مٹھ کے بنیادی نظریہ کے طور پر لازماً برہمچاری رہیں گی روحانیت نفس کشی قربانی اور خود پر کنٹرول اس مٹھ کی لڑکیوں کا مقصد رہے گا۔ اور خدمت اور دھرم سیوا ان کی زندگی کا نصب العین ہوگا۔ ایسی مثالی زندگیوں کو دیکھ کر کون ہے جو ان کا احترام نہیں کرے گا اور انکے لئے شردھا نہیں رکھے گا۔ اگر اس ملک کی عورتوں کی زندگی کو اس انداز میں موڑ دیا جائے تو ۔۔۔ ساوتری اور گارگی جیسی مثالی دیویاں پھر جنم لے سکتی ہیں۔

---

www.taemeernews.com

تمدّنی زندگی کی نشوونما

ہمیں اپنی فطرت کے مطابق نشو ونما پانی چاہیئے۔ ان ملکی سوسائیٹیوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش فضول ہے جو ہم پر مسلط کر دی گئی ہیں۔ یہ ناممکن بات ہے۔ ایشور کا شکر ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ ہمیں زور زبردستی دوسری وضع قطع میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔ میں دوسری قوموں کے رسوم ورواج کو برا نہیں کہتا وہ انکے لئے اچھے ہیں لیکن ہمارے لئے نہیں۔ ان کے موجودہ نظام کے پس منظر میں دوسرے علوم دوسرے رسوم ورواج اور دوسری روایات ہیں۔ ہم اپنی روایات اور اپنے ہزاروں برس کے کرموں کے ساتھ جو ہمارے پس منظر میں ہیں قدرتی طور پر خود اپنے ہی رجحان کو اپنا سکتے ہیں اپنے ہی راستوں پر چل سکتے ہیں اور ہمیں یہی کرنا چاہیئے۔

ہم اہل مغرب نہیں بن سکتے ———— ۔ اس لئے مغربیت کا ملمع چڑھانا فضول ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ مغربیت کا ملمع چڑھا سکتے ہیں، اسی لمحہ آپ کی موت واقع ہو جائے گی۔ آپ کے اندر زندگی باقی نہیں رہے گی۔ ایک دھارا اس جگہ سے بہت پرے جہاں سے وہ نکلا تھا انسانی تاریخ کے لاکھوں ادوار سے گزرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ کیا آپ کا مطلب اس دھارا کو روکنا ہے اور اس کو اس کے منبع ہمالیائی برف کی چٹانوں کی طرف واپس لوٹانا ہے۔ اگر یہ ممکن ہے تو بھی آپ کے لئے یورپین بن جانا ممکن نہیں ہے۔ اگر آپ کو ایک یورپین کا چند صدی پرانی تہذیب کو اتار پھینکنا ناممکن نظر آتا ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ بیسویں صدی پرانے شاندار کلچر کو اتار پھینکیں گے؛ یہ ہو نہیں سکتا۔ اس لئے ہندوستان کو یورپین طرز میں ڈھالنا ناممکن اور ایک بے وقوفانہ کام ہے۔

ہندوستان اور اس کے مسائل صفحہ 77

ہندوستان کے اندر ہمارے راستہ میں دو بڑی روکاوٹیں ہیں۔ پرانی قدامت پرستی اور جدید یورپی تہذیب جس نے ہماری راہیں مسدود کر رکھی ہیں۔ ان دونوں میں سے میں پرانی قدامت پرستی کو ترجیح دوں گا۔ یورپین طرز کے نظام کو نہیں۔ کیوں کہ پرانا قدامت پرست جاہل ہو سکتا ہے وہ اکھڑ ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ آدمی ہے وہ اعتقاد رکھتا ہے۔ اس کے پاس طاقت ہے۔ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہے جبکہ یورپین تہذیب میں رنگا ہوا آدمی اپنی کوئی طاقت نہیں رکھتا وہ رنگ رنگ کو خصوصیتوں کے نظریات کا ایک تودہ ہے جو مختلف ذرائع سے بے جوڑ طریقہ پر اکٹھے کرلئے گئے ہیں۔ اور یہ نظریات ہضم نہ ہونے والے ہیں غیر مربوط ہیں اور غیر یکساں ہیں۔ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا نہیں ہے۔ وہ کبھی اس طرف جھکتا ہے کبھی اس طرف۔ اس کے کام میں مقصدی طاقت کہاں ہے؟ انگریز لوگوں میں سے چند لوگوں کی سرپرستی میں۔ اصلاحات کی اس کی سکیمیں کچھ خاص سماجی رسومات کی برائیوں کے خلاف اس کی پرجوش لعن طعن کا سوتا کوئی یورپین سرپرستی ہے۔ ہمارے کچھ رسوم ورواج کو برا کیوں کہا جاتا ہے؟ کیوں کہ یورپین ایسا کہتے ہیں۔ اور یہی بات ان دلائل کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جو وہ پیش کرتا ہے۔ میں ان دلائل سامنے جھکوں گا نہیں۔ آپ کی جو شکتی ہے اس میں یقین رکھئے اور مرجایئے۔ اگر دنیا میں کوئی برائی ہے تو وہ کمزوری ہے ہر قسم کی کمزوری کو دور کیجئے۔ کیوں کہ کمزوری گناہ ہے کمزوری موت ہے۔ اس غیر متوازی مخلوق نے بھی واضح شخصیتوں کی شکل اختیار نہیں کی ہے۔ ہم انہیں آدمی عورت یا جانور پکارنے والے کون؟ جب کہ وہ پرانے قدامت پرست صادق القوی تھے اور آدمی تھے۔

ایک طرف وہ قدامت پرست آدمی ہے جو تمام تر قوم کا سرچشمہ حیات ہے، روحانیت کا حامل ہے دوسری طرف وہ آدمی ہے جس کے ہاتھوں میں مغرب کے نقلی جواہرات بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن جس کے پاس روحانیت کے جاں بخش اصول نہیں ہے۔ اس لئے ان دو میں سے مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ایک آدمی اس بات سے اتفاق کرے گا کہ ہمیں اول الذکر کو انتخاب کرنا چاہئے جو قدامت پرست ہے کیونکہ اس سے کچھ توقعات وابستہ ہیں۔ اس کے پاس قومی موضوع ہے۔ کوئی چیز پاس رکھنے کے لئے ہے اس لئے وہ زندہ رہیگا لیکن دوسرا ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ روحانیت کو ترک کر دیں۔ اور مغرب کی تہذیب کو مادی بنانے کا کام جاری رکھیں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ چند نسلوں کے بعد آپ ایک الگ نسل بن جائیں گے۔ کیوں کہ قوم کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ وہ بنیاد ختم ہو جائے گی جس پر قوم کی عمارت کی تعمیر کی گئی ہے۔ نتیجہ ہر طرح سے تباہی و بربادی کی صورت میں نکلے گا۔

www.taemeernews.com

اگر کوئی شخص ہندوستان کے اندر کھاؤ پیو اور عیش اڑاؤ کا پرچار کرتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص مادیت کو ایشور کی حیثیت دینا چاہتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ اس مقدس دھرتی پر اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مغربی تہذیب اپنی چمک اور دمک خودنمائی، پالش، اور طاقت کے شاندار مظاہرے کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ میں برملا کہتا ہوں۔ یہ بے حقیقتوں کی بے حقیقتی ہے۔ صرف ایشور ہی باقی رہے گا صرف روح ہی باقی رہے گی۔ صرف روحانیت ہی باقی رہے گی۔ اس کو یاد رکھئیے۔

ہم ہندوستان سے باہر کی دنیا کے بغیر گذر نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری بے وقوفی ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم کامیاب ہو سکتے ہیں اور ہم نے ہزار سالہ غلامی کی صورت میں اس کی سزا بھگتی ہے۔ دنیا سے کٹے رہنے کا پھل چکھا ہے۔ اب ہمیں مزید سزا نہیں بھگتنی چاہیئے۔ ایسے تمام بے وقوفی اور حماقت کو کر ہندوستانیوں کو ہندوستان کے باہر نہ جانا چاہیئے غلط ہے سمجھئے ان سب خیالات کو دماغ سے نکال پھینکنا چاہیئے۔ جتنا زیادہ آپ باہر جائیں گے، مختلف ملکوں کا سفر اختیار کریں گے اسی قدر زیادہ اپنا اور اپنے ملک کا بھلا کریں گے۔ زندگی کا پہلا ظاہرا اثر اس کی توسیع ہے۔ اگر آپ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی زندگی میں وسعت دینی چاہیئے۔ جس لمحہ آپ نے وسعت دینے کے عمل کو ختم کر دیا اسی لمحہ موت آپ کے قریب ہوگی اور خطرہ سامنے ہوگا۔

کئی خطرے راہ میں ہیں اور ان میں ایک خطرہ اس شدید قسم کا ہے کہ دنیا میں صرف ہم ہی نہیں۔ ہندوستان کے ساتھ اپنی تمام تر محبت اپنی تمام تر وفاداری اور ماضی کے لئے اپنے تمام تر احترام کے ساتھ میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمیں دوسروں سے بہت سی باتیں سیکھنی ہیں۔ ہمیں سب کے قدموں میں بیٹھ کر کچھ سیکھنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ یاد رکھئیے کہ ہر شخص ہمیں بڑے سبق دے سکتا ہے، ہمارے عظیم ترین ماہر قانون منو کا کہنا ہے "کچھ اچھا علم حاصل کیجئے خواہ وہ ادنیٰ درجہ کے آدمی سے پیدائشی طور پر کم درجہ کے آدمی سے سیکھنا پڑے۔ سیوا کر کے سیکھنا عالم بالا کے لئے راہ بناتا ہے" اس لئے ہمیں منو کے سچے بچوں کی حیثیت سے ہمیں ان کا حکم بجالانا چاہیئے اور اس زندگی کے اور اس زندگی کے بعد کی زندگی کے اسباق کو حاصل کرنے کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے خواہ وہ ہمیں کسی سے بھی حاصل ہوں۔

یورپ میں ہر چیز سے یونان کے اثرات نمایاں ہیں ہر ایک عمارت اور ہر ایک فرنیچر پر یونان کی تہذیب کا نقش قائم ہے یورپ کی سائنس اور اس کا آرٹ سوائے یونان کی سائنس اور آرٹ کے اور کچھ نہیں ہے۔ آج ہندوستان کی سرزمین پر قدیم یونانی اور قدیم ہندو کا ملاپ ہو رہا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ اور خاموشی کے ساتھ خمیر اٹھ رہا ہے۔ وسعت پذیر جان بخش اور نشاۃ ثانیہ کی تحریک جو ہم اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں ان دونوں عناصر کے یکجا ہونے سے پیدا ہوئی ہے۔ ہمارے سامنے زندگی کا ایک زیادہ وسیع اور

www.taemeernews.com

زیادہ جامع نظریہ موجود ہے اور اگرچہ شروع میں ہم نے معمولی دھوکہ کھایا اور تنگ نظری سے کام لیا آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ لہریں متحرک ہیں زندگی کے یہ وسیع تصورات اس چیز کی منطقی تفسیر ہیں جو ہماری قدیم کتابوں میں موجود ہے۔ ہمارے بزرگوں کے جو ابتدائی تصورات تھے وہ ان کے منطقی نتائج کی شدت کے ساتھ تعمیل کررہے ہیں ہمارے مقاصد یہ ہونے چاہئیں کہ ہم فراخ دل بنیں - باہر جائیں دوسروں میں ملیں اور خود کو کائناتی باشندہ بنائیں۔

ہمیں مغرب سے بہت سی باتیں سیکھنی ہیں۔ ہمیں مغرب سے اس کی سائنس اور اس کا آرٹ سیکھنا چاہئے ہمیں کسی حد تک جماعت کی طاقت اختیارات کو استعمال کرنے کی صلاحیت تنظیمی قابلیت اور چھوٹے سے چھوٹے اسباب کی بنا پر بہتر نتائج پیدا کرنے کے سلسلہ میں کسی حد تک مادی علم بھی حاصل کرنا چاہئے۔ شاید ایک خاص حد تک ہم اکو مغرب سے حاصل کرسکتے ہیں۔

ہمیں سفر کرنا چاہئے ہمیں غیر ممالک میں جانا چاہئے ہمیں دیکھنا چاہئے کہ دوسرے ملکوں کے اندر سوسائٹیاں کس طرح کام کرتی ہیں اور دوسری قوموں کے دماغوں میں جو کچھ ہے ہمیں خود کو آزاد رکھتے ہوئے اسے سمجھنا چاہئے بشرطیکہ ہم واقعی ایک قوم بننا چاہتے ہیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیے۔ اور اس بات کا موازنہ کیجئے کہ آپ کیا کرسکتے ہیں۔ ہر قوم سے سیکھئے جو بات بھی آپ کے فائدے کی ہو اس کو حاصل کیجئے۔

لیکن یاد رکھئے کہ ایک ہندو کی حیثیت سے ہمیں ہر چیز کو خود اپنے نظریات کے تابع رکھنا ہے۔ ایک سچے ہندو کیریکٹر کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ اس کا یورپی سائنس کا علم اور گیان اس کی دولت اس کی پوزیشن اور نام ایک خاص نظریہ کے تابع رہیں جو کہ ہر ہندو بچے کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہوتا ہے یعنی روحانیت اور نسل کی پاکیزگی۔

ایشیا کی آواز مذہب کی آواز رہی ہے۔ یورپ کی آواز سیاسیات کی آواز ہے۔ یونانی ذہن کے لئے اس کی صرف اپنی سوسائٹی ہی سب کچھ ہے اس کے بعد جو کوئی بھی ہے وحشی ہے۔ یونانی کے علاوہ کسی اور کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ یونانی جو کچھ کرتے ہیں ٹھیک اور درست ہے باقی دنیا میں جو کچھ ہے نہ تو وہ درست ہے نہ ٹھیک نہ اسے باقی رہنے دیا جانا چاہئے۔ یہ بات انتہائی بشری انتہائی فطری اور انتہائی فن کارانہ ہے اسی لئے یونانی پورے طور پر صرف اپنی دنیا میں رہتا ہے۔ وہ خوابوں کی بات نہیں کرتا یہاں تک کہ اس کی شاعری بھی عملی ہے اس کے دیوی اور دیوتا نہ صرف جیتے جاگتے انسان ہیں بلکہ انتہائی انسانی جذبات رکھتے ہیں اور اسی طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح ہم میں سے کوئی محسوس کرتا ہے۔ وہ خوبصورتی سے پیار کرتا ہے لیکن یاد رکھئے، وہ صرف بیرونی خدوخال سے عشق کرتا ہے۔ وہ پہاڑوں، برف کے گالوں، حسین چہروں، حسین وجمیل صورتوں کا دلدادہ ہے۔ یونانیوں کی جنت

www.taemeernews.com

صرف بیرونی اور ظاہری حسن سے ہے۔ اور چونکہ یورپ کی تہذیب یونان کی تہذیب کی پیداوار ہے اس لئے سارے یورپ کی آواز گویا یونان کی آواز ہے ۔

ایشیا کی بات دوسری ہے یہ خوبصورت اور لطیف تر، بلکہ روحانی ارتقا کے ساتھ پیار کرتا ہے۔ یہ باطن پر نظر رکھتا ہے ظاہر پر نہیں۔ یہاں فطرت کے لئے پیاس ہے تو طاقت کے لئے بھی پیاس ہے وہاں فضیلت کے لئے بھی ایسی ہی پیاس ہے۔ یونانی اور چینی کا وہی نظریہ۔ لیکن اس کا دائرہ بہت وسیع ہے ایشیا میں آج بھی پیدائش رنگ اور زبان سے کبھی قوم نہیں بنتی۔ مذہب سے قوم بنتی ہے۔ کوئی بات نہیں اگر ایک بودھ چین کا باشندہ ہے یا ایران کا وہ ایک دوسرے کو بھائی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ ایک ہی مذہب کے پیرو ہیں۔ مذہب ایک بندھن ہے انسانیت کا اتحاد ہے اور پھر اس کے بعد مشرق انھیں اسباب کی بنا پر تصوراتی ہے وہ پیدائشی طور پر خواب لیتا ہے جھرنوں کا نغمہ پرندوں کے گیت چاند سورج اور ستاروں کی اور پوری کائنات کی خوبصورتی بہت کچھ ہے مگر ایک مشرقی ذہن کے لئے کافی نہیں ہے وہ خواب سے بالاتر خواب دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ حال سے بالاتر جانا چاہتا ہے۔ حال اس کے نزدیک بے حقیقت ہے۔

مشرق صدیوں سے نسل انسانی کا گہوارہ رہا ہے یہاں انقلابات آتے رہے ہیں حکومتوں پر حکومتیں بدلی ہیں سلطنتوں کے بعد سلطنتیں قائم ہوئی ہیں انسانی طاقت، شان و شوکت اور دولت سب کو زوال آتا ہے البتہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے اگر مشرقی ذہن اس دنیا کے علائق پر حقارت کی نظر ڈالتا ہے۔ قدرتی طور پر وہ بھی ایسی کا متلاشی ہے جس میں تغیر نہ ہو کوئی ایسی چیز جو لافانی ہو جو مصائب اور موت کی اس دنیا میں ابدی لافانی اور دائمی ہو۔ ایک مشرقی پیغمبرانہ نظریات پر کبھی اصرار نہیں کرتا۔ جہاں تک پیغمبروں کا تعلق ہے آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ ایک کے علاوہ باقی تمام پیغمبر مشرق میں پیدا ہوئے۔ اگر ایسے لوگ جن کی آنکھوں پر مادی اشیا کی چمک دمک نے پردے ڈال دئے ہیں جن کی زندگی کا کل منشا کھانا پینا اور عیش اڑانا ہے جن کی ملکیت کا نظریہ زن زمین اور سیم و زر ہے جن کی مسرت کا نظریہ احساسات ہیں جن کا ایشور سونا ہے اور جن کی منزل دنیا میں تن آسانی کی زندگی گزارنا اور پھر مرجانا ہے جن کے دماغ کبھی آگے کی باتیں نہیں سوچتے اور جو اپنے ماحول کے ظاہری اسباب کے علاوہ اور کسی چیز کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا نہیں چاہتے اگر ایسے لوگ ہندوستان آئیں تو وہ یہاں کیا دیکھیں گے؟ ہر جگہ غریبی مفلسی توہم پرستی تاریکی اور وحشت انگیزی۔ کیونکہ دماغوں میں خوشی اور روشنی کا مطلب لباس اور تعلیم اور سماجی ترقی کا حصول ہے ایک طرف مغربی قوموں نے اپنی مادی پوزیشن کو بہتر بنانے کی ہر کوشش کی ہے دوسری طرف ہندوستان کے اندر اس کے برعکس معاملہ ہے۔

وہاں دنیا کے صرف وہ لوگ آباد ہیں جنھوں نے انسانی تاریخ میں کبھی دوسروں کو فتح کرنے کے لئے اپنی

www.taemeernews.com

سرحدوں سے باہر قدم نہیں نکالا جنھوں نے دوسروں کے مال و اسباب پر کبھی لالچ کی نگاہ نہیں ڈالی جن کا قصور صرف یہ تھا کہ ان کی زمینیں زرخیز تھیں اور انھوں نے اپنے ہاتھوں کی محنت سے دولت جمع کی تھی ان چیزوں کے ساتھ دوسروں کا لالچ اس قدر بڑھا کر وہ انھیں لوٹنے کے لئے آئے وہ لوٹے جانے پر ہی قانع رہے اور وحشی کہلائے اور جواب میں وہ اس دنیا میں ایشور کی روشنی کو پھیلانا چاہتے ہیں دنیا کو انسانی فطرت کے رازوں سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں حقیقی آدمی پر جو پردہ پڑا ہوا ہے اس کو اٹھانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ خواب کو سمجھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس تمام مادیت کے پیچھے حقیقی زندگی ہے وہ انسان کی روحانی کیفیت سے واقف ہیں جس کو کوئی نگاہ خفا نہیں کر سکتی کوئی جرم جس کو ختم نہیں کر سکتا کوئی ہوس جس پر اثرانداز نہیں ہو سکتی جسکو آگ جلا نہیں سکتی پانی تر نہیں کر سکتا گرمی اس کو خشک نہیں کر سکتی ان کے نزدیک انسان کی یہ کیفیت اسی قدر حقیقی ہے جس قدر مغربی دنیا کے احساسات کے نزدیک کوئی ظاہری چیز

کمال یہ ہے کہ جب کوئی آدمی یہ اعلان کرتا ہے کہ یہ دنیا محض ایک خواب ہے وہ کپڑے اتار پھینکتا ہے جائیداد کو چھوڑ دیتا ہے اور جس چیز کو وہ صحیح سمجھتا ہے اور جس پر اس کو یقین ہوتا ہے اس چیز کا مظاہرہ کرتا ہے کمال یہ ہے کہ جب کسی آدمی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ زندگی ابدی ہے تو وہ دریا کے کنارے جا بیٹھتا ہے اور اپنے جسم سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے جیسے وہ کوئی چیز نہیں ہے بالکل اسی طرح جس طرح آپ معمولی تنکے کو توڑ سکتے ہیں ان کے اندر بے پناہ بہادری پوشیدہ ہے کہ وہ موت کا ایک بھائی کی حیثیت سے مقابلہ کرنے کو تیار نہیں کیونکہ وہ یقین کرتے ہیں کہ ان کے لئے کوئی موت نہیں ہے اس میں ان کی طاقت مضمر ہے جس نے انھیں ہزاروں برس کے مظالم اور غیر ملکی حملوں کے باوجود ناقابل فتح بنا دیا ہے۔ وہ قوم آج بھی باقی ہے اور اس قوم میں انتہائی تباہی کے دنوں میں بھی روحانی پیشوا پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایشیا نے روحانیت میں ایسے ہی عظیم انسان پیدا کئے ہیں جس طرح مغرب نے سائنس اور سیاسیات میں پیدا کئے ہیں۔

آپ لوگ جو مغرب کے رہنے والے ہیں اپنے معاملات میں فوجی امور میں سیاسی نظریات کو برقرار رکھنے میں اور دوسری باتوں میں عمل ہیں۔ شاید ایک مشرقی ان باتوں میں چابکدست نہیں ہے۔ لیکن وہ خود اپنے میدان میں ماہر ہے وہ مذہب کے معاملے میں ماہر ہے جس طرح آپ ملک سے وفاداری کے نام بہادری کا مظاہرہ کرنے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے ملک کے لئے جانیں نثار کر دیتے ہیں اسی طرح ایشور کے نام پر وہ بہادر ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی فلسفہ کی تعلیم دیتا ہے دوسرے ہی روز اس فلسفہ پر اپنی زندگیوں میں عمل کرنے کے لئے سینکڑوں لوگ تیار ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ایک پاؤں پر

www.taemeernews.com

کھڑے ہونے سے نجات حاصل ہوگی تو پانچ سو آدمی فوراً ہی ایک ٹانگ پر کھڑا ہونا شروع کر دیں گے۔

آپ اس کو مہمل بات کہہ سکتے ہیں لیکن اس کو یاد رکھئے اس کے پیچھے ان کا فلسفہ ہے۔ انتہائی عملی فلسفہ۔

مغرب میں نجات اور مکتی کا مطلب محض ذہنی ورزش ہے، ایسے منصوبے جن کا کبھی کوئی حل نہیں نکلتا جن پر عملی زندگی میں کبھی عمل نہیں ہوتا۔ مغرب میں جو شخص چرب زبانی سے کام کرتا ہے وہ سب سے بڑا پرچارک ہوتا ہے مغربی دنیا کو ابھی اس بات کے سمجھنے کے لئے مدت چاہیئے کہ اعلیٰ ترین روحانیت کیا ہے۔ انکے نزدیک ہر چیز پونڈ، شلنگ اور پنس ہے۔ اگر کوئی مذہب انھیں دولت یا صحت یا خوبصورتی دیتا ہے یا عمر کو طویل کرتا ہے تو وہ سب اس مذہب میں شامل ہو جائیں گے ورنہ نہیں۔ جس طرح عملی زندگیوں میں آسائشوں کے حصول کا مغربی نظریہ ہے اسی طرح روحانیت کی اعلیٰ ترین شکل کو برقرار رکھنے کا ہمارا نظریہ ہے وہ مذہب کا مظاہرہ خالی خولی باتوں سے نہیں کرتے بلکہ اس زندگی میں اسکے ہر پہلو پر عمل کرتے ہیں۔

نشو و نما کے لئے آزادی شرط اول ہے۔ آپ کے بزرگوں نے روح کو ہر قسم کی آزادی دی جس کے نتیجے میں مذہب کو فروغ ہوا۔ انھوں نے اپنے جسموں کو ہر قسم کے بندھنوں میں جکڑا تاکہ سوسائٹی فوقیت حاصل نہ کر سکے۔ اس کے برعکس مغرب میں سوسائٹی کو ہر آزادی دی گئی لیکن مذہب کو نہیں۔ مغرب چاہتا ہے کہ روحانیت کا ہر ایک جزو سماجی ترقی کے ذریعہ ہے جب کہ مشرق چاہتا ہے کہ جتنی سماجی ترقی حاصل ہو وہ روحانیت کے ذریعہ حاصل ہو۔

صرف روحانی علم ہی ہے جو ہمت کے لئے ہماری تکلیفوں کو ختم کر سکتا ہے۔ دوسرے علم صرف کچھ عرصہ کے لئے ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ صرف روحانیت کے علم ہی کی وجہ سے خواہشات کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جسمانی طاقت اور ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ شاندار اور عظیم ہوتا ہے جن کا انحصار سائنس کے اطلاق کے ساتھ مشینوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے لیکن ان میں سے دنیا پر کسی کا اس قدر اثر نہیں پڑتا جس قدر روحانیت دنیا پر اپنا اثر قائم کرتی ہے۔

مشینیں بنی نوع انسان کو کبھی مسرت نہیں بخش سکتیں نہ ان سے بنی نوع انسان کو کوئی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ شخص جو ہمیں اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہے یہ دعویٰ کرے گا کہ خوشی مشینوں سے نہیں ہے بلکہ یہ ہمیشہ دماغوں میں ہوتی ہے صرف وہی شخص مسرت حاصل کر سکتا ہے جو اپنے دماغ پر قابو رکھتا ہو اور دوسرا کوئی نہیں۔ اور آخر کار مشینوں کی طاقت ہی کیا ہے؟ اس آدمی کو عظیم آدمی کیوں کہا جائے۔ جو بجلی کے کرنٹ کو تار میں بھیجتا ہے؟ کیا قدرت ایک لمحے کے اندر اس سے لاکھوں گنا نہیں بھیجتی؟ قدرت کے سامنے ہی پوجا کیلئے کیوں نہ جھکا جائے؟ کیا فائدہ ہے اگر آپ اس تمام دنیا پر غلبہ حاصل کرلیں اور کائنات کے ہر ذرہ کے آقا بن جائیں؟

www.taemeernews.com

یہ بات آپ کو خوشی نہیں بخش سکتی جب تک کہ آپ اپنے اندر خوشی کی طاقت کو پیدا نہ کریں جب تک آپ خود اپنے کو فتح نہ کریں۔

یہ درست ہے کہ آدمی کا جنم پراکرتی کو فتح کرنے کے لئے ہوا ہے لیکن اہل مغرب کے نزدیک قدرت سے مراد ظاہری شکل سے ہے یہ درست ہے کہ ظاہری قدرت یہاڑوں سمندروں دریاؤں اور اپنی ناگزیر طاقتوں اور مختلف اقسام کی وجہ سے نہایت شاندار ہے تاہم آدمی کی باطنی قدرتا اس سے بھی زیادہ شاندار ہے چاند سورج اور ستاروں سے اعلیٰ ترین ہے۔ ہماری اس زمین سے اعلیٰ تر ہے طبیعاتی کائنات سے اعلیٰ تر ہے جس کی وجہ سے ہماری ان زندگیوں کو فوقیت حاصل ہے اور یہ مطالعہ کا دوسرا میدان مہیا کرتی ہے اس میدان میں مشرقی لوگوں کو اس قدر سبقت حاصل ہے جس قدر دوسرے میدانوں میں مغربی لوگوں کو۔

مشرق کے لئے روحانیت کی دنیا اسی قدر حقیقی ہے جس قدر مغرب کے نزدیک احساسات کی دنیا۔ روحانیت میں مشرقی آدمی کو ہر وہ چیز ملتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے یا جس کی وہ توقع رکھتا ہے اس میں اس کو وہ تمام چیزیں ملتی ہیں جن سے زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔ مغربی آدمی کے نزدیک وہ محض ایک خواب لینے والا ہے مشرق کے مغربی شخص خوابیدہ ہے۔ جو حیات کے یک روزہ کھلونوں سے کھیل رہا ہے اور وہ اس بات کو سوچ کر ہنستا ہے کہ ترقی یافتہ مرد اور عورتیں بڑے بوڑھے مرد اور عورتیں اس مٹھی بھر پراکرتی کے لئے کس قدر ہلکان ہو رہا ہے، جسے جلد یا بدیر خیرباد کہنا ہوگا۔ ہر شخص دوسرے کو کہتا ہے کہ تم محض خواب دیکھ رہے ہو لیکن انسانی نسل کی ترقی مشرقی نظریہ حیات اس قدر ضروری ہے جس قدر مغربی ہے۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔

اس لئے قدرتی امر ہے کہ کبھی روحانی ہم آہنگی پیدا ہوئی، مشرق کی بدولت ہوئی۔ حق تو یہ ہے کہ اگر اہل مشرق مشینی علم سیکھنا چاہتا ہے تو اسے اہل مغرب کے قدموں میں دوزانو بیٹھ کر سیکھنا چاہئے۔ اگر مغربی آدمی روح الشعور روحانیت کے بارے میں جاننا چاہے اور اس کائنات کے رازوں کا مطلب سمجھنا چاہے تو اس کو جاننے کے لئے مشرق کے قدموں میں بیٹھنا چاہئے۔

ہماری یہ دنیا عنت کی تقسیم کے منصوبے پر قائم ہے۔ یہ کہنا بے کار بات ہے کہ ایک شخص کے اندر ہی سب صلاحیتیں ہو سکتی ہیں۔ پھر بھی ہم کس قدر بچوں جیسی باتیں کرتے رہیں! بچہ اپنی ناواقفیت کی حالت میں سوچتا ہے کہ اس کا گہوارہ ہی سب کچھ ہے۔ اور کائنات کی لالچی نگاہیں اس پر جمی رہتی ہیں۔ اس طرح وہ قوم جس کے پاس مادی طاقت ہے سمجھتی ہے کہ یہی طاقت سب کچھ ہے۔ یہی ترقی کا مقصد ہے اسی کو حاصل کرنا چاہئے۔ یہی تہذیب ہے اور اگر کوئی ایسی قوم ہے جو اس قسم کی طاقت نہیں رکھتی وہ زندہ رہنے کے لائق نہیں ہے اس کا وجود بیکار ہے! دوسری طرف دوسری قوم سمجھ سکتی ہے کہ محض مادی تہذیب قطعی طور پر بے کار ہے۔ مشرق سے وہ آواز

299 www.taemeernews.com

ابھری جس نے دنیا کو بتایا کہ اگر کوئی شخص کائنات کی ہر شے رکھتا ہے اور اگر اس کے پاس روحانیت نہیں ہے تو اس کا کیا حاصل ہے ؛ یہ مشرق کی قسم ہے۔ دو قسمیں عظیم ہیں دونوں کی اپنی اپنی عظمت ہے ـــــ نئی ہم آہنگی کا مطلب ان دونوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط کرنا ہے۔

قومی زندگی بیدار اور حوصلہ مند قومی زندگی کے لئے پہلی شرط یہ ہے ۔ دنیا کو اپنی ہندوستانی تصورات نے فتح کیا۔ ہندوستانی تصور روحانی اور فلسفیانہ تصور کو ایک بار پھر پھیلنا چاہئے اور دنیا کو فتح کرنا چاہیئے۔ دنیا میں بڑی بڑی فاتح قومیں ہوئی ہیں۔ ہم بھی عظیم فاتح رہے ہیں۔ ہندوستان کے شریف شہنشاہ اشوک نے ہماری فتح کی کہانی مذہب اور روحانیت کی فتح کی حیثیت سے بیان کی ہے۔ ایک بار ہندوستان کو پھر دنیا کو فتح کرنا چاہیئے۔

وہ ہر روز آپ سے یہ کہیں گے کہ سب سے پہلے ہمیں اپنے گھروں کو دیکھنا سب سے بہتر ہے۔ اور پھر اس کے بعد باہر کارخ کرنا چاہیئے۔ لیکن میں صاف صاف آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کا وہی کام بہترین ہوتا ہے جو آپ دوسروں کے لئے کرتے ہیں۔ آپ نے اگر اپنے لئے کوئی بہترین کام کیا ہے تو وہ وہی کام ہے جو آپ نے دوسروں کی خدمت کے لئے کیا ہے۔ اپنے تصورات کو سمندر پار کے ملکوں میں پھیلانے کے لئے دوسری غیر ملکی زبانوں میں کیا ہے۔

اگر غیر ملکی اپنی فوجوں کے ساتھ ہندوستان آتے ہیں اور یورش کرتے ہیں تو انہیں کرنے دیجئے۔ مادر ہند اٹھو اور اپنی روحانیت کے ذریعہ دنیا کو فتح کرو۔ اس سرزمین پر سب سے پہلے جو اعلان کیا گیا اس کو ذہن میں رکھئے۔ محبت کو نفرت پر فتح حاصل ہوئی ہے۔ نفرت خود نفرت کو کبھی فتح نہیں کر سکتی۔ مادیت اور اس کی تمام کلفتوں کو کبھی مادیت سے فتح نہیں کیا جا سکتا۔ جب فوجیں فوجوں پر فتح پانے کی کوشش کرتی ہیں تو انسانیت ذبح ہو جاتی ہے اور شیطنت ناچ اٹھتی ہے۔ روحانیت کو مغرب کو فتح کرنا ہوگا۔

آہستہ آہستہ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ جس چیز کی ایک قوم کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی انہیں ضرورت ہے وہ روحانیت انہیں کہاں سے ملے ؛ ایسے آدمی کہاں ہیں جو کہ ہندوستان کے عظیم رشیوں کے پیغامات کو لیکر باہری ملکوں میں جانے کے لئے تیار ہوں ؛ وہ آدمی کہاں ہیں جو ہر شے کی قربانی کرنے پر آمادہ ہوں تاکہ یہ پیغام دنیا کے کونے کونے میں پہنچ سکے ؛ سچائی کی اشاعت کے لئے ایسی بہادر روحوں کی ضرورت ہے ایسے بہادر کارکنوں کی ضرورت ہے جو باہری ملکوں میں جائیں اور ویدانت کی عظیم سچائیوں کی نشر و اشاعت کریں

دنیا کو اس روحانیت کی ضرورت ہے اس کے بغیر دنیا تباہ ہو جائے گی۔ تمام مغربی دنیا ایک کوہ آتش

www.taemeernews.com

فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے جو کسی وقت پھوٹ سکتا ہے اور مغربی دنیا پارہ پارہ ہو سکتی ہے انھوں نے دنیا کے ہر حصہ میں سچائی کو تلاش کیا ہے لیکن انہیں تسکین نہیں ملی ہے۔ انھوں نے مسرت کے جام کو پیا ہے۔ اور اس کی بے حقیقتی کو محسوس کر لیا ہے۔ اب کام کا وقت ہے کہ ہندوستان کے روحانی تصورات مغرب میں جڑ پکڑ سکیں۔

اس لئے ہمیں ضرور باہر جانا چاہئے۔ اور ہر اس چیز سے اپنی روحانیت کا تبادلہ کر لینا چاہئے جو وہ ہمیں دیں۔ ہم ہمیشہ طالب علم نہیں بنے رہیںگے استاد بھی بنیںگے۔ مساوات کے بغیر دوستی نہیں ہو سکتی اور ایسی صورت میں مساوات قائم نہیں ہو سکتی۔ جب ایک فریق مستقل طور پر استاد بنا رہے اور دوسرا سیکھنے کیلئے اسکے قدموں میں بیٹھا رہے آپکو سکھانا بھی ہے اور سیکھنا بھی ہے اور آپکے پاس دنیا کو آئندہ آنیوالی صدیوں تک سکھانے کے لئے بہت موجود ہے۔

ساتھ ہی آپ کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ روحانیت کے تصور کے ذریعہ دنیا کو فتح کرنے سے میری مراد جاں بخش تصورات کی اشاعت ہے سینکڑوں قسم کے توہم پرستی کے نظریات سے نہیں ہے جو ہمارے اندر صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ اس ملک تک میں ان کو ختم کیا جانا چاہئے۔ اور ایک طرف اٹھا کر پھینک دینا چاہئے تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائیں۔

مغربی دنیا میں ویدانت مت کے کل رازوں کے پرچار ان طاقت ور قوموں کی ہمدردی اور احترام حاصل کر سکیں گے اور روحانیت میں ہماری حیثیت سدا ان کے استادوں کی رہے گی۔ اور مادیت سے متعلق معاملات میں وہ ہمارے استاد رہیں گے۔ جس روز ہم نے روحانیت کو ان کے سامنے جھکا دیا اور ہمارے ملک کے لوگ مذہب حاصل کرنے کے لئے مغربی لوگوں کے قدموں میں بیٹھے۔ اسی روز فی الواقع اس تنزلی پذیر قوم کی قومیت مر جائے گی ختم ہو جائے گی۔

ان کے سامنے دن رات "مجھے یہ دو مجھے وہ دو" چلانے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ جب اس لین دین کے ذریعہ دونوں قوموں کے درمیان ہمدردی کا رشتہ استوار ہو جائیگا۔ پھر اس کے بعد اس قسم کا شور و غل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہیگی وہ خود بخود اپنے طور پر کام کریں گے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ مذہب کی اس کاشت اور ویدانت کی اس وسیع اشاعت سے اس قوم کو اور مغرب کو دونوں کو یکساں طور پر فائدہ حاصل ہوگا۔ میرے نزدیک اسکے مقابلہ میں سیاسیات پر انحصار کرنا ثانوی چیز ہے۔ میں اپنے اس یقین کو عملی طور پر عمل میں لانیکے لئے اپنی زندگی قربان کر دوں گا۔

---

301 www.taemeernews.com

ہندوستان کی عورت[1]

اتوار کی ایک صبح سویرے، مَیں ایڈیٹر کی فرمائش پوری کرنے کی خاطر سوامی وویکانند کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ان سے عرض کی کہ وہ ہندوستان کی عورت کے درجہ اور اس کے مستقبل کے موضوع میں اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں۔

"آؤ ہم سیر کو چلیں، راہ چلتے چلتے ہوا خوری بھی ہو جائے گی اور ساتھ ساتھ مَیں آپ کے سوال کے متعلق بھی کچھ کہتا جاؤں گا" سوامی جی نے فرمایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دُنیا کے حسین ترین قدرتی نظاروں کی طرف رواں تھے۔ راستہ بہت سہاونا تھا۔ کہیں کہیں سورج کی سنہری کرنوں سے راستہ چمک رہا تھا اور کہیں کہیں خوبصورت درختوں کی ڈالیوں اور شاخوں نے آگے بڑھ کر راستہ کو نرم و نازک اور شگفتہ آنچلوں سے چھپا لینے کی کوشش کی ہوئی تھی۔ یہ راستہ کبھی ان چھوٹے چھوٹے گاؤں میں لے جاتا تھا، جہاں مٹی اور گھاس پھوس کے چند جھونپڑیاں کھڑی تھیں اور ان کے باہر خوش طبع بچے کھیل کود میں مصروف تھے اور کبھی کبھی اس رونق اور چہل پہل سے دور ہم ایک ایسے خاموش مگر خوبصورت نظاروں میں گھر جاتے تھے کہ قدرت کی رعنائیوں کو دیکھ دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتے تھے۔ فصل سے لہلہاتے کھیتوں سے پرے اونچے اونچے درخت نیلے آسمانوں کی بلندیوں کو چھو رہے تھے اور ان سے کچھ دور گاؤں کی لڑکیاں ہاتھوں میں درانتیاں لئے، جاڑے کے لئے مکی کا غلہ گھر میں ڈالنے کے

1۔ رسالہ "پرابدھ بھارت" دسمبر 1898 سے ماخوذ

www.taemeernews.com

خراماں خراماں، گیت گاتی ہوئیں فصل کاٹنے کے لئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان کے قدموں میں ایک رقص تھا اور آنکھوں میں مسرت کی چمک۔ کبھی یہ راستہ ہمیں سیبوں سے لدے درختوں کے باغ میں لے جاتے اور کبھی ہم کھلی چٹانوں پر چل رہے ہوتے تھے۔ جن سے وہ برف پوش چوٹیاں صاف نظر آتی تھیں۔ جو نیلے آسمان کے پس منظر میں ہلکے نیلے رنگ کے بادلوں کے سرکتے آنچلوں میں بہت خوبصورت اور دلکش نظر آتی تھیں۔

ان نظاروں میں کھوئے ہوئے نامعلوم ہم کب تک یونہی چلتے چلے گئے کہ میرے رفیق سفر۔ شری سوامی جی ——— نے آغاز گفتگو کرتے ہوئے کہا "آریوں اور ساميوں (عراقی، آرمینی، حبشی، شامی اور عرب نسلوں کے لوگوں) میں عورت کے متعلق خیالات ایک دوسرے کے بالکل خلاف ہیں، اور ان میں زمین و آسمان کا بُعد ہے۔ ساميوں میں عورت کی موجودگی تک کو لعنت تصوّر کیا جاتا ہے، عورت کی ذات کو عبادت و ریاضت کے لیئے سد راہ اور خطرناک تصوّر کیا جاتا ہے۔ عورت بہت سی مذہبی فریضے تک ادا نہیں کرسکتی، جیساکہ ان لوگوں میں رواج ہے گوشت کھانے کے لیئے جانور ذبح کرتے ہیں۔ لیکن عورت کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ اس پر مذہبی پابندی ہے۔ لیکن آریوں میں کوئی مذہبی فریضہ اس وقت تک مکمل نہیں کہلا سکتا۔ جب تک کہ عورت مرد کے ساتھ نہ ہو۔۔۔۔۔۔"

میں نے بات کاٹتے ہوئے ایک الجھے اور حیران کن سوال سے سوامی جی کو چونکا دیا: "لیکن کیا سوامی جی ہندو دھرم، آریہ دھرم نہیں ہے؟"

سوامی جی نے فرمایا "عصر جدید کا ہندو دھرم زیادہ تر پرانوں کا ہندو دھرم ہے یعنی بُدھ کے وقت کے بعد کی پیداوار ہے۔ سوامی دیانند سرسوتی نے لکھا ہے کہ اگرچہ گھر میں یگیہ کے ہون کُنڈ میں آگ جلانے کے لیئے عورت کا ساتھ ہونا ضروری ہے لیکن اسے شالگرام شیلا وغیرہ کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیئے کیونکہ یہ رسم و رواج پرانوں کے آخری دور میں شروع ہوا تھا، پہلے نہ تھا۔"

میں پھر قطع کلام ہوگیا۔ میں نے کہا۔ "شائد یہی وجہ ہے کہ آپ ہم میں عورت کے غیر مساوی درجہ اور اس کی کمتری کا سبب بُدھ مت کو ٹھہراتے ہیں؟"

سوامی جی بولے "جہاں کہیں یہ احساس کمتری ہے، وہاں لازمی طور پر اس کی وجہ بُدھ مت کی تعلیم تھی لیکن عورت کی کمتری اور اس کے غیر مساوی درجہ کے بارے میں آپ کو مغربی نکتہ چینیوں کی ہمنوائی کرتے ہوئے یہ تصوّر نہیں کرلینا چاہیئے کہ ہمارے ہاں عورت کا درجہ کمتر ہے اور ہم اسے مساوی درجہ یا حقوق نہیں دینا چاہتے۔ نہیں، حق تو یہ ہے کہ حالات نے ہمیں کتنی ہی صدیوں سے عورت کے بارے میں اپنے

www.taemeernews.com

نظریات میں تبدیلی کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور ہم حملہ آوروں کی پیہم یلغاروں اور جارحانہ کارروائیوں کی وجہ ان کی حفاظت کے بارے میں زیادہ چوکنے اور فکرمند رہنے لگے۔ اور اس طرح عورتوں کے متعلق ہم نے ایسے رسم و رواج بنا لئے، جن میں اس کی حفاظت کا سوال مقدم ترین تھا۔ مردوں کے احساسِ برتری یا عورتوں کے احساسِ کمتری کا ذکر کیوں؟ ہمیں اپنے رسم و رواجوں کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔"

"تو کیا آپ سوامی جی! عورت کو ہم ہندوؤں میں جو موجودہ مقام حاصل ہے، اس سے مطمئن ہیں؟"

"ہرگز نہیں"۔ سوامی جی بولے "لیکن ہمیں اس صورتِ حال میں مداخلت کرنے کا صرف اتنا ہی حق حاصل ہے کہ تعلیم کو فروغ دیں۔ ہمیں عورتوں کو ایسی تعلیم و تربیت دینی چاہیئے کہ وہ اپنے مسائل کو خود حل کرنے کی صلاحیت اور قابلیت حاصل کر لیں۔ لیکن ہمیں کسی صورت میں حق حاصل نہیں کہ عورتوں کے نام پر، اُن کی فلاح و بہبود کے نام پر من مانی کرتے رہیں۔ ہمیں صرف انہیں تعلیم دینی چاہیئے اور انہیں آزادی دینی چاہیئے کہ وہ اپنے معاملات کو جس طرح چاہیں حل کریں، اور میرا یقین ہے کہ ہندوستان کی عورتیں دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کی عورتوں کی طرح اس قابل ہیں کہ وہ معاملات کو خوش اسلوبی سے حل کر سکیں ....."

"لیکن اس بُرے اثر کو کس طرح زائل کیا جائے، جو آپ کے خیال میں بدھ مت کی پیداوار ہے؟"

"یہ بُرا اثر" سوامی جی نے فرمایا "ایمان و اعتقاد کے ضعف و زوال نے پیدا کیا۔ جو بھی تحریک اُبھرتی ہے اور کامیاب ہوتی ہے، اپنی مخصوص خوبیوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ لیکن جب زوال آتا ہے تو یہی خوبیاں اس کی سب سے بڑی کمزوریاں اور خامیاں بن جاتی ہیں۔ بھگوان بُدھ جو انسانوں میں سب سے اعلیٰ اور ارفع انسان تھے ــــ ایک لاجواب ناظم اور منتظم تھے۔ انہوں نے اپنی تحریک کی بدولت ساری دنیا میں ایک انقلاب سا برپا کر دیا۔ لیکن ان کا مت ــــ گوشہ نشینی، رہبانیت اور خانقاہی ــــ زندگی کی تعلیم دینے والا مت تھا۔ اس سے قدرتاً یہ خرابی نکلی کہ سادھو کے لباس تک کو مقدس اور متبرک کہا جانے لگا۔ یہی نہیں، انہوں نے پہلی مرتبہ ایسے تارک، لدنیا گوشہ نشینوں اور راہبوں کے بل جُل کر رہنے کی زندگی کا آغاز کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ عورتوں کا درجہ حقیر اور کمتر ہو گیا۔ کیونکہ راہبہ عورتوں پر بھی کسی بھکشو کے حکم اور فرمان کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس نظام کی بدولت فوری اثر یہ ہوا کہ بدھ مت کی سالمیت حاصل ہو گئی، لیکن اس نظام کی جو دور رس نتائج تھے، انہوں نے عورتوں میں احساسِ کمتری پیدا کر دیا۔"

لیکن کیا ویدوں میں سنیاس آشرم کو نہیں مانا، ویدوں میں بھی سنیاس بننے کی تلقین کی گئی ہے۔ پھر بھگوان بُدھ نے کونسی بات ایسی کی، جس سے یہ خرابی پیدا ہوئی؟"

" بلاشبہ ویدوں میں سنیاس دھرم کو مانا گیا ہے لیکن وید اس بارے میں مرد اور عورت

www.taemeernews.com

میں کوئی تمیز وامتیاز روا نہیں رکھتے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ راجہ جنک کے دربار میں جب یاگیہ ولکیہ پہنچے تھے تو ان پر جرح کس نے کی تھی؟ جرح کرنے والوں میں ممتاز کون تھا؟ ایک عورت جس کا نام تھا واچا کاوئی، یعنی جو فنِ فطانت میں لاجواب ہو۔ اُسے اُس زمانہ میں برہم ویدی کہا جاتا تھا۔ اس نے یاگیہ ولکیہ سے مناظرہ کرتے ہوئے کہا تھا "جو سوالات میں آپ سے پوچھنے والی ہوں، وہ سوالات ایسے ہی ہیں جیسے کسی ماہر تیر انداز کے ہاتھ میں دو تیر ہوں"۔ اس جرح اور مناظرہ میں کہیں بھی اس کی جنس کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ کیسی آزادی تھی عورتوں کو جب مردوں اور عورتوں میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ اور پھر زمانہ قدیم میں رشیوں کے جنگلوں میں بنائے گئے آشرموں کو ہی دیکھ لیجئے۔ لڑکوں اور لڑکیوں میں کس قدر مساوات تھی؟ سنسکرت کے ڈرامے دیکھئے۔ شکنتلا کی کہانی پڑھیئے اور دیکھئے کہ کیا انگریز مصنف Tennyson's Princess کا ڈرامہ "شہزادی" ہمیں کچھ سکھا سکتا ہے؟

• سوامی جی! آپ زمانہ قدیم کی عظمتوں کو بے نقاب کرنے میں ثانی نہیں رکھتے۔ آپ نے کس خوبی اور کمال سے ماضی کی شان کبریائی کو کس اچھوتے انداز سے پیش کی ہے؟"

سوامی جی بولے " غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے دُنیا کے دونوں رُخ دیکھے ہیں اور میرا وشواس ہے کہ وہ نسل اور وہ دھرم جس نے سیتا جیسی دیوی پیدا کی تھی یا سیتا جیسی دیوی کا خواب دیکھا تھا اور دنیا کو اس کا تصور دیا تھا۔ وہ نسل اور وہ دھرم عورت کے متعلق اس قدر تعظیم و تکریم رکھتا ہے کہ کرۂ ارض پر اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ مغربی ممالک میں عورتوں پر محض قانونی دفعات کی رُو سے ایسی پابندیاں عائد ہیں جن کا ہم نے کبھی تصور تک نہیں کیا۔ بلاشبہ ہمارے نظام کی منفرد عظمتیں اور خوبیاں ہیں اور ویسی ہی اس کی خامیاں ہیں۔ لیکن کونسا مذہب اور نظام ہے جو ان سے پاک وصاف ہو؟ دُنیا کا ہر نظام خوبیوں سے ہی پُر نہیں، اس میں خرابیاں بھی ہیں۔ ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ سارے کرۂ ارض پر عام کوشش یہی ہے کہ محبت و نرم دلی، شفقت اور راست روی سے پیش آیا جائے اور قومی رسم و رواج اسی جذبہ، اور اسی رجحان کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ جہاں تک ہمارے نظام کی خوبیوں اور عظمتوں کا تعلق ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں، کہ ہمارے ہندوستانی رواج دُنیا کے رواجوں سے کہیں بہتر اور اعلیٰ ہیں اور سب پر فوقیت رکھنے والے ہیں"۔

" تب کیا سوامی جی! اس سے یہ مطلب اخذ کیا جائے کہ ہندوستانی عورتوں کے سامنے کوئی مسئلہ اور مشکل نہیں؟" میں نے سوال کیا۔

سوامی جی نے فرمایا۔ "کیوں نہیں، ہندوستانی عورتوں کے سامنے بہت سے سوالات ہیں کٹھن

 www.taemeernews.com

اُور مشکل مسائل لیکن ایسا کوئی بھی مسئلہ نہیں، ایسی کوئی بھی مشکل نہیں جسے تعلیم جیسے جادوئی لفظ سے حل نہ کیا جا سکے لیکن مشکل ہے کہ تعلیم کے متعلق ہمارا تصور ابھی خام ہے اُور ہم تعلیم کے متعلق بے نقص نظام کا تصور نہیں سوچ سکتے۔"

"لیکن اس اعلیٰ تعلیم کی آپ کیسے تصریح و صراحت کرتے ہیں؟" سوامی جی سے میرا سوال تھا ——— سوامی جی ہنس کر کہنے لگے: "مَیں تو کسی بھی چیز کی تصریح و صراحت نہیں کرتا۔ تاہم تعلیم کو لیاقت اُور قوّت دماغی کی نشو و نما اور ترقی تو قرار دیا جا سکتا لیکن اسے بہت سے الفاظ کا ذخیرہ جمع کرنے کا نام نہیں دیا جا سکتا یا پھر اسے ایک فرد کو اس طرح تربیت دینا کہا جا سکتا ہے کہ وہ راستی اور مستعدی سے سوچ سکے۔ ایسی تعلیم و تربیت دینے سے ہی ہم سنگھمترا، لیلا، اہلیہ بائی اُور میراں بائی کی مریاداُ اُور شان کو اُونچا کرنے والی عورتیں بنا سکتے ہیں اُور بے خوف عورتوں کے متعلق ہندوستان کی ضرورت کو پُورا کر سکتے ہیں۔ صرف ایسی عورتیں ہی قومی ہیرو اُور مشاہیر پیدا کر سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ بےغرض، مجسمہ اخلاق، پیکر محبت و ایمان اور ایک ایسی قوّت رکھنے والی ہوں گی، جو قوّت صرف ایشور کے چرن کملوں کو چھُونے سے ہی بل سکتی ہے۔"

"دُوسرے الفاظ میں آپ کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم میں مذہب و دھرم کا عنصر ہونا چاہیئے؟" مَیں نے سوامی جی سے دریافت کیا۔

"مَیں تو مذہب و ایمان کو تعلیم کا مرکزی نکتہ، اس کی جان، اس کی رُوحِ رواں تصوّر کرتا ہُوں۔" سوامی جی نے فرمایا۔ "لیکن یہ یاد رہے کہ مذہب اُور دھرم سے میری مُراد اس مذہب و دھرم سے نہیں جو مَیں اُور آپ اپنے دماغوں میں لیئے پھرتے ہیں یا اس کے متعلق میرے یا آپ کے ذہنوں میں جو خیالات ہیں، مَیں انہیں مذہب و ایمان نہیں کہتا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اُستاد کو زندگی کے دُوسرے شعبوں کی طرح تعلیم کے بارے میں طالبہ کو وہیں سے آگے لے جانا چاہیئے، جہاں پر وہ کھڑی ہو۔ کم سے کم مزاحمت سے اسے اپنی مخصوص طرزِ فکر کے مطابق ترقی کرنے میں مدد دینی چاہیئے۔"

"لیکن" مَیں نے سوال کیا۔ "سوامی جی! یقینی طور پر برہمچریہ کو جسے ہمارے دھرم میں جو عظمت و اہمیت ماں اُور بیوی سے چھین کر ایسے افراد کو دی گئی ہے، جو ان تعلقات سے بے نیاز رہیں ـــ عورت کے درجہ پر براہ راست حملہ کے مترادف ہے۔"

سوامی جی فرمانے لگے: "لیکن آپ کو بھُولنا نہیں چاہیئے کہ اگر ہمارے دھرم نے مرد کے لیئے برہمچریہ کو افضل ترین قرار دیا ہے تو یہی مرتبہ، تعظیم و تکریم برہمچریہ عورتوں کے بارے میں دی گئی ہے۔

306 www.taemeernews.com

اور پھر آپ کا سوال بتاتا ہے کہ آپ کے ذہن میں تذبذب ہے۔ ہندو دھرم انسانی رُوح ـــــــ آتما کے لئے ایک فرض اور صرف ایک فرض کی نشان دہی کرتا ہے اور یہ فرض ہے۔ اس بے ثبات دُنیا میں ثبات تلاش کرنا۔ اس فانی دُنیا میں باقی کی جستجو کرنا۔ کفر و کذب میں حق و صداقت کو ڈھونڈنا۔ یہ مقصد حیات کیسے حاصل کیا جائے؟ اس بارے میں کسی نے بھی کوئی ناطق اور قطعی راستہ تجویز نہیں کیا۔ شادی شُدہ ہو یا غیر شادی شُدہ، بھلا ہو یا بُرا، پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ، جاہل ہو یا دانش ور کسی پر کوئی روک یا پابندی نہیں۔ ہر وہ فرد جو اس منزل اور نصب العین حیات کی طرف جادہ پیما ہے، برحق ہے۔ راست رو ہے۔

یہی وہ بڑا فرق ہے جو بُدھ مت اور ہندو دھرم میں ہے۔ کیونکہ بُدھ دھرم کی سب سے بڑی ہدایت یہ ہے کہ اس خارجی دُنیا کے بے ثبات کو سمجھ لو، اور یہ کام صرف ایک مخصوص طریقۂ زندگی اپنانے سے یعنی تارک الدنیا بننے یا راہبانہ زندگی گزارنے سے ہی ممکن ہے۔ کیا آپ کو یاد ہے، مہا بھارت کی وہ کتھا جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک نوجوان یوگی جو اپنے طیش و رنج کی آگ سے کوّے اور بگلے کو جلا کر راکھ کر دینے کی کرامت حاصل کر چکا تھا؟ کیا آپ کو یاد ہے کہ یہ نوجوان سادھو شہر میں گیا اور وہاں پہلے اس نے ایک ایسی بیوی کو دیکھا جو اپنے بیمار پتی کی سیوا کر رہی تھی اور پھر ایک قصاب کو دیکھا جس کا نام وِدھ تھا۔ ان دونوں نے اپنے اپنے فرض کو تندہی اور صدق دلی سے بجالانے کے راستہ پر چل کر ایشور کو پالیا تھا؟

”سوامی جی! اس مُلک کی عورتوں کو آپ کوئی سندیش دینا پسند کریں گے؟“

سوامی جی نے فرمایا ”اس مُلک کی صرف عورتوں سے ہی کیوں؟ مَیں جو کچھ انہیں کہنا چاہتا ہُوں وہی کچھ مَیں مردوں سے کہوں گا۔ ہندوستان میں صدق و یقین رکھیئے۔ ہندوستانی اعتقاد اور ایمان پر بھروسہ رکھیئے۔ مضبوط بنیئے، ہمیشہ پُراُمید رہیئے، ہمیشہ غیرت و شرم رکھیئے اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھیئے کہ اگر آپ کسی سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں تو یاد رکھیئے کہ دنیا کے دُوسرے لوگوں کی نسبت ہندو آپ کو بے حساب علم و فضل دے سکتے ہیں۔“

Vivekananda

سوامی جی کے دستخط

307 www.taemeernews.com

حضرت محمدؐ

بھگوان کرشن کی قدیم تعلیم بھگوان بدھ حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ کی تعلیم میں ہم آہنگ ہے۔ تینوں میں سے ہر ایک نے ایک نظریہ کا آغاز کیا۔ اور اس کو انتہا تک پہنچایا۔ بھگوان کرشن تمام دوسرے پیغمبروں سے بہت پہلے آئے (تاہم ہم کہہ سکتے ہیں) بھگوان کرشن نے پرانے نظریات کو اپنا کر اُن میں امتزاج پیدا کیا اگرچہ اُن کی تعلیم قدیم تعلیم ہے۔ اُن کی تعلیم کچھ عرصے کے لئے بدھ مت کی بڑھتی ہوئی لہروں میں ڈوب گئی تھی۔ آج یہ ہندوستان کے لیئے خاص تعلیم ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو اس شام میں حضرت محمدؐ کے بارے میں کچھ کہوں گا اور بتاؤں گا کہ عرب کے اُس عظیم پیغمبر نے کیا خاص کام انجام دیا۔

حضرت محمدؐ نے جوانی کے عالم میں (بظاہر) مذہب سے زیادہ رابطہ نہیں رکھا۔ وہ روپیہ کمانے والے دھندے کی طرف راغب تھے اُن کو ایک بہترین نوجوان سمجھا جاتا تھا۔ اور بے حد خوب صورت تھے۔ ایک مالدار بیوہ تھی جو اُن سے محبت کرنے لگی اور اُن کی شادی ہوگئی۔ جب حضرت محمدؐ دُنیا کے بڑے حصّے کے شہنشاہ بن گئے اور ایران اور روما کی سلطنتیں اُن کے قدموں پر آ پڑیں تو ایک روز اُن سے پُوچھا گیا۔ آپ کو اپنی کون سی بیوی محبوب ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا پہلی کیونکہ وہ سب سے پہلے مجھ پر ایمان لائی۔

عورتیں اعتقاد رکھتی ہیں وہ آزادی حاصل کرتی ہیں ہر چیز حاصل کرتی ہیں اس خصوصیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں جو عورتوں کی ہے۔

گناہوں بُت پرستی پتھروں کی پوجا اوہام پرستی اور انسانوں کی قربانی کے رواج کو دیکھ کر حضرت محمدؐ کا دل بہت تکلیف محسوس کرتا تھا یہودیوں پر عیسائی غالب آچکے تھے دُوسری طرف عیسائیوں کا خود یہودی قوم

www.taemeernews.com

سے بھی بُرا حال تھا۔

ہم ہمیشہ بہت عجلت سے کام لیتے ہیں (لیکن) اگر کوئی بڑا کام سرانجام پاتا ہے تو اس کے لئے بڑی تیاریاں کرنی پڑتی ہیں' رات دن بہت زیادہ عبادت کرنے کے بعد حضرت محمدؐ نے اپنے نصب العین اور تصورات کا آغاز کیا۔ جبرئیل ان کی خدمت میں حاضر ہوئے' ان کو بتایا کہ وہ سچائی کے پیغمبر ہیں جبرئیل نے ان سے کہا حضرت عیسٰی حضرت موسٰی اور دوسرے تمام پیغمبروں کی تعلیمات منسوخ ہوگئیں اب وہ اپنی تعلیم کا آغاز کریں۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ عیسائی حضرت عیسٰی کے نام پر سیاسیات کا پرچار کر رہے ہیں اور فارس کے لوگ تشفویت کا شکار ہیں حضرت محمدؐ نے کہا ــــ ہمارا خدا صرف ایک ہے۔ وہ کائنات کا خالق ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔

خدا ــــ خدا ہے۔ اس میں کوئی فلسفہ نہیں کوئی پیچیدہ فلسفۂ اخلاق نہیں ــــ نہیں ہے کوئی سوائے اللہ کے اور محمدؐ اس کے رسُول ہیں ــــ حضرت محمدؐ نے مکے کے گلی کوچوں میں تبلیغ شروع کر دی۔ مکہ والوں نے ان کو سزا دی اور وہ مکہ چھوڑ کر مدینہ شہر چلے گئے اور جب قریش کی جارحانہ سرگرمیاں بند نہیں ہوئیں تو مجبوری کے عالم میں ان کے خلاف جنگ کرنی پڑی۔ اور تمام نسل کو متحد کر لیا خدا کے نام پر جو کہ عظیم ترین فاتح طاقت ہے دنیا کو (اسلام) کے طوفان میں ڈبو دیا۔

آپ ــــ لوگ بہت تنگ نظر ہیں اور لئے اوہام پرست اور حاسد ہیں' ــــ یہ تمام پیغمبر خدا ہی کی طرف سے آئے ورنہ وہ اس قدر عظیم کیسے ہوسکتے تھے' آپ خامیوں کو دیکھتے ہیں ہم میں سے ہر ایک کی اپنی خامیاں ہیں۔ کون خامی نہیں رکھتا۔ میں بہو دیوں میں بہت سی خامیاں گنا سکتا ہوں' گناہ گار ہمیشہ خامیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ مکھیاں آتی ہیں اور فاسد مادہ کو چوستی ہیں لیکن شہد کی مکھیاں آتی ہیں اور پھولوں سے شہد چوستی ہیں مکھیوں کا راستہ اختیار نہ کیجئے بلکہ شہد کی مکھیوں کا راستہ اختیار کیجئے۔

بعد میں حضرت محمدؐ نے کئی شادیاں کیں۔ عظیم شخصیتوں میں سے ہر ایک دو سو بیویاں رکھ سکتی ہے ــــ آپ کی طرح "دیوؤں" کو میں ایک بیوی کے ساتھ شادی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ عظیم روحوں کے کیرکٹر بہت عجیب وغریب ہوتے ہیں ان کے بارے میں کوئی احتساب نہیں کرنا چاہیئے۔ حضرت عیسٰیؑ حضرت محمدؐ کے بارے میں احتساب کرسکتے ہیں آپ اور میں کون؟ معمولی بچے ــــ ہم ان عظیم روحوں کے بارے میں کیا سمجھتے ہیں؟ اسلام عوام کے لئے تبلیغی پیغام کی حیثیت سے آیا۔ پہلی تعلیم یہ تھی ــــ مذہب صرف ایک ہے اور وہ ہے محبت نسل' رنگ اور کسی بھی چیز کا کوئی امتیاز نہیں' اسی مذہب محبت اسلام اختیار کرو ــــ یہ عظیم تعلیم بالکل سادہ اور ذی فہم تھی' ایک خدا پہ ایمان لاؤ جو زمین اور آسمان کا خالق ہے' ہر شئے کو اس نے پیدا کیا' ایمان محمدی دلیل بر ہستی نہ کرد۔

309 www.taemeernews.com

یہ انسانی جسم کائنات کا عظیم ترین جسم ہے اور انسان عظیم ترین مخلوق انسان کی حیثیت تمام جانداروں اور فرشتوں سے بلند ہے یہاں تک کہ دیوتاؤں کو بھی پھر انسانوں کے جسم میں آنا پڑا اور نجات حاصل کرنا پڑتا ہے انسان ہی نجات حاصل کرتا ہے دیوتا نہیں، یہودیوں اور مسلمانوں کے مطابق خدا نے فرشتوں کو پہلے بنایا پھر انسانوں کو۔ آدمی کو بنانے کے بعد خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اس کو سجدہ کریں سب نے ایسا ہی کیا کہ سوائے ایک ابلیس کے۔ اور وہ خدا کی طرف سے شیطان قرار پایا اس مثال کے پیچھے ایک عظیم سچائی ہے، یہ کہ یہ انسانی پیدائش ہی عظیم پیدائش ہے۔ دنیا میں دو قسم کی نسلیں ہیں، ربانی اور الہامی۔ ربانی کہتے ہیں کہ وہ روح اور آتما ہیں۔ الہامی کہتے ہیں کہ وہ جسم ہیں، پرانے ہندوستانی فلسفہ والوں نے اس پر زور دیا ہے کہ جسم کوئی شے نہیں ہے انسان اپنے پرانے جسم کو چھوڑ کر نئے میں چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پرانا جسم بھی نئے جسم میں تبدیل ہوتا رہتا ہے (گیتا ۲۲،۲) جہاں تک میرا تعلق ہے میرے علم اور میرے مشاہدہ نے مجھے بتایا ہے کہ دوسرا راستہ صحیح ہے۔ میں ہمیشہ مسلمانوں اور عیسائیوں کا ہم خیال رہا ہوں جو جسم کو اہمیت دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے کچھ خاص فرقوں کے لوگ زندگی بھر اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ ان کا بڑا عظیم الشان مقبرہ ان کی موت کے بعد بنے۔ میں ان میں ایسے فرقوں کو جانتا ہوں جن کے ہاں جیسے ہی بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے لئے مقبرہ تیار ہونے لگتا ہے وہ اس کام کو اہم ترین کام تصور کرتے ہیں۔ جتنا بڑا اور خوب صورت مقبرہ ہوگا اتنا ہی وہ اچھا آدمی سمجھا جائے گا۔

ان کی مسجدیں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے گرجا گھروں کی طرح سادہ ہوتی ہیں نہ کوئی مصوری نہ رنگ و برش کی کرامت۔ کونے میں ایک منبر اور اس پر قرآن حکیم رکھا ہوا ہے۔ لوگ صف باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں نہ کوئی پجاری نہ پادری اور نہ بشپ جو بھی عبادت کرتا ہے اس کو صف میں کھڑا ہونا پڑے گا۔

یہ پرانے لوگ خدا کے پیغمبر تھے میں ان کے سامنے سر نیاز خم کرتا ہوں، میں انہیں پوجتا ہوں ان کے قدموں کی خاک لیتا ہوں لیکن وہ مر چکے ہیں ہم زندہ ہیں ہمیں آگے بڑھنا چاہئے، مذہب حضرت عیسےٰ یا حضرت محمد کی تقلید نہیں ہے اگرچہ اتباع بھی عمدہ چیز ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں۔ عیسےٰ کے مقلد نہ بنئے بلکہ عیسیٰ بنئے۔ آپ بھی اسی قدر عظیم ہیں جس قدر عیسےٰ اور بدھ تھے یا کوئی اور مہاپرش ہو سکتا ہے۔ اگر ہم نہیں ہیں تو ہمیں ایسا بننے کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے اور ہم ایسے ہو سکتے ہیں میں بالکل عیسیٰ جیسا نہیں ہو سکتا۔ یہ غیر ضروری ہے کہ میں ایک یہودی پیدا ہوں۔

سب سے بڑا مذہب یہ ہے کہ آپ اپنی فطرت کے سامنے سچے ہوں، اپنے پر اعتقاد رکھیں اگر آپ کا وجود نہیں ہے خدا کا یا کسی اور کا وجود کس طرح ہو سکتا ہے آپ جہاں کہیں بھی ہیں یہ ذہن ہی ہے جس کے ذریعہ قادر مطلق تک کا ادراک

www.taemeernews.com

ہوتا ہے۔ میں خدا کو دیکھتا ہوں اس لئے اس کا وجود ہے اگر میں خدا کے بارے میں سوچ نہیں سکتا (میرے لئے) خدا کا وجود نہیں۔ ہماری انسانی ترقی کا یہی عظیم سفر ہے

یہ عظیم زُدھیں راستے کی روشن نشانیاں اور علامتیں ہیں بس اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہ کہتے ہیں "بھائیو آگے بڑھو" مگر ہم بھی ثابت قدم ہیں ہم نہیں چاہتے کہ حرکت کریں یا آگے بڑھیں، ہم سوچنا نہیں چاہتے ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے لئے سوچیں ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے پیغمبروں نے اپنا مشن مکمل کر لیا وہ ایک مقصد حیات لے کر آئے تھے اس مقصدِ حیات کو پا گئے۔ انہوں نے ہم سے کہا۔ کھڑے ہو جاؤ اور کچھ کر کے دکھاؤ لیکن صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ہم اس پیغام سے چمٹے ہوئے ہیں سوئے ہوئے ہیں ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

اعتقاد ایمان اور اصول کی بات کرنا آسان ہے لیکن ایک حُسنِ اخلاق کی تعمیر کرنا اور خیالات کے طوفان پر قابو پانا بہت مشکل ہے۔ ہم نکمے بن جاتے ہیں بگلا بھگت بن جاتے ہیں اور صرف گفتار کے غازی بنا رہنا چاہیئے۔ مذہب کوئی ضابطہ اور اصول نہیں ہے یہ ایک عمل ہے بس۔ ضابطے اور اصول عمل کے لئے ہوتے ہیں۔ عمل سے ہمیں طاقت ملتی ہے اور آخر کار بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہو جاتے ہیں اصول صرف عمل پر یشرم کے لئے مفید ہے پریشرم کے ذریعہ روح کی تکمیل ہوتی ہے جب آپ کہتے ہیں کہ میں ایمان لایا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیئے آپ کاہل، بے حس، پژمردہ بن کر رہ جائیں اور آگے بڑھنے کی آرزو کا گلا گھونٹ دیں؛

"جب کبھی نیکیوں میں کمی آتی ہے اور بدی کی کثرت ہو جاتی ہے تو میں انسانی شکل اختیار کر لیتا ہوں، بھلائی کی نجات کے لئے بدی کی تباہی کے لئے اور رُوحانیت قائم کرنے کے لئے ہر دور میں آتا ہوں۔"

گیتا کے مندرجہ بالا الفاظ کتنے صاف ہیں روشنی کے عظیم پیغمبر۔ وہ ہمارے عظیم اُستاد اور معلّم ہیں ہمارے بڑے بھائی ہیں لیکن ہمیں خود اپنے راستے پر چلنا چاہیئے اور اپنی محنت سے جادۂ پیمائیاں کرنی ہیں؛

ہم ہندو نہ صرف تمام مذاہب کے لئے روادار ہیں بلکہ انہیں تسلیم کرتے ہیں مسلمانوں کی مسجدوں میں نماز پڑھ لیتے ہیں زرتشتوں کی آگ کے سامنے بیٹھ کر پوجا کر لیتے ہیں اور صلیب عیسیٰ کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک جاتے ہیں؛

[حضرت محمدؐ اور اسلام کے متعلق سوامی جی کے خیالات کی بہترین آئینہ داری اور عکاسی ان کا وہ خط کرتا ہے جو انہوں نے اپنے ایک عقیدت مند نینی تال کے رہنے والے جناب محمد سرفراز حسین کے نام الموڑہ سے ۱۰ جون ۹۸ء کو لکھا تھا، ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ (ایڈیٹر)]

www.taemeernews.com

459

میرے پیارے!

میں نے آپ کے خط کو بہت زیادہ پسند کیا۔ اور مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ خدا خاموشی سے ہماری مادرِ وطن کے لئے لاجواب اور حیرت ناک باتیں کر رہا ہے۔

ہم اسے ویدانت کہیں یا کسی دوسرے نام سے موسوم کریں لیکن حق و صداقت یہی ہے کہ ادویت ازم مذہب اور تخیل و تفکر کا حرفِ آخر ہے۔ صرف ادویت ازم کے طفیل ہر کوئی شخص تمام مذاہب، تمام عقیدوں اور تمام مت متانتروں کو محبت کے ساتھ دیکھ سکتا ہے میرا تو عقیدہ ہے کہ مستقبل کے روشن ضمیر نوعِ انسان کا یہی مذہب ہوگا۔ دوسری نسلوں کی بہ نسبت ہندو اس فیصلہ پر دوسروں سے کہیں جلدی پہنچنے کا فخر و افتخار حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ وہ یہودیوں اور عربوں سے کہیں زیادہ قدیم باشندے ہیں۔ لیکن عملی ادویت ازم کو جو ساری کائنات کو اپنی روح اور اپنی جان کی طرح عزیز و پیاری جاننے کی تعلیم دیتا ہے، ہندوؤں نے کبھی فروغ نہ دیا۔

اس کے برخلاف میرا مشاہدہ تو یہ ہے کہ اگر کبھی کسی مذہب نے قابلِ قدر طریقہ سے پیار اور محبت کو دستورِ حیات بنایا اور دوسروں کو پیار سے دیکھا تو یہ مذہب اسلام ہے اور صرف اسلام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں پختہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عملی اسلام کی امداد کے بنا ویدانت کی سب تھیوریاں خواہ وہ کتنی ہی شاندار اور لطیف کیوں نہ ہوں بیشتر انسانوں کے لئے سراسر غیر مفید ہیں۔ ہم تو بنی نوعِ انسان کو ایک ایسے مقام تک لے جانا چاہتے ہیں جس جگہ نہ وید ہیں نہ بائبل ہے نہ قرآن ہے لیکن اس جگہ پہنچنے کے لئے ہمیں ویدوں، بائبل اور قرآن میں یگانگت پیدا کرنی ہوگی۔ دنیا کو یہ تعلیم دی جانی چاہیئے کہ تمام مذاہب اور تمام عقیدے درحقیقت اسی مذہب اور ایمان کی مختلف تفسیریں اور صورتیں ہیں اور یہ مذہب اور ایمان ہے کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے مذہب کا مقصد تو صرف اسے پانا ہے اور اسے پانے کے لئے جو نسا راستہ جسے پسند آتا ہے، اختیار کر لے کیونکہ سب مذہبوں کی منزل وہی ایک ہے۔

ہمیں اپنی مادرِ وطن کے لئے دونوں عظیم نظریات ہندو دھرم اور اسلام کا اتصال اور دونوں کا اتحاد ضروری ہے میرے نزدیک ہندو دھرم کا ویدانت دماغ ہے اور اسلام جسم ہے ہندوستان کا شاندار مستقبل ان دونوں کے اتصال میں مضمر ہے میں اپنے تصور کی آنکھ سے اس درخشندہ ہندوستان کو دیکھ رہا ہوں جو ویدانتی دماغ اور اسلام کے جسم کی بدولت کشمکش اور طوائف الملوکی سے ابھر رہا ہے اور لاجواب شان و شوکت اور ناقابلِ تسخیر طاقت کا مالک ہوگا۔

میں تو ہر وقت یہی دعا مانگتا ہوں کہ خدا آپ کو بنی نوعِ انسان خاص طور پر ہماری غریب مفلس مادرِ وطن کی خدمت کے لئے شاندار ذریعہ بنائیں۔

محبت و شفقت کے ساتھ آپ کا

وویکانند

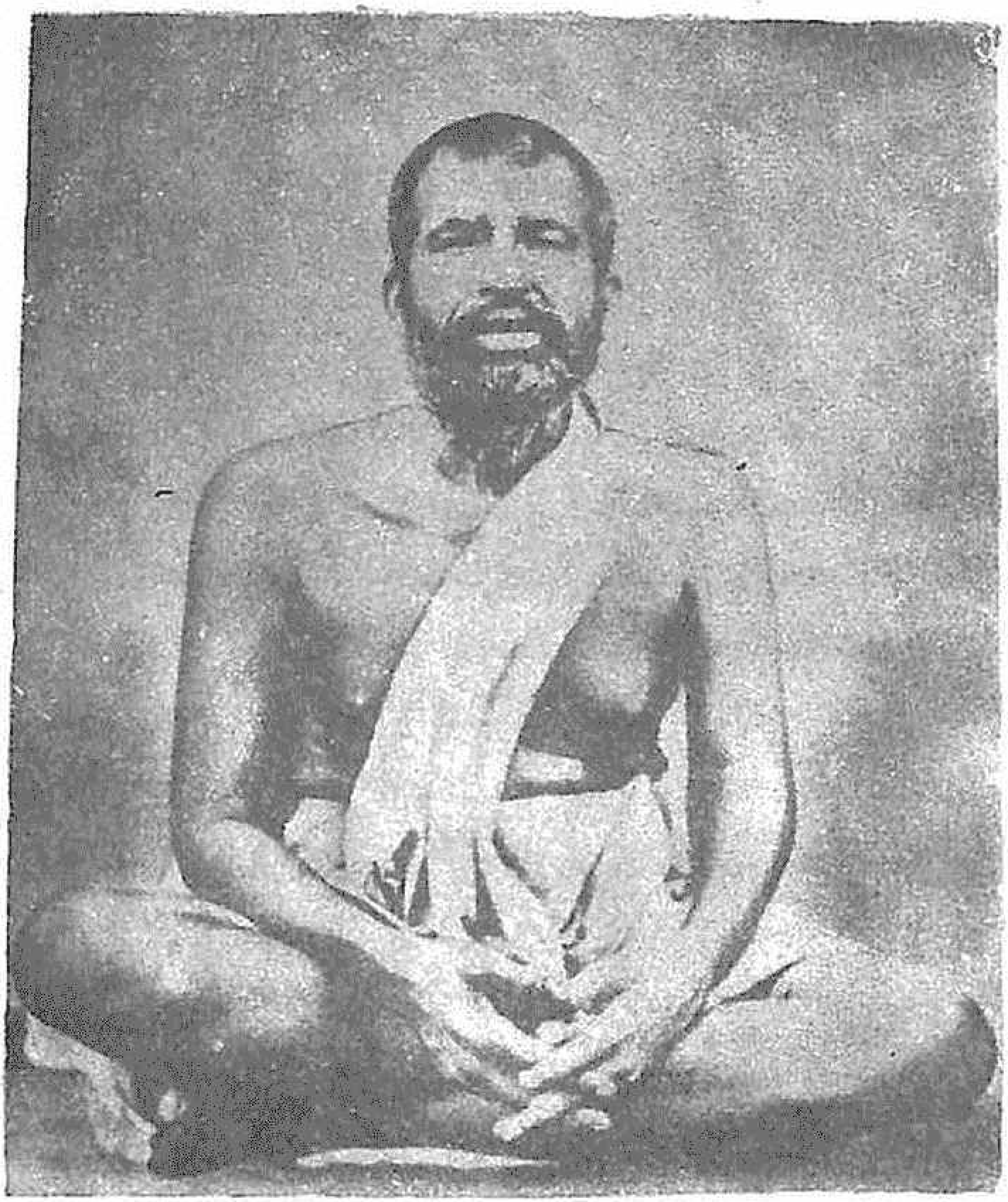

پَرم ہَنس شری سوامی رام کرشن جی

جو

شری سوامی وویکا نند جی

کے

گورو دیو تھے ۔